سہ ماہی برقی مجلہ

تفکر (کراچی نمبر - حصہ اول)

اپریل - جون 2024

جعفر طیار لائبریری

 www.jtlibrary.org JaffareTayyarLibraryOfficial +92 317 24 86 365

فہرست

حرف آغاز

جعفر طیار لائبریری کی جانب سے سہ ماہی برقی مجلے تفکر کا اس بار کراچی نمبر نکالا جا رہا ہے جو 3 حصوں پر مشتمل ہے۔اور یہ تینوں حصے ایک ساتھ جاری کیے جا رہے ہیں۔

پہلا حصہ

پہلے حصے میں صرف ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی طریقے سے کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ان مضامین کو بھی ایک خاص ترتیب سے رکھا گیا ہے پہلے کراچی کی تاریخ سے متعلق اور براہ راست کراچی سے متعلق مضامین رکھے گئے ہیں۔اس کے بعد کراچی شہر کی مختلف آبادیوں کی تاریخ اور ان کے بارے میں مضامین ترتیب وار رکھے گئے ہیں۔اور آخر میں وہ مضامین رکھے گئے ہیں جو کراچی کی کسی مخصوص تاریخ یا شناخت سے متعلق ہیں۔

دوسرا حصہ

دوسرے حصے میں کراچی شہر پر لکھی جانے والی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ کراچی شہر اور اس کے باسیوں پر لکھی جانے والی تمام کتابوں کا تعارف پیش کیا جائے۔اس لیے شہر کے کسی مخصوص علاقے پر لکھی جانے والی کتابیں اور مخصوص عنوانات پر بھی لکھی گئی کتابوں کے تعارف کو بھی شامل کیا گیا ہے۔دوسری جانب کراچی شہر پر وفویات کے موضوع پر لکھی گئیں کتابوں کا تعارف بھی اس حصے میں موجود ہے۔

تیسرا حصہ

تیسرے حصے میں کراچی شہر کے وفات پا جانے والے مشاہیر کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے وہ بھی ان کی وفات کی تاریخ کے اعتبار سے۔

کوئی بھی شخص ان تینوں حصوں کا مطالعہ کر کے کراچی شہر سے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔یہ مجلہ انشاءاللہ کراچی شہر کو جاننے کا شوق رکھنے والوں اور کراچی پر لکھنے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے کافی مددگار ثابت ہو گا۔
کراچی شہر پر لکھے جانے والے کچھ مضامین جو سوشل میڈیا پر موجود تھے ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔مگر کچھ پر مضمون لکھنے والے کے نام کا تحریر نہ ہونے کی وجہ سے نام نہیں دیا گیا۔کیونکہ یہ ایک برقی مجلہ ہے اس لیے مضمون کے لکھنے والے کے نام کا پتہ چلتے ہی ان کا نام تحریر کر دیا جائے گا۔کسی بھی مضمون میں پیش کی گئی رائے مصنف کی ذاتی رائے ہوتی ہے، جس سے برقی مجلہ تفکر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

نعتِ الرسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پروفیسر بابر عسکری

نعتیہ قطعہ

اَوج پر میرے مقدّر کا ستارا آئے
شہرِ سرکار سے جس روز بُلاوا آئے

سبز گنبد کی طرف دوڑ کے جاؤں ایسے
جس طرح پیاسا کوئی جانبِ دریا آئے

یا نبی، یا نبی یا محمد مجھ گناہگار پر یہ عطا ہو
میری تقدیر میں بھی تو کچھ دن شہرِ طیبہ کی آب و ہَوا ہو

پاس کچھ بھی نہیں میرے زادِ سفر، نہ ہی مثلِ فرشتہ میں رکھتا ہوں پَر
آپ کے دَر پہ اُڑ کر میں پہنچوں آپ چاہیں تو یہ معجزہ ہو

وجہِ تخلیقِ دونوں جہاں آپ ہیں، رازِ کن کے فقط راز داں آپ ہیں
ایسا کوئی نہیں آپ ہیں بس جس کا عاشق خُدا با خُدا ہو

آپ ہر اک سے افضل ہیں بعد خُدا، آپ جیسا نہیں ہے نہ ہوگا نہ تھا
اپنے جیسا کہے آپ کو جو کیوں نہ محشر میں اُس کو سزا ہو

آپ ہیں علم کا شہر دَر ہیں علی، رب نے بھیجی ہے اقراء کی پہلی وحی
دولتِ علم اُمّت کو بخشیں جہل کا تا کہ اب خاتمہ ہو

نیکیاں تو ہیں اعمال نامے میں کم، دامن اُمید کا پھر بھی تھامے ہیں ہم
حشر میں تم اَے زہرا کے بابا میری بخشش کا اِک آسرا ہو

اَے مسیحائے عیسی جو بیمار ہیں، رات دن درد و غم میں گرفتار ہیں
آپ کی ایک نظرِ کرم سے غم کے ماروں کو حاصل شفا ہو

میرا وقتِ نزع جب ہو آقا میرے، آپ کا نام اُس دم لبوں پر رہے
قبر میں ہوگی زیارت ہمیں جب خوف کیوں پھر ہمیں موت کا ہو

خُرّم و بابر ہم سے ثنائے نبی، مثلِ حسّان و دعبل نہیں ہو سکی
کیسے کوئی بشر کہہ سکے گا نعت جبکہ خُدا کہہ رہا ہو

نظم شہرِ کراچی

پروفیسر آصف ناجی

بادِ صبا ہے، یہ شہرِ کراچی
خدا کی عطا ہے، یہ شہرِ کراچی

اندھیرے سے لڑنے کی عادت ہے اسکو
سَحر آشنا ہے، یہ شہرِ کراچی

پیار و محبّت سے لکھی ہوئی اِک
عجب داستاں ہے، یہ شہرِ کراچی

آنچل میں سب کو چُھپائے ہوئے ہے
ماں کی طرح ہے، یہ شہرِ کراچی

لُٹا تا چلا جا رہا ہے اُجالے
چَراغِ وفا ہے، یہ شہرِ کراچی

زخم آج بھی اِسکے تازہ ہیں لیکن
مُسّمِم وفا ہے، یہ شہرِ کراچی

دریا دِلی بھی مثالی ہے اِسکی
شاہوں کا شاہ ہے، یہ شہرِ کراچی

ہر رنگ ملتا ہے میرے شہر میں
قوس و قزح ہے، یہ شہرِ کراچی

واقف نہیں ہے یہ دھوکہ دہی سے
بہت باوفا ہے، یہ شہرِ کراچی

تعصب کے خونی شکنجے سے اَب بھی
نبرد آزما ہے، یہ شہرِ کراچی

واقف نہیں ہے یہ دھوکہ دہی سے
بہت باوفا ہے، یہ شہرِ کراچی

کراچی کی مختصر ترین تاریخ

تحریر: پروفیسر سید علی عمران

محققین کی رائے کے مطابق کراچی آخری برفانی دور کے خاتمے پر سمندر کے کنارے سے نمودار ہونا شروع ہوا.
ویسے تو کراچی کے آثار سکندر اعظم سے بھی پہلے کے ملتے ہیں اور ملیر وادی کی تاریخ قدامت کے اعتبار سے قدیم پتھروں کے وسطی دور سے شروع ہوتی ہے تاہم 326 قبل مسیح میں جب سکندر اعظم کا جرنل نیر کس برصغیر پر فوج کشی کے بعد کراچی کے قریب جزائر میں قیام پذیر ہوا تھا اس وقت کراچی کا نام "کروکالا" تھا. جس کا مقامی زبان میں مطلب واگھو (دیوتا) کے ہیں. جرنل نیر کس نے اپنے قیام کے دوران اس کا نام تبدیل کر کے اپنے بادشاہ کے نام پر "سکندری جنت" رکھ دیا. اس کے بعد بھی کراچی کے بے شمار نام تبدیل ہوتے رہے.
پہلی صدی سے ساتویں صدی تک کراچی کی بندرگاہ پر بدھ مذہب کے پیروکاروں کا اثر ورسوخ ملتا ہے جو بیرون ملک پنج شیل کا پیغام لیکر جاتے تھے. ساتویں صدی میں جب برہمنوں نے سندھ پر غلبہ حاصل کیا تو کراچی کی بندرگاہ کو تباہ کر دیا اور کراچی کے قریب دیبل اور بھمبھور کی بندرگاہوں کو فروغ دیا. 712ء میں جب محمد بن قاسم نے دیبل کی بندرگاہ پر حملہ کیا تو اپنا ساز وسامان کراچی کی بندرگاہ کے ذریعے اتارا اور کراچی کی بندرگاہ کو "دربو" کا نام دیا. یوں کراچی کا ایک نیا نام رکھ دیا گیا.
سندھ میں عرب دور تقریبا 300 سال پر محیط رہا. اس دوران بنو امیہ کے 10 گورنر رہے جب کہ بنو عباس کے 31 گورنر مقرر ہوئے اسکے علاوہ کافی عرصہ فاطمیوں کے بھی زیر اثر رہا. اس پورے عرصے میں کراچی کا کوئی خاص ذکر نہیں ملتا سوائے عباسی دور میں عبداللہ شاہ غازی کی شہادت کے جن کا مزار آج بھی کراچی میں کلفٹن کے مقام پر مرجع خلائق ہے.
عباسیوں کی حکومت 111 سال تک مکمل طور پر رہی مگر پھر خلافت عباسیہ کمزور ہوتی چلی گئی. عباسی سلطنت کے ماتحت جو ریاستیں تھیں وہ آہستہ آہستہ خود مختار ہوتی چلی گئیں. 855ء میں عمر بن عبدالعزیز ہباری جو عباسیوں کی طرف سے سندھ کا والی مقرر ہوا تھا آزاد حکمران بن گیا مگر خطبہ عباسیوں ہی کا جاری رہا. 871ء میں یعقوب بن لیث صفاری نے جب ایران میں زور پکڑا تو ہباری حکومت اس کی باجگزار بن گئی. دوسری جانب ملتان میں فاطمیوں کے زیر اثر حکومت قائم ہو گئی اور اس کے اثرات سندھ تک آ گئے.
1010ء میں محمود غزنوی نے ملتان سے لے کر سندھ تک جو فاطمیوں کے زیر اثر سلطنت قائم ہو گئی تھی انتہائی خون خرابے کے بعد اس کو حاصل کر لیا.

1030ء میں محمود غزنوی کے انتقال کے بعد اس کے خاندان والے امور سلطنت کو نہ چلا پائے اور سندھ میں 1044ء میں سومرا خاندان اقتدار میں آ گیا.

1175ء میں شہاب الدین غوری نے دوبارہ سندھ پر قبضہ کر لیا مگر سومرا خاندان کے ساتھ معاہدہ ہو گیا اور سومرا خاندان سلطنت دہلی کے زیر اثر کام کرتا رہا اسطرح کہ سلطنت دہلی کا ایک امیر ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا. سومرا خاندان کے 20 حکمران 1340ء تک سندھ پر حکمرانی کرتے رہے.

محققین کی ایک رائے کے مطابق سومرو عربی النسل قوم ہے جن کے مورث اعلی صحابی رسول سمرہ بن جندب ہیں. جبکہ کچھ محققین کی نظر میں یہ حضرت علی کے فرزند حضرت محمد ابن حنفیہ کی اولاد سے ہیں. جبکہ دیگر محققین کی نظر میں سومرو فرزند زمین ہے اور صوبے کے پہلے باشندے سندھ کی اولاد ہیں

1340ء میں سمہ جام قبیلے نے سومرو قبیلے کی حکومت ختم کر کے سندھ کی حکمرانی حاصل کی اور 1521ء تک اس خاندان کے 18 حکمران گزرے انہی حکمرانوں نے نیا دارالحکومت ٹھٹہ میں تعمیر کروایا. یہ خاندان بھی ہمیشہ سلطنت دہلی کا باج گزار رہا. کچھ محققین کی نظر میں سمہ قبیلہ سندھ کا مقامی قبیلہ ہے جبکہ کچھ محققین کی نظر میں سمہ جام بھی ایران سے آئے ہوئے حکمران تھے.

1521ء کے شروع میں ارغون خاندان کی حکومت شروع ہوئی. ارغون چنگیز خان کی نسل سے تھے جو خراسان سے ہوتے ہوئے سندھ کے شہر ٹھٹہ پر حملہ آور ہوئے اور پھر سندھ فتح کرنے کے بعد ٹھٹھہ کو ہی دارالخلافہ بنایا.

1554ء میں ترخان سندھ کی حکومت پر قابض ہو گئے. امیر تیمور نے اس قبیلے کو اسکی بہادری پر ترخان کا لقب دیا تھا. ترخان دور میں کراچی کا نام "کراشی" ہو گیا تھا. اس دور میں کراچی کی بندرگاہ ایک محفوظ بندرگاہ تصور کی جاتی تھی

اکبر اعظم نے 1590ء میں سندھ پر مکمل تصرف حاصل کر لیا جو محمد شاہ رنگیلا کے دور تک جاری رہا. مغلوں کے دور میں کراچی کی بندرگاہ کو مکمل نظر انداز کیا گیا اور یہاں کوئی ترقی نہیں ہوئی. اس دور میں کراچی کو "مون ہارا" کے نام سے پکارا جاتا تھا

1699 میں مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے سندھ کی حکومت کلہوڑوں کو دی یوں کلہوڑوں نے مغل حکومت کے گورنر کے طور پر سندھ کا نظام حکومت سنبھالا اور 1738ء تک گورنر کے طور پر کام کیا مگر جب محمد شاہ رنگیلا کے دور میں مغل حکومت کا شیرازہ بکھرنے لگا تو کلہوڑوں نے سندھ کو مغلوں کی ماتحتی سے نکال لیا اور یوں سندھ نادر شاہ درانی اور پھر احمد شاہ ابدالی کا باج گزار بن گیا.

کلہوڑا خاندان رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کی اولاد میں سے تھے اسی نسبت سے یہ عباسی کہلاتے تھے مگر اپنے جد امجد کے لقب کی مناسبت سے کلہوڑا کہلانے لگے. 1697ء میں اورنگزیب عالمگیر نے خون بہا کے طور پر کراچی کو خان آف قلات کے حوالے کر دیا تھا اور یہ 1757ء تک بلوچستان کا حصہ رہا.

کھارک بندر کی قدیم بندر گاہ پر جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے مسائل کی وجہ سے جہاز کراچی آنے لگے اور تجارت کا رخ بھی کراچی کی طرف مڑ گیا جس کی وجہ سے لوگوں کا رخ کراچی کی طرف ہونے لگا. کلہوڑوں نے اپنی رعایا کی حفاظت کے لیے 1757ء میں کراچی پر قبضہ کر لیا اور اپنی حکومت قائم کر لی. کلہوڑوں کے دور میں کراچی کو "کلاچو جو گوٹھ" کے نام سے پکارا جاتا تھا. کلہوڑوں کے دور میں کراچی میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی اور اس وقت کراچی کی آبادی کوئی آٹھ ہزار نفوس کے لگ بھگ تھی.

1774ء میں اتفاقیہ طور پر کلہوڑا خاندان کے ایک فرد نے خان آف قلات کے بھائی کو قتل کر دیا جس کی وجہ سے کلہوڑوں نے کراچی کو خون بہا کے طور پر ایک بار پھر والی قلات کو دے دیا. یوں کراچی 17 سال بعد پھر خان آف قلات کے عملداری میں چلا گیا.

خان آف قلات نے کراچی پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور حاکم تک مقرر نہیں کیا. بس جہازوں سے محصولات وصول کرنے کے لئے ایک کسٹم کا ٹھیکیدار مقرر کر دیا تھا.

موجودہ کراچی کی بنیاد 1729ء میں ایک ہندو تاجر بھوجو مل نے رکھی جو پہلے کھارک بندر کے علاقے میں رہتے تھے مگر کراچی کی بندر گاہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے کراچی آکر آباد ہو گئے. اس زمانے میں کراچی کو قلاچی جو گوٹھ کہا جاتا تھا اس کے مکین کیماڑی منوڑا اور سمندر کے ساحلی علاقوں کی حد تک محدود تھے اور ونگورا، بندری اور کراچو کہلاتے تھے. جبکہ باتھ آئی لینڈ، کلفٹن، گزری، محمود آباد، منظور کالونی، اعظم بستی اور کورنگی کے بعض علاقے جزائر کی صورت میں سمندر کا حصہ تھے جو آہستہ آہستہ سمندر کے پیچھے ہٹنے کی وجہ سے خشک میدانوں میں تبدیل ہوتے گئے اور کراچی شہر کا حصہ بنتے گئے.

سیٹھ بھوجو مل نے اپنے قیام کے ساتھ ہی ڈاکوؤں سے بچنے کے لیے شہر کے گرد دیوار بنوائی اور اس کے دو دروازے رکھے ایک سمندر کی طرف کھلنے والا دروازہ کھارو در جو بعد میں کھارادر کے نام سے مشہور ہوا اور میٹھے پانی یعنی لیاری ندی کی طرف کھلنے والے دروازے کو میٹھو دروازو کا نام دیا گیا جو بعد میں میٹھادر کے نام سے مشہور ہوا. سیٹھ بھوجو مل نے ہی کراچی کو آباد کر کے باقاعدہ شہر کی بنیاد رکھی اور تاجروں کو اس شہر کی طرف راغب کیا.

1783ء میں کلہوڑوں کو تالپوروں نے شکست دی اور سندھ پر قبضہ کر لیا. 1792ء میں تالپوروں نے کراچی پر قبضے کی نیت سے 2 حملہ کیے مگر کامیاب نہ ہو سکے.

تیسری دفعہ پھر تالپور کراچی فتح کرنے پہنچے اور بڑے بڑے ہندو تاجروں کو خطوط بھی لکھے جس میں صلح کرنے کے بدلے مختلف مراعات دینے کا وعدہ کیا. پہلے کراچی والے خان آف قلات کے پاس پہنچے اور لشکر بھیجنے کی درخواست کی مگر خان آف قلات نے اہل کراچی کی درخواست یہ کہہ کر رد کر دی کہ وہ فی الحال تالپوروں سے جنگ نہیں کرنا چاہتے. اسطرح اہل کراچی مجبور ہو گئے کہ تالپوروں سے کچھ شرائط پر صلح کر لیں. ان شرائط میں سے اہم یہ دو شرائط تھیں کوئی سپاہی شہر کے اندر داخل نہیں ہو گا دوسری یہ کہ جو حاکم مقرر ہو گا وہ اہل شہر کے مشورے سے انتظام چلائے گا.

اسطرح 1795ء سے 1839ء تک کراچی تالپوروں کے قبضے میں رہا۔ اس زمانے میں کراچی کو کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا جن میں "قلاچو"، "قلاچی جو کنڈ" اور "خور علی" تھے۔ اس زمانے میں کراچی کی آبادی آٹھ ہزار سے 14 ہزار ہو گئی۔ اس آبادی میں زیادہ تر ماہی گیر اور ملاحوں کی تعداد تھی جو کہ شہر کے باہر رہتی تھی شہر میں اکثریت ہندو تاجروں کی تھی جو بہت دولت مند تھے۔ تالپور دراصل بلوچوں کی ایک شاخ ہے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ کی اولاد ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔

1839ء میں انگریزوں نے کراچی پر قبضہ کرتے ہی اس شہر کی بندرگاہ کی اہمیت کو محسوس کر لیا تھا اور اسے تجارتی اور فوجی نقطہ نظر سے بہت اہمیت دینے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ 1843ء میں سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے فوری طور پر ہی سندھ کا دارالحکومت حیدرآباد سے کراچی منتقل کر دیا۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں اس بندرگاہ نے کلیدی کردار ادا کیا جب کہ انگریزوں کے دور میں تجارتی لحاظ سے بھی اس کا اہم کردار رہا۔ اس کی ترقی کی صورتحال کا اندازہ لگاتے ہوئے پورے برصغیر سے بابصیرت تاجروں نے کراچی کا رخ کرنا شروع کر دیا۔

کراچی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میں جنرل چارلس نیپیئر جنہوں نے سندھ فتح کیا تھا 1847ء میں اپنی الوداعی پارٹی میں کہا کہ

عنقریب کراچی تو مشرق کی ملکہ ہو گی جب تو اس بلند مرتبے پر پہنچے تو میری تمنا ہے کہ میں تجھے ایک بار دیکھ سکوں

1860ء تک کراچی کا کوئی مخصوص نام نہیں تھا اس کو مختلف نام دیئے جاتے تھے مختلف ادارے خط و کتابت کرتے وقت اسے مختلف نام دیتے تھے کچھ اسے "کریچی" کچھ "کرانچی" اور کچھ "کراچے ٹاؤن" لکھا کرتے۔ جبکہ ریلوے والے کوراچی لکھتے۔

1860ء میں جب کراچی چیمبر آف کامرس کا قیام ہوا تو پہلی مرتبہ "کراچی" کا نام استعمال کیا گیا کیونکہ تمام تجارتی اور صنعتی ادارے اس کے ممبر تھے اس لیے بہت تیزی سے خط و کتابت میں یہی نام رائج ہو گیا۔ انگریز حکومت نے بھی بلا جھجک اس ہی نام کو منظور کر لیا اور سرکاری گزٹ میں اس نام کی وضاحت کر دی اور یوں سب کراچی لکھنے کے پابند ہو گئے۔

کراچی میں بلوچوں کی آمد

تحریر: شبیر احمد ارمان

سینئر سیاستدان عبداللہ حسین ہارون کے ایک اخباری بیان نے میری طرح ہر کس و ناکس کو حیرت زدہ کردیا ہے جس میں انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ 1928ء کی بات ہے جب ایک دو لاکھ روپے آج کے کروڑوں روپوں کے برابر تھے، اس وقت حاجی سر عبداللہ ہارون نے انگریز سرکار کو کراچی میں مسلمانوں کی اکثریت دکھانے کے لیے اس وقت کے میونسپل کمشنر سے لیاری کو 2 لاکھ روپے میں خرید لیا جس کی رجسٹری آج بھی موجود ہے اور لیاری میں دو قوموں بلوچ اور سندھی (کچھی) کو ایک ساتھ لاکر آباد کرنے کے لیے بلوچستان میں سرداروں اور نوابوں سے کئی ملاقاتیں کیں اور بلوچوں کو کراچی لانے پر آمادہ کیا۔

تب لیاری میں مسلمانوں کی اکثریت ثابت ہوگئی تو کراچی پاکستان کے حصے میں آیا گرچہ کراچی اور لیاری کی تاریخ کے اوراق اس حوالے سے خاموش ہیں لیکن چونکہ یہ بات سر عبداللہ ہارون کے پوتے عبداللہ حسین ہارون نے کی ہے جو ایک ذمے دار شخصیت ہیں اور اقوام متحدہ میں پاکستان کے مندوب رہ چکے ہیں اس لیے تحقیق کرنیوالوں کے لیے یہ بات باعث حیرت ہے، اور وہ تاریخی دستاویز کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق بتاتے ہیں کہ کراچی شہر کی بنیاد 1729ء کو رکھی گئی جس وقت یہاں صرف 25 جھونپڑیاں تھی یہ لوگ ماہی گیر تھے اور مکران کے علاقے کلانچ سے آئے تھے، لیاری ندی کے کنارے آباد ہونے والی یہ آبادی (لیاری) آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔ مکران اور ایرانی بلوچستان سے ہجرت کر کے لوگ یہاں آباد ہو گئے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ کراچی میں بلوچوں کی آمد تین ادوار پر مشتمل تھی۔ پہلا دور 1725ء سے 1770ء تک رہا، دوسرا دور 1797ء اور تیسرا دور 183 0ء تھا اس طرح لیاری اور یہاں آباد ہوئے بلوچوں کو تین صدیاں بیت چکی ہیں۔ آیے! تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں۔

1725ء میں کراچی ایک قصبہ (کوک) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جب ندی کے جنوب میں اور سمندر کے قریب ہونے کی وجہ سے اس کی تجارتی اہمیت ہوتی لیکن سمندر کے اس جگہ سے ہٹنے کی وجہ سے یہ بندرگاہ تباہ ہوگئی۔ 1729 میں کراچی بندرگاہ ڈربو (DIRBO) کہلایا جانے لگا جہاں تجارت شاہ بندر، لہری بندر، مسقط، سورت پور بندر اور ملبار بندرگاہ سے کی جاتی تھی۔ کراچی میں گزری کے نام سے بھی ایک چھوٹی بندرگاہ تھی لیکن وہ اتنی معروف نہ تھی۔ آج گزری بڑی آبادی ہے۔

جب سندھ میں نور محمد کلہوڑو کی حکومت تھی تو ان دنوں کراچی کی سرزمین پر مچھیروں کی جھونپڑیاں تھیں جو صرف مچھلی کے شکار پر گزارا کرتے تھے۔ یہاں اس وقت کی قدیم مقامی آبادی مہاڑ، جھیل اور جوکھیہ قبائل کی تھی جو سامان تجارت پر چنگی وصول کرتے تھے۔ اس وقت جوکھیہ کے سردار جام دریا خان جوکھیہ تھے۔ جب شاہ بندر بند ہوا تو وہاں کے باسی بھی کولاچی (کراچی) میں آکر آباد ہوئے۔ ان دنوں بلوچستان پر خان آف قلات کی حکومت تھی۔ اس دور میں ایران سے آنیوالے بلوچوں کی اکثریت گڈاپ، منگھوپیر، ماری پور، ہاکس بے اور

دیگر علاقوں میں آباد ہوگئی۔

حاجی خمیسہ عرف خمو یہاں کی سب سے عمر رسیدہ شخصیت تھی، بلوچوں نے زمینیں خریدیں اور زمینداری کا پیشہ اختیار کیا۔ اس دور میں زراعت کا پیشہ بھی ایک کاروبار کی حیثیت رکھتا تھا۔ کراچی میں سب سے پہلے بلوچ (کلمتی قبیلے) سے تھے۔ کلمتی اور جوکھیو قبیلے میں قریبا 18 جنگیں ہوئیں۔ آج بھی منگھوپیر، جنگ شاہی اور نیشنل ہائی وے پر جتنی پرانی قبریں ملیں گی وہ یا تو کلمتیوں کی ہیں یا پھر جوکھیوں کی۔ جنگ میں صلح ہونے کے بعد کلمتی یہاں مستقل طور پر آباد ہونا شروع ہوگئے اور کاشتکاری کے ساتھ ساتھ مویشیوں کی تجارت بھی کرنے لگے۔

یہ بلوچ جلد ہی یہاں کی مقامی آبادی میں گھل مل گئے۔ یہ پہلا دور تھا جو 1770ء تک رہا۔ دوسرا دور۔ میر خان قلات کا بھائی خان عبداللہ خان سندھ کے کلہوڑو حاکموں کے ہاتھوں قتل ہوا تو کلہوڑو حکمراں نے خون بہا کے طور پر کراچی کی بندرگاہ خان آف قلات کے سپرد کر دی جس کی وجہ سے اس بندرگاہ کا نام (قلاتی بندرگاہ) پڑ گیا۔ آگے جا کر اس کا نام (کراچی بندرگاہ) ہوگیا۔ خان قلات نے کراچی کی ترقی اور یہاں کا کاروبار دیکھتے ہوئے شہر میں ایک حاکم مقرر کر دیا جو لوگوں سے ٹیکس وصول کرتا تھا۔ کراچی میں کاروباری فضا کو دیکھتے ہوئے مختلف ممالک کے بیوپاری اس بندرگاہ پر آنے لگے۔ تجارت کی وجہ سے یہاں پارسی اور ہندو تاجر پیشہ افراد بھی آباد ہونا شروع ہوئے۔ اس دور میں بلوچستان سے مختلف قبائل جن میں بروہی، گبول، دشتیاری، جدگال وغیرہ بھی شامل تھے کراچی میں آئے۔ کراچی 1797ء تک خان آف قلات کے ماتحت رہا۔

اس زمانے میں سندھ کی حکومت کلہوڑو کے ہاتھوں نکل کر سندھ میں آباد ایک بلوچ قبیلے (تالپور) کو ملی۔ میر فتح علی خان تالپور نے اپنے تین بھائیوں سمیت یہاں حکومت کی اور پروگرام بنایا کہ آمدنی بڑھانے کے لیے کسی طرح شہر کراچی پر قبضہ کیا جائے۔ میاں فقیرو نے فوج کے ساتھ دوبارہ کراچی پر حملہ کیا لیکن اسے شکست کا سامنا کرنا پڑا بالآخر میروں نے کراچی پر قبضہ کر کے منوڑہ میں ایک چھوٹا سا قلعہ بنایا اور سندھ میں آباد ایک بلوچ قبیلے کے سردار نظامانی کو کراچی کا گورنر مقرر کیا اور اس قلعے کی نگرانی کے لیے کئی ہزار بلوچ مامور کیے۔

کراچی نے اس دور میں بہت ترقی کی۔ تیسرا دور، 1839ء میں کراچی پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا یوں کراچی برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ 1843ء تک انگریزوں نے پورے سندھ پر قبضہ کر لیا اور برطانوی حکومت نے سر چارلیس نیپئر کو سندھ کا پہلا گورنر مقرر کیا جس نے کراچی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اس وقت کراچی کی آبادی صرف 14 ہزار تھی۔ انگریزوں نے آمد کے بعد کراچی کو ایک منصوبہ بندی کے تحت ترقی دی اور برطانیہ کے فوجی ساز و سامان کی ترسیل کراچی کی بندرگاہ سے ہونے لگی۔ ان دنوں مکران سے بڑی تعداد میں بلوچ کراچی آ کر آباد ہوئے۔

اس کی ایک وجہ مکران میں قحط سالی اور ایرانی بلوچستان میں شاہ ایران کے سپاہیوں کے مظالم تھے۔ وہ کشتیوں اور خشکی کے راستے کراچی آئے اور یہاں آ کر ماہی گیری، کشتی سازی، کھیتی باڑی اور مزدوری کے پیشے اپنائے۔ انگریزوں نے انھیں لیاری میں آباد کیا۔ اس وقت

لیاری جنگل، ویران، کھنڈر اور جنگلی جانوروں کا مسکن تھا۔ 1928ء میں جب رضا شاہ پہلوی نے ایرانی بلوچستان پر قبضہ کر لیا تو دشتیار سے بھی بلوچ لیاری، کراچی میں آکر آباد ہوئے۔ کراچی میں تعمیراتی کاموں، سڑکوں، پلوں کی تعمیر، کراچی پورٹ اور ریلوے میں مزدوروں کی مانگ کی وجہ سے 19 ویں صدی کے آخر اور 20 ویں صدی کے شروع میں کئی برسوں تک مختلف بلوچ قبیلے، ایرانی بلوچستان اور مکران سے آکر کراچی میں آباد ہوتے رہے۔ اس دور میں تمام محنت طلب کاموں میں بلوچ پیش پیش رہے۔

کراچی میں بلوچ کمیونٹی نے آباد ہونے کے ساتھ ہی سب سے پہلے زمین داری، ماہی گیری اور مال مویشیوں کی تجارت کا پیشہ اپنایا۔ زمین داری اور ماہی گیری سے جو منافع حاصل ہوتا اس سے وہ زمینیں خریدتے رہے۔ تقسیم سے قبل تک بلوچ کمیونٹی کراچی کی قریبا 60 فیصد زمینوں کی مالک بن گئی۔ لال محمد بلوچ کے نام سے منسوب لالو کھیت (لیاقت آباد)، ناظم آباد، گلشن اقبال، ملیر، گڈاپ، منگھوپیر، لانڈھی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، شرافی گوٹھ، ائیرپورٹ، ڈرگ کالونی ماڈل کالونی، ہاکس بے اور ماڑی پور سمیت کئی گوٹھوں کی زمینوں کی ملکیت بلوچ کمیونٹی کے پاس تھیں جن پر باقاعدگی سے کاشتکاری ہوا کرتی تھی۔

انگریزوں کی آمد کے بعد بلوچ کمیونٹی نے محنت مزدوری کا پیشہ اپنایا اور ماہی گیری کے ساتھ مچھلی کی خرید و فروخت بھی شروع کر دی۔
تقسیم سے قبل تک کراچی کی بلوچ کمیونٹی کے لوگ درج ذیل کاروبار کے بیوپاری تھے۔

فشری میں کشتیوں کے مالکان، مچھلی کے سپلائرز، سبزی منڈی میں فروٹ اور سبزیوں کی تجارت، بکرا پیڑی میں مال مویشیوں کی تجارت، دودھ، کھجور کے پتوں کی چٹائی، مچھلی کے جال اور ہاتھ سے بنی دیگر چیزوں کی خرید و فروخت، مکانات اور پلوں کی تعمیر کی ٹھیکے داری، چمڑے اور اس سے بنی مصنوعات کے ایکسپورٹرز، خورونوش اور دیگر اجناس کے بیوپاری، ٹرانسپورٹ۔ تجارت وزمین داری کے علاوہ انھوں نے محنت مزدوری اور درج ذیل ملازمتیں اختیار کیں سرنگیں کھودنا، ریلوے لائن کی پٹری بچھانا، پل تعمیر کرنا، سڑکیں بنانا، عمارتوں کی تعمیرات، پورٹ پر سامان اتارنا اور چڑھانا، TPX ریلوے میں مزدوری کرنا، قلی کا کام کرنا، گدھا گاڑی اور اونٹ گاڑی چلانا، ٹرکوں سے سامان اتارنا اور چڑھانا، موٹر مکینک، بائی سائیکل مکینک، سی مین، چمڑے کی رنگائی، کشتیوں کے معمار، گھر کے معمار، فشری میں مچھلیوں کے سپلائرز کی ملازمت، پرائمری اسکولوں میں اردو، سندھی کے استاد، ریلوے، کے ایم سی، کے پی ٹی اور دیگر سرکاری اداروں میں چھوٹے عہدوں پر ملازمتیں اختیار کیں مضبوط جسم رکھنے کی وجہ سے محنت طلب کاموں میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ تجارت اور ملازمت میں ہندو، پارسی اور سندھی، کچھیوں کے بعد بلوچ کمیونٹی کے لوگوں کی اکثریت تھی۔

انگریزوں کے دور میں کراچی کی تعمیر کا احوال

تحریر: اقبال اے رحمٰن

بستیاں وجود میں آجاتی ہیں مگر اپنی شناخت بناتے بناتی ہیں، کراچی بھی ایک بستی تھی اسلئے کے اسکے درمیان سے ایک ندی گزرتی تھی، لیاری ندی، لیار کے درختوں سے گھری، جہاں پانی وہاں حیات اور جہاں حیات وہاں انسان، لیاری ندی اور اطراف کا علاقہ بھی آباد تھا، اس علاقے کی جانب آسان ترین رسائی بلوچستان کی جانب سے تھی سو یہ علاقہ بلوچوں سے آباد تھا مگر یہ شہر نہ تھا ایک بستی تھی، بستیاں برسہا برس جنگل کے بیچ بھی قائم و آباد رہتی ہیں، یہ نظام قدرت ہے، کراچی بھی بستی کے طور آباد تھا کہ ۱۷۳۹ میں اسکی بندرگاہ دریافت ہوئی، جس طرح اس بستی نے پہلے میٹھے پانی کے زریعے کشش پیدا کی اور لوگ اسے آباد کرنے آئے ابکی بار کھارے پانی کی کشش تھی کہ اسے آباد کرنے لوگ دوسری جانب سے یہاں آکر آباد ہونے لگے جن میں اکثریت اندرون سندھ اور بلوچستان کے ساحلی علاقوں سے آنے والے لوگ تھے، زراعت، شیر فروشی اور مال مویشی کی تجارت والی بستی اب ماہی گیری اور حرفت میں شناخت بنانے لگی، بستی اب قصبہ بن گئی تھی، کلہوڑوں نے اسے اپنی حکمرانی میں لے لیا، پھر حکمرانی بدل گئی، اب تالپور اسکے وارث تھے، قصبہ اب شہر بننے کو تھا، شہر کے گرد فصیل قائم کردی گئی تھی، زراعت اور ماہی گیری اس فصیل کے دروازوں میٹھادر اور کھارادر کی صورت نمایاں تھی، سو برس گزر گئے، ۱۸۳۹ آگیا اور ۱۸۳۹ کے ساتھ انگریز بھی آگئے، چارلس نیپئیر اس شہر کے فرماں رواں ٹھہرے اور انہوں نے اس بندرگاہی شہر کو شہر نگاراں بنانے کا عندیہ دے دیا، اب کیا تھا گجرات سے پارسی آئے اور گووا سے پرتگیزی کرسچن، سنہ ۱۸۵۰ میں جیسلمیر کے مارواڑی سنگتراش جو حیدرآباد میں آباد تھے نئی صورتحال کے تحت کراچی آئے اور شہر کی تعمیرات میں اپنا شاندار حصہ ڈالنے لگے۔ شہر کی تمدنی تعمیر شروع ہوگئی اور شہر واقعی شہر نگاراں بن گیا۔

سو برس نہیں گزرے تھے کہ شہر وہاں تک آباد ہوگیا جہاں شہر کی ایک چھوٹی سی پہاڑی چٹانوں کے درمیان کھڑی تھی، جو ٹیکری کہلاتی تھی، جہاں آج مزار قائد ہے، یہیں تک شہر بسانے کا انگریزوں کا اولین ہدف تھا، جب شہری حکومت کے سربراہ بابائے کراچی جمشید مہتا تھے، انہوں نے پالیسی بنائی کے اس شہر کو ٹیکری سے آگے بھی جانا چاہیئے مگر منظم انداز میں، طریقہ کار وضع ہوا جسکے تحت شہر میں بستی برادریوں کو سوسائٹی یا کالونی کی صورت آباد کرنے کا فیصلہ ہوا، پارسی برادری، گوونز، حیدرآبادی ہندو عامل اور متمول شہریوں کی انجمن درخواست دہندہ کی صورت سامنے آئے یوں پارسی کالونی، کیتھولک کالونی نمبر ایک اور دو، عامل کالونی نمبر ایک اور دو اور کاسموپولیٹن کالونی سوسائٹیز کی صورت وجود میں آئیں اور شہر کا مضافاتی حصہ بنگلوں سے آباد ہونے لگا، یہ ۱۹۲۵ کی بات ہے۔

کیتھولک کالونی وہاں بسی جہاں کرسچن برادری کا سینٹ لارینس چرچ ۱۹۱۲ سے قائم تھا اسکے اطراف میں بسی آبادی پہلے کیتھولک کالونی نمبر ایک کہلائی، قیام پاکستان کے بعد بہت بعد میں گارڈن ایسٹ سے معروف ہوئی، سینٹ لارنس چرچ کی بجائے غفوریہ مسجد یا پاکولا مسجد اب اسکی شناخت ہے۔ ہمارے گروپ ممبر رفیق بھائی موسانی یہیں رہتے ہیں اور ثاقب منصور یہاں رہ کر گئے ہیں، ہم یہاں سے قریب تر جمشید روڈ پر رہتے تھے مگر اس علاقے کو کھنگالنا تھا اور کتاب کا حصہ بنانا تھا سو معاون ایڈمن عمران بھائی کے ساتھ ان دونوں اصحاب کی سرکردگی میں آج اس پورے علاقے کا دورہ ہوا، غفوریہ مسجد پر ثاقب اور رفیق صاحب کی گاڑیاں کھڑی رکھ دی گئیں اور ہماری گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ ثاقب بھائی نے اور کاغذ قلم عمران بھائی نے سنبھال لیا۔ ابتدا میں خالد سویٹ نزد سینٹرل جیل پر رفیق بھائی نے پر تکلف ناشتہ کروایا، پھر جو چلے تو ثاقب بھائی اور رفیق بھائی کا تبصرہ بھی چل پڑا، شہر کے اس تاریخی خطے کے خدوخال واضع ہوتے چلے گئے، تقسیم سے پہلے کی گوونز سے آباد سوسائٹی اور تقسیم کے فوراًبعد سے لیکر بتدریج اس علاقے میں آتی مسلم اشرافیاء۔

مانک جی اسٹریٹ میں رئیس امروہوی صاحب کا مکان جو اب بلڈنگ اور مسجد کی صورت آباد ہے، سید محمد تقی صاحب کا گھر اور مشرق اخبار کا پریس، قادری مسجد و مزار، پارسی کالونی اور وہاں کی مسز سلیز کا مکان اور رفیق بھائی کی جانب سے کیک، یزدانی بیکری کے پیٹس، سوسائٹی کے ایک ایک گھر اور اسکے مکینوں کی معلومات، نسروانجی ٹائلز کی جگہ بسا بلوچ گارڈن، وہ مکان جو خالد اسحق ایڈووکیٹ اور انکی ۲۵۰۰۰ کتابوں سے آباد تھا، باسم اسکوائر جو کبھی بھٹو صاحب ہمشیرہ کا مسکن تھا، بوہرہ برادری کی محمدی مسجد اور سائیں جی جی ایم سید کا مسکن حیدر منزل۔

نجفی لائبریری وہال، امام خمینی ہال، حمید بھوجانی ہال و درسگاہ، سینٹ لارنس اسکول، سینٹ لارنس چرچ،
غفوریہ مسجد اسکا قیام، چٹائیوں سے بنی مسجد سے لیکر تعمیر و توسیع تک مراحل کا جو نقشہ کھینچا گیا، سبحان اللہ، اسکے بعد رفیق بھائی بصد اصرار اپنے دولت کدے پر لے گئے اور مہمان نوازی کا حق ادا کر دیا، ایک گھنٹے کی نشست ہوئی، کراچی، سعودیہ اور جرمنی کی باتیں، چٹکلے اور قہقہے۔ رخصت لیتے وقت رفیق بھائی کی جانب سے تینوں دوستوں کو سوغات کی صورت پیش کیا گیا تحفہ، خوب رہا آج کا سفر، شکریہ برادران رفیق، ثاقب و عمران۔

کراچی: سرزمینِ پاکستان میں متحدہ ہندوستان کی تہذیب کا واحد اور شاید آخری استعارہ

تحریر: محمد فہد حارث

ہندوستان کے ہمارے ایک نہایت پیارے وفاضل دوست نے سید منور حسن مرحوم سے متعلق اپنی ایک تحریر میں ضمنی طور پر کراچی پر تبصرہ کیا کہ کراچی دِلّی کا پاسنگ بھی نہیں ہے جس پر ہم نے ان کی تحریر پر ذیل کا تبصرہ کیا جس کے بعد محترم دوست نے کمالِ عاجزی کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اپنے تبصرے سے رجوع کر لیا کہ "اگر میں غلطی نہیں کرتا تو میری اصلاح کیسے ہوتی؟ میں اپنی بات واپس لے رہا ہوں" اور واقعی حق پرست و سلیم الفطرت لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہمارے تبصرے کی بابت بعض دوستوں نے انباکس میں عرض کیا کہ اس کو مستقل پوسٹ بنادیا جائے سو بس اسی سبب اس تبصرے کو پوسٹ کی شکل میں ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

آپ کی یہ بات کہ کراچی دِلّی کا پاسنگ بھی نہیں، دل پر آکر لگی ہے۔ اگر تو آپ نے کبھی کراچی کی زیارت نہیں کی اور پھر یہ بیان صادر فرمایا ہے تو مجھے نہایت دکھ ہے کہ ایک شہر کو جانے بغیر آپ نے اتنا بڑا دعویٰ کیسے کر دیا اور اگر کراچی کی زیارت کرنے کے بعد آپ نے یہ بات بولی ہے تو مجھے حیرانگی ہے۔ کراچی پاکستان کی سرزمین پر وہ واحد شہر ہے جس نے آج بھی متحدہ ہندوستان کی تہذیب کو اپنے دل میں زندہ کر کے رکھا ہوا ہے۔ اور اس بابت پاکستان کا کوئی دوسرا شہر کراچی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہاں آج بھی دلی، شاہجہاں پور، بنارس، لکھنؤ، الٰہ آباد، پیلی بھیت، بِہار، بریلی، حیدرآباد دکن، فیض آباد، جوناگڑھ، سورت، آگرہ، کانپور، رامپور اور غازی پور بستے ہیں۔ پورا پاکستان کراچی کے لوگوں کے رہن سہن اور ان کی بولی یعنی اردو پر فریفتہ رہتا ہے۔ اور آپ کہتے ہیں کہ کراچی دلّی کا پاسنگ نہیں جبکہ لاہور کو یہ مقام حاصل ہے۔ یقیناً لاہور کی اپنی تاریخی حیثیت ہے لیکن کراچی نے اپنا تاریخ و حال خود بنایا ہے۔ یہاں آج بھی دِلّی کے کھانے مشہور ہیں، کبھی برنس روڈ چلے جائیں تو ہندوستان کا کون سے علاقہ نہ ہو گا جس کے کھانے برنس روڈ پر نہ ملتے ہوں۔ کراچی کے محلّوں میں آپ کو دلّی کے غرارے اور دکن کی ساڑھیاں پہنے آج بھی بڑی بوڑھیاں نظر آجاتی ہیں۔ کراچی جس قدر متحدہ ہندوستان کی تہذیب سے رچا بسا ہے، شاید ہی پاکستان کو کوئی دوسرا شہر اس کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتا ہو۔ کراچی کا علاقہ لالو کھیت جو کہ کسی زمانے میں مہاجر بستی کے طور پر بسایا گیا تھا اور جس پر ابراہیم جلیس صاحب نے کالم "ہم بھی لالو کھیت میں اور تم بھی لالو کھیت میں" لکھا تو کہا تھا کہ کراچی میں فی مربع گز شاعر و ادیب سب سے زیادہ لالو کھیت میں رہتے ہیں۔

اگر یہاں صرف ایک لالوکھیت کی تاریخ وحال بیان کرنے لگ جاؤں تو وہی دلّی کا پاسنگ ہونے کو کافی ہو جائے گا کہ لالوکھیت خود ایک چھوٹا دلی سا ہے جہاں دلّی سے آئے سینکڑوں خاندان بستے ہیں۔ پاکستان کا کوئی اور شہر نہیں جہاں آج بھی دلّی کے چاندنی چوک کے چرچے اور لکھنؤ و فیض آباد کے پکوان و شاعری کے قصہ مقبول ہوں۔

یہ کراچی ہی ہے جس نے لاکھوں مہاجرین کو اپنے اندر یوں سمو لیا کہ شہر کے قلب میں ایک چھوٹا سا ہندوستان وجود میں آگیا۔ کبھی کراچی آیئے گا تو آپ کو دِلّی یا الٰہ آباد والوں کی شادیوں میں لے چلیں گے۔ ان قدیم رسوم و رواج کے ساتھ تو یہ شادیاں آج ہندوستان میں بھی نہ ہوتی ہوں جس طرح سے کراچی والوں نے ان کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ ہمارے گھروں میں آج بھی بڑے بوڑھے الٰہ آباد پرگنہ چائل کی پوربی زبان بولتے ہیں۔ وہ آج بھی بیلٹ کو بیلٹ نہیں پیٹی بلاتے ہیں، اندر آنے کو بھیتر آؤ کہتے ہیں۔ دوسری طرف لکھنؤ و فیض آباد کے لوگ ہیں جن کی اودھی ستھری اردو آج بھی ان کے شاندار ماضی کا پتہ دیتی ہے۔ ساتھ ہی مرغی خانہ کے علاقے میں حیدر آباد دکن کے لوگوں کے محلوں کے محلے آباد ہیں جو "ق" کو "خ" بولتے ہیں اور آج بھی ان کی لڑکیاں پوٹیاں کہلاتی ہیں اور لڑکے پوٹے۔ اکثر ان کی خواتین اپنے گھروں کے دروازوں پر حیدر آبادی طرز کی ساڑھیاں پہنے دکھائی دیتی ہیں۔ تو دوسری طرف آج بھی کراچی میں دِلّی سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والی بڑی بوڑھیاں سفید براق غراروں میں اپنے گھروں میں سارے کام آسانی سے بجالاتی ہیں۔ کراچی میں کبھی کسی الٰہ آبادی کی شادی میں آیئے گا تو آپ کو دکھائیں گے کہ کیسے خاندان کی بڑی بوڑھیاں دلہن کے اسٹیج کے قریب سب سے بہترین والے صوفوں پر سفید چکن کے کُرتا شلوار میں ملبوس نہایت وقار کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہیں اور شادی میں آنے والا ہر شخص ان کو سلام کرنا اور ان سے دعائیں لینا اپنا فرضِ منصبی سمجھتا ہے۔ آج بھی ہماری شادیوں میں بڑی بوڑھیاں اپنے پاندان ساتھ لے کر آتی ہیں۔ میرے گھر میں والد کے انتقال کے بعد کوئی پان نہیں کھاتا لیکن پاندان آج بھی گھر کی زینت ہے کہ کب خاندان کی کوئی عمر رسیدہ خاتون یا مرد آجائیں اور پان کی فرمائش کر دیں۔ ہمارے گھروں میں آج بھی نعمت خانوں کا رواج ہے۔ جس میں لوگ دہی جماتے اور دیگر مسالہ جات رکھتے ہیں۔ کتنے گھروں میں آج بھی چاندی کے پاندان، پیتل کے لوٹے اور کٹوریاں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ آج بھی شادیوں میں جوتا چھپائی اور آرسی مصحف کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ یہاں آج بھی ہندوستان بِہار اور پٹنہ کے بِہاری اپنے بچوں کے لئے رشتہ ڈھونڈتے ہوئے سیّد اور بِہاری کی شرط لازمی عائد کرتے ہیں۔ شادی کے مواقع پر گھروں میں نائی اور نائن کا دستور اور شادی کارڈ کی جگہ حاضری کے دفتر پر مہمانوں کے گھر جا جا کر "ص" لکھوانے کا رواج تو ۱۹۸۰ء کی دہائی تک کراچی میں موجود رہا ہے۔ ہمارے الٰہ آبادی گھرانوں میں تو آج بھی شادی کے موقع پر لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے لڑکے کی پھوپھو کی اٹیچی آتی ہے جس میں سرمہ دانی سے لے کر تیل کی کپّی تک موجود ہوتی ہے۔ آپ کسی الٰہ آبادی یا دلّی والے کے گھر چلے جائیں، گھر کے بیچوں بیچ ایک مسہری یا تخت پر گھر کی سب سے عمر رسیدہ نانی یا دادی اپنے چاندی کے پاندان کے ساتھ ہاتھ میں

سروتا پکڑے چھالیہ کترتی آپ کو نظر آجائینگی۔ لکھنؤاور فیض آباد کے بڑے بوڑھوں کے سامنے تو آج بھی آپ کو زبان سنبھال کر بات کرنی پڑتی ہے۔ یہاں آپ نے اردو کے کسی لفظ کا غلط تلفظ ادا کیا اور وہاں انہوں نے آپ کی زبان پکڑلی اور پھر وہ بے نقط سنائی کہ آپ دل ہی دل میں اپنی قسمت پر ماتم کناں ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ کیا ضرورت تھی، منہ کا بند کواڑ کھولنے کی۔

برنس روڈ جایئے آپ کو وہاں آج بھی دِلّی کے مشہور مٹکے والی چاٹ نظر آجاتی ہے جو کہ نجانے کتنی دہائیوں سے اسی ذائقہ کی چاٹ بنا اور بیچ رہا ہے۔اور اس کے ساتھ میر ٹھ کے کباب والی دکان، پھر نہاری، پھر بریانی۔۔۔ گویا برنس روڈ کے نائی وحلوائی نہ ہوئے لکھنؤ کے رکابدار ہو گیے جو آپ کو اپنے چٹ پٹے ذائقوں اور ان کی نت نئی جدت سے واپس ماضی کے لکھنؤ پہنچادیتے ہیں۔اسی طرح دھورا جی کی چاٹ، بر گر اور کاٹھیاواری چھولے بھلا کون بھلا سکتا ہے۔

آپ نے کراچی کے بارے میں ایک اجنبی بات کی اس لیے یہ سب لکھنا پڑ گیا۔اہل پاکستان سے پوچھئے کہ وہ کراچی کو کس رعب و داب سے دیکھتے ہیں۔وہ اہل کراچی کی اردو پر فریفتہ رہتے ہیں اور اسی لہجے میں اردو بولنا چاہتے ہیں۔اہل کراچی کے قدیم گھرانوں کا پہنناوڑھنا آج بھی پورے پاکستان کے لوگوں کی نگاہوں میں ستائش کے ساتھ دیکھا اور برتا جاتا ہے۔الغرض ہر شہر کی الگ اہمیت ہوتی ہے۔یہ کہہ دینا کہ فلاں شہر فلاں شہر کا پاسنگ نہیں نہایت دل دکھا دینے والی بات ہے۔کراچی پاکستان کی سرزمین میں متحدہ ہندوستان کی تہذیب کا واحد اور شاید آخری استعارہ ہے۔

کراچی ایک نشہ
مڑ مڑ کے نہ دیکھ

تحریر: نوائے سروش

آپ نے وہ کہاوت یا قصہ تو سنا ہو گا کہ میں کمبل کو چھوڑتا ہوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔
یہی کچھ حال میرا ابھی ہے۔ مجھے بھی ایک کمبل اسی بری طرح چمٹا رہتا ہے۔ میرے اس کمبل کا نام کراچی ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن کوئی نہ کوئی بات کراچی کی چھیڑ بیٹھتا ہوں۔ اس میں میرا ابھی قصور نہیں ہے۔ کراچی کی بات ہو تو کراچی والے خود گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ایک کہتا ہوں وہ ایک کی چار لگاتے ہیں۔ اس شہر دلبرا کو چھوڑ تو آیا ہوں لیکن اب تک مڑ مڑ کر اسی جانب دیکھتا رہتا ہوں۔ اور میں کروں تو کیا کروں۔ کینیڈا اور پاکستان میں نو دس گھنٹوں کا فرق ہے۔ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر کراچی فون کرنا چاہتا ہوں تو وہاں بہت رات ہو چکی ہوتی ہے۔ یہاں کے دوستوں کو فون کرتا ہوں تو بات گھوم پھر کر "اپنے کراچی" کی طرف نکل جاتی ہے۔ انوار احمد صاحب کو فون کرتا ہوں تو ناظم آباد کے قصے چھڑ جاتے ہیں۔ علی احمد شاہ صاحب سے بات کرو تو کہیں نہ کہیں سے مشترکہ دوست نکل آتے ہیں۔ ناظم الدین ناظم سے بات کرو تو ہم دونوں رنچھوڑ لائن، شومار کیٹ، پولیس لائنز سے ہوتے ہوئے، بہادر آباد، ٹی وی اسٹیشن، عالمگیر روڈ، لیاقت لائبریری اور نجانے کہاں کہاں پہنچ جاتے۔ زبیر الدین صاحب کے ساتھ ریڈیو پاکستان، کراچی ٹی وی، جہانگیر روڈ وغیرہ کے قصے چھڑ جاتے ہیں۔ آج انصاری عبدالعزیز صاحب سے بات ہوئی اور وہ مجھے مارٹن کوارٹرز، جمشید روڈ، حیدر آباد کالونی، پی آئی بی کالونی، جہانگیر روڈ وغیرہ کی سیر کراتے رہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ لاکھ کوئی کراچی سے نکل آئے، کراچی اس کے اندر سے نہیں نکلتا۔ اور یقین کیجئے کراچی چیز ہی ایسی ہے کہ آپ اس سے پیچھا چھڑا ہی نہیں سکتے۔ میں نے آدھی سے زیادہ زندگی دوبئی اور عرب امارات میں گذاری۔ بچپن میں بمبئی دیکھا اور اب بھی میرا ممبئی کا گہرا مشاہدہ ہے۔ میں نے دو طویل مضامین ممبئی کے بارے میں لکھے ہیں۔ دہلی کو بھی دیکھا اور دہلی پر بھی کم از کم دو مضامین لکھے ہیں۔ تقریبا چھ ماہ سے زیادہ وقت انگلستان میں گذرا۔ وہاں کے ماحول کو بھی خاصی اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اب سال بھر سے ٹورونٹو کینیڈا میں ہوں۔ ٹورونٹو دنیا کا سب سے زیادہ "کثیر القومی" یا "کثیر الثقافتی "Multicultural" شہر ہے۔

اب میری بات سے کوئی اتفاق کرے یہ نہ کرے۔ میری ذہنی حالت پر شبہ کرے۔ مجھے فاتر العقل سمجھے۔ مجھے متعصب گردانے،

لیکن میں یہ پوری سنجیدگی اور شرح صدر کے ساتھ اور بانگ دہل کہتا ہوں کہ کراچی جیسا شہر دنیا میں کہیں نہیں۔ دنیا کا ایسا کون سا مسئلہ ہے جو کراچی میں نہیں۔ شہری زندگی کی ایسی کون سی خرابی اور برائی ہے جو یہاں نہیں۔ دنیا کے ترقی یافتہ شہروں سے میرا شہر بہت پیچھے ہے۔ اب تو میرے ملک کے وہ لوگ بھی جو کبھی میرے شہر آکر، پگڑیاں سنبھال کر یہاں کی اونچی عمارتیں اور روشنیاں دیکھا کرتے تھے وہ بھی کراچی کا تمسخر اڑاتے ہیں۔

لیکن ان تمام خرابیوں، تمام تر مصیبتوں کے باوجود جس طرح یہاں زندگی رواں دواں رہتی ہے ایسی دنیا میں کہیں نہیں۔ یقین کیجئے ٹورونٹو تو مجھے کراچی کے مقابلے میں قبرستان لگتا ہے۔ ذرا اپنے آپ کو کیماڑی میں تصور کیجئے اور بندر روڈ (ایم اے جناح روڈ) کی جانب چلنا شروع کیجئے۔ برنس روڈ، صدر، ایمپریس مارکیٹ، گارڈن روڈ، سولجر بازار وغیرہ کو رہنے دیں۔ بندر روڈ پر پرانی نمائش سے ہوتے ہوئے گرومندر کی جانب آئیں۔ یہاں سے جمشید روڈ مڑ جائیں، جیل کے کونے سے دائیں مڑ کر یونیورسٹی روڈ پر آجائیں، پرانی سبزی منڈی، سوک سینٹر، حسن اسکوائر، مسجد بیت المکرم، نیپا سے ہوتے ہوئے گلستان جو ہر مڑ جائیں۔

بتایئے اس تمام راستے آپ نے ایک لمحے کے لئے بھی، ایک لمحے سے میری مراد دن اور رات کے لمحات سے ہے، آپ نے زندگی کو کہیں ساکت یا جامد دیکھا۔ چوبیس گھنٹوں میں کبھی آپ یہاں خود کو کہیں تنہا محسوس کر سکتے ہیں۔ ابھی میں نے صدر، برنس روڈ، طارق روڈ، بہادر آباد، لیاقت آباد، ناظم آباد، نارتھ ناظم آباد، فیڈرل بی ایریا، کھارادر، سولجر بازار، بوٹ بیسن، کلفٹن، کورنگی، لانڈھی، اورنگی اور نہ جانے کتنے علاقوں کا ذکر نہیں کیا۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ چوبیس گھنٹوں میں یہاں ایک لمحہ بھی کہیں آپ کو خاموشی نظر آئے گی؟۔

اس شہر کے اتنے رنگ اور اتنے روپ ہیں کہ شمار کرنا ناممکن ہے۔ حالت یہ ہے کہ ملک سے باہر، چاہے دوبئی ہو، ریاض ہو، لندن ہو، مسی ساگا ٹورونٹو ہو، ہم نہاری، بریانی یا کباب کھا کر پہلا تبصرہ یہ کرتے ہیں کہ "یار، وہ کراچی والی بات نہیں" یا "واہ، کراچی کا مزہ آگیا"۔ یہ تبصرہ کسی اور شہر کے حوالے سے سننے میں نہیں آتا۔ اچھی اور لذیذ چیز کو پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ "بالکل کراچی جیسی لگتی ہے"۔

کراچی کی باتیں، کراچی کے رنگ اس قدر منفرد ہیں کہ شاید ہی کہیں ایسے اور اتنے رنگ نظر آئیں۔ میں اگر ان کا ذکر کرنے بیٹھوں تو میری باتوں میں ربط نہیں ملے گا کہ ہر جا اتنے رنگ بکھرے ہوئے ہیں کہ ہر ایک کا ذکر کرنا بھی آسان نہیں۔ اگر آپ میں ہمت ہے

تو ایک طویل تحریر کے لئے تیار رہیں۔

باغیانہ رنگ۔۔

کراچی کی ایک پہچان اس کا باغیانہ اور حریت پسندانہ رنگ ہے اور کراچی اس کی سزا بھی بھگت رہا ہے۔ میں نے آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو ایک ایسے ماحول میں پایا جہاں طلباء بازؤں پر سیاہ پٹیاں باندھے گھوم رہے تھے۔ اسکولوں اور کالجوں میں سیاہ کنٹوپ پہنے لاٹھی بردار پولیس کے ٹرک دیکھے۔ دیواروں پر نعرے لکھے دیکھے "طلباء کا ساتھ دو"، "علی مختار رضوی کو رہا کرو"، "معراج محمد خان کو رہا کرو"، "این ایس ایف زندہ باد"۔

میں اپنے چچا اور ان کی عمر کے نوجوانوں سے حسین نقی، علی مختار رضوی، معراج محمد خان، جوہر حسین، فتحیاب علی خان کی باتیں سنتا۔ اے ٹی نقوی کے دور میں نواب مشتاق احمد گرمانی کی موٹر کو آگ لگانے کے قصے۔ پولیس فائرنگ سے سات طلبہ کی شہادت، اور پھر فیض، مصطفےٰ زیدی اور حبیب جالب کی نظمیں اس ظلم کی مذمت میں سنیں۔ بارہ طلبہ کے شہر بدر ہونے کی کہانیاں سنیں۔ ایوب کے خلاف ہنگامے اور کرفیو دیکھے۔ بھٹو کے خلاف مزاحمت دیکھی۔ ناظم آباد، لالوکھیت، برنس روڈ، کورنگی کے نوجوانوں کو خاک اور خون میں لتھڑتے، ماریں کھاتے اور جیل جاتے دیکھا۔

یہی باغیانہ رنگ یہاں کی صحافت میں تھا۔ ابراہیم جلیس، منہاج برنا، نصراللہ خان، انعام درانی، احفاظ ارحمان، محمود شام اور دوسرے صحافیوں کو پڑھا۔ پھر اس شہر کا ایک ادبی رنگ تھا۔ حضرت جوش، رئیس امروہوی، سلیم احمد، ماہر القادری، محشر بدایونی، جمیل الدین عالی، محسن بھوپالی، حمایت علی شاعر، صہبا اختر، جون ایلیا، نقاش کاظمی، عبیداللہ علیم، پروین شاکر، زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض جیسے بلند آہنگ اور بلند قامت شاعروں کو سنا۔

اور اس ادبی دھنک کا سب سے گہرا رنگ، جس نے کراچی ہی نہیں، پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، یعنی ابن صفی کی جاسوسی دنیا اور عمران سیریز کا رنگ۔ اور اسی شہر میں خدا کی بستی اور جانگلوس جیسے ناولوں کے خالق شوکت صدیقی، دلی کی آخری شام، کے مصنف علی احمد، اور "دس کروڑ بھکاری" کے خالق ابراہیم جلیس کے رنگ بھی بکھرے ہوئے تھے۔

یہ شہر جہاں علم و ادب کا شہرہ تھا۔ جہاں سلیم الزماں صدیقی، اشتیاق حسین قریشی، محمود حسین اور اے بی اے حلیم، کرار احمد، سحر انصاری، جمیل جالبی، جیسے اساتذہ ہوا کرتے تھے۔ جامعہ کراچی، ڈی جے سائنس، این ای ڈی انجینئیرنگ، گورنمنٹ کامرس، آدم جی سائنس، داؤد انجینئرنگ، ڈاؤ میڈیکل، ایس ایم، اسلامیہ، نیشنل، پریمئر، سرسید، سینٹ جوزف، سینٹ پیٹرک، کراچی گرامر، حبیب پبلک، سندھ مدرسہ جیسی درسگاہیں ہیں۔

اور اس شہر کے منبر و محراب سے مفتی محمد شفیع، احتشام الحق تھانوی، عبدالحامد بدایونی، علامہ رشید ترابی، ابن حسن جارچوی، طالب جوہری جیسے نابغہ علماء کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ اسی شہر کے عید میلادالنبی اور یوم عاشور کے جلوس بھی اپنی ہی شان لئے ہوتے ہیں۔

یہ شہر جو میرے قائد کی جائے پیدائش بھی ہے اور یہیں وہ خاک کی چادر اوڑھے سو رہے ہیں۔ یہ شہر مادر ملت کی آخری آرام گاہ بھی ہے تو دختر مشرق کی جائے پیدائش بھی۔ اسی شہر کے خالق دناہال میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر پر بغاوت کا مقدمہ چلا تھا اور یہیں کی سنٹرل جیل میں وہ پابند سلاسل بھی ہوئے۔

فلاحی کاموں میں کوئی شہر میرے کراچی کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ یہاں چپے چپے پر عبدالستار ایدھی جیسے فرشتے کی خدمت کے نشان ثبت ہیں۔ اسی شہر میں حکیم سعید نے شہادت دی۔ یہیں رتھ فاؤ جیسی محسنہ بھی دفن ہے۔ یہ شہر سر جن جمعہ، سر جن ایچ ایم رضوی اور سر جن ادیب رضوی جیسے قابل اور بے لوث معالجوں کا شہر ہے۔ یہیں الخدمت، چھیپا، سیلانی اور انصار برنی جیسے ادارے بھی ہیں۔

یہاں دلی والے اپنی کرخنداری بولتے ملیں گے تو بہاری، حیدرآبادی، لکھنوی اپنے اپنے لہجوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہاں میمن، گجراتی، سندھی، بلوچی، مکرانی، بروہی، ہندکو، پشتو، سرائیکی، پنجابی، ساری زبانیں، شانہ بشانہ سنائی دینگی۔ چینی دندان ساز، چائنیز ریسٹورنٹ، ایرانی ریسٹورنٹ، ملباری ہوٹل شہر کے قلب میں نظر آئیں گے۔ پارسی، گوانیز، بوہرے، ہندو، اس شہر کے قدیم باشندے آج بھی اس سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں۔

یہاں انگریزی بولنے میں جمشید مارکر، عمر قریشی، جاوید جبار، افتخار احمد، چشتی مجاہد، انیتا غلام علی، ایڈورڈ کیرپیئیڈ، اسلم اظہر اور ضیاء محی الدین گوروں کے کان کاٹتے تھے۔

یہ شہر اردشیر کاوس جی کا شہر ہے۔ یہاں امر جلیل جیسا سندھی ادیب رہتا ہے۔ اس شہر سے والس متھائس، انٹاؤ ڈی سوزا، انیل دلپت اور دانش کنیریا نے پاکستان کے لئے فخریہ کرکٹ کھیلی ہے۔ بہرام ڈی آواری اور گوشپی آواری نے پاکستان کے لئے سونے کے تمغے جیتے ہیں۔ یہاں ایمی منوالا، تارا گھنشیام، مہاراج کتھک، رقص کناں رہتے تھے۔ دیپک پروانی آج ملک سے باہر بھی اپنے نت نئے ڈیزائنز کے لئے مشہور ہے۔

یہ خوبصورت آوازوں کا شہر ہے۔ یہاں کے ریڈیو سے زیڈ اے بخاری، شکیل احمد، انور بہزاد، شمیم اعجاز، وراثت مرزا، زبیر الدین، امیر خان، مغل بشر، عبدالماجد، ایس ایم سلیم۔ محمد یوسف، طلعت حسین، عرش منیر، منی باجی، بیگم خورشید مرزا، صفیہ معینی، نیلوفر علیم، جمشید انصاری، قاضی واجد، محمود علی، سبحانی بایونس کی آوازوں نے دھوم مچار کھی تھی تو یہاں کے ٹیلیویژن سے شکیل، طلعت حسین، زینت یاسمین، سحر جلال، بشریٰ انصاری، خالدہ ریاست جیسے فنکار اپنی صلاحیتوں کالوہا منواتے رہے ہیں۔ یہاں خواجہ معین الدین، علی احمد اور انور مقصود جیسے باکمال ڈرامہ نگار اپنے کمال دکھاتے رہے۔

اس شہر نے شمیم آرا، وحید مراد، ندیم، کمال، لہری اور نرالا جیسے اداکار دیئے تو یہاں کے معین اختر، عمر شریف، ملک انوکھا، اسمعیل تارا، ماجد جہانگیر اور زیبا شہناز نے سکھایا کہ شائستگی کے ساتھ کیسے ہنسایا جاتا ہے۔ اسی شہر نے خانصاحب مہدی حسن، احمد رشدی، حبیب ولی محمد، ایم کلیم، نسیمہ شاہین، نگہت سیما، مہناز بیگم، عالمگیر اور محمد علی شہکی جیسی ریشمی اور سریلی آوازیں موسیقی کی دنیا کو دیں۔

یہ شہر محمد برادرز، حنیف، وزیر، مشتاق، صادق اور شعیب محمد کا شہر ہے اور یہیں پاکستان چوک پر رستم زماں بھولو پہلوان کے اکھاڑے میں اسلم، اکرم، اعظم، گوگا اور زبیر عرف جھارا زور کیا کرتے تھے۔ یہیں سے جہانگیر خان جیسا فاتح عالم ابھرا اور اسی شہر نے جاوید میانداد جیسا بے مثال کھلاڑی پیدا کیا۔ یہیں سے ظہیر عباس، آصف اقبال، شاہد آفریدی، اصلاح الدین، منور الزماں، صفدر عباس، حس سردار اور سہیل عباس جیسے کھلاڑیوں نے پاکستان کا نام دنیا میں روشن کیا۔
یہ طلبہ کا شہر تھا۔ تعلیمی سرگرمیاں اور مقابلے اس شہر کی جان تھے۔ ریڈیو پاکستان کے ہفتہ طلباء کے علاوہ شہر کے مختلف تعلیمی اداروں میں مباحثوں، مشاعروں، کوئز پروگراموں میں ظہور الحسن بھوپالی، دوست محمد فیضی، ولی احمد رضوی، شفیع نقی جامعی، انیس تفضل، کشور غنی، منور غنی، خوشبخت شجاعت، پروین شاکر، نقاش کاظمی، عقیل عباس جعفری، عابد علی بیگ، ضیاالرحمن ضیا، حافظ نسیم وغیرہ اپنے اپنے کمالات دکھاتے۔

یہاں استاد محبوب نرالے عالم، الحاج فضل احمد کشمیر والا، اسلام سلمانی بی اے جیسی دلچسپ شخصیتیں بھی رہتی تھیں جن کی اپنی اپنی کہانیاں ہیں۔ اس شہر کے اخبار، جنگ، انجام، حریت، ڈان، سن اور ان کے لکھنے والے اور ان کی داستانیں۔
اس شہر میں ۱۲۰ سے زائد سنیما تھے۔ بمبینو، لیرک، کیپری، پرنس، کیپیٹل، ریو، ریکس، پیراڈائز میں انگریزی فلموں کے شائقین کو بہترین فلموں کے ساتھ بہترین کافی اور برگر بھی ملتے تھے۔ ریوالی، نشاط، جوبلی، کوہنور، ریگل، لائٹ ہاؤس، خیام، ریلیکس، ڈرائیوان اور شہر کے ہر علاقے میں خوبصورت، آرام دہ اور معیاری سنیما گھر بکھرے ہوئے تھے جہاں نائلہ، ارمان، لاکھوں میں ایک، آگ کا

دریا، صاعقہ، کنیز، چکوری جیسی فلمیں ہم آج تک نہیں بھولے۔

شہر میں گاندھی گارڈن، ہل پارک، سفاری پارک تو تھے ہی، شہر سے باہر کلفٹن، ہاکس بے، منوڑا، سینڈس پٹ، نیلم لوائنٹ، پیراڈائز پوائنٹ، فرنچ بیچ، چرنا آئی لینڈ جیسے ساحلی تفریحی مقامات بھلا کس شہر میں یکجا ملیں گے۔

اور شہر میں آئے روز ہونے والی ادبی اور ثقافتی تقریبات، آرٹ اور کلچر کی نمائشیں، ادبی میلے، آرٹس کونسل، پاک امریکن کلچرل سنٹر، کیٹرک ہال، ڈینسو ہال، فلیٹ کلب، برٹش کونسل، ادارہ یادگار غالب، فریر ہال، لیاقت لائبریری اور بے شمار ادبی، مذہبی، تعلیمی، سماجی تقریبات۔۔۔اور تقریباہر روز کہیں نہ کہیں شادی بیاہ کی کوئی نہ کوئی تقریب۔۔اور کچھ نہیں تو سوئم اور چالیسویں کا کھانا۔۔۔

اور کھانے پینے کی بات ہو تو کہاں تک سنوگے، کہاں تک سنائیں، گھسیٹے خان کی حلیم، بندو خان کا پراٹھا کباب، فرزند علی کی قلفی، نیو پنجاب کی لسی، فریسکو کی مٹھائی اب پرانی باتیں ہوئیں۔ برنس روڈ کے دہی بڑے، ربڑی، وحید کے کباب، اسٹوڈنٹ بریانی، صابر، زاہد، جاوید، ادریس اور نہ جانے کس کس کی نہاری۔۔۔رحمت شیریں، ملا احمد، سن شائن اور ان گنت مٹھائیاں۔

اس شہر میں ہونے والے واقعات، بشیر ساربان کا قصہ، ثروت اکرام اللہ کی اردن کے ولی عہد سے شادی، اردو سندھی کے ہنگامے، دوسرے شہروں سے لوگوں اور فقیروں کی یلغار، لوٹ مار، ٹوٹی سڑکیں، بہتی نالیاں، کچروں کے ڈھیر اور دوسری طرف ڈی ایچ اے اور بحریہ ٹاؤن جیسے رہائشی علاقے جو دوبئی اور یورپ کو بھی شرمائیں۔

کراچی کی، کراچی کے لوگوں کی، کراچی کے علاقوں کی، کراچی کے واقعات کی اور کراچی کی یادوں کی اتنی باتیں تو صرف مجھ اکیلے کو یاد ہیں۔اور کتنی باتیں ہوں گی، کتنا کچھ نہیں لکھا ہو گا۔اس سے دگنا، تگنا لکھا جا سکتا ہے۔ تین کروڑ کی آبادی ہے، میں نے تو تین سو نام بھی نہیں لکھے ہوں گے۔ کیا کچھ ہے میرے شہر میں۔

اب آپ ہی بتائیں اس کمبل سے کیسے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔

ہم پر الزام ہے
کراچی والے کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔

تحریر: اظہر عزمی

کراچی میں رہتے پوری زندگی گزر گئی۔ جب بھی کراچی سے باہر نکلے، کراچی والوں کی صفائیاں ہی دیتے رہے۔ پہلا الزام تو یہی رہا کہ کراچی والے مہمان نواز نہیں۔ وقت نہیں دیتے۔ پہچانتے نہیں۔ گھر جاؤ تو پہلے یہ پوچھتے کب تک رکنے کا ارادہ ہے؟ اور اگر رات گھر میں قیام نہ کروانے کا ارادہ ہو تو کہتے ہیں "کھانا کھا کر جانا"۔

ایک مرتبہ ملتان سے بذریعہ بس کراچی آرہا تھا۔ رات کے وقت روانگی ہوئی۔ یونیورسٹی کے دو شستہ و مہذب طالب علم ساتھ والی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ تعارف ہوا اور جب انہیں پتہ چلا کہ میں کراچی والا ہوں (ویسے یہ میرا تجربہ رہا ہے کہ آپ کہیں چلے جائیں کراچی والے پہچان میں آجاتے ہیں) تو راستے بھر کراچی والوں سے متعلق پوچھتے رہے۔ سہراب گوٹھ آگیا اور میں نے آنکھ تک نہ جھپکی۔ ان کی ایک ایک بات کا خندہ پیشانی سے جواب دیتا رہا۔

میں جانتا تھا کہ وہ میرے جوابات سے بہت زیادہ مطمئن نہ ہوں گے پھر بھی اپنے طور پر انہیں صفائی دینے کے بجائے بڑے شہر کی مصروفیات، ضروریات، فاصلوں اور اوقات کار کا بتاتا رہا۔ چھوٹے شہروں میں وقت گھڑی کی صورت ہاتھ میں بندھا ہوتا ہے۔ بڑے شہروں میں انسانوں کی باگیں وقت کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں۔ میں نے کہا کہ کراچی ملک کا سب سے بڑا شہر ہے۔ صنعتی و تجارتی مرکز ہے۔ گنجان آباد ہے، کئی کلو میٹر پر پھیلا ہوا ہے اس لیے زندگی ایک لگے بندھے ٹائم ٹیبل کے تحت گزرتی ہے۔ آپ دبئی کی مثال لے لیں۔ گو کہ چھوٹا سی جگہ ہے لیکن اس کی زندگی کراچی سے بھی تیز تر ہے۔ دنیا کے تمام بڑے ترقی یافتہ شہر اسی صورت حال سے اور بھی زیادہ دوچار ہیں۔

میں نے انہیں بتایا کہ بڑے شہروں میں محبت، خلوص، پیار اور مہمان نوازی کم نہیں ہوتی۔ وقت کی قلت پڑ جاتی ہے۔ چھوٹے

شہروں میں فاصلے کم اور وقت زیادہ ہوتا ہے۔ میل ملاپ اور روز کی بیٹھکیں عام ہوتی ہیں۔ مہمان آجائے تو اس کی خاطر و مدارات میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں رکھا جاتا۔

اتفاق دیکھئے جو لڑکے مجھے ملتان سے کراچی آتے ہوئے ملے۔ سالوں بعد ان میں سے ایک مجھے مل گیا۔ میں تو اسے نہ پہچان سکا لیکن وہ مجھے پہچان گیا۔ اپنا تعارف کرایا اور بہت سادگی سے اس دن کے سوالوں پر معذرت کرنے لگا: اس دن ہم نے آپ سے بہت تلخ سوالات کیے تھے لیکن آپ نے جس تحمل اور دلیل سے جواب دیے۔ ہمیں احساس تو ہو گیا تھا کہ جو کچھ ہم سوچتے اور سمجھتے ہیں۔ سب کچھ ایسا نہیں۔ کافی کچھ پروپیگنڈا اور ہمارے ذہن کی اختراع بھی ہے۔ اس دن اس کے اردو بولنے میں مقامی رنگ نمایاں تھا جس میں ایک الگ مزا تھا مگر آج اس کی اردو کراچی والی تھی ماسوائے چند الفاظ کے۔ میں کہا تمہاری اردو بہت صاف ہو گئی ہے۔ کراچی والی حس مزاح بھی اس میں آگئی تھی، بولا: دل جو صاف ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا یہ جملہ بہت اچھا لگا۔

کہنے لگے مجھے کراچی آئے چار سال ہو گئے ہیں۔ یہاں ملازمت کرتا ہوں۔ یقین جانیں گھر سے آفس اور آفس سے آنے جانے میں جان نکل جاتی ہے۔ گھر آنے کے بعد اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ کسی کے ہاں جایا جائے۔ بس صبح آفس جانے کی فکر ہوتی ہے۔ میں نے کہا تو پھر کوئی مہمان آجائے تمہارے شہر سے تو؟ نظریں جھکا کر کہنے لگا: سر جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بس ایک کوشش ہوتی ہے کہ اس کی بہترین مہمان نوازی کروں مگر دو تین گھنٹے سے زیادہ کی سکت نہیں ہوتی۔ سارا معاملہ وقت کا ہے۔ دل تو رات گئے تک بیٹھنے کو چاہتا ہے مگر ذہن گھڑی کی طرح ٹھک ٹھک پیغام رہتا ہے۔

میں نے کہا تو اب وہ وضاحتیں جو میں نے دی تھیں۔ اب وہ آپ کرتے ہیں۔ بولا: آپ سے کہیں زیادہ کرنی پڑتی ہیں لیکن وہ مانتے نہیں کہتے ہیں تجھے کراچی کی ہوا لگ گئی ہے۔ یہاں کا پانی جو منہ لگ گیا ہے۔ میں نے کہا: اب بتاو، کوئی حل ہے۔ کہنے لگا: ایک بات کہوں میں آپ سے۔ میں نے ہاں میں سر ہلادیا۔ آپ لوگ بڑے کشادہ دل ہوتے ہیں۔ تصنع و بناوٹ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اب تو میں بھی کراچی والوں کی فہرست میں آگیا ہوں۔

میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا: بڑے شہروں کے لوگ بڑے کشادہ و سادہ دل ہوتے ہیں۔ اس لیے ہر الزام کا جواب بہت اطمینان

و دلیل سے دیتے ہیں۔ مگر دوسرے شہر والے اسے بہانے بازی اور شہری ہوشیاری کے خانے میں رکھ کر کسی جواب سے مطمئن نہیں ہوتے۔ کسی طرح کراچی والوں کو الزامات کے کٹہرے سے باہر نہیں نکالتے۔ میں نے کہا گھر جانا ہوتا ہے؟۔ کہنے لگا: عید تہوار پر تو ضرور جاتا ہوں مگر تیسرے روز کی صبح سے ہی نکلنے کی سوچتا ہوں۔ گھر والے بہت روکتے ہیں مگر میری ملازمت تو پرائیوٹ ہے مجھے تو پہنچنا ہوتا ہے۔ اکثر شادی و فوتگی میں بھی نہیں پہنچ پاتا۔

میں نے اسے بتایا کہ جس رات تم مجھے ملے تھے۔ تمہیں معلوم ہے۔ میں اسی صبح ایک تدفین میں شرکت کے لیے ملتان پہنچا تھا۔ رات بھر کا جاگا تھا اور رات کو پھر بس میں سوار ہو گیا اور پوری رات کتنی دلجمعی اور اطمینان سے تمھارا ہر الزام سنتا رہا۔ کسی مرحلے پر تمھیں لگا کہ میں اکتا گیا ہوں۔ چاہتا تو آنکھیں موندھ کر سو جاتا۔ بس ایک بات یاد رکھنا بڑے شہر میں رہو تو دل بھی بڑا رکھو ورنہ تمھیں یہ سننے کو بھی ملے گا کہ کراچی والے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

میں نے اسے بتایا کہ باتیں تو ہم بھی بہت محسوس کرتے ہیں مگر کبھی کہتے نہیں۔ کراچی والے کبھی دوسرے شہر کے لوگوں پر الزام نہیں لگاتے۔ میں نے اسے بتایا کی جس انتقال میں، میں گیا تھا۔ وہاں نماز جنازہ میں لوگوں کی شرکت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کراچی والے اتنا شادی میں بن سنور کر نہیں جاتے جس طرح وہ سفید کڑک شلوار سوٹ میں تازہ تازہ شیو کر کے آئے تھے۔ کار والوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ جنازے سے آگے اپنی شاندار کاریں کھڑی کر دیں تاکہ ایک ایک شخص میت کے ساتھ ساتھ کاروں کو بھی دیکھ لیں۔ میں نے اسے بتایا کہ جو جینز کی پینٹ پہن کر میں کراچی سے چلا تھا۔ بس اس پر ٹی شرٹ ضرور تبدیل کی تھی اور اسی ٹی شرٹ اور جینز کی پینٹ کے ساتھ تمھیں ملا تھا۔ تصنع اور بناوٹ کی کھوٹ کراچی والوں میں مشکل سے ملے گی کیونکہ اس کے لیے بھی وقت درکار ہوتا ہے۔

میں نے جو خاص بات وہاں نوٹ کی وہ کراچی والوں کے عمومی مزاج کے بالکل خلاف تھی۔ وہاں سرکاری افسران اور زمینداروں کو اضافی و غیر ضروری اہمیت و عزت دی جارہی تھی۔ کراچی والے اس عادت سے بہت دور ہیں۔ یہاں بڑے سے بڑے طرم خان آجائے۔ کراچی والے اگر جاننے والا ہے تو عزت سے ضرور پیش آتے ہیں ورنہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہاں آکر تم میں کیا تبدیلی آئی؟ ہنسا: اپنے کام میں اتنا مصروف رہتے ہیں کہ کہیں اور دھیان جاتا ہی نہیں۔ میں نے کہا: کیا بے حس ہو گئے ہو؟ بولا: ایسا بالکل بھی نہیں۔ جب ضرورت ہو تو محلے اور رشتے داروں سے رابطہ اور ملاقات لازمی ہے۔

میں نے کہا: تم نے کبھی دیکھا اگر روڈ پر کوئی معمولی سا بھی حادثہ ہو جائے تو ذرا سی دیر میں کتنے موٹر سائیکل اور کاروں والے رک

جاتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن پر الزام ہے کہ ان کے پاس وقت نہیں۔ کراچی میں سب سے زیادہ فلاحی ادارے موجود ہیں جو کسی سے کچھ نہیں پوچھتے اور سب کے لیے دست تعاون دراز کرتے ہیں۔

اس کے بعد وہ چلا گیا اور کراچی کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گیا۔ اب پتہ نہیں کہ وہ دوبارہ ملے کہ نہیں۔ کراچی سمندر کے کنارے آباد ہے جہاں آبادی کا ایک سمندر ہے۔ اگر کراچی والوں کو سمجھنا ہے تو پھر آپ کو اس آبادی کے سمندر میں اترنا ہو گا۔ گہرائی میں اتریں گئے تو معلوم ہو گا کہ دور سے ٹھاٹھے مارتا یہ سمندر کتنا سادہ مزاج، وسیع الذہن اور کشادہ دل ہے۔

جعفر طیار لائبریری درج ذیل افراد اور ان کے اہل خانہ کی بہت ممنون ہے کہ جنہوں نے بڑی تعداد میں لائبریری کو اہم اور نایاب کتابیں عطیہ کیں۔

1۔ سید حسن امام
2۔ سید رفیق عباس جعفری
3۔ پروفیسر ڈاکٹر فیصل
4۔ جناب جعفر بلگرامی
5۔ سید زین العابدین (سر زین)
6۔۔ انجمن ترقی اردو پاکستان
7۔ سید ابرار حسین اثر سلطان پوری

لیاری کی مختصر تاریخ

تحریر: اقبال اے رحمٰن

لیاری کراچی کا مشہور ترین خطہ ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ خطہ زمین ہی کراچی ہے کیونکہ یہ دور آغاز ہی سے کراچی کا رفیق ہے، لیاری ندی دراصل دریا ہے مگر چونکہ مقامی آبادی سمندر کو دریا اور دریا کو ندی کہتی تھی لہذہ کوسوں دور سے بہتا چلا آرہا یہ دریا ندی کہلایا اور کہلاتا ہے، یہ ندی یا دریا جوں جوں سمندر سے قریب ہوتا گیا اسکے دونوں جانب لئی کے خودرو درخت اگتے گئے، لئی کے درختوں کی کثرت کے سبب سندھی زبان میں یہ علاقہ "لئی واری "یعنی لئی والی جگہ کہلایا، لئی واری گزرتے وقت کے ساتھ "لیاری" بن گیا۔ لیاری کو لیاری کہے جانے کا سبب بنے ان درختوں کی شاخیں گھریلو مصنوعات جیسے ٹوکریے اور چھلیاں بنانے کے کام آتی ہیں، جھگیوں کی چھت بھی ان جھاڑیوں سے بنائی جاتی ہیں جو تیز دھوپ میں چھت کو تپنے نہیں دیتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ندی کے کناروں پر جمی زردی مائل سرخ مٹی بھی اس نام کا محرک بنی کیونکہ زردی مائل سرخ رنگ سندھی زبان میں لئاری کہلاتا ہے جس سبب آگے چل کر لیاری کا نام اختیار کر گیا، ندی ہی کے راستے میں آتے پیلو کے درخت بھی تھے، پیلو مقامی زبان میں ملاپ اور یاری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، یاری کا لفظ بھی لیاری کہلانے کا محرک ہو سکتا ہے مگر نہ ہو تو بھی کیا؟ لیاری ہے تو یاروں یعنی دوستوں کی سرزمین۔

لیاری ندی اور اسکے پانی کے سبب یہ علاقہ زراعت پیشہ لوگوں کے لئے پر کشش تھا، ماہرین آثار قدیمہ نے دستیاب معلومات سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قریباً 4000 ہزار سال قبل یہ علاقہ زراعت پیشہ لوگوں سے آباد تھا، مگر اسکی آبادِ نو کی منزل کراچی کی بندرگاہ کی دریافت کے بعد کی ہے، جب یہاں آنے اور رہائش اختیار کرنے والے والے زراعت کے لئے نہیں بلکہ مزدوری کے لئے آکر آباد ہوئے۔ سنہ 1730 تک سیٹھ بھوجومل سندھ کے بیوپاریوں کے ساتھ کیماڑی کی بندرگاہ دریافت کر کے کراچی آچکے تھے بندرگاہ کی شہرت سن کر بلوچستان سے اولین طور پر جو لوگ آئے وہ ماہی گیر تھے جنکو لئی کے درختوں والی جگہ بھا گئی اور ان درختوں کے جھنڈ میں ان بلوچ ماہی گیروں کی 20 سے 25 جھگیاں آباد ہو گئیں، گویا یہ طے ہوا کہ لیاری کو ابتدا میں مسکن بنانے والے اور پھر آباد کرنے والے اور اسکے بعد ایک مخصوص ثقافت کا رنگ عطا کرنے والے بلوچ ہیں، اسی لئے بلوچ لیاری سے والہانہ محبت کرتے ہیں اور اسے اپنی دھرتی ماں قرار دیتے ہیں۔
کھارادر میں جہاں آج مچھی میانی مارکیٹ ہے وہاں سندھی ماہی گیروں کی جھگیاں تھیں، 1870 میں اس جگہ مارکیٹ کی تعمیر کے لئے

ان ماہی گیروں کو وہاں سے ہٹایا گیا اور لیاری میں موجود برساتی پانی کی گزرگاہ سے بنے ایک کھڈ کی بھرائی کر کے وہاں آباد کرایا گیا یہ علاقہ کھڈا کہلایا بلوچوں کے بعد یہ دوسری بڑی آبادی تھی جو لیاری میں قیام پزیر ہوئی آبادی بڑھنے کے ساتھ دیگر برادریوں کی آمد شروع ہوئی جن میں کچھی، اوکھائی میمن، پٹھان، میانوالی یہ سب قدیمی طور پر لیاری میں آنا شروع ہو گئے تھے، 1946 میں بہار میں ہوئے فسادات کے سبب پیر الہی بخش صاحب کی کوششوں سے بہار کے متاثرہ خاندانوں کو باقاعدہ سے ایک ہاؤسنگ سوسائٹی بنا کر لیاری میں آباد کرایا گیا، پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ہجرت کر کے آنے والی برادریوں نے لیاری میں پہلے سے موجود اپنی برادریوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی، آگرہ سے آئی اردو گفتار برادری نے بھی لیاری کو مسکن بنایا، اسی طرح سے شہر کی اقتصادی ترقی نے بلوچستان میں بسے کسی زمانے میں افریقہ سے غلام کی صورت میں لائے گئے شیدی افراد کو ترغیب دی کہ وہ شہر میں آکر مزدوری کر کے اپنے رزق کا سامان کریں جو نہ صرف یہ کہ لیاری کا حصہ بلکہ نمایاں حصہ بنے۔ طویل عرصے تک بلوچستان میں رہنے کی وجہ سے بلوچی زبان بولتے ہیں، بلوچی ثقافت بھی اپنالی ہے اسلئے لوگ انکو بلوچ ہی سے تعبیر کرتے ہیں، یوں لیاری مختلف برادریوں کے کلچر سے سجا ایسا گلدستہ بن گیا جس کا نمایاں پھول بلوچ اور نمایاں خوشبو بلوچ ثقافت ہے۔

لیاری چست لوگوں کی چست سرزمین ہے جہاں کے محنت کش سدا بہار اور منکسر المزاج ہیں، یہاں فٹ بال، باکسنگ اور سائیکلنگ کی دنیا ہے اور یہاں موسیقی اور سروں سے والہانہ لگاؤ کی ایسی ثقافت ہے جسکا اظہار پورے کراچی میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔

تعلیم یافتہ لوگ لیاری میں "تعلیم آفتاب" کہلاتے ہیں، دیکھا آپ نے لیاری کے لوگ غلط کہہ کر بھی کتنا صحیح کہہ جاتے ہیں، تعلیم کو روشنی اور وہ بھی سورج کی روشنی سے تشبیہ دینا انکی فطری ذہانت کی عکاس ہے۔

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

لیاری میں موسیقی اور فن سے محبت کے سبب ہوٹلوں سے گانوں کی صدائیں بھی آتیں تھیں اور شادی بیاہ اور دیگر مواقع پر پاکستان کے صف اوّل کے فنکار بلوچ قوم کی فن اور فنکار دوستی کی قدر کرتے ہوئے حاضری دیتے تھے، اسی علاقے کو استاد بڑے غلام علی خاں صاحب کی حاضری کا شرف حاصل ہے، ایسا نہیں کہ فن کے استادوں کی یہ حاضری اشرافیہ کے ایوانوں میں ہو، یہ حاضری محنت

کش اور غریب آبادی میں ہوتی تھی اسلئے کہ فن اور موسیقی سے انکی حد درجہ محبت کے سبب انکے لئے یہی ایوان اشرافیہ تھا، یہاں فٹبال کی آباد دنیا کے سبب پاکستان کی فٹبال ٹیم گویا یہیں رہتی تھی، فٹبال سے محبت کا یہ عالم تھا پہلے کھلاڑی، پھر ریفری پھر کوچ اور آخر میں میدان ہی کو اوڑھنا بچھونا بنالینا آنکھوں دیکھی بات ہے، عموماً نام کے ساتھ بخش لگتا ہے، اللہ بخش، رسول بخش، پیر بخش، مولا بخش، لال بخش اور اسطرح کے نام فٹبال میچ کی کمینٹری کے درمیان کمینٹری کرنے والوں کو چکرا دیتے تھے، یہاں کی آباد باکسنگ اور سائیکلنگ کی دنیا بین الاقوامی مقابلوں میں پاکستان کا نام روشن کروانے کا سبب بنی ہے، یہاں بانسری اور ہارمونیم بجانے والے گلیوں کے فنکار اور بلوچی دھنوں پر والہانہ اور دیوان وار رقص کرنے والے محبت بھرے دل رہتے ہیں، یہیں ہم جیسے تعلیم آفتاب (تعلیم یافتہ) کہلاتے لوگ گلی محلے میں بیٹھے بلوچوں سے جب کوئی سوال پوچھیں تو جواب میں ہاں نہیں بلکہ "جی ہاں" کی صدا انکی انکساری اور تعلیم دوستی کی عکاس ہوتی ہے، اسی لیاری میں جرائم کی دنیا بھی تھی، ہر طرح کا نشہ اور مارفیا کے انجیکشن بھی یہیں ملتے تھے مگر احترام اشراف اور احترام نساء ایک ایسی صفت ہے جو لیاری اور اسکے لازم و ملزوم بلوچ کلچر کی ایک نمایاں خوبی کے طور پر بد ترین حالات میں بھی برقرار رہی اور ہمیشہ رہیگی۔

اُن کی نظروں میں مجسّم دل ہوا جاتا ہوں میں
اب تو خود ہی ناز کے قابل ہوا جاتا ہوں میں

لیاری

کراچی کے مضافات میں جاگتی بستی ابراہیم حیدری

کتاب: "نگری نگری پھرا مسافر" سے اقتباس

(جمال خان کلادی)

کراچی کے جنوب میں کورنگی کریک کنارے آپ کو ماہی گیروں کی ایک قدیم بستی ابراہیم حیدری ملے گی، اس بستی کی قدامت کے متعلق پتہ چلتا ہے کہ سکندر اعظم سے پہلے دارا اول 521ق،م میں یونانی سیاح اسکائے لیکس کو ھندستان کے حالات دیکھنے بھیجا تھا اس زمانے میں دریائے سندھ کا ایک بہاؤ اس کے نزدیک سے گزر کر سمندر میں گرتا تھا۔

ایچ ٹی لیمبرک نے سکندری جنت کا نام دیا تھا، ایرین کی تحریروں کے مطالعہ کے بعد لگتا ہے یہ علائقہ ریڑھی میان اور کیاڑی کے بیچ والا علائقہ ابراہیم حیدری، واگھوڈر اور ریڑھی میان کا علائقے انتہائی سرسبز اور شاداب تھے، لیمبرک ان علاقوں کو "وٹیجی" اور ابراہیم حیدری کے نام سے بلاتا تھا، گزری کریک جو ملیر ندی کا مہانہ Estuary ہے وہ بھی کسی زمانے میں یہاں آکر اس کریک سے ملتی تھی۔

موجودہ ابراہیم حیدری کی بستی ٹالپور دور میں آباد ہوئی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب نمک کا اونٹ ایک روپیہ، چاول کے چالیس سیر دس آنے اور گندم کے ڈھائی من ایک روپیہ میں مل جاتے تھے، ان شب و روز میں ان کناروں پر کچھ ماہیگیر آکر رکے سمندر کے سحر نے انہیں ایسا جکڑا کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے، کچھ عرصے میں گھر بنے گھروں کے آنگن بنے ان آنگنوں کے سامنے نیلا سمندر، سفید ریت کنارے پہ کھڑی بادبانی کشتیاں، جال بنتے ماہیگیر بس ایک چھوٹی سی بستی آباد ہو گئی، تھوڑے عرصے میں یہ بستی دو درویشوں "ابراہیم شاہ" اور "حیدر شاہ" کے نام سے منسوب ہو گئی ان بزرگوں کی آخری آرام گاہیں اس وقت ابراہیم حیدری میں موجود پاکستان ایئر فورس کمپائونڈ کے اندر موجود ہیں۔

چالیس پنتالیس سال عرصہ پہلے جہاں بجلی گھر بنا ہوا ہے وہاں پر سفید چاندی جیسی ریت کے ٹیلے ہوتے تھے سمندر کا پانی اتنا صاف اور ہلکا نیلا ہوا کرتا تھا کہ اگر اس میں سکہ گر جائے صاف نظر آتا تھا یہی وجہ تھی کہ پاکستان کے مشہور اداکار مختلف فلموں کی شوٹنگ کیلئے یہاں آتے رہے ہیں خاص کر 1964ع میں اداکار شکیل اور رخسانہ کی فلم "ناخدا" شبنم اور وحید مراد کی مشہور فلم "سمندر" جو 1968 میں ریلیز ہوئی تھی ابراہیم حیدری کے صاف ستھرے سمندر کناروں پر مہینوں تک شوٹنگ ہوتی رہی،

گائوں میں بجلی ستر کی دھائی میں آئی ہزاروں کی ابادی والی بستی پانی میٹھے پانی کے کوؤں سے پیتے تھے، خوشی غمی میں ساتھ رہتے تھے خرید و فروخت بیل گاڑیوں کے ذریعے اکثر جوڑیا بازار سے کرتے تھے مادرانہ معاشرے کی اس بستی میں مرد حضرات مچھلی کے شکار کیلئے ھفتوں مہینوں بعد لوٹتے تھے گھر چلانا رشتے کرنا اور مسئلے مسائل م میں حتمی رائے خواتین کی ہوتی تھی، چوبیس گھنٹے جاگتی بستی

میں لوگ جیٹی کی جانب آتے جاتے تھے کوئی مچھلی کے شکار کی تیاری کر رہا ہوتا تھا کوئی کشتیوں سے مچھلی اتار رہے ہوتے تھے کہیں کشتیوں کی مرمت کی جارہی ہوتی تھی تو کہیں نئیں کشتیاں بن رہی تھیں جال بونالوھار رازامزدور واپاری دکاندار کی چہل پہل رات دن ہوتی تھی اور رات بھر ہوٹل بھی کھلے رہتے تھے،

بس اب تو نظر لگ گئی ہے باقی علاقوں کی طرح اس شہر کو تقریباً ایک لاکھ ابادی کی ابراہیم حیدری میں نہ وہ خوشیاں ہیں نہ اتنی کاروباری سرگرمیاں نہ سمندر میں جوش نہ صاف نیلا پانی نہ چاندی سی ریت بس اس وقت کالی کیچڑ اور آلودہ پانی شہر کا کچرا ڈمپ کرنے کی جگہ کا منظر دکھتا ہے،

ملیر کی مختصر تاریخ

تحریر: پروفیسر سید عمران ظفر

ملیر نام کے خطے

دنیا میں 5 ایسے خطے ہیں جن کا نام ملیر ہے. پہلا انڈیا کے صوبے راجھستان میں ایک علاقہ "ملیر کوٹلہ" کے نام سے ہے. دوسرا صوبہ سندھ کے ضلع تھرپارکر کے علاقے ننگرپارکر میں ایک علاقہ ملیر کے نام سے ہے. اسی طرح سے صوبہ بلوچستان کے ضلع لسبیلہ کا ایک ساحلی علاقہ "کنڈ ملیر" کے نام سے ہے. اس کے علاوہ ضلع جامشورو میں ایک ندی ہے اور اس کے کنارے پر انگریزوں کی تعمیر کردہ چھوٹی سی عمارت "ملیری لانڈھی" کے نام سے بھی ہے جس کے قریب اسی نام سے ماضی میں کوئی گاؤں بھی آباد تھا. پانچواں کراچی کا "ضلع ملیر" ہے.
ملیر سندھی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی سرسبز کے ہیں. مگر شاہ جو رسالو میں شاہ عبداللطیف بھٹائی نے ماروی کے حوالے سے جس ملیر کا ذکر کیا ہے وہ ضلع تھرپارکر کے تعلقہ ننگرپارکر کے ایک گوٹھ کا نام ہے. جہاں ماروی کا کنواں بھی موجود ہے
بعض محققین کی نظر میں یہ مالور، مالیر، ملیر، مالیر وغیرہ میں سے کسی ایک کی بگڑی ہوئی شکل ہو سکتی ہے. تھر والے ملیر اور کراچی والے ملیر میں مماثلت دراصل بارشوں کی وجہ سے ہونے والی سرسبزی اور شادابی ہے.
اس کے علاوہ ملیر کے نام پر ایک تحقیق اور بھی ہے جس کے مطابق یہ لفظ ملیر ہے. یہاں لام پر تشدید ہے یہ لفظ بلوچی زبان کا ہے جس کے معنی "سر کی چوٹی" یا "چٹیا" کے ہیں. اگر ملیر ندی کے نقشے پر غور کیا جائے تو کاٹھور کی طرف سے آنے والی دو ندیاں خادیجی اور مول سپر ہائی وے پر انصاری پل کے پاس ایک دوسرے سے مل کر ایک ہو جاتی ہیں اور اسے ملیر ندی کا نام دیا جاتا ہے. ندیوں کے اس ملاپ کو نقشے میں دیکھا جائے تو دونوں ندیاں آپس میں باہم اس طرح مل کر ایک ہوتی ہیں جیسے عورتوں کے بالوں کی چٹیا بنتی ہے اور اسے بلوچی زبان میں ملیر کہتے ہیں. مقامی بلوچی زبان میں یہ لفظ اب متروک ہو چکا ہے تاہم بلوچستان اور ایران کی بلوچی زبان میں اب بھی یہ لفظ رائج ہے اور استعمال کیا جاتا ہے.

ملیر نام کے خطے

جدید کراچی شہر کی بنیاد سے بہت پہلے ملیر میں آبادی کے آثار موجود تھے. یہاں ہر دور کے آثار ملتے ہیں جن سے وادی کی قدامت کا پتہ چلتا ہے. دریائے سندھ کے سمندر میں گرنے کی جگہ سے قریب ہونے کی وجہ سے کشمیر سے سمندر تک اور دیگر ملکوں کی جانب گزرگاہوں کا راستہ بھی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ وادی ملیر ہمیشہ آباد رہی ہے اور اسے سندھ کی ثقافت کا شمال مغربی ستون سمجھا گیا ہے.
ملیر ندی کے کنارے پر کئی مقامات ایسے ہیں جہاں ہڑپہ تہذیب کے آثار پائے جاتے ہیں. ضلع ملیر کے گڈاپ ٹاؤن کے علاقے کونکر کی بلند

پہاڑی کی گھاٹیوں اور لانڈھی کے قریب واقع چٹان کے قرب وجوار میں کچھ اوزار برآمد ہوئے ہیں جو قدیم پتھر کے زمانے کے آخری دور کے ہیں جبکہ جدید پتھر کے دور کے اوزار بھی ملیر ندی اور اس کی معاون ندیوں کے قریب سے ملے ہیں. اس کی قدامت تقریباً آٹھ ہزار سال پرانی ہے. اسی طرح سے گوٹھ اللہ ڈینو میں ایک ٹیلے کی کھدائی کے دوران تانبے کے دور کے نوادرات بڑے پیمانے پر حاصل ہوئے ہیں.

اکثر محققین کراچی کے علاقے ملیر، لانڈھی اور منگو پیر کو زبردست تاریخی حیثیت دیتے ہیں اور ان علاقوں کو ہڑپہ اور موہنجوداڑو کی تہذیبوں کا ہم عصر بتاتے ہیں اور عرب کے دور سے جوڑتے نظر آتے ہیں لیکن ابھی تک کراچی کی تاریخ پر عملی طور پر کوئی کام نہیں ہوا۔

کچھ ذکر ملیر ندی اور ڈملوٹی کے کنوں کا

بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ ملیر ندی خود سے اپنا وجود نہیں رکھتی بلکہ 2100 فٹ بلند مول پہاڑ سے آنے والی مول ندی اور جامشورو ضلع کی 1000 فٹ بلند پہاڑیوں سے نکلنے والی خادیجی ندی 30 میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب سپر ہائی وے کے پاس انصاری پل کے سامنے آپس میں مل کر ایک ہو جاتی ہیں تو اپنا وجود کھو کر ملیر ندی بناتی ہیں. پھر اس ندی میں مزید تھدو ندی، بازار ندی، آبدار ندی، سکھن ندی اور کونکر ندی بھی شامل ہو جاتی ہیں. یوں انصاری پل سے لے کر سمندر کے کنارے گذری کے مقام تک یہ ندی ملیر ندی کہلاتی ہے. ان ندیوں کی مخصوص زمین کی وجہ سے ندی میں آنے والا برساتی پانی زیر زمین اندر ذخیرہ ہو جاتا ہے اور دراصل یہی ذخیرہ ملیر کے پورے علاقے میں زراعت کو فروغ بخشتا ہے.

ملیر ندی اور اس میں شامل ہونے والی تمام معاون ندیوں میں مسامدار زمین اور پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے جب بہت زیادہ برسات میں زیر زمین پانی کا بہاؤ اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ کئی جگہ سے واپس زمین سے باہر نکل جاتا ہے. اسی لئے برسات کے بعد بھی کافی عرصے تک ندی میں مختلف جگہوں سے پانی رواں رہتا ہے. جسے مقامی زبان میں "نہہ" کہتے ہیں۔ خادیجی ندی میں ایسے معاملات بہت زیادہ ہیں اور زیر زمین پانی بہت وافر مقدار میں موجود رہتا ہے اس لئے اس ندی میں سے اکثر جگہ سے پانی باہر آجاتا ہے اور پورے سال بہتا رہتا ہے. ایک خاص ٹیلے سے جو پانی باہر آتا ہے تو وہ آبشار کی شکل اختیار کر لیتا ہے جسے خادیجی آبشار کہتے ہیں۔ یہ آبشار انتہائی خوبصورت ہے اور پورے سال ہی بہتا رہتا ہے.

اسی صورت حال کو دیکھتے ہوئے انگریز انجینئروں نے ایک اسکیم تیار کی جس میں ملیر ندی پر ڈملوٹی کے مقام پر کنویں کھود کر زیر زمین قدرتی پانی کے بہاؤ کو استعمال کر کے کراچی کو پانی سپلائی کا منصوبہ تیار کیا. اس کا سنگ بنیاد اس وقت کے صوبہ بمبئی کے گورنر سر رچرڈ ٹیمپل نے 1881ء میں رکھا جبکہ اپریل 1883ء میں اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا.

مسام دار زمین کے باعث زیر زمین بہاؤ سے خود بخود پانی کنویں میں آتا جہاں اسکے پیندے میں 2 فٹ قطر کی پائپ لائن سے پانی نکال کر کراچی شہر کو فراہم کیا جاتا. ڈملوٹی کے مقام پر کراچی کو پانی سپلائی کرنے کے لیے 10 کنویں کھودے گئے اور 20 میل طویل زمین دوز

راستوں کے ذریعے پچاس لاکھ گیلن پانی روزانہ کراچی شہر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے یہاں سے فراہم کیا جاتا تھا. قیام پاکستان کے بعد جب آبادی میں اضافہ ہوا تو اس کے علاوہ بھی دیگر ذرائع سے پانی حاصل کیا جانے لگا تاہم آج بھی ان کے ذریعے پانی فراہم کیا جاتا ہے.

ڈملوٹی کے قریب قائداعظم کے لیے ایک رہائشگاہ بھی بنوائی گئی تھی مگر قائداعظم رحلت فرما گئے اور اس میں رہائش اختیار نہ کر سکے.

وادی ملیر

یوں تو کراچی کا پورا مضافات جس میں ملیر، شاہ فیصل کالونی، لانڈھی اور کورنگی شامل ہیں وادی ملیر تصور کیے جاتے ہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ علاقے اپنے جغرافیہ اور آبادی کے بڑھاو کی وجہ سے الگ انفرادی حیثیت حاصل کرتے چلے گئے۔

خود ملیر بھی اب دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے ایک دیہی ملیر اور دوسرا شہری ملیر. اس مضمون سے پہلے ایک مضمون دیہی ملیر پر جس کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔ دیہی اور شہری ملیر دونوں کو یہاں تفصیل سے بیان کیا جارہا ہے۔

دیہی ملیر

کچھ ذکر ملیر میں آباد قبائل کا

ملیر میں جوکھیہ قبیلے کے علاوہ ٹھٹہ سے میمن اور سید، بلوچستان سے بلوچ اور سندھ کے کوہستان سے پالاری، برفت اور خاصخیلی قبیلے صدیوں پہلے سے ملیر آکر آباد ہوتے رہے ہیں. جب کہ قیام پاکستان کے بعد بہت بڑی تعداد میں ہندوستان سے مہاجرین یہاں آکر قیام پذیر ہوئے.

ملیر میں سید، جوکھیا، خاصخیلی، پالاری، برفت، میمن، باریچہ، بابڑا، سرہندی، جاموٹ، جبکہ بلوچ قبائل میں کلمتی، جدگال، گورگیج، ھوت، واڈیلا، واشکی، لاشاری، لغاری، کھوسو، رند اور بروھی وغیرہ شامل ہیں.

اس کے علاوہ برٹش دور میں بڑے پیمانے پر ایرانی بلوچ بھی ہجرت کر کے کراچی میں سکونت پذیر ہوئے اور ان کی اکثریت لیاری اور ملیر کے علاقوں میں رہائش پذیر ہے ان کے علاوہ شیدی یا مکرانی بھی یہاں بڑی تعداد میں آباد ہیں.

ملیر 15 سے لے کر سپر ہائی وے تک کی تمام زمینیں زیادہ تر جوکھیہ، بلوچ، میمن، خاصخیلی اور ہندو بنیوں کی تھیں. انگریزوں کے زمانے میں جب یہاں گجرات سے خواجہ (اسماعیلی) آئے تو ان لوگوں نے بھی یہاں پر زمینوں کو خریدا. آج بھی ان کے پاس کافی زرعی زمین موجود ہے. ہندو بنیے قرض کے بدلے زمین رہن کے طور پر رکھ لیتے تھے اور رقم نا ملنے پر زمین اپنے نام کروا لیتے تھے. یہ یہاں کا عام رواج تھا.

ملیر کے مختلف ادوار

وادی ملیر میں پختہ عمارتوں کی تعمیر کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے چودھویں سے سترہویں صدی عیسوی جوچو کنڈی کی قبروں کی

تعمیر کا دور ہے. چوکنڈی طرز کی قبریں ملیر میں کافی جگہ پر موجود ہیں مگر بڑے قبرستان ملیر میں دو جگہ پر ہیں ایک قبرستان ڈملوٹی روڈ پر واقع ہے جو قدامت کے لحاظ سے لانڈھی کے چوکنڈی کے قبرستان سے پرانا ہے اور تقریباً چودھویں صدی عیسوی کا ہے. جب کہ لانڈھی والے چوکنڈی کا قبرستان سولہویں صدی عیسوی کا ہے. ان قبرستانوں میں قبائلی تصادم کے نتیجے میں مرنے والوں کی قبریں بھی موجود ہیں.

دوسرا دور 1885 کا جب ڈملوٹی پر انگریزوں نے کنویں بنائے اور مختلف تعمیرات کی.

تیسرے دور میں ہندوؤں نے اس پر فضا مقام کا رخ کیا اور اپنی بڑی بڑی حویلیاں بنوائی جن کی تعمیر زیادہ تر 1910 کے بعد سے شروع ہوئیں جن میں ملیر مندر اور اس سے ملحقہ صحت گاہ اور ملیر مندر سے ملحقہ دیگر تعمیرات بھی اسی علاقے میں شروع ہوئیں.

چوتھے دور میں ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجرین کے لیے شیڈ اور کوارٹر بنے۔

ملیر 15 سے لے کر سپر ہائی وے تک کی مشہور آبادیاں

1. جام گوٹھ

جام دراصل جوکھیہ قبیلے کے سردار کا لقب ہے. کیوں کہ جام گوٹھ میں جوکھیا قبیلے کے سردار رہتے ہیں لہذا اسی مناسبت سے اس علاقے کا نام جام گوٹھ پڑ گیا.

جوکھیو قبیلہ سمہ قوم میں شامل کیا جاتا ہے یہ راجپوت نسل سے ہیں. یہ لوگ بارہویں صدی عیسوی میں وسطی سندھ سے مختلف وجوہات کی بنا پر ہجرت کر کے سندھ اور قلات کی سرحد پر واقع علاقے گنگھورا میں رہائش پذیر ہوئے جو شاہ بلاول نورانی کے مزار سے کوئی 3 میل کے فاصلے پر ہے. پھر یہ آہستہ آہستہ حب ندی سے گھارو کے درمیان آباد ہونا شروع ہو گئے چودھویں صدی عیسوی میں جوکھیا قبیلے نے اپنا ایک سردار میرن جی حاجی کو چنا جس نے پہلی بار جام کا لقب اختیار کیا. میاں غلام شاہ کلہوڑو نے جام بجار جوکیہ کو جاگیر عطا کی اس طرح جوکھیا قبیلہ جو اس علاقے میں پہلے سے آباد تھا انتہائی طاقتور بھی ہو گیا. 1757ء میں جب غلام شاہ کلہوڑو نے کراچی پر دوبارہ اپنی عملداری حاصل کی تو جوکھیہ قبیلے اور دیگر قبائل کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ تمام تجارتی قافلوں کی کراچی سے سہون تک حفاظت کریں گے.

2. اولڈ تھانہ

اٹھارویں صدی کے شروع میں خاصخیلی قبیلے کے لوگ اس وقت کے کراچی اور ٹھٹہ ضلع کی سرحد پر واقع گھگھر کے علاقے سے موجودہ اولڈ تھانے میں آ کر رہائش پذیر ہوئے جہاں اس کا پہلا نام گھار (gharh) پڑا. خاصخیلیوں کی آبادی کے بعد اس علاقے میں بلوچوں نے بھی رہائش اختیار کرنا شروع کی. محرم کے حوالے سے "حشر پڑ" بن جانے کے بعد 18 ویں صدی کے آخر میں اس علاقے کا اسی مناسبت سے نیا نام حشر پڑ ہو گیا. انگریزوں کے زمانے میں اس علاقے میں ایک پولیس کی چوکی بن گئی جس کی مناسبت سے قیام پاکستان کے بعد اس

علاقے کا نیا نام اولڈ تھانہ ہو گیا.

3. میمن گوٹھ

پندرویں صدی عیسوی میں ٹھٹہ شہر میں پیر سید یوسف الدین کے ہاتھ پر ہندو لوہانہ قبیلے کے 700 خاندانوں نے بیعت کی اور مسلمان ہو گئے. پیر صاحب نے ان نو مسلم خاندانوں کو مومن کا لقب دیا جو وقت کے ساتھ ساتھ میمن بن گیا. اس کے علاوہ ایک اور تحقیق کے مطابق محمد بن قاسم کی فتح سندھ کے بعد اس کا خیر مقدم کرنے والے بدھ مت کے لوگوں میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے وہ سما کہلائے انہی میں مامون خاندان بھی تھا جو آگے جا کر میمن ہو گیا. ان کی اکثریت ٹھٹہ شہر اور اس کے قرب وجوار میں صدیوں سے رہتی تھی. 1840 سے 1850 کے دوران میمن قبیلے کے اکثر خاندان مختلف وجوہات کی بنا پر ٹھٹہ سے حیدر آباد، سہون اور کراچی میں منتقل ہونا شروع ہو گئے. کراچی میں میمن خاندان کے لوگ ملیر کے ایک مخصوص علاقے میں منتقل ہوتے رہے جن میں ماکر پئی بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ ملیر منتقل ہو گئے. بعد میں میمنوں کے علاوہ اور بھی بہت سارے لوگ اس علاقے میں منتقل ہوئے. اس پورے علاقے میں ماکر پئی کے بیٹے مراد میمن نے اپنی سمجھداری اور بہادری کی وجہ سے آس پاس کے تمام علاقوں میں بہت زیادہ شہرت حاصل کی اور اسی مناسبت سے پورا علاقہ مراد میمن گوٹھ کے نام سے مشہور ہو گیا. یہ علاقہ کراچی شہر میں دیہی اور شہری زندگی کا مرکب ہے. پورے گڈاپ ٹاؤن کے لوگ جو دیہی کراچی سے تعلق رکھتے ہیں خریداری کرنے کے لئے میمن گوٹھ کا ہی رخ کرتے ہیں.

4. درسانو چھنو

پرانے زمانے میں ٹھٹھہ اور بمبھورا اہم شہر تصور کیے جاتے تھے اور یہاں سے بلوچستان کے شہروں میں جانے کے لیے تجارتی قافلوں کی سب سے اہم گزر گاہ درسانو چھنو سے ہی گزرتی تھی جو ایک قدیم آبادی ہے. حضرت یوسف شاہ جن کا مزار درسانو چھنو میں ہے ان کے مزار کے پاس درس قبیلے کے ایک فرد نے جھونپڑی جسے مقامی زبان میں چھنہ کہتے ہیں بنوائی. تھوڑے عرصے بعد یہ جھوپڑی یعنی چھنہ "درس جو چھنو" کے نام سے مشہور ہو گئی. جو کثرت استعمال سے "درسانو چھنو" ہو گیا اور سرکاری کاغذات میں بھی یہی نام درسانوں چھنو کے نام پر ریکارڈ ہو گیا.

5. سومار کنڈانی اور سومار اسماعیل

1765ء میں تھدو نالہ کے قریب ہریالی کو دیکھتے ہوئے منڈو خاصخیلی جونا گڑھ سے لسبیلہ اور پھر گڈاپ ہوتا ہوا اس علاقے میں رہائش پذیر ہوا. اور تھوڑے ہی عرصے میں اس علاقے میں خاصخیلیوں کی ایک بڑی تعداد رہائش پذیر ہو گئی. سومار اس علاقے کا بہت معزز شخص تھا جبکہ اس علاقے میں کنڈا کا بہت بڑا درخت تھا جو ابھی دس سال پہلے ختم ہوا ہے. سومار کی شخصیت کی وجہ سے یہ پورا علاقہ سومار کہلانے لگا. 1970ء میں جب اس علاقے میں روڈ پڑی تو یہ علاقہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا جس کی وجہ سے آپس میں لڑائی شروع ہو گئی اور یہ لوگ فیصلے کے لیے جام کے پاس پہنچے. جام نے دونوں علاقوں کا الگ الگ نام دے دیا لیکن کیونکہ سرکاری دستاویز میں اس علاقے کا نام سومار تھا

اس لئے روڈ کے ایک طرف والے علاقے میں مشہور درخت کنڈا تھا جس کی مناسبت سے یہ علاقہ سومار کنڈانی کے نام سے مشہور ہو گیا. اور روڈ کے دوسری طرف مشہور شخصیت اسماعیل تھے اس لیے اس علاقے کو انکے نام پر سومار اسماعیل گوٹھ کہا جانے لگا.

6. ملا عیسی گوٹھ

واجہ ملا عیسی انیسویں صدی عیسوی میں ملیر کے ولی صفت روحانی شخصیت تھے ان کے قلبی اور روحانی پہلو کے متعلق روایات مشہور ہیں. آپ ہی کے نام پر اس علاقے کو ملا عیسی گوٹھ کہا جاتا ہے جب کہ آپ کے پوتوں میں واجہ رحیم بخش، واجہ محمد بخش اور واجہ اکرم شامل ہیں.

7. آسو گوٹھ

آسو گوٹھ دراصل اس علاقے کے بہت مشہور حلوائی آسو مل کے نام پر ہے جو قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے ہندوستان کے شہر بمبئی چلا گیا تھا. بمبئی میں اس کا آج بھی مٹھائی کا بہت بڑا کاروبار ہے. جس جگہ آج بکرا پیڑی ہے وہاں کبھی آنسو مل کا خالص دودھ حاصل کرنے کے واسطے بہت بڑا بھینسوں کا باڑا تھا جو اس کے جانے کے بعد بکرا پیڑی میں تبدیل ہو گیا. نیشنل ہائی وے پر جہاں آج گوشت مارکیٹ ہے وہاں آسو مل کی مٹھائیوں کی بہت بڑی دوکان تھی جہاں سے مٹھائیاں شہر کی جانب بھجوائی جاتی تھیں.

8. کھوئی گوٹھ

بلوچستان سے ہجرت کر کے آنے والے زکری زیادہ تر ایک خاص جگہ پر رہائش پذیر ہوئے.. یہ لوگ کیوں کہ زیادہ تر پہاڑی علاقوں سے آئے تھے اور بلوچی زبان میں پہاڑ کو کوہ کہتے ہیں اور یہ کوہ بگڑ کر کھوئی گوٹھ ہو گیا. اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہاں مشہور شخصیت واجہ کھوئی تھے جن کے نام پر یہ کھوئی گوٹھ بنایا گیا ہے

9. ملیر کینٹ

ملیر میں دوسری جنگ عظیم کے دوران نیو ملیر کے نام سے ایک فوجی پڑاؤ ڈالا گیا تھا. 1941ء میں اس پڑاو کو چھاؤنی کی حیثیت دینے کے لیے کنٹونمنٹ ایکٹ کے تحت حکومت انڈیا نے نیو ملیر کے فوجی پڑاؤ کو مستقل چھاونی کی حیثیت دے دی. یوں 1941 میں ملیر کینٹ مستقل فوجی چھاؤنی بنا.

10. بھرو گوٹھ

اولڈ تھانہ آنے سے پہلے ایک گاؤں بھرو جو کھیو کے نام سے بھرو گوٹھ ہے. اسی طرح سے ملیر بھر میں بہت سارے گاؤں اور گوٹھ یا تو وہاں کے زمینداروں کے نام سے ہیں یا پھر خاص قبیلے کی اکثریت ہونے کی وجہ سے اس قبیلے کے نام سے بنائے گئے ہیں.

چلتے ہو تو ملیر کو چلیے

تحریر: شاہد حسین

کراچی کے تمام علاقوں میں سب سے بڑا ملیر ہے۔اس بات کا اندازہ یہاں سے لگایا جاسکتا ہے کہ کراچی کے تین داخلی دروازے (ٹول پلازہ) ملیر کی حدود میں واقع ہیں۔ ملیر اپنے اندر آدھے کراچی کو سمیٹے ہوئے ہے اس کا ایک سرا ضلع ٹھٹھہ دوسرا انوری آباد اور تیسرا حب بلوچستان سے ملا ہوا ہے۔اس مختصر سی تحریر میں پورے ملیر کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں ہے پر اسی ملیر کے ایک حصے جس میں ہم رہائش پذیر ہیں جسے ملیر کالونی کہتے ہیں کا احوال آپ کی نظر کرتا ہوں کہ آج سے چالیس سال پہلے کے ملیر اور آج کے ملیر میں کتنا فرق ہے۔ ملیر کالونی میں داخلے کے تین دروازے ہیں ملیر ہالٹ، ملیر کالا بورڈ اور ملیر پندرہ۔۔
آیئے آپ کو ملیر کالا بورڈ کے قدیم راستے کے ذریعے ملیر کالونی لیے چلتے ہیں۔اس سے ناجانے کتنے لوگوں کی جذباتی اور معاشی یادیں وابستہ ہیں۔

کالا بورڈ کے سیدھے ہاتھ پر ایرانی ہوٹل قائم تھا یہ ایرانی ہوٹل ملیر کالونی کے تینوں داخلی دروازوں پر قائم تھے۔ ملیر ہالٹ والے دروازے پر قائم ہوٹل کی جگہ بینک کھل گیا اور کالا بورڈ والے ہوٹل کو گرا کر تجارتی بلڈ نگ تیار کی جارہی ہے اسی طرح ملیر پندرہ والا ہوٹل شاید ابھی باقی ہے پر اس کی انتظامیہ تبدیل ہو چکی ہے۔پرانے کراچی کی یادگار یہ ایرانی ہوٹل ہوتے تھے جو اپنے جائے وقوع کی بنا پر ایک کے بعد ایک تجارتی بلڈ نگوں میں تبدیل ہورہے ہیں۔

الٹے ہاتھ پر قائم درخشاں سوسائٹی میں سن 71ء 72 میں چیدہ چیدہ بنگلے تھے سوسائٹی کے وسیع خالی حصے پر اوڈھ خانہ بدوشوں کی بستی آباد تھی۔ س زمانے میں آج کیطرح انسانوں کی گہما گہمی دیکھنے کو نہیں ملتی تھی۔ مجھے یاد ہے میری عمر تین چار سال ہوگی میں اپنی پھوپھی صاحبہ کے ساتھ بس کے انتظار میں کھڑا تھا مجھے سخت پیاس لگی ہوئی تھی میں نے ضد کرنا شروع کردی کہ میں پانی پیوں گا زیادہ ضد کرنے پر پھوپھی صاحبہ نے قریبی جھونپڑی کے قریب جاکر پانی مانگا جو انھوں نے قریبی رکھے مٹکے سے نکال کر دیا وہ پانی نا جانے کس خلوص اور محبت کے ساتھ دیا گیا تھا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ لمحہ میرے ذہن پر نقش ہوگیا۔

اسی دوران سن 72ء میں اپنی بیماری کی وجہ سے سول ہسپتال میں تقریباً دوماہ زیر علاج رہا وہاں نیم غنودگی میں یہ ہی مطالبہ ہوتا کہ مجھے اس جھونپڑی سے پانی لاکر پلاؤ جسکا اماں کے پاس کوئی جواب نہ ہوتا۔

آج درخشاں سوسائٹی کی وجہ شہرت لب سڑک بنگلوں میں قائم مختلف ہسپتال اور کلینکل لیبارٹریز ہیں۔ آج لوگ جسمانی صحت کے لیے یہاں آتے ہیں لیکن جب یہ ہسپتال اور کلینکل لیبارٹریز یہاں نہیں تھیں تو ایک ایسا شخص بھی تھا جو بلا معاوضہ لوگوں کا روحانی علاج کرتا

تھا۔ یہ بزرگ پچھلی گلی میں جھنڈے والے بابا کے نام سے لوگوں کا روحانی علاج کرنے کے لیے مشہور تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ان کے گھر پر موجود رہتا تھا۔ انکی رحلت کے بعد اس بنگلے کی رونقیں بھی ماند پڑ گئیں۔ آج ملیر کالا بورڈ کی وجہ شہرت ہسپتالوں، لیبارٹریز اور دوائیوں کی تھوک دوکانوں کی وجہ سے ہے جہاں سے ملیر اور اسکے اطراف میں رہنے والے لوگ مستفید ہوتے ہیں۔
یہیں وہ مشہور زمانہ مدینہ ٹیلی ویژن سنٹر کالا بورڈ ہے جسکا اشتہار ملیر کے تمام سنیماؤں کی زینت بنا تھا۔،،ادھر شکایت موصول ادھر مکینک روانہ مدینہ ٹیلی ویژن سنٹر کالا بورڈ ملیر،، کالا بورڈ سے اگلا اسٹاپ برف خانے کا ہے۔ آج سے پندرہ برس پہلے تک وہ برف خانہ موجود تھا لیکن اب وہ اجاڑ اور ویران پڑا ہے پر اسکے ساتھ اب ایک سرد خانہ قائم ہو چکا ہے جہاں میتوں کو جمع کرنے اور ان کو غسل دینے کا انتظام ہے۔
اسی سرد خانے سے منسلک ٹی بی ہسپتال اور کرسچن محلہ ہے جسے ہم بچپن سے دیکھتے چلے آرہے ہیں یہاں سینٹری ورکرز کی بڑی تعداد آباد ہے۔ اسی برف خانے کے سامنے یہاں کی قدیم امام بارگاہ ہے پہلے کے مقابلے میں ارد گرد نئی نئی سوسائٹیوں کے قائم ہونے سے سارا سال یہاں کی رونقیں بحال رہتی ہیں۔
یہ علاقہ پکوان ہاؤسز اور حال ہی میں قائم ہونے والے چند ریستورانوں کی وجہ سے مشہور ہے۔
یہیں پر قائم صاحب داد بلوچ گوٹھ کی زرعی زمین تھی جس پر سبزیاں کاشت کی جاتی تھیں اب اس وسیع زرعی زمین پر شادمان سوسائٹی قائم ہے۔ اسی سے ملحق مشہور زمانہ پاکستان پبلک اسکول کی عمارت اور قدیم ڈسپینسری قائم ہے۔
اس سے اگلا اسٹاپ لال مسجد کا کہلاتا ہے اس مسجد سے ملحقہ محلے میں گجراتی بولنے والی گھانچی کمیونٹی آباد ہے۔ ہمارے بچپن میں یہاں کی خواتین مختلف قسم کے پاپڑ اپنے گھروں میں تیار کر کے گھر گھر فروخت کرتی تھیں۔ مرد بھی چھوٹے موٹے کام کر کے زندگی کی گاڑی کھینچنے میں ان کی مدد کرتے تھے۔
غربت کے اس دور میں ان کا گزر بسر اسی پیشے پر تھا پھر وقت بدلا تو نوجوانوں نے کاروبار میں جو کہ اس قوم کا جدی پشتی پیشہ ہے ہاتھ ڈالا۔ دوسرا بڑا کاروبار ٹرانسپورٹ کا ہے۔ شادی بیاہ اور تفریح کے لیے یہیں سے کوسٹر اور مزدا کرائے پر ملتی ہیں۔ اس کمیونٹی کا شادی حال بھی ہے جو عرصہ چالیس سال سے اس بنیادی ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ یہاں سے شادی کے بندھن میں بندھنے والے ناجانے کتنے جوڑے امت محمدیہ میں اضافے کے مبارک عمل کا حصہ بنے ہوئے ہیں۔
اسی لال مسجد کی ایک دوکان میں ایک حلوہ پوری کی دوکان ہے جہاں صبح کے اوقات میں لائن میں لگ کر صبح کا ناشتہ ملتا ہے۔ اسی سے ملحقہ گلی میں بسم اللہ حلیم کے نام سے ایک قدیم دوکان ہے جو اپنے چاہنے والوں کو لذت کام و دہن کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔
اب تھوڑا آگے چلتے ہیں یہاں ایک گلی شیشہ گلی کے نام سے مشہور ہے جہاں مکانوں کی آرائش کے لیے شیشے کی بہت سی دوکانیں

ہیں۔ یہیں سے پورے ملیر اور اطراف کے علاقوں کی شیشے کی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس گلی کے ابتدائی حصے میں عرصہ پچاس سال سے سلائی مشین ٹھیک کرنے کی دوکانیں ہیں۔ اس گلی کی دوسری وجہ شہرت یہاں پر رہنے والے وہ لوگ ہیں جن کے آباؤاجداد رام پور انڈیا سے ہجرت کرکے آئے اس گلی کے لوگ اپنی بہادری کی وجہ سے مشہور ہیں انہوں نے اپنی بہادری کی بہت بڑی بڑی قیمت چکائی ہے۔ اسی گلی کے سامنے تیس چالیس سال پہلے ملیر کی مشہور مٹھائی کی دکان آزاد مٹھائی والے کے نام سے معروف تھی پھر نا جانے کیا ہوا کہ وہ دوکان بند ہوگئی۔ اسی آزاد مٹھائی والے کے قریب حکیم سید شریف حسن حسنی کا مطب ہوتا تھا جنکی مشہوری کے لیے پینٹرز حضرات نے ملیر کے درودیوار کو رنگا ہوا تھا۔ تھوڑا آگے جائیں تو مشہور زمانہ ملیر ٹنکی کا اسٹاپ آجاتا ہے۔ اس اسٹاپ کا نام ٹنکی پڑنے کی وجہ یہاں پر قائم وہ اور ہیڈ ٹینک ہے جس سے پورے ملیر کالونی کو پانی فراہم کیا جاتا تھا اب وہ ٹینک متروک ہو چکا ہے لہذا زمنی ٹینک کے ذریعے کچھ مختصر علاقوں کو پانی فراہم کیا جاتا ہے۔ اس ہائیڈرینٹ کی دیوار کے ساتھ بہت سے گل فروشوں کی دوکانیں ہیں۔ جہاں شادی کے بندھن میں بندھنے والے جوڑوں کے ماتھے کا سہرا، سہاگنوں کے لیے گجرا، کنواریوں کے لیے کنگن اور اپنے مہمانوں کی عزت افزائی کے لیے رنگارنگ پھولوں کے ہار تیار کیے جاتے ہیں۔ ہاں سفر آخرت کے لیے بھی پھولوں کی چادر اور قبر پر ڈالنے کے لئے پھول بھی یہیں سے دستیاب ہوتے ہیں۔

انہی ہار پھول والوں کے سامنے ہڈی جوڑنے کے ماہر پہلوان اپنے تخت پر مختلف تیل لیے براجمان ہوتے تھے بڑی دور دور سے لوگ ہائے ہائے کرتے آتے اور واپسی میں مسکراتے چہرے کے ساتھ بائے بائے کرتے ہوئے جاتے۔ اسی زمانے میں یہاں عرصہ دراز سے قائم کیفے صابرین لوگوں کی لذت کام ودہن کے لیے مشہور تھا یہاں کا قورمہ مجھے بہت پسند تھا پر پرانے بزرگوں کے رخصت ہونے کے بعد اس ہوٹل کی رونقیں ماند پڑ چکی ہیں۔ اسی ہوٹل سے ملحق مشہور مٹھائی کی دوکان الیاس سوئیٹس ہے ایک زمانے میں ان کے سوا کوئی قابل ذکر مٹھائی کی دوکان نہیں تھی پر چند سال سے حافظ سوئیٹس کے آنے سے یہاں کی رونقوں میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

اب یہ علاقہ الیکٹرونکس کے آلات خریدنے کا مرکز ہے۔ ابتداء میں دو الیکٹرونکس کی دوکانیں اقبال اینڈ کو اور رفیع الیکٹرونکس ہوتی تھیں بعد میں تو اس کام سے منسلک تاجروں کا گویا سیلاب آگیا۔ پورے ضلع ملیر اور ان سے ملحقہ علاقے اپنی الیکٹرونکس اور الیکٹرک کے سامان کی خریداری کے لیے یہاں تشریف لاتے ہیں۔ اسی سے ملحق جامعہ مارکیٹ ملیر ٹنکی ہے ایک زمانے میں یہ چھوٹی سی مارکیٹ تھی جہاں سے روزمرہ کے سودا سلف کے لیے قریبی علاقے ماڈل کالونی اور ملیر کینٹ کے لوگ تشریف لاتے تھے یہاں کی مشہور ماموں بھانجے کی یونانی دوائیوں کی دوکان کو کوئی نہیں بھول سکتا کو کوئی نہیں بھول سکتا پر اب بہت سے لوگ کمر کس کر اس شعبے میں آکر بیٹھ گئے ہیں۔

جب سے ہوش سنبھالا دو بزرگوں کو تلی ہوئی مچھلی بیچتے دیکھا جب جب یہاں سے گزر ہوتا مچھلی تلنے کی خوشبو دل کو بے قرار کردیتی پر جیب اجازت نہ دیتی تو فقط خوشبو سونگھنے پر ہی اکتفاء کرتے جسے خوشبو سونگھنا ہو آج بھی وہ دوکانیں قائم ودائم ہیں۔ انہی دوکانوں کے سامنے چنے بھوننے کا بھاڑ ہے جب جب وہاں سے گزر ہوتا چنے بھوننے کی خوشبو گویا پاؤں جکڑ لیتی مجال ہے کہ چنے لیے بنا آپ وہاں سے سرک جائیں۔

یہیں پر اجمیری لسی ہاؤس ہے چالیس سال سے یہ دوکان دیکھ رہا ہوں پہلے عادی لسی پینے والے یہاں آتے تھے اب ٹرینڈ بن گیا ہے لوگ خاندان کے ساتھ رات کو لسی پینے آتے ہیں۔

کسی زمانے میں مارکیٹ سے ملحقہ وسیع خالی زمین پر عیدالاضحی کے موقع پر مویشی منڈی لگتی تھی پھر نا جانے کیا ہوا کہ اس وسیع خالی زمین پر اچانک دوکانیں تعمیر ہونا شروع ہو گئیں اب یہ مارکیٹ ہول سیل مارکیٹ کے طور پر جانی جاتی ہے روزمرہ استعمال کی تمام اشیاء خریدنے کے لیے پورے ملیر سے دوکان دار حضرات یہاں کا رخ کرتے ہیں۔

اسی مارکیٹ کی کچھ ذیلی گلیاں ماڈل کالونی ریلوے اسٹیشن پر نکلتی ہیں جو اپنی حالت زار پر نوحہ کناں ہے۔

کبھی یہاں صبح ساڑھے سات بجے والی ٹرین پکڑنے کے لئے ماڈل کالونی، سعود آباد اور ملیر کالونی کے مختلف علاقوں سے جوق در جوق لوگ پیدل اسٹیشن کی طرف رواں دواں ہوتے تھے۔ گاڑی کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے تک پلیٹ فارم پر تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی تھی۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے تک اس ریلوے اسٹیشن کو کچرا کنڈی میں تبدیل کر دیا گیا تھا پر عوامی احتجاج کے نتیجے میں وہاں صفائی کرانا پڑی۔ پر اب بھی وہاں کے ٹوٹے پھوٹے پلیٹ فارم بزبان حال اداروں کی بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔

ہائے افسوس! اس پلیٹ فارم کی رونقیں شاید اب ہم کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔

ملیر ٹنکی سے کچھ آگے بڑھیں تو آرسی ڈی گراؤنڈ آجاتا ہے۔

پہلے اس اسٹاپ کو لیٹر بکس کہا جاتا تھا کہ گراؤنڈ کے ایک کونے میں لیٹر بکس نصب تھا وہ لیٹر بکس امتداد زمانہ کے ہاتھوں تباہ ہو گیا نہ وہ چٹھیاں لکھنے والے ہاتھ رہے نہ دھڑکتے دلوں کے ساتھ انہیں چاک کرنے والے۔۔۔۔۔

س چوراہے پر ایک کونے پر حسینی سفارت خانہ امام بارگاہ دوسرے کونے پر آرسی ڈی گراؤنڈ ایک طرف مشہور و معروف حافظ سوئیٹس۔۔۔۔

اس مختصر سے ٹکڑے پر عمارتی رنگ و روغن کی مشہور دوکان مدینہ پینٹ ہاؤس، عسکری پینٹ ہاؤس اور دیگر رنگ و روغن کی دکانیں ہیں۔ ملیر کالونی میں رہنے والے رنگ و روغن کی خریداری یہیں سے کرتے ہیں۔ اسی طرح چھتوں پر پانی ذخیرہ کرنے کی ٹنکیاں اور ہر قسم کے ڈنکی پمپ اور موٹروں کی خریداری کے لیے لوگ یہیں سے رجوع کرتے ہیں۔

اس چوک کی خاص بات مشہور زمانہ حافظ سوئیٹس ہے انکی قدیم دوکان مسلم آباد ملیر سٹی پر واقع ہے اس دوکان کے یہاں آنے سے علاقے کی رونق میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

اللہ پاک نے جو پزیرائی انکے کاروبار کو عطا فرمائی ہے کسی کسی کے نصیب میں آتی ہے۔

دعوت و تبلیغ سے سے جڑے ڈاڑھی ٹوپی سے مزین سارا عملہ دین دار افراد پر مشتمل ہے جب جائیں تازہ مٹھائی آپکی منتظر ہے۔ اس

چھوٹی سی جگہ پر پاکستان کی علاقائی سوغاتیں اپنے اصل ذائقوں کے ساتھ جمع کر دی گئی ہیں۔
اس کے سامنے ملیر کی مرکزی امام بارگاہ حیدری مشن واقع ہے۔ موجودہ دنوں میں اسکی چہل پہل اور رونقوں میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ کھوکھراپار سے نکلنے والے ماتمی جلوسوں کا یہیں پر اختتام ہوتا ہے۔ اس امام بارگاہ کے سامنے مشہور زمانہ آر سی ڈی گراؤنڈ واقع ہے۔ ملیر والوں کی سیاسی اور مذہبی تقریبات کا یہی گہوارہ ہے۔ ایک ہی وقت میں یہاں فٹبال بھی کھیلی جاتی ہے۔ کبھی سیاسی نعروں کی فلک شگاف گونج تو کبھی مترنم آواز میں نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی صدائیں کانوں میں رس گھول رہی ہوتی ہیں۔ کچھ نہ ہو تو نئے ڈرائیونگ سیکھنے والے مردوزن سے یہ گراؤنڈ آباد رہتا ہے۔ ہمیں بھی صاحب زادے نے کار چلانے کی تربیت یہیں دی تھی۔ چھٹی والے دن چھوٹے بچوں کی دسیوں ٹیمیں کرکٹ کھیلنے میں مشغول ہوتی ہیں۔ اس گراؤنڈ کے سامنے کا راستہ ماڈل کالونی کی طرف جاتا ہے۔
اسی گراؤنڈ سے منسلک مشہور ڈینٹسٹ ڈاکٹر نثار احمد برنی کا قدیم کلینک ہے عرصہ پچاس سال سے یہ کلینک آباد ہے۔ اسی گراؤنڈ سے منسلک سوشل سکیورٹی ہسپتال ہے لاعلمی کی بنا پر بہت کم لوگوں کو یہاں سے استفادہ کرتے دیکھا۔ اسکے ساتھ ہی ملیر کی قدیم مسجدوں میں سے ایک طیبہ مسجد ہے ویسے تو اسکی رونقیں سارا سال ہی جاری رہتی ہیں پر جب پہلی دفعہ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے مولانا حامد رضا خان بریلوی تشریف لائے تو یہاں کی رونق دیکھنے لائق تھی۔ جمعہ کی نماز میں دور دور سے لوگوں کی ایک کثیر تعداد یہاں آتی ہے مسجد کے باہر پھل اور سبزی والوں کا وہ ہجوم ہوتا ہے کہ مت پوچھیں ان کی اکثریت یہاں سے اپنے ٹھیلے خالی کر کے جاتی ہے۔ اسی مسجد کے سامنے ہمارے ہم مکتب رفیق کا گھر تھا جو آج اسٹوڈنٹس بیکری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ پہلے یہی چھوٹی سی بیکری دوسرے کونے پر تھی اس جگہ پر منتقل ہونے کے بعد عوام کی جو پذیرائی ملی وہ قابل تحسین ہے۔
اسی بیکری کے سامنے سعود آباد ڈسپنسری قائم ہے بچپن میں اماں کے ساتھ بارہا یہاں جانے کا اتفاق ہوا اس زمانے میں گھر سے لائی ہوئی بوتل میں لال دوائی بھر کر دیتے تھے جو گولیوں کے ساتھ تین بار پینی ہوتی تھی ہمیں اس کا ذائقہ اتنا پسند تھا کہ جی کرتا تھا کہ یکمشت ہی پی جائیں کیونکہ اس کے پینے کے بعد ایک ڈکار آتی تھی جو بڑی فرحت بخش ہوتی تھی پر اماں تھوڑی سی پینے کے بعد ہاتھ سے چھین لیتی تھیں۔ آج اسکی حدود میں نادرا آفس بھی قائم ہے جہاں شناختی کارڈ بنوانے کے لئے صبح چھ بجے سے لائن لگانی پڑتی ہے۔
اسی دفتر کے ساتھ شمع ملت اسکول تھا جہاں سے ہم نے 76,77ء میں چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی اس اسکول سے وابستہ یادوں کا ایک خزانہ ہے جو کسی اور موقع پر گوش گزار کروں گا۔
قدیم زمانے سے یہ اسٹاپ پولیس چوکی کے نام سے معروف ہے۔ یہاں کی خاص بات نبو کے مشہور بن کباب ہیں۔ آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی اسکے ذائقے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ضلع کاؤنسل مارکیٹ پرانے وقتوں کی یاد دلاتی ہے۔ فاروقی مسجد جو جماعت اسلامی کی مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اس سے آگے بڑھیں تو ملیر کی ماربل اور ٹائیل کی دوکانیں آجاتی ہیں جہاں سے قسم

ہا قسم کے ماربل اور ٹائل خریدنے کے لیے ملیر، ماڈل کالونی سے لوگ یہاں کا رخ کرتے ہیں۔
انہی ٹائل ماربل کی دو کانوں کے سامنے سعود آباد کا قدیم مراد میمن گرلز اسکول واقع ہے۔ یہاں سے پڑھ کر نکلنے والی بچیاں آج ناجانے زندگی کے کن کن شعبوں میں خدمات انجام دے رہی ہونگی اور ناجانے کتنی نانیاں دادیاں بن کر پوتا پوتی، نواسا نواسیوں کو گودوں میں کھلا رہی ہوں گی۔ اسی اسکول کے برابر میں ایک ہیلتھ کلب ہوتا تھا جو اب فرنیچر کی دوکان میں تبدیل ہو چکا ہے۔
لیجیے دوستو ہم سعود آباد چورنگی پہنچ گئے۔
دوستو آج اس چورنگی کی خوبصورتی اور گہما گہمی دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ اہل ملیر نے یہاں سے گزرتے ہوئے کتنا خون جگر جلایا ہے گٹر اور بارش کے پانی کے ساتھ مل کر یہ چورنگی ایک سیاہ پانی کی جھیل کا منظر پیش کرتی تھی۔ ہر شخص اللہ سے عافیت مانگتا ہوا اس جھیل سے گزرتا تھا کہ کسی بھی وقت پانی کے نیچے پوشیدہ گڑھا آنے کی صورت میں جھیل برد ہو سکتا تھا جہاں گندے پانی میں بھیگ کر شرمندگی اور بے بسی کی تصویر بننا لازمی تھا۔ جو موٹر سائیکل سوار یہاں سے گزرتا اسکی ٹانگیں موٹر سائیکل کے ہینڈل پر رکھی ہوتیں ساتھ بیوی بچے ہوں تو کیسا مضحکہ خیز منظر ہوتا ہوگا سارا خاندان اس جھیل سے صحیح سلامت گزرنے پر خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔ کم و بیش دس سال مصیبت کاٹنے کے بعد اللہ پاک نے بہترین سڑکوں کا تحفہ دیا ہے۔
اس چورنگی کے الٹے ہاتھ کی سڑک کھوکھراپار ندی کنارہ جاتی ہے آج یہ سڑک ملیر کالونی کی وی آئی پی سڑکوں میں شمار کی جاتی ہے۔
تمام کمرشل بینکوں کی شاخیں اور ملیر کالونی کے تینوں پیٹرول پمپ یہیں واقع ہیں۔ یہ سڑک پرانی موٹر سائیکلوں کی بہت سی دوکانوں کے لیے بھی معروف ہے۔ پورے ملیر سے پرانی موٹر سائیکلوں کی خرید و فروخت کے لیے لوگ یہاں کا رخ کرتے ہیں۔
پھر اس سڑک کا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ اس کے ایک کنارے ہم بھی رہتے ہیں۔
یہیں پر ملیر کالونی کے قدیم وجدید شادی ہال بھی واقع ہیں۔ بے شمار شادیوں پر دولہا کو مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ کار سے اترتے دیکھا اور واپسی پر دلہن کے ہمراہ انتہائی سنجیدہ چہرے کے ساتھ کار میں رخصت ہوتے دیکھا پھر مسکراتے کم ہی دیکھا۔
یہی پر ایک مشہور اور اپنے عروج کے زمانے میں انمول پیلس شادی ہال کو حبیب مسجد میں تبدیل ہوتے دیکھا
اللہ پاک حبیب جیولر کی بخشش و مغفرت فرمائے اپنے اللہ سے بڑا اچھا سودا کر گئے۔
عرصہ دراز سے یہ چوک کھوکھراپار اور سعود آباد کے رہنے والوں کے لئے معاشی اور سماجی مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ساری ضرورتیں اسی چوک سے پوری ہوتی تھیں آج بھی اس چوک کی رونق دن کے مقابلے رات میں اپنے عروج پر ہوتی ہے۔
یہ ملیر کی فوڈ سٹریٹ ہے جہاں مشہور زمانہ ربن دادا کی نہاری، گڈلک کے شامی کباب اور پان، کشمیری کی چائے اور مختلف ریسٹورنٹس کی قطار اپنے کھانوں میں بے مثال ہے۔ کسی زمانے میں ربن دادا کی نہاری کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ دو بھائی ملکر اسے چلاتے تھے۔ جب بھی یہاں سے نہاری کا پارسل لو وہ اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ چار پانچ افراد پر مشتمل خاندان پیٹ بھر کر کھانا کھالیتا تھا۔ پھر

ناجانے کیوں ربن دادا ہوٹل کا زوال شروع ہوگیا۔اس خلا کو پُر کرنے کا فریضہ اردو نگر پر ڈبل اسٹوری اسکول کے ساتھ عبدالغفار اور عبدالجبار نام کے دو بھائیوں نے سنبھال لیا۔ آج بھی ملیر کالونی کے پرانے رہائشی انہی تنگ وتاریک گلیوں سے گزرتے ہوئے یہاں کی نہاری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

جس جگہ ربن دادا کا پرانا ہوٹل تھا اس جگہ سے 15 نمبر بس براستہ لیاقت مارکیٹ جناح اسکوائر سے ملیر 15 پھر ناجانے کہاں جاتی تھی۔یہی بس لوگوں کی واحد سواری تھی۔ میں نے جب بھی سعود آباد چورنگی پر اس بس کو دیکھا اسٹارٹ حالت میں ہی دیکھا بس کی پچھلی جانب نصب انجن سے چھک چھک کی آواز بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔

یہیں سے ملیر 15 کے لیے تانگے چلتے تھے یعنی سعود آباد سے لیاقت مارکیٹ، جناح اسکوائر پھر ملیر 15 اپنے بچپن میں دادی اور اماں کے ساتھ بارہاتانگے پر بیٹھ کر لیاقت مارکیٹ جاتے تھے۔ اکثر تو سعود آباد سے پیدل ہی لیاقت مارکیٹ جانا ہوتا تھا۔اسی چوک پر سعودیہ گرلز کالج واقع ہے جہاں سے میری تمام بیٹیوں کے ساتھ ساتھ ناجانے کتنی بیٹیاں گریجویشن مکمل کر کے ملک و قوم کا نام بلند کررہی ہیں۔یہ سڑک اہلیان ملیر کو لکڑی کے دروازے اور کھڑکیاں بنانے کے کاریگر اور اس سے متعلقہ سامان کے لیے مخصوص ہے۔

یہیں میرے بچپن کے دوست اور ہم مکتب شکیل احمد کا شکیل پکوان ہاوس ہے یہاں کے پکے ہوئے کھانوں کا کوئی ثانی نہیں۔ میں نے وہ وقت بھی دیکھا جب تھوڑے سے چاول ابال کر اس کا پانی سڑک پر بکھیر دیا جاتا جس کی خوشبو کو سونگھ کر اور پانی سے بھری دیگوں میں چمچہ چلاتے ہوئے گزرنے والے یہ تاثر لیتے کہ کتنا چلتا ہوا پکوان ہاوس ہے۔انہیں کے سامنے روہیل کھنڈ انڈیا سے ہجرت کرکے آئے ڈاکٹر روہیلہ کا زبردست چلتا ہوا کلینک تھا دور دور سے علاج کے لئے لوگ یہاں کا رخ کرتے تھے۔

یہیں پر ایک قدیم نمک کی چکی ہے جو ملیر اور اس کے اطراف کے علاقوں کو عرصہ دراز سے نمک تقسیم کررہی ہے۔اسی چکی کے ساتھ چارپانچ دو کانیں بحری جہازوں سے نکلی موٹروں کی ہیں جو سفید پوشوں کا بھرم ہوئی ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ اولڈ از گولڈ تو یہی پرانی موٹریں گھروں میں لگنے کے بعد بیس پچیس سال آسانی سے کھینچ جاتی ہیں۔

یہاں سے آگے چلیں تو نشتر اسکوائر پر قائم نورانی مسجد ہے جسکا شمار ملیر کی قدیم مساجد میں ہوتا ہے۔اسی مسجد کی ایک چھوٹی سی دکان میں ایک پینٹر صدیقی آرٹس کے نام سے ہیں۔ دوسرے پینٹر عارف آرٹس کے نام سے شیشہ گلی میں ہوتے تھے۔ دونوں حضرات کا خط دہلوی تھا ایک زمانہ تھا کہ یہ دونوں حضرات ملیر میں راج کرتے تھے۔ کسی دکان کا شٹر انکے لکھے ہوئے حروف سے خالی نہ تھا اس زمانے میں ہر نئی کھلنے والی دکان کو دلکش رنگوں سے سجانے کا سہرا انہیں حضرات کے سر جاتا ہے۔ سچ پوچھیں تو مجھے صدیقی صاحب کا خط پسند تھا ایسا لگتا تھا گویا سائن بورڈ پر موتی پرو دیئے گئے ہوں۔ایسی ندرت اور اپنے فن میں کمال کسی کسی کو حاصل ہوتا ہے۔

عارف صاحب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں دونوں کی اولادوں نے اپنے آباء کے فن کو سنبھالا دینے کی حتی المقدور کوشش کی پر بھلا ہو جدید پینا فلیکس کا کہ اس کے آگے ایک نہ چلی۔ عارف صاحب کی اولاد زمانے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی طرف مائل تھی سو

انھوں نے پینافلیکس کی لائن اختیار کرلی صدیقی صاحب کے فرزند جیسے تیسے اس فن کو سنبھالے ہوئے ہیں پر انکی کوشش بھی شب آخر کے بجھتے ہوئے چراغ کی سی ہے نا جانے کب تھر تھراتی لو گل ہو جائے۔

لیجیے جناب ہم لیاقت مارکیٹ کے قریب پہنچ گئے۔ لیکن پہلے ذکر ہو جائے شیشہ گلی کے اس سرے پر واقع این قدیر دندان ساز کا۔ حالات کی آندھی جیسی بھی چلی آندھی کے جھکڑ چلے یا بادِ صبا کے جھونکے اپنی دکان لیے یہیں جمے رہے۔ آج ملیر کے اچھے دندان سازوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہی حال رام پور والوں کی دکان پینٹالو کا ہے تیز آندھیوں نے قدم اکھیڑنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی پر مجال ہے کہ پائے استقامت میں جنبش طاری ہو جاتی نرم گرم دنوں کو دیکھتے ہوئے جمے رہے جب جب لیاقت مارکیٹ کا نام آئے گا پینٹالو لازم و ملزوم ہو گا۔

سعود آباد کی جانب سے لیاقت مارکیٹ میں داخل ہوں تو سیدھے ہاتھ کی سڑک ملیر کالونی ڈاکخانے کی طرف مڑ جاتی ہے اور الٹے ہاتھ کی سڑک لیاقت مارکیٹ کے مین گیٹ کی طرف۔۔۔۔

مین گیٹ کے سامنے لیاقت سپر مارکیٹ ہے جس جگہ یہ مارکیٹ ہے اس جگہ ایک میدان تھا جسکے بیچ میں کے ڈی اے کا دفتر قائم تھا اسکے اطراف میں خواتین کے پسندیدہ کھانے پینے کے ٹھیلے ہوتے تھے۔ جہاں پر چھولے، دہی بڑے، فالودہ، نان ٹکی اور پکوڑے سموسے کے ٹھیلے اپنے ذائقے اور خوشبو کی وجہ سے اپنے اندر ایک کشش رکھتے تھے۔ مارکیٹ کی تھکا دینے والی مشقت سے گھبرائی خواتین کا آخری ٹھکانہ یہی ٹھیلے تھے جہاں جسم و جاں اور زبان کی تسکین کا وافر سامان موجود تھا۔ ٹھیلوں کے ساتھ کرسیاں اور بینچیں پڑی ہوتیں سائے کے لیے دو ڈنڈوں کے ساتھ بڑی سی چادر بندھی ہوتی جہاں بیٹھ کر خواتین ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتیں۔

پھر ایک دن کے ڈی اے آفس کو مسمار کر کے اس چورنگی پر ڈھیروں دکانیں تیار کر دی گئیں جو آج لیاقت سپر مارکیٹ کے نام سے معروف ہے۔ چورنگی کو تو چھوڑیں اس سے ملحقہ فٹ پاتھ پر بھی آج دکانیں لاکھوں روپے کی ہیں۔

پہلے وقتوں میں آپ سکون اور اطمینان سے یہاں پر خریداری کر لیتے تھے پر آج مرد و زن کا وہ اژدہام ہے کہ اللہ کی پناہ۔۔۔۔

یہاں کی قدیم دکانوں میں مسلم بک ڈپو بھی تھا جو اب مسلم جنرل اسٹور میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اب سے چالیس سال پہلے ان کے نام کا ڈنکا سارے ملیر میں بجتا تھا اسکول کی کتابوں سے لے کر اخبارات اور رسائل اچھے خاصے رعایتی نرخوں پر ملتے تھے تمام ڈائیجسٹ اور رسائل سب سے پہلے یہاں پہنچتے جہاں قارئین بے چینی سے انتظار کر رہے ہوتے۔

اپنے بچپن اور نوجوانی میں بارہا یہاں سے خریداری کی ہے۔ اسی گلی میں مہتاب جنرل اسٹور جو اب مہتاب کاسمیٹکس میں تبدیل ہو کر زنانہ لوازمات تقسیم کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہاں کی قدیم دکانوں میں ایک نکٹے حکیم بھی تھے۔ تھی تو یہ پنساری کی دکان پر غربت کے زمانے میں نا جانے کتنی جڑی بوٹیاں یہاں سے خرید کر خواتین گھروں میں ہی علاج کر لیتی تھیں۔

قدیم اقبال آئل ڈپو کا مشینی کولہو اور ڈپو کے سامنے ہاتھ کا کولہو پہلی دفعہ ہم نے یہیں دیکھا جہاں مختلف بوتلوں میں رنگارنگ تیل کی شیشیاں دھری ہوتیں۔

اقبال آئل ڈپو کے سامنے چھوٹی سی مٹھائی کی دوکان ہے جب بھی اماں مارکیٹ جاتیں ہم پیچھے لگ جاتے وہ کہتیں مارکیٹ میں تو تمہیں اپنے ساتھ رکھ کر گھسیٹنا پڑتا ہے ہر دوکان کے سامنے رک کر وہ چیز لینے کا مطالبہ کرتے ہو تم گھر پر رہو میں تمہارے لیے مارکیٹ سے چیز لاؤں گی یوں واپسی میں اماں اس مٹھائی کی دوکان سے ہمارے پسندیدہ نمک پارے اور چاول سے بنے لڈو لاتیں جسے ہم شوق سے کھاتے۔ بہت سال پہلے بی بی سی سے سنا کہ ایک ہی نام سے مشہور ایشیا کی سب سے بڑی لیاقت مارکیٹ ہے۔ آپ جو چاہیں۔ یہاں سب کچھ ملتا ہے۔

اسی مارکیٹ سے ملحقہ ملیر کا قدیم کیسینو سنیما ہے کسی زمانے میں یہاں کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں معیاری فلمیں دیکھنے لوگ دور دراز سے یہاں آتے پھر تھرڈ کلاس فلموں کے لیے یہ سنیما مخصوص ہو گیا یوں لوگوں نے یہاں کا رخ کرنا چھوڑ دیا اب یہ سنیما اپنے آنے والوں کی راہ تک رہا ہے پر اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا۔

شاید اب یہ بھوتوں کا مسکن ہے۔ اسی کیسینو سنیما کے باہر والے فرش پر پورے ملیر اور اطراف کے علاقوں میں تقسیم ہونے کے لیے صبح تین بجے اخبارات اور رسائل پہنچتے تھے۔ صبح پانچ بجے ہاکروں کا ہجوم ایجنسی سے اخبار وصول کرکے خبروں اور ضمیمے کے صفحات یکجا کرتا اور علی الصبح علاقوں میں نکل جاتے۔

لیکن بار بار کی بدامنی کی وجہ سے یہ جگہ اب کالا بورڈ پر ہسپتالوں کے چبوترے پر منتقل ہو گئی۔ لیاقت مارکیٹ کا ایک حصہ تانگہ اسٹینڈ کے نام سے مشہور ہے پرانے زمانے میں یہاں سے تانگے ملیر پندرہ تک جاتے تھے یہیں پر سعود آباد سے آنے والے تانگے جمع ہوتے۔ یہاں گھوڑوں کو پانی پلانے کی سبیل تھی جہاں تھکے ہارے گھوڑے اپنی پیاس بجھاتے۔ یہ جگہ آج بھی تانگہ اسٹینڈ کے نام سے مشہور ہے۔

اسی تانگہ اسٹینڈ کی اندرونی گلیوں میں اتوار کے روز پرندوں کی مارکیٹ لگتی جہاں خرید و فروخت کرنے والے رنگارنگ پرندوں اور کبوتروں کے ساتھ آتے۔ دیکھا دیکھی کباڑیوں نے بھی پورے ہفتے کباڑ میں جمع کی ہوئی چیزیں یہاں لاکر فروخت کرنا شروع کر دیں آخر وقتوں میں انسانوں کے ساتھ ساتھ گاڑیوں کا گزرنا بھی محال ہو گیا تو انتظامیہ نے اسے ملیر ہالٹ کے پھاٹک پر منتقل کر دیا رفتہ رفتہ سختی کرتے یہ قدیم بازار بھی ختم ہو گیا یوں وہ غریب لوگ جو یہاں کے کباڑی بازار سے قیمتی چیزیں کوڑیوں کے مول خرید لیتے تھے ہمیشہ کے لیے ان چیزوں سے محروم ہو گئے۔ یہی راستہ آگے جا کر جناح اسکوائر پر جا ملتا ہے۔

جناح اسکوائر سے ذرا پہلے ایک ٹھیلا مولانا بٹ پائے کے نام سے مشہور تھا۔ جنکا اشتہار نفیس، شبانہ اور کیسینو سنیما پر چلتا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بارہا مولانا کے ٹھیلے سے بٹ اور پائے کھانے کا اتفاق ہوا اس جیسا ذائقہ آج تک میسر نہ آسکا۔ کیا نفاست سے صاف کیے ہوئے بٹ اور پائے تھے دور سے ہی اسکی خوشبو اپنی جانب مبذول کراتی تھی۔ مولانا اللہ میاں کے پاس کیا گئے اپنے بٹ پائے کا ٹھیلا بھی ساتھ لے گئے۔

یہ جناح اسکوائر ہے جو اپنی ہارڈ ویئر، سیمنٹ اور ٹین کی چادروں، ٹی آر گارڈر کی دوکانوں کے لیے مشہور ہے۔ یہیں پر ایک مشہور آڈیو کیسٹ کی دوکان تھی اپنے زمانے میں کاروبار میں سب سے آگے تھی۔ ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق گانوں، قوالیوں، اور نعتوں کی کیسٹوں کے لیے یہاں آتا تھا۔

پہلے بھی اور اب بھی یہ چوک اپنی رونقوں کی وجہ سے مشہور ہے اس چوک پر لگے لاتعداد ٹھیلے لذت کام و دہن کے لیے مشہور ہیں۔ یہاں کی مشہور دوکان معروف سوئیٹس ہے جہاں کی بہترین مٹھائیاں ہر ایک کی پسند ہیں۔ یہاں کی خاص بات نفیس سنیما ہے اہل ملیر کو یہ سنیما اسکی انتظامیہ نے یہ کہہ کر متعارف کرایا تھا کہ ہم نے اس زمانے کے حساب سے ایک اچھے سنیما کی تمام صفات یکجا کر دی ہیں اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ یہاں کے پر سکون ماحول میں بندہ فلم دیکھ کر لطف اندوز ہوتا تھا اپنی نوجوانی میں اس سنیما میں لگی کوئی انگلش فلم شاید ہی ہم چھوڑتے تھے۔ ہم دوستوں میں سے ایک تگڑا اور ہوشیار قسم کا دوست کھڑکی سے جڑے ہجوم میں گھس کر ٹکٹیں لے آتا ٹکٹیں لیتے ہوئے خود تو بھوت بن جاتا پر ہماری مشکل آسان کر دیتا۔ یہیں پر ہم نے شیخ مختار کی انڈین فلم نور جہاں دیکھی جسکا ٹکٹ ملنا خوش نصیبی کی علامت سمجھا جاتا۔ یہی حال شبانہ سنیما کا تھا جناح اسکوائر سے پیدل لوگ شبانہ سنیما پہنچ جاتے تھے۔ اس سنیما کا بھی ملیر کے بہترین سنیماؤں میں شمار ہوتا تھا۔ اب اسکا ائیر کنڈیشنڈ پلانٹ کیلیے پکانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

جب سے پاکستان میں معیاری فلمیں بنانے والے فلم ساز اس دنیا سے رخصت ہوئے پاکستانی فلم انڈسٹری کا بھی دھڑن تختہ ہو گیا لا محالہ اسکے اثرات سنیما پر ہی پڑنے تھے سو آج ان سنیماؤں کی جگہ بڑے بڑے شاپنگ پلازہ تیار ہو رہے ہیں۔

جناح اسکوائر سے الٹے ہاتھ کی جانب جائیں تو یہاں موجود حنفیہ مسجد اپنے آباد کرنے والوں کے لئے عرصہ دراز سے روح کی پاکیزگی کا سامان کر رہی ہے۔ مولانا سالک ربانی صاحب کے ایمان افروز بیانات نے ناجانے کتنے خدا فراموش دلوں کو رب کی طرف پھیرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

یہیں پر قائم ڈبل اسٹوری اسکول نے معاشرے کے ناجانے کتنے انمول ہیرے تراش خراش کر ملک و قوم کے حوالے کیئے۔ پہلے یہ اسکول سڑک سے نظر آتا تھا پر اسکے سامنے مونو ٹیکنیک انسٹیٹیوٹ قائم ہونے پر اب عمارت کے پیچھے چھپ گیا ہے۔

اسی انسٹیٹیوٹ کے سامنے ملیر کے مشہور و معروف جراح بنیاد علی برنی کی رہائش گاہ ہے۔

نو مولود بچوں کو سب سے زیادہ موصوف کا سامنا کرنا پڑتا تھا ملیر کے ہزاروں نو مولود بچے جو اب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ چکے ہیں ان کے نام اور کام سے خوب واقف ہیں۔

جناح اسکوائر سے سیدھے ہاتھ پر جائیں تو لیاقت اسکوائر تک آٹو پارٹس کی دوکانیں ہیں جس میں سب سے مشہور عارف آٹوز ہے۔ اسی کے ساتھ گولڈن بریانی جو اپنے ذائقے کے لیے پورے ملیر میں مشہور ہے۔ لیاقت اسکوائر کے ساتھ ملیر کا انڈسٹریل ایریا ہے جو

گارمنٹس فیکٹریوں سے آباد ہے اسکے سامنے ملیر کی قدیم جعفر طیار سوسائٹی ہے جہاں اہل تشیع کی ایک کثیر تعداد آباد ہے۔
یہ سوسائٹی علم وادب سے تعلق رکھنے والے اہل علم کی وجہ سے جانی پہچانی جاتی ہے۔
یہاں سے تھوڑا آگے بڑھیں تو مشہور زمانہ شیش محل کا مشہور اسٹاپ آجاتا ہے جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے لگے دائیوں کے بورڈ یاد دلاتے ہیں کہ گاؤں کی سیدھی سادی لیکن اپنے کام میں ماہر دائیاں تھوڑے پیسے لے کر بہت بڑا کام کر دیتی تھیں۔اس سے کچھ فاصلے پر قدیمی باؤٹ گوٹھ اور داؤد گوٹھ ہیں جو آج شہری آبادی میں ضم ہو چکے ہیں۔اس سے تھوڑے فاصلے پر قدیم جانوروں کا ہسپتال ہے نوجوان نسل کو شاید ہی اس ہسپتال کا پتہ ہو۔یہاں سے تھوڑا آگے بابو بینڈ آگرہ اور اسی کاروبار سے جڑی ایک آدھ دوکان اپنی کسمپرسی اور زبوں حالی پر نوحہ کناں ہے۔
لیجیے دوستو ملیر پندرہ آگیا جہاں پی ون منی بس کے لیے کتنی ہی دیر انتظار میں کھڑے رہتے تھے اب تو جب اندرون ملک سے واپسی پر لانڈھی اسٹیشن پر اتر کر گھر جاتے ہوئے چشم تصور سے اپنے آپ کو ملیر پندرہ پر بسوں کا انتظار کرتے دیکھتے ہیں۔

امتحانات کے زمانے میں لوڈشیڈنگ کے اوقات میں جعفر طیار لائبریری میں طلباء امتحانات کی تیاری کرتے ہوئے۔

انگریزوں کے کراچی کا پوش علاقہ "سولجر بازار"

تحریر: نثار نندوانی

کراچی میں مزار قائداعظم محمد علی جناح کے چوراہے نمائش پر آپ کھڑے ہیں اور میری ویدر ٹاور کی طرف سے آئے ہیں اگر سیدھے چلے جائیں تو گرو مندر آئے گا مگر اسی چوراہے سے دائیں طرف شاہراہ قائدین پر پہنچ جائیں گے، بائیں جانب بریٹو روڈ ہے اسی روڈ پر محفل شاہ خراسان اور نشتر پارک موجود ہیں، آگے جائیں تو سولجر بازار کا چوراہا ہے جو ایک گرو مندر اور دوسری طرف سید ھاڈولی کھاتہ پہنچ جائیں گے درمیان ہولی فیملی ہسپتال اور سامنے پارسیوں کی ابادی رہائش پذیر ہے۔

آج ہم بات کریں گے ڈولی کھاتا عرف عام سولجر بازار، یہاں انگریزوں کے دور میں ایک چھوٹی سی چھاؤنی بنائی گئی تھی جسے ڈولی کھاتا کہا جاتا تھا مگر اس نام کی ایک اور بھی وجہ تھی وہ تھی کہ یہاں سے "وکٹوریہ" "بگھی" چار جسے گھوڑے کھینچتے تھے ان کا ٹھکانہ تھا، انگریز، پارسی، کرسچین لوگ یہیں سے بگھی میں بیٹھ کر کراچی کی سیر و تفریح کرتے تھے۔

یہاں 1922 میں انگریزوں نے ایک دو منزلہ مارکیٹ تعمیر کی تاکہ فوجی یہاں سے خرید و فروخت کر سکیں اس وجہ سے اس کا نام سولجر بازار پڑ گیا، یہ بازار گھوڑا بگھی کیلئے بہت مشہور تھی، انگریزوں نے اسی مارکٹ کے باہر ایک حوض اور شیڈ بنایا تھا جہاں گھوڑے پانی پیتے تھے اور شیڈ کی چھاؤں میں آرام کرتے تھے۔

انگریزوں کے دور میں یہ کراچی کا پوش ایریا تھا۔ سندھ کے قوم پرست رہنما سائیں جی ایم سید کی رہائش گاہ حیدر منزل بھی اسی علاقے میں تھی جواب نہیں رہی۔ محترمہ بینظیر بھٹو کی جائے پیدائش بھی اسی ڈولی کھاتے کی ہے۔

سولجر بازار میں واقع "پنچ مکھی "ہنومان مندر بھی ہے۔ جس کے بارے میں ہندو برادری کے ماننے والوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اس مقام پر ایک سادھو کی عبادت کے سبب پنچ مکھی ہنومان زمین کی ساتویں تہہ سے سفر کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے اور انہوں نے سادھوؤں کو بشارت دی کہ وہ 7 مٹھی مٹی موجودہ قدیم مندر کی جگہ سے نکال لیں۔ جس پر سادھو نے جیسے ہی مٹی نکالی، پنچ مکھی ہنومان کی مورتی زمین سے باہر آ گئی۔ جو کہ آج بھی موجود ہے اور پوری دنیا سے لوگ یہاں آتے ہیں۔

اسی علاقے میں وہ تاریخی پارک ہے جسے "نشتر پارک" کے نام سے جانا جاتا ہے جس نے پاکستان کے قیام سے پہلے کی کئی کہانیاں اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔

گلستانِ شفیع اوکاڑوی (سولجر بازار) کراچی میں ایک قطعہ زمین پر جو گزشتہ سو برس سے مسجد کے لیے وقف تھا، مولانا حافظ محمد شفیع اوکاڑوی نے تعمیر مسجد کی بنیاد رکھی اور بلا معاوضہ خطابت شروع کی۔ ایک ٹرسٹ قائم کیا، جس کا نام گلزارِ حبیب ﷺ رکھا۔

مولانا حافظ محمد شفیع اوکاڑوی اس کے بانی و سربراہ تھے ان کی آخری آرام گاہ بھی وہیں ہے۔
کراچی کا پرانا ہسپتال ہولی فیملی کی موجودگی بھی اس کے پوش علاقہ ہونے ثبوت ہے۔ سولجر بازار کو کئی طرح سے اہمیت حاصل ہے کہ عید میلاد نبی کے چھوٹے بڑے جلوس یہیں جمع ہوتے ہیں اور اسی جگہ سے آگے کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔
محرم الحرام کی مجالس محفل شاہ خراسان اور نشتر پارک میں منعقد ہوتی ہیں، نو، دس محرم کے مرکزی جلوس بھی اپنی منزل کیلئے یہیں سے سے آگے قدم بڑھاتے ہیں۔

کٹی پہاڑی کی کہانی....

کراچی صرف بلند عمارتوں کا شہر ہی نہیں۔ یہاں کم اونچائی کے پہاڑی سلسلے بھی واقع ہیں۔ یہ ٹیلے نما خشک پہاڑ ضلع غربی کی حدود میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہی میں سے ایک منگھو پیر کا پہاڑی سلسلہ بھی ہے۔
اگرچہ ان پہاڑی سلسلوں کو متعدد مقامات پر کاٹا گیا ہے۔ 2009 میں قصبہ کالونی کے پاس منگھو پیر کے پہاڑی سلسلے کو بھی کاٹا گیا۔ جس کا مقصد اورنگی ٹاؤن اور نارتھ ناظم آباد ٹاؤن میں آمد و رفت کا دورانیہ کم کرنا تھا۔ تاہم پہاڑ کا کاٹا جانا ایک عمل نہیں بلکہ علاقے کی مستقل شناخت بن گیا۔ لہٰذا سڑک کاٹنے والے ہوشیار رہیں کہیں کل کسی سڑک کا نام کٹی سڑک نہ پڑ جائے۔
منقول

کراچی کی ناگن چورنگی....

کراچی کے ضلع وسطی میں ناگن چورنگی کے نام سے مشہور چوراہا نارتھ کراچی سیکٹر الیون سی، الیون ای اور سیکٹر ففٹین کے سنگم پر واقع ہے۔ جہاں اب دو بڑے پل ایک دوسرے کو کراس کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے یہ چوراہا سگنل فری ہو گیا ہے۔
اس چورنگی کو ناگن کیوں کہتے ہیں؟ نام سن کر تو لگتا ہے کہ کسی زمانے میں یہ علاقہ سانپوں کی آماجگاہ رہا ہوگا یا پھر یہاں سپیرے بستے ہوں گے، لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔
دراصل اس چوک پر تین سڑکیں سانپ کی طرح بل کھاتی آملتی ہیں۔ سانپ سے مشابہ ہیئت کی وجہ سے لوگ اسے ناگن چورنگی کہنے لگے۔

رنچھوڑ لین یا گزدر
(یہاں ہر وقت آوازیں گونجتی رہتی ہیں)

تحریر: اقبال اے رحمٰن

کراچی کا قدیم علاقہ، رنچھوڑ لائن یار گزدر یہاں ہر وقت آوازیں گونجتی رہتی ہیں
رنچھوڑ لائن کا ذکر اس علاقے کے مرکز میں آباد سلاوٹ برادری کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس برادری سے وابستہ بابا میر محمد بلوچ اور ہاشم گزدر نے برادری کو ایک علیحدہ شناخت دی۔ یہ شناخت تقسیم ہند سے قبل بھی تھی اور اس کے بعد بھی رہی۔ انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد میں بھی ان کا بڑا کردار رہا ہے۔ 'گزدر آباد' کو عام طور پر 'رنچھوڑ لائن کے طور پر زیادہ جانا جاتا ہے۔ گزدر نام درحقیقت ایک خطاب تھا جو ہاشم گزدر کے والد کو راجھستان کے راجا نے شاہی محل کے مین گیٹ کے اوپر بادل والاس تعمیر کرنے پر دیا تھا۔ ہاشم گزدر 1941 اور 1942 میں کراچی کے میئر تھے، تحریک آزادی کے ایک فعال رکن اور قائداعظم کی گڈ بک میں شامل تھے۔ تقسیم سے پہلے وہ سندھ کے وزیر رہے اور بعد میں پاکستان کی مرکزی قانون ساز اسمبلی کے رکن بن گئے "۔ محمد ہاشم گزدر ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ رہنما تھے۔ پاکستان کی قانون ساز مجلس میں سندھ کی نمائندگی کی، ان ہی کے نام پر 1951 میں رنچھوڑ لائن کے نام کو تبدیل کر کے گزدر آباد کر دیا گیا تھا۔ نام کی تبدیلی کا اندازہ بس سرکاری ریکارڈ سے ہوتا ہے یا رنچھوڑ لائن میں واقع چند نجی عمارت کی پیشانی پر درج عمارت کے نام کے ساتھ گزدر آباد لکھا ہونے سے۔ آج بھی یہ علاقہ رنچھوڑ لائن ہی کے نام سے معروف ہے۔ یہ کراچی شہر کے غریب علاقوں میں سے ایک ہے، جہاں ہر جگہ تجاوزات کی بھرمار ہے، مگر ان گلیوں کے وسط میں قدیمی مسلمان مارواڑی آباد ہیں۔ یہ بہت گنجان اور پر رونق علاقہ ہے، ان کی ایسوسی ایشن سلاوٹہ جماعت کے نام سے ہے، سلاوٹ کے معنی پتھر کے کام کے ہوتے ہیں۔ جو برصغیر کی تقسیم سے قبل راجھستان کے شہر جیسلمیر سے کراچی اور حیدرآباد منتقل ہو گئے تھے۔ اس علاقے کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ یہ علاقہ رنچھوڑ نام کی کسی ہندو شخص کے نام سے انگریزوں کے ابتدائی دور میں آباد ہوا تھا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گنجان علاقہ آباد ہو گیا۔ تقسیم سے قبل یہاں ہندوؤں کی اکثریت بھی آباد تھی۔ انیسویں صدی میں برٹش راج کے دنوں میں جب شہر میں تعمیرات کا کام بڑھا تو راجھستان کے ضلع جیسلمیر سے آئے پہلے سے آباد رنچھوڑ لائن کی مارواڑی برادری کے گویا بھاگ کھل گئے۔ جیسلمیر سے ہر سطح کے ماہر تعمیرات کراچی آنا شروع ہوئے اور اس علاقے کو اپنا مسکن بنایا۔ مارواڑی برادری آپس میں جڑ کر رہنے والی ہے، رنچھوڑ لائن (گزدر آباد) کی آبادی ایک اندازے کے مطابق بیس ہزار کے لگ بھگ ہے اور وہ اپنے آباؤاجداد کی جانب سے بسائے گئے علاقے سے منتقل ہونے کے لیے تیار نہیں۔ یہاں کی مرکزی شاہراہ متعدد گلیوں سے منسلک ہے جن

کے پرانے نام ابھی تک برقرار ہیں جیسے پیرو بدھا اسٹریٹ، کلیان جی اسٹریٹ۔ کراچی شہر کی تاریخ میں آبادی کا موازنہ کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس شہر کی اولین مسلمان آبادی یہی مارواڑی برادری تھی۔ اس علاقے میں کراچی میں پائی جانے والی قدیم ترین ایک مسجد آج بھی ہے جو جامع مسجد پیچ والی "وچلی" کے نام سے معروف ہے یہ تقریباً دو سو برس قدیم ہے۔ مجموعی طور پر اس علاقے میں پانچ مساجد ہیں جن کا سنگی کام یہاں کے رہائشیوں کے آباواجداد نے کیا تھا۔ جبکہ جامع مسجد بادامی 1875 سے موجود ہے۔ بنگی مسجد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک صدی پرانی ہے، جبکہ سب سے اہم عمر جامع مسجد پاکستان ہے جو 1940 میں قرارداد پاکستان کی یاد میں تعمیر کی گئی۔ رنچھوڑ لائن میں بھی ایک کلاک ٹاور قائم ہے، جس کو پونا بھائی کلاک ٹاور کہتے ہیں پونا بائی نامی ایک خاتون کے نام سے بنایا گیا تھا۔ یہ ٹاور بھی اپنی رونقوں بیٹھکوں چائے خانوں اور منفرد طرز زندگی کی بناء پر مشہور و معروف تھا، آج بھی اس کے اطراف کے علاقوں کا طرز زندگی وہی ہے لیکن اب ترجیہات بدل گئی ہیں نئی نسل کو اس بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں۔ بابا میر محمد بلوچ اس برادری کے معروف رہنما گزرے ہیں، میر صاحب بمبئی اسمبلی کے ممبر تھے، باٹا شوز کو برٹش انڈیا میں متعارف کروانے کا سہرا بھی ان ہی کے سر ہے۔ ان کی قد آور شخصیت کی بنا پر لیاری کا ایک اسکول اور ایک سڑک بھی ان کے نام سے موسوم ہے۔ اسی برادری کے ایک بزرگ عبدالطیف ڈینو سلطان صاحب سلاوٹو نے قرآن مجید کے عربی متن کو سندھی رسم الخط میں منتقل کر کے عربی سے نابلد سندھ کے لوگوں کے لئے قرآن مجید کی تلاوت کو آسان بنایا تھا، معروف فنکار لیاقت سولجر کا تعلق بھی اسی برادری سے ہے-تاج محل کی تعمیر مارواڑ (راجھستان) کے معماروں کا شاہکار ہے۔ تعمیرات ان کا پیشہ ہے۔ دور مغلیہ میں شہرہ آفاق تعمیرات کرنے والوں کی اولادیں کراچی کی تعمیرات میں پوری طرح شریک رہی ہیں۔ علاقے میں رہنے بسنے والے یہ مارواڑی منفرد زبان اور روایات کے حامل ہیں، یہاں کے نوجوانوں میں ایک ہی رنگ اور ڈیزائن کے کپڑے پروگرام کے تحت سلوا کر پہننے کا رواج ہے۔ شادی کی تقریب میں آمد بارات پر دولہا کا استقبال خواتین کی جانب سے تھالیاں بجا کر کرنے کی ایک منفرد روایت ہے۔ اس طرح کا خیر مقدم کبھی کبھار کسی خاص مہمان کی آمد پر بھی کیا جاتا ہے جیسے 1977 میں انتخابات کے موقع پر بھٹو صاحب کا جلوس رنچھوڑ لائن سے گزرا تو سیاسی وابستگی سے قطع نظر بلڈنگ کی بالکنیوں سے والہانہ انداز میں تھالیاں بجائی گئیں جو سلاوٹ برادری کی منفرد مہمان نوازی کا آئینہ دار تھا۔ ایک وہ وقت بھی تھا جب رنچھوڑ لائن کی نبی بخش روڈ سے متصل گلیوں میں ہر وقت کسی نہ کسی چیز بیچنے والے کی آوازیں گونجتی رہتی تھیں، صبح سویرے فقیروں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ کچھ لوگ سائیکل کے دونوں طرف کھجور کی بڑی ٹوکریاں باندھے بیکری بنے گلی میں چلے آتے تھے، ہر کوئی اپنی علیحدہ مخصوص صدا سے پہچانا جاتا تھا، صبح کے اوقات میں ڈبل روٹی، انڈے اور مکھن پر زور ہوتا تھا اور شام میں یہی لوگ گرما گرم آلو کے پیٹس اور کیک رس لے کر آتے تھے۔ آج بھی ہر گلی کے نکڑ پر لکڑی کی بینچیں ہر کونے میں رکھی ہیں، جہاں ہر وقت ہی لوگ موجود رہتے اور بھیل پوری سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو کہ اس علاقے کی خاص سوغات ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اس علاقے میں جرائم کی شرح بہت کم ہے۔ گزدر آباد کی تنگ گلیاں نہ صرف دن

بامشکل ہی آسمان کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہاں کی گلیوں میں مقامی رہائشی لوٹ مار کے ڈر سے آزاد ہو کر آزادی سے گھومتے ہیں، گھر کے دروازے دن ہو یا رات کھلے رہتے ہیں۔ یہاں سب لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہتے ہیں۔ رات میں یہاں سلاوٹ برادری نے اپنی مدد آپ کے تحت ایک لائبریری قائم کر رکھی ہے جو تمام دن بند رہتی ہے، البتہ شام کو سلاوٹ جماعت کے بزرگ یہاں بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں۔ جب رات کا سناٹا چھا جاتا ہے تو یہاں کی خواتین اپنے گھروں کے باہر رکھے تختوں پر آ کر بیٹھنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ہنسنے ہنسانے میں مصروف یہ خواتین رات کے اس پہر گلیوں پر حکمرانی کرتی ہیں۔ وہ اپنا فرصت کا وقت بھرپور انداز سے گزارتی ہیں۔ آج رنچھوڑ لائن میں جابجا بلڈوزر کھڑے نظر آتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ برادری اب سڑکوں اور دیگر میونسپل تعمیرات میں بھی مصروف عمل ہو گئی ہے۔ یہاں کے لوگ اپنے جدّی پشتی پیشے یعنی تعمیرات کے کام سے تو وابستہ ہیں ہی ساتھ فی زمانہ تعلیم کی جانب بھی رجحان بڑھ رہا ہے۔ یہاں میں اب تعلیم یافتہ لوگ بھی نظر آنے لگے ہیں، انجینئر بننا تو ان کے لئے کوئی کمال کی بات نہ تھی، مگر اس برادری نے شہر کو اچھے ڈاکٹر بھی دیئے ہیں۔ تعلیمی اور معاشی ترقی کے باوجود اس برادری کا رہنا بسنا اور اوڑھنا بچھونا اب بھی رنچھوڑ لائن ہی ہے۔

کراچی چھاونی (کینٹ) اسٹیشن

کراچی چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی کا مرکزی ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس اسٹیشن کی تعمیر کا آغاز برطانوی دور میں 1896ء میں شروع ہوا اور 1898ء میں 80,000 روپے کی لاگت سے مکمل ہوا۔ ابتدا میں یہ فریر اسٹریٹ ریلوے اسٹیشن کہلاتا تھا۔ اس ریلوے اسٹیشن پر ہسپتال، مسجد اور تھانے سمیت مختلف سہولیات موجود ہیں۔ یہ ڈاکٹر داود پوتا روڈ، صدر کے قریب واقع ہے۔

ماہرینِ تعمیرات کے مطابق کینٹ اسٹیشن کی عمارت رومن اور اطالوی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ اس کا مرکزی دروازہ رومن گوتھک طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے جب کہ ستونوں میں اطالوی طرزِ تعمیر کی جھلک ملتی ہے۔ اس کے پلیٹ فارموں کی تعداد 5 ہے، جب کہ ٹریک کی تعداد 8 ہے۔

کراچی کینٹ کا ریلوے اسٹیشن مسافر ٹرینوں کی آمدورفت کے حوالے سے مصروف اسٹیشن ہے جہاں سے مختلف ٹرینیں اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتی ہیں۔

حکومت سندھ نے کراچی چھاؤنی ریلوے اسٹیشن کی عمارت کو محفوظ ورثہ قرار دے دیا۔

صدر کراچی بین الاقوامی مذاہب کی عمدہ مثال

تحریر: محمد فیصل عشرت

کئی سالوں سے سیاسی اور فرقہ وارانہ تشدد کی زد میں رہنے والا کراچی بہترین شہرت کا حامل نہیں ہے، اور اگر گذشتہ چند سالوں کی سرخیوں کو مدِ نظر رکھیں، تو شاید اسے برداشت سے خالی شہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ مگر شہر کی تقریباً ہر مذہبی برادری کے ساتھ اسکول اور کالج جانے کی وجہ سے مجھے یہ ماننے میں اب بھی دشواری ہوتی ہے کہ کراچی کے لوگ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ لٰہذا میں کراچی کے صدر کے علاقے کو قریب سے دیکھنے کے لیے نکل پڑا ہوں۔

میں نے تاریخی زیب النساء اسٹریٹ سے سینٹ پیٹرک کتھیڈرل تک پیدل چلنا شروع کیا۔ آپ یہاں سے چلتے جائیں، تو ہر ایک بلاک پر ایک مختلف مذہبی برادری آباد نظر آئے گی۔ یہاں پر یہ برادریاں ایک دوسرے کے ساتھ کئی سالوں سے بھائی چارے سے رہ رہی ہیں۔ میرے راستے میں پہلی مذہبی عمارت انتہائی خوبصورت مگر نظرانداز کردہ کچھی میمن مسجد ہے۔ اس سڑک پر بنیادی طور پر میمن برادری کے افراد رہتے ہیں۔

اس گلی میں تھوڑا دور چلنے کے بعد میں ایک اور بلاک آ پہنچا، جہاں پارسی برادری آباد ہے۔ لفظ پارسی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب فارس (موجودہ ایران) سے تعلق رکھنے والا ہے، اور پارسی برادری خود کو یہیں سے تعلق رکھنے والا بتاتی ہے۔ اگر آپ اس گلی پر تھوڑا غور کریں، تو آپ کو لفظ ایران یا ایرانی ہر دوسری دکان پر نظر آئیں گے، جیسے ایرانی بیکری، ایرانی چائے وغیرہ۔

آزادی کے بعد ابتدائی چند سالوں میں پارسی کراچی کی سب سے زیادہ بااثر اور دولتمند برادری تھی۔ انہوں نے شہر بھر میں کئی سماجی و طبی ادارے قائم کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سب سے اہم این ای ڈی یونیورسٹی اور لیڈی ڈفرن ہسپتال ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں ان کی برادری کی تعداد ہجرت اور گھٹتی شرحِ پیدائش کی وجہ سے کم ہو رہی ہے، اور زیادہ آتشکدے باقی نہیں بچے ہیں۔

ان میں سب سے بڑا این جے بہرانا دارِ مہر (آتشکدہ) ہے۔ غیر پارسی افراد کا مندر کے احاطے میں داخلہ سختی سے منع ہے، اور بہت منت سماجت کے بعد گارڈ اور آتشکدے کے متولی نے مجھے ویرانڈے تک آنے دیا۔ ویرانڈے کے فرش پر چاک سے بالکل ویسے ہی رنگ برنگے ڈیزائن بنے ہوئے تھے، جیسے ہندو گھروں اور مندروں میں دکھائی دیتے ہیں۔

باہری دیوار پر نظر ڈالنے پر مجھے ویسے ہی نشانات اور مجسمے دکھائی دیے جو میں نے فارس کی تاریخی جگہوں پر دیکھے تھے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں فراوہار تھا، جو عمارت کے سب سے اوپر بنا ہوا تھا۔ باہر سے ایک دیوار پر زرتشت کا پورٹریٹ نظر آرہا تھا، جو کہ زرتشتی کے اوقات میں پر ہجوم رہتی ہیں بلکہ لوگوں کی آمد و رفت رات میں بھی جاری رہتی ہے۔ گھر آپس میں اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ

مذہب کے بانی ہیں۔ حوڑادور چلنے پر میں عظیم الشان لیکن بے ہنگم ایمپریس مارکیٹ کے سامنے کھڑا تھا۔
مجھے لگا جیسے میں ایک بہت بڑی مسجد کے عقب میں کھڑا ہوں۔ میں ایک نہایت متجسس شخص ہوں، اور میرا تجسس مجھے مسجد کے بیرونی دروازے تک لے گیا، جو گلی میں تھوڑا دور ہی تھا۔ قریب پہنچنے پر میں نے جانا کہ یہ داؤدی بوہرا برادری کا جماعت خانہ ہے۔
داؤدی بوہرا برادری کو شہر بھر میں ان کی امن پسندی اور مہمان نوازی کے لیے جانا جاتا ہے۔
میں داخلی دروازے تک گیا اور اندر جانے کی اجازت طلب کی۔ میں بھگا دیے جانے کے لیے بالکل تیار تھا لیکن میری توقعات کے برعکس مجھے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اندر جانے دیا گیا اور ساتھ میں ایک شخص کو بطور گائیڈ بھی ساتھ کر دیا گیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ جماعت خانہ طاہری مسجد کہلاتا ہے، اور یہ شہر کے سب سے بڑے جماعت خانوں میں سے ہے۔
مسجد تک جانے والا داخلی حصہ نہات عظیم الشان ہے۔ مسجد کے اندرونی حصے میں دنیا بھر کی اسلامی ثقافتوں کے طرز ہائے تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ مسجد کا سب سے شاندار حصہ وہ ہے جہاں نماز پڑھی جاتی ہے۔ جب فانوس جلائے گئے، تو میں اس جگہ کی خوبصورتی اور بناوٹ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میرا خیال ہے کہ تصاویر خود اپنی کہانی بہتر بیان کریں گی۔
اب میرے گائیڈ نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا کہ نماز کا وقت ہوا چاہتا ہے، لہٰذا ٹور اب ختم کرنا ہوگا۔ میں نے مہمان نوازی اور مسجد کے مختصر مگر جامع ٹور کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اب میں سینٹ پیٹرک کتھیڈرل کی جانب بڑھ رہا تھا جو مسجد والی سڑک پر ہی ہے۔ چرچ کے آس پاس شہر کے سب سے مشہور کانوینٹ اسکول سینٹ پیٹرک اور سینٹ جوزف قائم ہیں۔ کیونکہ یہ اتوار کی دوپہر تھی، چنانچہ اسکول بند تھے اور علاقہ کافی پرسکون تھا۔ میں چند لوگوں کو چرچ سے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔
گیٹ پر پہنچنے پر میں نے گارڈ سے اندر جانے کی اجازت مانگی تو اس نے کہا "یہ خدا کا گھر ہے، میں آپ کو کیسے روک سکتا ہوں؟"
کتھیڈرل سے پہلے جو چیز آپ دیکھیں گے، وہ سفید ماربل کی "مسیح بادشاہ کی یادگار" ہے۔ اس یادگار کے اندر ایک چھوٹا صندوق اور گوا کے بزرگ سینٹ فرانسس زیویئر کا ایک مجسمہ ہے۔
کیونکہ کراچی کی زیادہ تر کیتھولک کمیونٹی گوا سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے یہاں پر سینٹ فرانسس سے بہت عقیدت رکھی جاتی ہے۔
اپنی موجودہ صورت میں کتھیڈرل 1881 سے قائم ہے، لیکن اس جگہ پر 1845 سے چرچ موجود تھا۔ 2001 میں محمود آباد میں 5000 افراد کی گنجائش والے سینٹ پیٹرز کتھیڈرل کی تعمیر سے پہلے 1500 افراد کی گنجائش کے ساتھ یہ کراچی کا سب سے بڑا کیتھولک کتھیڈرل تھا۔
عبادت کا وقت ختم ہو جانے کی وجہ سے چرچ خالی تھا، لہٰذا میں اسے اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھ سکتا تھا۔ اندر سے چرچ نہایت وسیع و عریض تھا اور بیرونی ممالک کے گرجا گھروں کی طرح اس کی چھتیں بھی کافی اونچی تھیں۔ چرچ کے اندر رنگین شیشوں کی روایتی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔

چرچ مکمل طور پر دیکھ لینے کے بعد میں دروازے تک آیا اور گارڈ سے پوچھا کہ رکشہ کہاں ملے گا۔ اس نے مرکزی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ میں فوراً ایک رکشہ میں بیٹھا اور اپنے آخری اسٹاپ سوامی نارائن مندر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اگر ٹریفک نہ ہو، تو آپ 10 منٹ میں یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ مین ایم اے جناح روڈ پر اس جگہ ہے جسے عام طور پر لائٹ ہاؤس کہا جاتا ہے۔ مندر ایک محرابی دروازے کے بالکل پیچھے قائم ہے، جہاں سے اندر داخل ہونے پر آپ ایک احاطے میں پہنچتے ہیں جو سرخ پتھر سے تعمیر شدہ کے ایم سی بلڈنگ کے بالکل سامنے ہے۔

سوامی نارائن مندر اسی نام کے ایک احاطے کا حصہ ہے، جس میں ہندو اور سکھ برادری کے افراد رہتے ہیں۔ یہاں موجود زیادہ تر گھر ایک صدی پرانے ہیں۔ 1947 میں آزادی کے عین بعد ہندو اور سکھ برادریوں کے کئی افراد کو یہاں پناہ فراہم کی گئی تھی۔

اس پھلتی پھولتی برادری کے لوگ اب 1947 کے خونی دنوں سے بہت آگے نکل آئے ہیں۔ مندر کی طرف بڑھتے ہوئے مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ اس کے ساتھ ہی ایک سکھ گردوارہ بھی موجود ہے۔ عبادت کا وقت ہونے کی وجہ سے مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

پھر میں مندر کی جانب بڑھا۔ مندر بہت خوبصورت ہے، لیکن اس کی سب سے نمایاں چیز مندر کے اوپر ہاتھ سے بنائی گئی کرشن جی کی پینٹنگ ہے، جو ان کی کہانی بیان کرتی ہے۔ مندر کے ساتھ ہی ایک وسیع میدان ہے جو میلوں اور تقریبات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ سوامی نارائن مندر کی اپنی گئوشالہ بھی ہے جہاں گائے رکھی جاتی ہیں، ان کی عبادت کی جاتی ہے، اور ان کا خیال رکھا جاتا ہے

:طرح طرح کے لوگوں کو اپنی آغوش میں بسائے ہوئے کراچی کے صدر میں کافی دیر گھومنے کے بعد مجھے قائدِ اعظم محمد علی جناح کی 11 اگست 1947 کی تقریر یاد آ گئی، جس میں انہوں نے برابری سے لے کر قانون کی بالادستی اور مذہب کی آزادی کے متعلق ہر چیز پر بات کی تھی۔ لیکن آج ان کی اس تقریر سے جو چیز مجھے سب سے زیادہ یاد آئی، وہ یہ تھیں:

"آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصے میں ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلم مسلم نہیں رہیں گے۔ مذہبی تناظر میں نہیں، کیونکہ یہ ہر کسی فرد کا ذاتی معاملہ ہے، بلکہ سیاسی تناظر میں، بحیثیت ریاست کے شہری کے۔"

اپنے سفر کے اختتام پر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ یہ کہ اس علاقے کا ہر مذہبی گروہ اپنی روزمرہ کی زندگی اور اپنی عبادات بغیر کسی کشیدگی کے انجام دیتا ہے۔

اس بات سے فرق نہیں پڑتا کہ یہ پارسی ہوں، یا سکھ، ہندو، عیسائی، یا مسلم۔ عقیدہ سیاسی نہیں بلکہ ایک ذاتی ترجیح ہے جسے یہ سب لوگ سمجھتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ ریاست کے شہری ہیں، اور منفرد اور خوبصورت پاکستانی ہیں۔

گارڈن ویسٹ عروس البلاد کراچی

تحریر: عمران اشرف جونانی

کراچی کا وہ علاقہ جس کے بارے میں بہت کم لکھا گیا، عام طور پر لوگ یا تو گارڈن ایسٹ کو پہچانتے ہیں یا عثمان آباد لیاری وغیرہ کو، اگر اس علاقے کی پہچان ہوتی بھی ہے تو "جیلانی مسجد" اور "فوارہ چوک" کے نام سے۔ کچھ عرصہ سے ڈاکٹر اقبال ہاشمانی صاحب "ایام رقص طاؤس" میں کافی تفصیل سے اس قدیم علاقے کی تہذیب و تاریخ سامنے لا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمیں ان کی تحریر کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔

گارڈن ویسٹ بڑا اہم رہائشی علاقہ ہے جو لیاری عثمان آباد اور گارڈن ایسٹ کے درمیان واقع ہے، ملی جلی آبادی ہے لیکن خاص طور میمن برادری کی رہائش زیادہ ہے، عام طور پر جو لوگ موسیٰ لین بغدادی اور رنچھوڑ لائن وغیرہ سے نکلتے ہیں وہ یا تو حسین آباد کی طرف جاتے ہیں اور زیادہ دور رہائش مصلحت کے خلاف ہو تو پڑاؤ یہی گارڈن ویسٹ کا علاقہ ہوتا ہے۔

کراچی کا اولڈ سٹی ایریا پیدل گھومنے کی جگہ ہے، ایک اک گلی میں ایسی قدیم عمارتیں اور بنگلے اب بھی موجود ہیں کہ انسان کئی برس پیچھے کے زمانے میں پہنچ جاتا ہے، مختلف حوالوں سے مشہور عظیم پلازہ بھی عثمان آباد کی سرحد اور گارڈن ویسٹ کی ابتداء میں واقع ہے اور تو اور میوہ شاہ قبرستان جانے والے زائرین کا راستہ بھی یہی ہے۔

بہر حال تفصیل سے تو وہ لوگ لکھ سکتے ہیں جو عرصہ دراز سے یہاں مقیم ہیں ہم نے تو دو سطریں بس یوں گھسیٹ دیں کہ کافی عرصہ قبل اپنے ہی کیمرہ سے لی گئی ہارٹ ڈیوس روڈ کی یہ تصاویر سامنے آ گئی تھیں

یار زندہ صحبت باقی
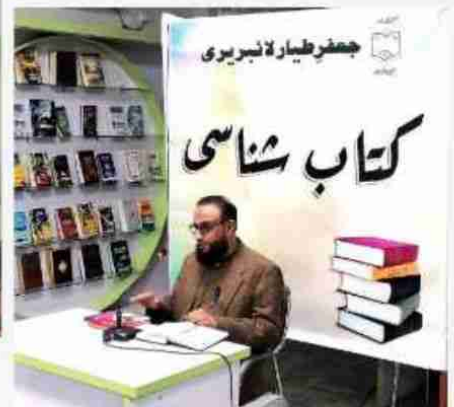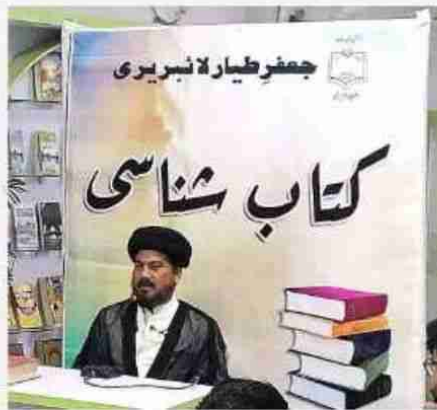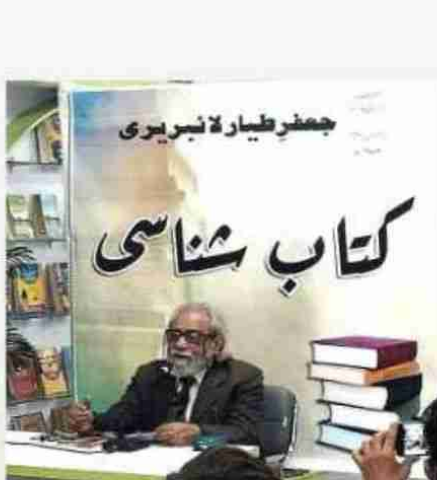
ناظم آباد۔۔۔۔۔۔
(ایک خواب گزیدہ شہر کی کہانی)
تحریر: رفعت علوی

"یہ سب علی گڑھ کے لونڈوں کی شرارت ھے" یہ جملہ میں نے کہیں پڑھا تھا اور اس میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان بننے کے بعد امروھہ کے مشہور شاعر جون ایلیا نے یہ کہا تھا، انکا مطلب یہ تھا کہ علی گڑھ اور عثمانیہ کالج کے گریجویٹ اور پر جوش نوجوان لڑکوں نے پاکستان مومنٹ چلائی اور پاکستان بنوایا۔

پاکستان بنا تو مہاجروں کے لٹے پٹے قافلوں نے کراچی کا رخ کیا۔۔۔۔۔۔۔

ایک وقت تھا جب یہ عروس البلاد کراچی لسبیلہ کے پل سے اُدھر ہی ختم ھو جاتا تھا اور خاصی چوڑی اور بہت کافی جوش و خروش سے جھاگ اڑاتی لیاری ندی کراچی کے باسیوں کے لئے حد آخر تھی جہاں لوگ اکثر بنسیاں ڈالے سگرٹ کے مرغولے اڑاتے مچھلیوں کا شکار کرتے نظر آتے تھے، لیاری ندی کے اُس پار دور تلک لق و دق سنسان علاقہ تھا جس میں جنگلات تھے اور جہاں گیڈر، لومڑی اور دوسرے جنگلی جانوروں کا بسیرا تھا

پھر یوں ھوا کہ پاکستان کے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین نے ھندوستان سے گھر لٹا کر آنے والے مہاجرین کے لئے ایک نئی بستی بسانے کا پلان کیا، یہ بستی لیاری ندی کی دوسری طرف یعنی کراچی کے باھر آباد کی گئی، حکومت نے یہ غیر آباد علاقہ ایک قبائلی سردار مستی بروہی خان سے خریدا اور یہاں کی زمین مہاجرین کو تین روپے پچاس پیسے فی اسکوائر یارڈ کے حساب سے بیچی گئی، یہ انیس سو باون کی بات ھے

راج نے شاقول اور کیرنی سنبھالی، رنگسازوں نے برش اور رنگوں کی بالٹیاں اٹھائیں فولاد کے بیوپاری لوھے کے ٹرکس بھر بھر کر لانے لگے سمنٹ ریت اور فولاد کے گارے سے مکان بنے، مہاجرین کی پہلی نسل کے مردوں نے مکان بنا کر اپنا فرض پورا کیا اور یوپی کی سگھڑ بیبیوں نے ان مکانوں کو گھر بنا دیا، صحنچے، دالان برامدے گملوں سے اٹ گئے، باھر گھاس کے تختوں کے پاس کی کیاریاں بگن ویلیا رات کی رانی اور عشق پینچاں کے پھولوں سے سج گئیں، گھر کے پچھواڑے میں کدو لوبیا سیم کی بیلوں نے دیواروں کو ڈھک دیا، ٹماٹر میتھی ھرا دھنیا اور پودینے کے ھرے بھرے پودوں کی مہک سے رسوئی خانے مہکنے لگے، کسی نے اپنے گھر پر نشیمن لکھوایا، کسی نے کہکشاں، کوئی کاشانہ بتول لکھوا کر شاد ھوا اور کوئی مصطفے منزل پر قانع ھو گیا، یہ سارے نام ان کے ماضی کا دین تھے وہ گھر جو مہاجرین ھندوستان میں نے اپنے پیچھے چھوڑ آئے تھے، یہ صرف ان کے ماضی سے جڑی یادوں کو خراج تحسین ہی نہ تھا بلکہ نئی

سرزمین میں اپنی ذاتی ملکیت کے احساس کا اطمینان بخش اظہار بھی تھا، دیکھتے دیکھتے ہی ناظم آباد کراچی کے الائیٹس کی محبوب بستی بن گیا

یہ تو دنیا کے سب ہی لوگ جانتے ھیں کہ کراچی کے نہایت ذھین فطین اور باصلاحیت لوگوں کا قیام ناظم آباد میں ہی رھا۰ ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۰ تک ناظم آباد انٹلیکچولز کی رھائش گاہ اور کلچرل ایکٹیویٹیز کا گڑھ تھا، پی آئی بی کالونی، آگرہ تاج کالونی اور بہار کالونی کے پڑھے لکھے لوگوں نے ان علاقوں کو خیر آباد کہہ کر ناظم آباد میں نئے سرے اپنی زندگی شروع کی۔

لمبی چوڑی دورویہ سڑکیں جن کے ساتھ دور تک درختوں کی قطاریں سایہ شجر دار کا نمونہ پیش کرتی تھیں پورا علاقہ اپنی صفائی ستھرائی کھلے میدانوں اور تازی ھوا کے جھونکوں کی وجہ کراچی کے دوسرے علاقوں سے منفرد تھا اور جلد ہی کراچی کے پوش ایریاز میں شمار ھونے لگا، ایک وقت آیا جب ناظم آباد میں گھر بنانا صاحب حیثیت ھونے اور تعلیم یافتہ ھونے کا سمبل بن گیا کراچی کے دوسرے علاقوں کے باسی ناظم آباد والوں کو مہذب تعلیم یافتہ اور انٹلکچول سمجھتے اور انکی خوش لباسی اور صلاحیتوں سے مرعوب بھی ھوتے، لوگوں نے ناظم آباد کو فرانس کے شہر پیرس میں واقع مونٹ پارناسے نامی علاقے کا ھم پلہ قرار دیا جہاں ایک ہی وقت میں بیکیٹ، پیکاسو، ھیمنگوے، روسو، عذرا پاؤنڈ اور سلازار جیسے بہت سے دانشور اور آرٹسٹ، رقاص، مجسمہ ساز، مصور، شاعر، اور کمپوزر رھا کرتے تھے،

گنگا جمنا تہذیب کا جتنا شہرہ ھے اگر اس تہذیب کا نمونہ دیکھنا ھے تو یہاں آباد گھرانوں کے مکینوں سے ملئے، جسٹس لاری، تنقید نگار فرمان فتحپوری، فلم ساز سعید رضوی، عالیہ امام، مجاھد بریلوی، مجنوں گور کھپوری، مختار زمن، ڈاکٹر سرور، ذکیہ سرور، ڈاکٹر طیب، کالمسٹ نصر اللہ خان، انعام درانی، کون کون یہاں نہیں رھتا تھا،

صادقین، اقبال مہدی، محسن بھوپالی، سنگیتا، زیبا، ندیم شکیل حنیف محمد، اقبال صفی پوری، سحر انصاری اور سلمی زمن جیسے انٹلیجنسیا، رائیٹرز، پوئٹس ارٹسٹ اسکالر، سول سرونٹ، سیاستداں، ڈاکٹرز، گلوکار، وکیل، تعلیمی ماھرین۔ یہ سب لکھنؤ، دہلی، امروہہ، کانپور، بدایوں، علی گڑھ، ملیح آباد، حیدر آباد، جونا گڑھ سے ھجرت کئے ھوئے نابغہ روزگار لوگوں کی پہلی نسل تھی۔

سرسید گرلز کالج، ناظم آباد اسکول، ناظم آباد کالج، عثمانیہ کالج، ھیپی ڈی اسکول، خان صاحب کا پریمیئر کالج، حورانی صاحب کا سٹی کالج، عبداللہ کالج، رابعہ زبیری کا کراچی اسکول آف آرٹ اینڈ کرافٹ، وسطانیہ اسکول کے علاوہ لڑکیوں اور بچوں کی لاتعداد نرسریاں اور اسکول کھلے اور کراچی کے دوسرے علاقے کے قدیم اور معتبر تعلیمی اداروں سے ٹکر لینے لگے

ناظم آباد کے اندر چھوٹے چھوٹے ناظم آباد بن گئے، گولیمار، عثمانیہ کالونی فردوس کالونی، رضویہ سوسائیٹی، مسلم لیگ کوارٹرز، پاپوش نگر اور بڑا میدان، جن کی اپنی آبادی چھوٹے شہروں کے برابر تھی۔

انو بھائی پارک، ھادی مارکیٹ، گول مارکیٹ، ضیاءالدین اسپتال بقائی اسپتال صادقین ھاؤس، سبطین منزل، محسن منزل اور حکیم

سعید کی ھمدرد لیبارٹیریز کا صدر دفتر ھمدرد سینٹر اس علاقے کے لینڈ مارک تھے اور پاک کریسنٹ کرکٹ کلب جہاں سے حنیف محمد، وزیر رئیس مشتاق اور صادق محمد نے کرکٹ کھیلی، ظہیر عباس اور آصف اقبال اس کلب سے کھیل کر فخر محسوس کرتے تھے، صلاح الدین سلو اور انتخاب عالم، نیشنل کرکٹ کلب کے قریب رہتے تھے جبکہ رضویہ سوسائیٹی کی ٹیم ڈائمنڈ کرکٹ کلب کا مشہور اسپن بولر محمود الحسن تھا۔

آغا جوس ھاؤس، انبالہ سوئیٹ، ملا حلوائی، کیفے ذائقہ، الحسن کافی ھاؤس اور کیفے وزیر کے خوش ذائقہ کھانے دلی اور اودھ کے کھانوں اور مٹھائیوں کو مات دیتے تھے، کیفے وزیر میں جو دن میں بائیس گھنٹے کھلا رھتا تھا ایک آنے کی چائے ایک روپے پچاس پیسے کا چکن تکا اور چار آنے کی نہاری ملتی تھی، ایک پیالی چائے عوض آپ اپنے دوستوں کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھ کر جمیل الدین عالی، عصمت چغتائی، کرشن چندر، جیلانی بانو، جوش اور اداس نسلوں کے خالق عبداللہ حسین کے علاوہ رونا لیلی، ناھید اختر، خورشید انور، ندیم وحید مراد اور شیم آرا پر بحث ومباحثہ کر سکتے تھے

ناظم آباد کلب اھل ناظم آباد کا ریلیکسیشن پوائنٹ تھا اور پھر غالب لائبریری تھی جس میں تین ھزار سے زیادہ کتابیں تھیں اور جس کو حبیب بنک نے فیض احمد فیض اور مرزا ظفر الحسن کی کوششوں سے بنایا گیا تھا، اس زمانے میں یہ ادبی تقریبات کا مرکز تھی،

فلمی تفریحات کے لئے ریلیکس سینما، نایاب سینما، شالیمار سینما لبرٹی سینما تھے جہاں شرفائے ناظم آباد اپنی فیملیز کے ساتھ فلم دیکھنے جاتے، میٹنی شوز میں گھریلو خواتین اور نوجوان لڑکیوں سے ھاؤس فل ھوتا، لڑکیاں بالیاں اپنی پڑوس اور کالج کی سہیلیوں کے ساتھ بے خوف خطر فلمیں دیکھتیں مگر کبھی کسی قسم کی بیہودگی یا خواتین کے ساتھ بدسلوکی کی شکایت سننے میں نہیں آتی تھی۔

ان دنوں گرمیوں میں گھر کے دالان صحن اور چھتوں پر سونے کا عام رواج تھا کھڑکیاں کھلی رکھی جاتیں جن سے فراٹے بھرتی ھوا پورے گھر کو فیضیاب کرتی، چوری چکاری، اسٹریٹ کرائمز ڈاکے کلاشنکوف جیسی چیزوں کا نہ ڈر تھا اور نہ کوئی تصور تھا

پھر محرم آتا تو زیڈاے بخاری اور رشید ترابی کی مجلسوں اور شہدائے کربلا کے اذکار سے ناظم آباد کی گلیوں میں سوگواروں کے جھمگھٹے لگ جاتے، سبیلیں لگتیں لڑکے لڑکیاں سیاہ لباس پہنے ایک گھر سے دوسرے گھر مجالس میں شریک ھونے جاتے اور مجال ھے کوئی شیئعہ سنی کے اختلاف کی بات بھی سنی گئی ھو۔

چراغوں کا دھواں ھو گئے ھیں، وہ زمانے رفتگاں ھو گئے ھیں، آج یہ سب باتیں ایک خواب سا لگتی ھیں مگر جو لوگ ان سنہرے برسوں میں ناظم آباد کی اس گولڈن لائف کا حصہ رھے ھیں وہ آج بھی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس یادگار دور کو یاد کرتے ھیں اور گنگناتے ھیں کہ قصہ ناظم آباد مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ۔۔۔۔۔

گولیمار (گلبہار کالونی) کی مختصر تاریخ

تحریر: پروفیسر سید عمران ظفر

کچھ احوال نئے گولیمار میں آنے والے مہاجرین کا

باقر صاحب جو آگرہ شہر کی ایک بستی شاہ گنج سے تعلق رکھتے تھے اور اس بستی میں ان کا خاندان صدیوں سے رہائش پذیر تھا۔ اس بستی کی شرح خواندگی 90 فیصد سے زیادہ تھی۔ زیادہ تر لوگ سرکاری نوکریوں میں تھے اور بڑی بڑی پوسٹوں پر موجود تھے۔ آپ کے پردادا ڈپٹی کلیکٹر کہ عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے اور دادا اور والد بھی سرکاری آفیسر تھے اور یہ خاندان ایک بڑی حویلی میں رہتا تھا جبکہ زمینداری الگ تھی۔

یوپی صوبے کے بہت سے شہروں کی طرح آگرہ شہر میں بھی کسی قسم کا ہندو مسلم فساد نہیں ہوا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد جب ہندوستان کے مسلمان اپنی جدوجہد کا حاصل اور امیدوں کے مرکز پاکستان جانے کے لیے دیوانہ وار اپنا سب کچھ چھوڑ کر پاکستان جارہے تھے تو آپ کے گھر والے بھی اپنا سارا گھر بار چھوڑ کر 1947ء میں ہی رشتہ داروں کے ساتھ اسپیشل ٹرین سے لاہور روانہ ہوگئے جبکہ آپ کے والد سرکاری افیسر تھے اور آپ کی تعیناتی حیدرآباد دکن میں تھی جہاں وہ اسپتال میں ایڈمٹ تھے مگر اس وقت پاکستان جانے کا ایسا جذبہ پیدا ہو گیا تھا کہ تمام باتوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔ لاہور آنے کے بعد دو مہینے تک اسٹیشن پر ہی بے یار و مددگار پڑے رہے کیونکہ آگے کی منزل کا کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ دوسری طرف والد جب اپنی حویلی پہنچے تو بستی کی تمام حویلیوں اور مکانات کو سندھ اور پنجاب سے آنے والے ہندو شرناتیوں (مہاجرین) میں تقسیم کیا جاچکا تھا. باقر صاحب اور ان کے رشتہ دار اسٹیشن سے اٹھ کر ٹرین سے کراچی آگئے۔ کراچی میں ہندوؤں کے مکانات خالی ہوگئے تھے بالکل اسی طرح جس طرح ہندوستان میں مسلمانوں کے مکانات خالی ہوگئے تھے۔ ان خالی مکانات میں ہندوستان سے آئے ہوئے مسلمان سکونت اختیار کرنے لگے۔ باقر رضوی صاحب کے خاندان والوں کو بھی شومار کیٹ میں عثمان آباد کے اندر جہاں انگریزوں کے اصطبل تھے اور 20 گھوڑوں کے باندھنے کی جگہ تھی اور اب خالی ہوگئے تھے، انہی خالی اصطبلوں میں رہائش کی جگہ مل گئی۔ خاندان والے جو کافی تعداد میں ساتھ تھے ہر خاندان الگ اصطبل میں رہائش پذیر ہوگیا۔ کچھ مہینوں تک آپ کا خاندان انہی اصطبلوں میں رہائش پذیر رہا اور پھر گولیمار منتقل ہوگیا۔ وہ کچھ عرصہ جو گھوڑوں کے اصطبل میں گزارا بقول اس خاندان کے ایک بزرگ کے "ہم ایک بہت بڑی حویلی کے رہنے والے تھے پاکستان کی محبت میں حالات نے یہ رنگ دکھائے کہ ہمارے خاندان نے سر چھپانے کے لیے گھوڑوں کے اصطبل میں کافی مہینے گزار دیے وہاں موجود گھوڑوں کی لید کی بو اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود آج بھی میرے ذہن سے نہیں نکلی۔ جب میں آنکھیں بند کر کے اس وقت کا سوچتا ہوں تو اس بو کو اب بھی محسوس کرتا ہوں۔"

کچھ ذکر قیام پاکستان سے پہلے کے گولیمار کا

قیام پاکستان سے پہلے لیاری ندی کا جنوبی حصہ ایک کھلا میدان تھا جو ناظم آباد سے آگے پہاڑ تک تھا۔اس میدان میں لیاری ندی کے ساتھ انگریزوں کی فوج گولی چلانے کی مشق کیا کرتی تھی اسی مناسبت سے اس میدان کو گولیمار کہا جاتا تھا۔ فائرنگ رینج کی مناسبت سے آصف کالونی گٹر باغیچے میں فوجیوں کا ایک اسلحہ ڈپو بھی تھا جہاں اب اسکول قائم ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اسی میدان پر جو بستی بسائی گئی اسکا نام بھی گولیمار ہی رہا جبکہ ندی کے دوسری جانب پرانا گولیمار تھا جس میں قیام پاکستان سے بہت پہلے سے فاصلے فاصلے سے سندھی اور بلوچ بستیاں تھیں۔ان چھوٹی چھوٹی آبادیوں کے بیچ میں ایک ہندو مہاجن دکاندار کا گھر تھا جس کے پاس 100 سے زیادہ گائیں بھینسیں تھیں جن سے وہ دودھ دہی کا کاروبار کرتا تھا اور اسکے علاوہ بھی اسکے دیگر کاروبار تھے۔

لسبیلہ پل سے جو سڑک ناظم آباد کی طرف جاتی ہے وہ اب نواب صدیق علی خان روڈ کہلاتی ہے اس سڑک پر لسبیلہ پل سے اترنے کے بعد بائیں طرف کا علاقہ ہی دراصل گولیمار کہلاتا ہے۔اس کے مغرب اور جنوب میں لیاری ندی ہے جبکہ مشرق میں نواب صدیق علی خان روڈ ہے اور شمال میں رضویہ سوسائٹی ناظم آباد موجود ہے۔پل بننے سے پہلے اس علاقے کا راستہ سردار عبدالرب نشتر روڈ سے لیاری ندی پر کھوپرامل کے قریب سے جاتا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے یہی شہر کا آخری بس اسٹاپ تھا اور یہیں سے گولیمار کے لوگ شہر جانے کے لیے بس حاصل کرتے تھے۔

گولی مار کے کئی نام بدلے پہلے پہل تو یہ پرانے گولیمار کی مناسبت سے گولیمار ہی رہا پھر اس کا نام پیر آباد ہو گیا پھر اس کا نام اعظم آباد ہو گیا آخر میں 1960 کی دہائی کہ آخر میں اس کو گلبہار کا نام دے دیا گیا مگر یہ علاقہ اب بھی اپنے پرانے نام گولیمار سے ہی مشہور ہے تاہم اب اس کا سرکاری نام گلبہار کالونی ہے۔

کچھ ذکر گولیمار کی تعمیر کا

مہاجرین کی آمد کے ساتھ ہی قائد اعظم نے مہاجرین کے لیے الگ کوارٹرز بنانے کے واسطے اپنے ذاتی پیسے پی ڈبلیو ڈی میں دے کر مہاجرین کی آبادکاری کے لیے ایک نظام بنانے کو دیا۔اس کے تحت پہلے مرحلے میں 500 کوارٹر بنائے جانے تھے اس تمام کام میں میجر حسن کا بنیادی کردار تھا کیونکہ ان کو الاٹمنٹ افیسر مقرر کر دیا گیا تھا۔ان کوارٹرز کو بنانے کا ٹھیکہ تاج کنسٹرکشن کمپنی کو ملا جس کے ذمہ دار ہندوستان میں انگریز دور کے سابق تحصیلدار ظہیر صاحب تھے. یہ طے پایا کہ پہلے 100 کوارٹرز بنائے جائیں گے اس کے بعد پھر مزید 400 کوارٹرز بنائے جائیں گے۔

لیاری ندی کے پاس موجودہ گولیمار کی زمین کا انتخاب کیا گیا اور فوری طور پر نقشہ تیار ہوا. شمالی نالے سے ملی ہوئی زمین پر لے اؤٹ کے نشان لگائے جانے لگے 1948ء کے شروع میں ہی پہلے مرحلے میں 100 کوارٹرز تعمیر ہو گئے اور یہی دراصل پورے پاکستان میں مہاجرین کی پہلی آبادکاری تھی۔ان کوارٹرز کے علاوہ 10 کوارٹرز بھنگیوں کے لیے بھی گولیمار مین روڈ کے ساتھ بنے۔

100 کوارٹرز چار چار کوارٹروں کے 25 بلاکوں پر مشتمل تھے۔ جبکہ 20 فٹ کی گلیاں تھیں اور چند گلیاں 30 فٹ کی بھی تھیں جو چوڑی سڑک کہلاتی تھی۔ ان سے آگے ایک نالہ آجاتا تھا اور پھر میدان۔ اس کے بعد 100 کوارٹرز کی طرز پر 1948ء میں ہی چار چار کوارٹرز کے 100 بلاکوں پر مشتمل 400 کوارٹرز تعمیر کیے گئے۔ ہر کوارٹر 65 گز کا تھا جس میں ایک کمرہ اور باقی صحن تھا۔ کونے پر ایک واش روم تھا وہ بھی کھڈی والا۔ جبکہ کمرے میں کچی کھپریل کی چھت ڈالی گئی تھی اور ان کی وجہ سے بارشوں کے زمانے میں تو براحال ہو جایا کرتا تھا کیونکہ یہ چھتیں ہر طرف سے ٹپکتی تھیں۔ لوگ کمرے کے اندر ہی 2 چارپائیوں کو کھڑا کر کے اس پر کوئی موٹا کپڑا ڈال کر بارش کہ پانی سے بچتے تھے۔ بعد میں لوگوں نے صحن کی زمین میں گارے کی دیوار بنا کر ایک غسل خانہ اور ایک باورچی خانہ بنایا۔ اس لق ودق صحرا میں یہ 500 کوارٹرز ہی تھے. منگھوپیر کی پہاڑیاں یہاں سے صاف نظر آتی تھیں۔ یہاں بجلی کا کوئی نظام نہیں تھا اور نہ ہی پانی کا کوئی نظام تھا پانی لیاری ندی کے کنوں سے لایا جاتا تھا جو کہ سندھی اور بلوچ آبادی میں لیاری ندی کے دوسری جانب تھے۔ بعد میں سرکار کی طرف سے 100 کوارٹرز اور 400 کوارٹرز میں ایک ایک نل لگا دیا گیا جہاں سے لمبی لمبی لائنوں میں لگ کر لوگ بالٹیوں اور کنستروں میں پانی بھر کر اپنے گھروں میں لے جاتے تھے۔ کچھ عرصے بعد کوارٹرز کے بیچوں بیچ سمینٹ کی ٹنکیاں بن گئیں جس کو محترمہ فاطمہ جناح کی جانب سے روزانہ بھروایا جاتا اور وہاں سے ماشکی ایک ایک آنے میں مشک گھر گھر پہنچانے لگے تو تھوڑا رہائشیوں کو سکون ملا۔ پاکستان کی محبت میں اپنے بنے بنائے پختہ گھر اور حویلیاں چھوڑ کر آنے والے مہاجرین کے لیے یہ چھوٹے چھوٹے سے کوارٹرز کیا تھے بس سر چھپانے کا آسرہ تھے۔

شروع شروع میں یہاں پر کوئی نہیں آرہا تھا سب یہاں آتے ہوئے ڈرتے تھے آنے والا اپنا سامان گدھا گاڑی پر لادے پہلے تمام خالی کوارٹرز کا معائنہ کرتا اور جس کوارٹر سے مطمئن ہوتا اس کوارٹر میں سامان اندر ڈلوا تا اور کوارٹر کو تالا ڈال کر چلا جاتا اور یہاں آبادی ہونے کا انتظار کرتا تا کہ کچھ انسان بسیں تو وہ بھی آجائے۔ جب تمام کوارٹرز میں تالے پڑ گئے تو سودے بازی بھی شروع ہو گئی پہلی قیمت یہ تھی کہ خریدنے والا اس گدھا گاڑی کا کرایہ ادا کر دے جو بیچنے والا اپنا سامان واپس دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال کرے گا۔

جب یہ کوارٹرز آباد ہونا شروع ہوئے تو مختلف کیمپوں میں مقیم مہاجرین اس طرف متوجہ ہوئے اور 100 کوارٹرز اور 400 کوارٹرز کے ارد گرد جھونپڑیاں پڑنا شروع ہوئیں خاص طور پر یہ انہی قطاروں میں بنائی گئیں جو سو کوارٹرز کی سیدھ تھی۔ کیونکہ یہ لوگوں کا اپنے اندازے کا کھیل تھا لہذا کہیں ترتیب رہی اور کہیں نہیں ہوئی بلکہ بعض جگہ تو ترتیب ایسی بگڑی کہ آج تک لوگ عذاب میں مبتلا ہیں۔ اور یوں ایک بڑی کچی آبادی وجود میں آگئی۔ اسطرح گولیمار میں کئی محلے وجود میں آنے لگے جن میں علی بستی، نشتر کالونی، فاروق آباد، غوثیہ کالونی، وحید آباد اور محمد آباد شامل تھے۔ ان میں وحید آباد ذرا منظم انداز میں آباد ہوا۔ اس علاقے میں موجود واحد اسکول کے ہیڈ ماسٹر کا نام وحید تھا اور انہی کے نام پر اس آبادی کو وحید آباد کہا جانے لگا۔ ماسٹر وحید کے اسکول کے بعد پہلا اسکول رانا لیاقت علی خان نے لڑکیوں کا اپوا اسکول بنوایا اور پھر اس کے بعد پاک ماڈل اور جے بی اسکول بنے۔

نشتر کالونی میں بڑی تعداد میں مراد آباد کے لوگ رہائش پذیر ہو گئے۔ گلی میں دو طرفہ دکانیں تو شروع ہی سے وجود میں آگئی تھیں۔ کیونکہ لوگ شاہی بازار کی طرز کے بازاروں کے عادی تھے یعنی جو سڑک کام سے آتے ہوئے گھر کے راستے کی طرف جائے تو اس کے اطراف سے سودا سلف خرید کر گھر لے جانے کے لیے دکانیں بنالی جاتی تھیں۔ لہذا مین روڈ سے آنے والی گلیوں کے اطراف کے دونوں طرف دکانیں بنتی چلی گئیں۔ جس گلی میں مراد آباد والوں کی اکثریت تھی زیادہ تر دکانیں انہی کے پاس تھیں۔ جس طرح ہندوستان میں الہ اباد کے امرود، بدایوں کے پیڑے، علی گڑھ کے تالے اور آگرے کے جوتے مشہور ہیں بالکل اسی طرح مراد آباد کے برتن بھی مشہور ہیں اور کیونکہ مراد آباد والے ظروف سازی کی صنعت یعنی آرائشی پیتل کا سامان بنانے میں ماہر تھے اس لیے یہ دکانیں آہستہ آہستہ پیتل کی ظروف سازی کی دکانوں میں تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ یوں پیتل گلی وجود میں آئی جو آج پورے پاکستان میں مشہور ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مین روڈ پر سینٹری کی بھی ایک مارکیٹ وجود میں آتی چلی گئی جو آج پورے کراچی کی سب سے بڑی سینٹری کی مارکیٹ ہے اور اس میں روزانہ کروڑوں روپے کا کاروبار ہوتا ہے۔

اسی طرح گولیمار کے بیچوں بیچ 1950ء میں لیاقت علی خان نے ایک جلسے سے خطاب کیا تھا جس جگہ کھڑے ہو کر خطاب کیا تھا اس جگہ پر ایک چوک بنا دیا گیا جسے لیاقت چوک کا نام دیا اور یہ اتنا مشہور ہوا کہ آس پاس کا علاقہ بھی لیاقت چوک کے نام سے مشہور ہے۔ 100 کوارٹر اور 400 کوارٹرز کے درمیان موجود میدان شروع سے ہی تجارتی علاقہ بن گیا تھا جہاں نورانی دواخانہ، خان صاحب کا ہوٹل، کہکشاں لائبریری، مناظر گیسو سوار اور ختنہ کرنے والے شمس الدین جراح بڑی شہرت کے حامل تھے۔

گولیمار میں بڑی تعداد آگرہ، مراد آباد اور ریاست بھرت پور اور اس کے قصبے پہر سر کے لوگوں کی تھی جبکہ ان کے علاوہ لکھنو، کانپور، دہلی، حیدر آباد دکن، الہ آباد اور علی گڑھ کے قصبے جلالی کے لوگ بڑی تعداد میں رہائش پذیر ہوئے۔

گولیمار کی مشہور شخصیات

گولیمار میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور ایک عمر گزاری ہے. خاص طور پر شعراء جن میں استاد نیر مدنی، شرف خورجوی، صوفی جمیل حسین رضوی، شان احمد قمر امروہی، شاہد الوری، عقیل دانش، صبیح رحمانی، پروفیسر وفا کانپوری، حیدر حسین کاوش اور انیس پہر سری شامل ہیں. سابق صوبائی وزیر الحاج شمیم الدین کا تعلق بھی گولیمار سے تھا۔ معروف ماہر تعلیم اور دانشور جناب پروفیسر عزیز مدنی، جناب پروفیسر ڈاکٹر فرحت حسین، پروفیسر چوہدری سہیل، پروفیسر صابری، پروفیسر عسکری، پروفیسر ڈاکٹر ضیاء عباس، پروفیسر ڈاکٹر کامران عباس، پروفیسر ڈاکٹر عدنان حسن اور فیس بک پر اپنی تحریروں سے شہرت پانے والے اظہر حسین عزمی کا تعلق بھی گولیمار سے ہی رہا ہے۔ ان کے علاوہ مشہور براڈکاسٹر جناب شعیب حزیں اور مسلم لیگی سیاستدان مولانا مالک اور الحاج شمیم الدین وغیرہ کا تعلق بھی گولیمار کے علاقے سے ہی تھا۔ معروف مصور احمد ہاشام کا تعلق بھی اسی بستی سے تھا۔ معروف گلوکار ایم کلیم اور یاور مٹکے والے قوال بھی اسی بستی کے سپوت تھے۔

المونیم کوارٹرز (سلور کالونی)

تحریر: عبدالرحمن سید

کیاآپ کو معلوم ہے کہ آج جس جگہ شارع فیصل پر FTC Building ہے، وہاں پر کبھی المونیم کوارٹرز ہوا کرتے تھے جنہیں سلور کالونی بھی کہتے تھے۔ پوری کالونی المونیم سے بنی ہوئی تھی۔ اور وہاں کے اندر کے راستوں پر جو کھمبے لگے ہوئے تھے ان پر مٹی کے تیل سے جلنے والی لالٹین لگی ہوئی تھیں۔ جو ہر شام کو جلائی جاتیں تھیں۔ اور صبح کو بجھادی جاتی تھیں۔

اب بھی جب کبھی اس طرف جاناہوتاہے تو میں وہاں کچھ دیر کے لئے اطراف کا جائزہ ضرور لیتاہوں، جہاں میرا سنہرہ بچپن گزرا تھا FTC Building کی طرف کھڑاہوکر سامنے سڑک پار دیکھتاہوں تو مجھے اے بی سینیالائن کی آبادی نظر آتی ہے، جہاں ایک چھوٹابازار میری نظروں کے سامنے گھوم جاتاہے، جہاں ایک شاپ کتاب کاپیوں کی بھی تھی۔ جس کانام غالبا "مسلم بک شاپ تھااور واپسی پر ساتھ ہی گورنمنٹ پرائمری اسکول تھا.

میرااسکول کاوقت سیکنڈ شفٹ یعنی دوپہر کے شاید 1 بجے تھا، میرااسکول بزرٹہ لائین میں تھاجو عائشہ باوانی اکیڈمی کے بالکل پیچھے تھا۔ ساتھ گوراقبرستان سے گزر کر جاناپڑتاتھا۔

مجھے یہ اسکول بالکل پسند نہیں تھا، وجہ وہاں کے شرارتی بچے تھے۔ جو وہاں مجھ پر بیتی اللہ کی پناہ پانچویں جماعت اور سن 1958 تھا۔
ایک سڑک FTC بلڈنگ سے کالاپل کی طرف نکلتی ہے، جو ریلوے لائن کے اوپر سے ہوتی ہوئی ڈیفنس سوسائٹی کو چھوتی ہوئی کورنگی لانڈھی کی طرف جاتی ہے۔ اب توکالاپل کی جگہ تھوڑاہٹ کرایک بڑاپل بنادیاگیاہے۔

کالاپل کے ساتھ نیوی کے خوبصورت گول بنگلوز بنے ہوئے تھے، جنہیں گول بنگلے کے نام سے یاد کیاجاتاتھا، وہاں پر تقریبا "ملٹری کا علاقہ تھا۔ اس لئے سارہ علاقہ صدر کینٹ می شمار ہوتاتھاکالاپل کے تھوڑاآگے ہی کراچی کینٹ کاریلوے اسٹیشن تھا۔ والد صاحب بھی فوج میں حوالدار کلرک تھےاور سب انہیں بابوبابو کہہ کر بلاتے۔

ہم بچوں کے توخوب مزے تھے فوجی علاقے کے باغ تھے جہاں آم اور امرود کے کافی درخت ہم بچوں کی توجہ کامرکز تھے.
ہم بچے اکثران باغوں میں گھسے رہتے تھے جب بھی ان کاموسم آتاتوآموں کو پکنے ہی نہیں دیتے تھے کچھ درختوں پر چڑھ جاتے۔ کچھ نیچے سے ہی پتھر مارمار کرکچے آم نیچے گرادیتے تھے۔ یہی حال امرود کا بھی ہوتاتھا۔ اکثرہم یہ حرکتیں بارش کے موسم میں کرتے تھے کیونکہ بارشوں میں باغوں کامالی اپنی کٹیامیں بندرہتاتھااور ہم بچوں کی توعید ہوجاتی تھی۔

المونیم کوارٹرز کے پیچھے پہلے ایک کچی آبادی تھی، مسلم کالونی یا مسلم سوسائٹی نام خود محلے والوں نے رکھ لیا تھا، وہیں پر ہماری رہائش تھی۔ چاروں طرف ملٹری کا علاقہ اور وہاں کے رہائشی کا بھی تعلق گورنمنٹ سے تھا کچھ فوجی بھی تھے، جیسے ہمارے ابا حوالدار کلرک تھے۔ شاید اس وقت نیا نیا پاکستان آزاد ہوا تھا، گورنمنٹ کی طرف سے ہر ایک کو وہاں جو آس پاس کے دفاتر میں کام کرتے تھے، انہیں اجازت مل گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے رہنے کے لئے مکان بنالیں، تو وہاں پر لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت مل جل کر اپنی ضرورت کے مطابق جگہوں پر کچے مکان بنالئے،

پاکستان کے ہر علاقے اور طبقے سے تعلق رکھنے والے اور انڈیا سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین بھی شامل تھے، جن میں ہم بھی تھے، ہمارا گھر ایک کونے میں تھا۔ اور اس گھر کا صحن بہت بڑا تھا، وہاں پانی بجلی کی سہولیات موجود نہیں تھی، وہاں پر کچھ کرسچن بھی آباد تھے.

کچی آبادی میں جب میں نے ہوش سنبھالا تو یہ سب کچھ دیکھا، والد صاحب نے گھر کے صحن کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک طرف سبزیاں اگالیں اور دوسری طرف بکریاں اور مرغیاں پال لیں.

ہمارے ابا ہر سال قربانی کے لئے ان ہی میں سے ایک بکرا خاص طور سے تیار کرتے تھے اور جس دن خاص مہمان آتے تو ایک یا دو مرغیاں بھی قربان ہو جاتی تھیں.

اکثر والد صاحب ایک بڑے پتیلے میں خود ہی پلاو تیار کرتے تھے، اور محلے میں اپنی گلی میں جو لوگ تھے، وہاں تک تو وہ بانٹ کر آتے تھے۔ کبھی گھر پر ہی بلا کر دعوت کرتے تھے.

وہاں پر ایک مسجد بھی ہے، جو اس وقت کچی تھی لکڑی کی بنی ہوئی تھی.

اب بھی وہ مسجد وہیں پر ہے مگر اب وہ ماشاءاللہ مکمل سنگ مرمر کی بن چکی ہے۔ چھوٹی مسجد ہے لیکن بہت خوبصورت ہے۔

سلور کالونی کی ایک خاص بات دیکھی کہ سڑکیں

بالکل صاف ستھری خوشگوار ماحول اس دور میں میونسپلٹی کا ادارہ بہت محنت سے کام کرتا تھا۔

بلکہ ہر محکمہ کو اپنی ایمانداری پر فخر تھا۔ ہر کام باآسانی ہو جاتا تھا۔

اس وقت ڈاکیہ گھر گھر دروازے تک خط پہنچاتا تھا وہ سائیکل چلاتا ہوا ہانپتے کانپتے محلے محلے گھر تک پہنچتا تھا۔ اس وقت ہمارے پاس شناخت کے لئے صرف راشن کارڈ ہوا کرتا تھا۔ جس پر تمام گھر کے افراد کے نام درج ہوتے تھے۔ اسی راشن کارڈ سے ہر سرکاری غیر سرکاری کام باآسانی ہو جاتے تھے۔ ماہانہ راشن ہمیں گورنمنٹ کے منظور شدہ راشن شاپ سے بہت سستے داموں پر مل جاتا تھا، جو ماہانہ ہر فیملی کے کوٹے کے مطابق فی کس افراد کے حساب سے ملتا تھا۔

سلور کالونی میں بھی ایک راشن شاپ تھا۔

پرانی یادیں انسان کو اپنا وقت یاد دلاتی ہیں کہ ہم پہلے کیا تھے اور آج اللہ کے فضل و کرم سے ہم کسی مقام پر ہیں، جس کا کہ جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

اس زمانے کی سادہ سی زندگی میں بس ایک خواہش ہماری تھی کہ ہمارے ہر کمرے میں بجلی کے بلب ہوں ٹیوب لائٹ ہو، پنکھے گھوم رہے ہو۔ ہماری خواہش اس وقت ابھرتی تھی جب ہم کسی سے ملنے گئے ہوئے ہوں اور وہاں بجلی ہو اور ہماری خواہش کے مطابق تمام لوازمات موجود ہوں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے انٹر کامرس 1968 میں عائشہ باوانی کامرس کالج سے مکمل کیا اور لالٹین کی روشنی میں پڑھا۔ امتحان دیا۔ میرے علاوہ سب بہن بھائیوں نے بھی المونیم کوارٹرز کے پرائمری اسکول میں پڑھا اور باقی بہن بھائیوں نے ھائیر سیکنڈری کے لئے PECHS کے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول سے میٹرک کلئیر بھی کیا۔

1968 میں ہی ہمارے والد صاحب نے شہر سے بہت دور ملیر میں مکان لیا۔ جہاں ہماری خواہش بجلی کی کمی پوری ہو گئی اور ہم سب بہن بھائی کا تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا کیوں کہ والد صاحب نے ہماری سب سے بڑی خواہش پوری کر دی تھی۔

ہمیں پہلے شہر جانے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ گورا قبرستان کے بس اسٹاپ سے بسیں ٹانگہ موٹر رکشہ 15 منٹ سے پہلے ہی صدر پہنچادیتے تھے المونیم کوارٹرز کے ساتھ ہی بس اسٹاپ تھا۔ کبھی ہم کالاپل سے شہر کی بس پکڑ لیتے مگر کالاپل تک پیدل جانا پڑتا تھا یہ بسیں لانڈھی کورنگی سے آتی تھیں۔

اس سے پہلے ہم ریلوے کینٹ اسٹیشن پہنچ جاتے وہاں سے ٹرام مل جاتی تھی۔ جو بعد میں بند ہو گئی۔ بہت اچھی سواری تھی۔ جب سے یہ علاقہ بدلہ ہر چیز سے دوری ہوتی چلی گئی بس سے شہر آنے کے لئے کم سے کم ایک گھنٹہ لگتا تھا۔ پھر تو اپنا پرانا علاقہ بہت یاد آنے لگا۔

پیر الٰہی بخش کالونی۔ایک مختصر جائزہ
(ایک بستی، تاریخ تہذیب تمدن و ثقافت)

تحریر: سید حسن ظہیر

بس اسٹاپ پیر کالونی کا قلب تھا کہ ابتداء سے آمد و رفت کا مرکز تھا اور یہاں کے رہائشیوں اور باہر کے لوگوں کے لئے پشت ہا پشت یادوں کے انمول ذخیرہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ کراچی کی بیشتر آبادی ۱۹۵۰ سے کم از کم ۱۹۹۰ تک پیر کالونی سے منسلک رہی ہے چاہے وہ پہلے وہاں رہے ہوں ہجرت کے بعد وہاں اترے ہوں کسی عزیز یا دوست کے پاس یا ان کے دوست اعزہ وہاں رہتے ہوں یا وہ پیر کالونی زبان و دہن کے چٹخارے لینے آتے ہوں۔ پیر کالونی کی مین روڈ ہو یا بسوں کے درمیانی پلیٹ فارم پر ڈھابا ہو یا سڑک کے کنارے ٹھیلے ہوں یا مختلف کاروبار کی دکانیں۔ مچھلی، کچوری، نہاری، پائے، سیخ کباب، سوپ، انواع و اقسام کی مٹھائیاں و پھل، دودھ دہی لسی، تندور کی خمیری روٹی ہو یا توے کی چپاتیاں یا پوریاں و پراٹھے و شیر مال و باقر خوانی اور ریستورانت کے لذیذ و مزیدار کھانے وغیرہ۔ کھیل کود کے میدان، کرکٹ ہاکی فٹبال والی بال کی مختلف ٹیمیں، ڈاکٹر و حکیم، اسپتال و کلینک، اسکول و کوچنگ سینٹر و مدرسے، لائبریریاں اور پرانی کتابوں کے خزانے، مساجد و امامباڑہ، بیکریاں ہوٹل و ڈھابے، ہر قسم کی ضروریات زندگی کی دکانیں ہوں۔ الغرض مکینوں کو ہر چیز میسر تھی۔ ایک اندازہ کے مطابق ۱۹۶۰ کی دہائی میں تقریباً ۲ مربع میل سے کم کا رقبہ اور زیادہ سے زیادہ ۲۵۰۰ کوارٹر اور ۱۲۰،۰۰۰ افراد سے کم کی آبادی۔ اب کیا کہیں کہ کالونی کی بستی ایک چھوٹی سی کائنات تھی جس کی ہمہ جہت ذہن و دہن کی کشش ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتی تھی! بس کیا کہیں کہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ عطار بگوید۔

تقسیم سے قبل سنٹرل جیل شہر سے باہر ہوتا تھا اور جمشید روڈ کے مکانات شہر کے آخر میں ہوتے تھے اس کے بعد سب کھلا علاقہ یا کھیت وغیرہ تھے۔ پاکستان آزاد ہونے کے بعد کراچی میں سب سے پہلے گورنمنٹ کوارٹر بنے تھے جو مارٹن کوارٹر، جہانگیر کوارٹر، پاکستان کوارٹر، کلے ٹن کوارٹر وغیرہ تھے جو حکومت نے سرکاری ملازمین کو مہیا کئے تھی۔ لیکن قیمت دے کر کوارٹر کی ملکیت ملنے والی غیر سرکاری پیر کالونی اپنی نوعیت کی یہ پہلی منظم بستی تھی کراچی میں جو ابتداء سے ہمہ رنگ تھی اور وہیں کے مکین اور قائدِ اعظم کے ساتھی پیر الٰہی بخش کے نام پر قائم ہوئی تھی خدا ان کو جنت میں محشور کرے آمین۔ بس اسٹاپ کے دوسری طرف کچی آبادی بننا شروع ہوگئی تھی جو جیل کی طرف پھیلنا شروع ہوگئی اور کالونی کی حدود سے باہر تھی اسی طرح مارٹن روڈ اور نفیس آباد و پریس کوارٹر و دیگر ملحقہ علاقے تھے۔ لیکن ضروریات زندگی، زبان و دہن کے چٹخارے اور بس کے سفر کے لئے وہاں کے رہائشی پیر کالونی کے بس اسٹاپ آتے تھے جو ایک مرکزی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

اس کائنات کا مزاج گنگا جمنی تہذیب کی طرح تھا۔ بہت بڑی اکثریت مہاجرین کی تھی جو ہندوستان کے صوبوں یوپی، سی پی، حیدر آباد، پنجاب، بنگال، کشمیر وغیرہ سے آئی تھی جہاں وہ پشتوں سے آباد تھے اور اکثریت زرعی زمین مکان دیگر جائیداد اور عزیزوں کو چھوڑ کر خستہ حال مادی اسباب سے مبّرا ایک نظریہ پاکستان کی خاطر سب کچھ قربان کیا اور ہجرت کرکے کراچی آگئے ایک نئی اجنبی جگہ مشکلات سے مزین اور صفر سے از سر نو زندگی شروع کی۔ گو مادی اسباب سے مبّرا لیکن مہاجرین اپنے ساتھ اپنی تہذیب تمدن و ثقافت، خاندانی اقدار، خودداری، عمدہ اخلاقیات، نشست و گفتار، رکھ رکھاؤ، لباس، کھانے و شادی بیاہ و دیگر روایات لائے تھے۔
لکھنؤ، دہلی، امروہہ، آگرہ، کشمیر، پنجاب اور دیگر شہروں سے لوگ آئے تھے۔ رواداری کے کیا کیا قصے بیان ہوں۔ کسی قسم کی مذہبی اور لسانی و دیگر عصبیتیں نہیں تھیں۔ ان لٹے پٹے خاندانوں نے انتہائی خندہ پیشانی سے ایک دوسرے کو قبول کیا کہ ان کے اپنے اعزہ بہت کم تھے اور یہ خاندان ایک دوسرے کے عزیز بن گئے۔ جینے مرنے میں ایک دوسرے کے ہمدم ہو گئے قرابتیں بڑھیں رشتہ داریاں قائم ہوئیں۔
پیر کالونی ابتداء سے بہت غریب پرور رہی ہے لیکن یہاں کے لوگ بااخلاق، علم دوست، مہمان نواز و ایثار کرنے والے تھے۔ تعلیم کا چرچا تھا، علم کو زیور سمجھتے تھے پیٹ پر پتھر باندھ کر بچوں بچیوں کو تعلیم سے آراستہ کرتے تھے اور ہر خاندان کے بچے و بچیاں اسکول کالج یا یونیورسٹی جاتے تھے اور اس معاملے میں لڑکے لڑکیوں میں فرق نہیں کرتے تھے۔ وہ لوگ کچھ عرصہ یہاں رہ کر اور بچت کر کے جب مستطیع ہوتے تھے تو بہادر آباد، PECHS، ناظم آباد و دیگر کو آباد کیا۔ اس بستی کے رہائشیوں نے بعد میں، اپنی تعلیم و کاوش یا اس تعلیم کے چرچے کے طفیل جوان کے ماں باپ نے ایثار کر کے ان کو دلوائی تھی، بہت نام پیدا کیا۔ کالونی کے گھروں میں نجی مشاعرے و موسیقی کی محفلیں ہوتی تھیں لیکن سب لوگ عبادات سے بھی غافل نہیں تھے اور خاموشی سے اپنی عبادات بجالاتے تھے۔ تعلیم و فنون لطیفہ بھی اپنے عروج پر پہونچے تھے۔ شاعر، اداکار، ادیب، صحافی، موسیقی، وغیرہ۔ مشتے نمونہ از خروارے مثلاً پیر الٰہی بخش، آل رضا، جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر ظفر سعید سیفی، کیپٹین حسن ظہیر شہید، عبدالوحید، منّور الزماں، افتخار سید، عشرت حسین، منور سعید، مقبول جعفر، راجہ صبح صادق و دیگر ایک بہت بڑی فہرست ہے جو طوالت کے باعث شامل نہیں ہے۔
گو پیر الٰہی بخش کالونی کا تاریخی احاطہ کرنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے لیکن اس مختصر بیانیہ کا مطلب اہالیان پیر الٰہی بخش کالونی کی نئی پشت کو یہ باور کرانا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد کراچی کی تاریخ میں پیر کالونی ایک اولین مثالی آبادی تھی جس پر ہم سب کو فخر ہونا چاہئے۔ ہم نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد کالونی سے ہجرت کی، دنیا کی دشت نوردی کی لیکن دل سے ابھی تک پیر الٰہی بخش کالونی کے باسی ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

شاہ فیصل کالونی کی مختصر تاریخ

تحریر: پروفیسر سید علی عمران

قیام پاکستان سے پہلے کا ڈرگ روڈ

یہ علاقہ دراصل کراچی کی ایک مشہور اور معروف سڑک ڈرگ روڈ کے نام سے موسوم تھا۔ یہ سڑک ایک انگریز کرنل ڈرگ کے نام سے منسوب تھی جس نے آرمی ڈپو تعمیر کروایا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران اس سڑک کے دونوں جانب فوجیوں کے لیے بیرکس اور اسٹور تعمیر کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ یہاں ایک ریلوے اسٹیشن بھی تعمیر کیا گیا تھا جو خالص فوجی مقاصد کے لیے تھا۔ 1920ء میں یہاں سول ہوائی اڈا بھی تعمیر کیا گیا تھا اور پھر دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں فوجی ہوائی اڈا بھی تعمیر کیا گیا۔

انگریزوں نے ہندوستانی فضائی فوج کو ڈرگ روڈ کے مقام پر ہی منظم کیا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس ہوائی اڈے کو ایک اور اعزاز بھی حاصل ہے کہ اسی ہوائی اڈے کے صدر دفتر میں قیام پاکستان کے بعد پاکستان کے پرچم کو لہرانے کی تقریب منعقد ہوئی تھی اور یوں پہلی بار پاکستان کی فضاؤں میں سبز ہلالی پرچم اسی ہوائی اڈے پر لہرایا گیا تھا۔

ہوائی اڈا بننے اور ریلوے اسٹیشن کہ قیام کی وجہ سے اس علاقے میں ایک چھوٹا سا قصبہ وجود میں آگیا تھا جو ڈرگ روڈ کی مناسبت سے ڈرگ کالونی کے نام سے مشہور ہوا تاہم اس کے علاوہ بھی کچھ گوٹھ یہاں پہلے سے موجود تھے۔

اس چھوٹے سے قصبے میں ایک گرجاگھر بھی تھا جو اب تک قائم ہے۔ اس کے علاوہ پارسیوں کا مرگھٹ بھی ریلوے اسٹیشن کے قریب قائم تھا جس میں سینکڑوں گدھ اور چیلیں منڈلاتے رہتے تھے تاہم یہ مرگھٹ قیام پاکستان سے بھی پہلے ختم کر دیا گیا تھا۔

قیام پاکستان کے بعد کی ڈرگ کالونی

قیام پاکستان کے بعد بہت بڑی تعداد میں ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں نے پاکستان کی جانب ہجرت کی یہ لوگ تعلیم یافتہ اور انتہائی ہنر مند تھے مگر اپنا سب کچھ ہندوستان چھوڑ آئے تھے اور سب نے اپنی زندگی صفر سے شروع کی۔ جب ان کی تعداد بڑھی تو ان لوگوں نے کراچی کے مضافات میں رہائش اختیار کرنا شروع کی۔ 1950 میں جب کمشنر کراچی نے آبادکاری پروگرام کے تحت وسیع اراضی پر پلاٹ ڈرگ کالونی میں چکور نالے (کسی زمانے میں اس نالے پر موسم سرما میں چکور آ کر بیٹھا کرتے تھے جس کی وجہ سے اس نالے کا نام چکور نالہ پڑ گیا) کے پاس زمین الاٹ کی تو لوگوں نے پہلے کچے مکانات بنانا شروع کیے۔ گھروں کی تعمیر کے لیے اکثر لوگ خود اپنے ہاتھوں سے مٹی کی کچی اینٹیں تیار کرتے اور گھروں کی چھتیں چٹائیوں سے بناتے۔ دروازے کھڑکیاں لگانے

کے اگر پیسے نہیں ہوتے تو ٹاٹ کی بوریوں سے پردہ بنا کر لگا دیتے۔ کھلے گھر میں خواتین کے پردے کے انتظام کے لیے ایسی بیلوں کے پودے زمین میں لگائے جاتے تاکہ یہ بیلیں پھیل جانے کے بعد پردے کا کام کریں۔ شروع شروع میں بجلی کا تصور بھی نا تھا اور لالٹین ہی پر گزارا تھا۔

1951ء میں چکوری نالے سے تھوڑا آگے جاکر سرکار نے باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ 80 گز کے کوارٹرز بنانا شروع کیے اور اسے ایک نمبر سے پانچ نمبر تک پانچ بلاکس میں تقسیم کیا۔ کراچی میں مہاجرین کے لیے قائم مختلف عارضی خیمہ بستیوں میں سے لوگ ان کوارٹرز میں لاکر بسائے گئے۔ ان کوارٹرز میں بسنے والے مہاجرین میں سب سے زیادہ بڑی تعداد الہ اباد سے آنے والے مہاجرین کی تھی اس کے علاوہ بہار، لکھنو، فتح پور، امروہہ اور دہلی وغیرہ سے آنے والے مہاجرین بھی یہاں بڑی تعداد میں آباد ہوئے۔

قیام پاکستان سے پہلے کی ڈرگ کالونی ہمیشہ سے کنٹونمنٹ بورڈ کے زیر کنٹرول تھی اور اب بھی کنٹونمنٹ بورڈ کے ہی انڈر آتی ہے اور یہ اب ایک بہت بڑی آبادی بن گئی ہے کینٹ بازار یہاں کا سب سے پرانا اور مشہور بازار ہے۔ اسی مناسبت سے یہ پورا علاقہ کینٹ بازار کا علاقہ یا اب بھی اسے ڈرگ روڈ کا علاقہ کہا جاتا ہے۔

گورنمنٹ کی طرف سے بسائی گئی کالونی میں 80 گز کے کوارٹرز اور کم رقبے پر دیگر رہائشی بلاکس کے علاوہ 400 گز کا رہائشی علاقہ بھی موجود ہے جس میں بڑے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ یہ یہاں کا پوش علاقہ ہے اور انتہائی منظم منصوبہ بندی کے ساتھ بنایا گیا ہے۔

جیکب لائن کے ایک گراؤنڈ میں جہاں خیمہ بستیاں آباد تھیں جب 1953ء میں برگیڈ تھانے کی بنیادیں پڑنے لگیں تو ان خیمہ بستیوں کو ختم کر کے تمام مہاجرین کو ٹرکوں میں بیٹھا کر ڈرگ کالونی میں ندی کنارے کہ علاقے میں دوبارہ خیمہ بستیاں لگا کر آباد کیا گیا۔ ندی کنارے اس جگہ پر صرف ریت ہی ریت تھی اسی مناسبت سے یہ علاقہ ریتا پلاٹ کے نام سے مشہور ہو گیا۔ شروع زمانے میں کئی دفعہ یہاں سیلاب بھی آیا اور آبادی کو نقل مکانی بھی کرنی پڑی۔ ریتا پلاٹ کی آبادی ہی میں سے زیادہ تر کو پھر پانچ نمبر میں بننے والے لال کوارٹرز جو محترمہ ام حبیبہ بیگم آغاخان (سوم) کی جانب سے بنائے گئے تھے اور سفید کوارٹرز جو سرکار کی جانب سے بنائے گئے تھے میں منتقل کیا گیا۔

1960 میں ڈرگ کالونی نمبر 3 میں ہاجرہ آباد کالونی کے نام سے کمشنر سید دربار علی شاہ نے سنگ بنیاد رکھا جس کی تکمیل پر محترمہ فاطمہ جناح نے مکینوں میں چابیاں تقسیم کی۔ اس وقت ایک کوارٹر کی قیمت 3 ہزار روپے تھی اور وہ بھی قسطوں میں وصول کی گئی۔ اس میں ایک کمیونٹی سینٹر بھی قائم کیا گیا جس کا نام معروف خاتون بیگم قیوم کے نام پر رکھا گیا۔ اسی طرح کا 4 نمبر میں بھی ایک کمیونٹی سینٹر کھوکھر کلب کے نام سے قائم ہے۔ اس کے علاوہ شاہ فیصل ایک نمبر پر مرکزی سڑک بازار کی صورت اختیار کر گئی ہے جہاں سب سے قدیم بازار سبزی گلی کے نام سے مشہور ہے۔ پرانے شمع سینما پر اب شمع شاپنگ سینٹر بنا دیا گیا ہے جو کالونی کا سب سے مشہور شاپنگ سینٹر بن گیا ہے۔

سپیریئر کالج والی ڈبل روڈ پر ہی اگے جا کر پشاوری چپلی کباب بہت مشہور ہیں اور لذیذ اتنے ہیں کہ شاید پشاور میں بھی ایسے لذیذ چپلی کباب نہ بنتے ہوں. اس کے علاوہ بمبئی بریانی، رحمان بیکرز، بمبئی بیکری، دہلی سویٹس اور امینیہ سویٹس بھی بہت مشہور ہیں.

کالونی کی ترقی میں سعید وارثی صاحب کا اہم کردار تھا جنہوں نے 1964ء میں مجلس سماجی کارکنان کے نام سے ایک تنظیم قائم کی تھی جبکہ اس کا دفتر ایک نمبر پر بنایا گیا تھا۔

ڈاکٹر قدسیہ شوکت عمر جو 1929ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی شادی کے 12 دن بعد ہی ان کے شوہر شوکت عمر کا انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر قدسیہ نے ان کی یاد میں 30 اگست 1960 کالونی میں ہی عید گاہ کے برابر میں شوکت عمر کے نام سے ایک ہسپتال قائم کیا۔ 1979ء میں انہوں نے اس ہسپتال کو فوجی فاؤنڈیشن کے حوالے کر دیا جو آج تک اسکے انتظام کو دیکھتا ہے۔

کچھ ذکر شاہ فیصل ٹاؤن کا

یکم ستمبر 1977 کو ڈرگ روڈ کا نام شارع فیصل اور 24 فروری 1979ء کو ڈرگ کالونی کا نام شاہ فیصل کالونی رکھ دیا گیا۔ یوں یہ پورا علاقہ شاہ فیصل کالونی کے نام سے مشہور ہو گیا تاہم کنٹونمنٹ کے اندر آنے والا علاقہ جو قیام پاکستان سے پہلے کا بنا ہوا تھا ڈرگ کالونی ہی رہا۔ پرانے لوگ اس پورے علاقے کو اب بھی ڈرگ کالونی کے نام سے ہی پکارتے ہیں۔

یہ علاقہ کراچی شہر کے شمال مشرق کی سمت میں واقع ہے۔ شاہ فیصل کالونی کا علاقہ ہمیشہ سے ضلع شرقی کا حصہ رہا ہے مگر 2000ء میں جب ضلعی نظام کو ختم کر کے ٹاؤن سسٹم متعارف کرایا گیا تو شاہ فیصل کالونی کو بھی ایک ٹاؤن بنا دیا گیا۔ یہ ٹاؤن ڈرگ روڈ کے اسٹیشن سے شارع فیصل اور نیشنل ہائی وے کے ساتھ ساتھ ملیر ندی تک تھا۔ اس طرح شاہ فیصل کالونی کی حدود بھی بڑھ گئی اور اس میں ملیر کے علاقے شمسی سوسائٹی، الفلاح، رفاہ عام، باغ ملیر جامعہ ملیہ اور باباولایت شاہ کے مزار سے ملیر ندی تک کے علاقے شامل کر دیے گئے۔ 2013ء میں جب ٹاؤن سسٹم کو ختم کر کے دوبارہ ضلعی نظام نافذ کیا گیا تو شاہ فیصل کالونی کو نئے بننے والے ضلع کورنگی کی ایک تحصیل کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ 2022 کے ضلعی ٹاؤن سسٹم میں شاہ فیصل ٹاؤن کو دوبارہ بحال کر دیا گیا ہے تاہم مور یہ خان گوٹھ کو اب ملیر میں شامل کر دیا گیا ہے یہ وہی گوٹھ ہے جس میں ہندو برادری کی بھی کافی گھر موجود ہیں اور وہ اپنے تمام رسم و رواج اسی جگہ منعقد کرتے ہیں۔ اس کے شمال مشرق میں ملیر، مشرق میں بن قاسم ٹاؤن، جنوب میں لانڈھی اور کورنگی ہیں جبکہ شمال مغرب میں فیصل کنٹونمنٹ واقع ہے۔

شاہ فیصل ٹاؤن کے مختلف علاقے

شاہ فیصل ٹاون میں ایک نمبر سے پانچ نمبر تک کے علاوہ سادات کالونی، ناتھا خان گوٹھ، ریتا پلاٹ، عظیم پورہ، گرین ٹاؤن، گولڈن

ٹاؤن، پنجاب ٹاؤن، وائرلیس گیٹ، شمسی سوسائٹی، رفاہ عام سوسائٹی، الفلاح سوسائٹی، باغ ملیر، باباولایت شاہ کے مزار کا اطراف، گوہر گرین سٹی، ملت ٹاؤن، گلفشاں سوسائٹی، پنجاب ٹاؤن، آصف اباد، سلمان فارسی سوسائٹی، بلال ٹاؤن، جامعہ ملیہ اور اس سے ملحقہ رفیع بلڈرز کی مختلف سوسائٹیز اور ملیر ندی تک کے دیگر گوٹھ جن میں خاص طور پر قدیم جمعہ گوٹھ اور صدیق گوٹھ شامل ہیں۔

اس ٹاؤن کی ایک اور بڑی پہچان یہ بھی ہے کہ اس میں جامعہ ملیہ کے پیچھے اور ملیر ندی کے ساتھ پاکستان کی دو معروف ترین حویلیاں بھی تھیں جن میں سے ایک نواب آف بہاولپور نواب صادق عباسی کی تھی. اسی حویلی میں قائداعظم محمد علی جناح نے بھی کئی دفعہ قیام کیا ہے. مگر اب اس تاریخی حویلی کے باغ کو ختم کر کے اسی کی زمین پر گوہر گرین سٹی قائم کی گئی ہے جبکہ اصل حویلی کی عمارت کو اب بھی اسی حالت میں قائم رکھا گیا ہے سنا ہے کہ اس میں آڈیٹوریم اور جمنازیم بنایا جائے گا. اس حویلی کے بالکل سامنے بھوپال ہاؤس ہے جہاں بھوپال کی شہزادی عابدہ سلطان قیام پاکستان کے بعد سے اپنی وفات تک رہائش پذیر رہیں اور ان کی قبر بھی یہیں موجود ہے.

PCB کے سابق چیئرمین شہریار خان انہی کے فرزند ہیں.

جامعہ ملیہ کے پاس حاجی نورالدین بلوچ صاحب کی قدیم حویلی بھی تھی جن کے نام سے قدیم نورالدین گوٹھ بھی آباد ہے۔

تعلیمی ادارے

شاہ فیصل کالونی میں پہلا اسکول حیدرآباد دکن کی بہادر یار جنگ سوسائٹی کی جانب سے ایک پرائمری اسکول مدرسہ تحتانیہ کے نام سے موجودہ ایک نمبر اور دو نمبر کے درمیان چورنگی کے پاس قائم گیا تھا۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب عبدالحمید صاحب اسکول ختم ہونے کے بعد جو عام طور پر سفید شیروانی اور جناح کیپ پہنتے تھے ڈرگ کالونی کی گلیوں میں گھومتے اور کھیلتے ہوئے بچوں کے والدین تک پہنچتے اور انہیں اس بات پر راضی کرتے کے بچوں کو اسکول داخل کروایا جائے۔ اسی سکول میں ایک اور استاد جناب عبدالکریم صاحب امتحانات کے قریب بچوں کو گھر بلا کر بلا معاوضہ تیاری کرواتے۔

موجودہ دور میں شاہ فیصل کالونی کی تعلیم کے فروغ میں سب سے اہم کردار سپیریئر کالج، خورشید گرلز کالج اور گورنمنٹ کالج برائے خواتین پانچ نمبر شاہ فیصل کالونی کا ہے۔ شاہ فیصل کالونی سے لے کر ملیر تک کے رہائشیوں کی ایک بڑی تعداد انہی دو کالجوں سے وابستہ رہی ہے۔ اس سلسلے میں خورشید گرلز کالج کی ایک سابقہ پرنسپل پروفیسر زینت ابتہاج کا کردار بہت اہم ہے۔

ان 3 تعلیمی اداروں سے بھی پہلے پورے مضافاتی علاقے میں جس ادارے کا سب سے اہم کردار رہا ہے وہ اسی ٹاؤن کے علامہ اقبال کالج کا ہے جو پہلے اسٹار گیٹ کے پاس واقع تھا اور پروفیسر حسنین کاظمی نے اپنے رفقاء کے ساتھ 1966ء میں قائم کیا تھا۔

2002ء میں اس کالج کی گرلز کو شاہ فیصل 2 نمبر پر جامعہ حمادیہ کے برابر میں گرلز کالج کے لیے بنائی گئی نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔ پرانی عمارت میں اور نئی عمارت میں بھی ایک طویل عرصے تک پروفیسر نوشابہ صدیقی پرنسپل رہیں۔ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ

ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں کو منعقد کرانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔
جامعہ ملیہ کا قیام مولانا محمد علی جوہر نے 1920ء علی گڑھ میں کیا تھا جسے بعد میں دہلی منتقل کر دیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر محمود حسین نے 1948ء میں جامعہ ملیہ کے سابق طالب علموں کی ایک تنظیم بنا کر جامعہ ملیہ کے ہی نام سے بڑی اراضی حاصل کی اور مختلف تعلیمی ادارے کھولے۔ موجودہ ضلع ملیر اور ضلع کورنگی کی تعلیمی ترقی میں اس ادارے کا کلیدی کردار ہے۔ ڈاکٹر محمود حسین کی قبر بھی جامعہ ملیہ کے احاطے میں موجود ہے۔
ان بڑے تعلیمی اداروں کے علاوہ شاہ فیصل ٹاؤن میں ہر بڑے اسکول کی برانچ موجود ہے۔ اس کے علاوہ نجی شعبے کے تحت قائم تعلیمی اداروں میں برائٹ سکسیس کوچنگ سینٹر، فارابی کوچنگ سینٹر اور آدم جی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں تاہم ماضی میں العمر کوچنگ سینٹر اس علاقے کا سب سے بڑا کوچنگ سینٹر تھا مگر اب برائٹ سکسیس کوچنگ سینٹر اس علاقے کا سب سے بڑا کوچنگ سینٹر ہے۔ جبکہ جامعہ فاروقیہ، جامعہ حمادیہ، مدرسہ قادریہ سبحانیہ اور دارالعلوم مدرسہ روحانیہ اسلامیہ جیسے بڑے مدارس بھی شاہ فیصل ٹاؤن میں واقع ہیں۔

معروف شخصیات

شاہ فیصل میں رہائش اختیار کرنے والے معروف ادبی لوگوں میں حمایت علی شاعر، ڈاکٹر ہلال نقوی، سرشار صدیقی، منظر ایوبی، سرور بارہ بنکوی، سید یاور مہدی، اوج کمال، شعیب ناصر، ساقی امروہوی، ابرار حسین اثر سلطان پوری، چھجن صاحب، جعفر ددا، اطہر نفیس، مختار حیات، امداد نظامی، وقار صدیقی، رحمان کیانی، مسلم ضیائی، عارف رئیسی، عظمت بلگرامی، رفیق عزیزی، خالد حمیدی، مذاق رامپوری، رسوا میر ٹھی، مرزا عالمگیر قدر، فضل فتح پوری_پروفیسر ظل صادق، کوثر الہ ابادی، نصیر الدین حیدر اور رفیع احمد فدائی (جن کے نام سے شوکت عمر ہسپتال کے پیچھے کی روڈ موسوم ہے) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن مفاد نسواں کی بیگم باجی، پی ائی اے کی مزدور یونین کے صدر طفیل عباس، معروف ہاکی کے کھلاڑی سمیع اللہ، کلیم اللہ، سلیم شیروانی اور شہناز شیخ جبکہ کرکٹر توصیف احمد اور معروف بینکر زیارت علی کا بھی شاہ فیصل کالونی مسکن رہ چکا ہے۔
پروفیسر ڈاکٹر شکیل اوج، مولانا سلیم اللہ خان، مولانا عبدالسبحان قادری، پروفیسر ضیاء اللہ صدیقی، پروفیسر عطااللہ حسینی، جسٹس اقبال رضوی، پروفیسر ڈاکٹر صلاح الدین قادری، پروفیسر ریاض احمد بدایونی، پروفیسر ناصر عباس، پروفیسر محمد کاظم، پروفیسر ذکااللہ صدیقی، پروفیسر سیف اللہ، پروفیسر قاسم قمر، پروفیسر اقبال انصاری، پروفیسر مسعود احمد فاروقی، پروفیسر چودھری احسان اللہ، پروفیسر ڈاکٹر طاہر علی، پروفیسر اقبال، پروفیسر ڈاکٹر صبا زہرا، پروفیسر نصر اقبال، پروفیسر حامد، پروفیسر عاکف، پروفیسر ڈاکٹر عدنان احمد، پروفیسر ڈاکٹر اسماعیل بدایونی، پروفیسر طہ عباس، پروفیسر سعید الرحمن، پروفیسر بوفہیم عبدالرحمن، پروفیسر مدثر اس کے علاوہ معروف سیاست دان کنور قطب الدین، صحافی ہمایوں ظفر اور اداکار وکیل فاروقی کا تعلق بھی شاہ فیصل ٹاؤن سے ہی ہے۔

لالو کھیت کی کہانی

اقبال مانڈری والا

آج شہر کا وسط کہلاتی یہ بستی کرنال کے نواب خانوادے کے اعلیٰ فطرت چشم وچراغ نے ہندوستان سے چلے آرہے قافلوں کے قافلوں کی آبادکاری کا چیلینج قبول کرتے ہوئے بسائی، اسے بسانے کے لئے شہر کا جو خطہ پسند کیا وہ پہلے سے آباد شہر کی پرلی جانب تھا، شہر کی زمین کے عین درمیان سے چلی آرہی لیاری ندی کے ایک جانب شہر تھا تو دوسری جانب وہ علاقہ جسے نہ تو شہر اور نہ ہی مضافات کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا، ویران اور اجاڑ لق ودق، کیکر سے بسا میدان، جہاں خاک اڑتی تھی، بہت بڑا علاقہ اگر آباد بھی تھا تو زیرزمین اسلئے کہ شہر کے مکین جب انتقال فرماتے تو انکی تدفین ندی کے اس پار بسائے گئے میوہ شاہ کے قبرستان میں ہوتی گویا ندی کے ایک جانب ''ہوتے'' تھے تو دوسری جانب ''سوتے''نوابزادہ لیاقت علی خاں نے سونے والوں کی زمین کو جاگنے والوں کی سرزمین بنانے کی بنیاد رکھی اور یہ سرزمین جاگی تو ایسی جاگی کہ دن تو آباد رہارات کو بھی دن کا ساسماں برپا ہو گیا۔

نواب زادہ صاحب نے ''کے آئی ٹی''یعنی کراچی امپروؤمنٹ ٹرسٹ بنایا جو آگے چل کے ڈی اے کی صورت اس شہر کی آبادکاری اور ترقی کا مستقل عنوان بن گیا، اسکے سربراہ سید امیر اعظم خاں صاحب تھے جنکی محنت شاقہ نے بہت جلد وہ دن دکھلا دیے جب ہزاروں خانہ بربادوں کو سر چھپانے کا ٹھکانہ میسر آگیا۔ ۸۰ گز پر بہت بڑی تعداد میں کچی دیواروں پر اٹھے ٹین کی چھتوں سے بنے کوارٹرز جو در و دیوار سے بے نیاز چٹائیوں میں لپٹے ہوئے تھے، قضائے حاجت کے لئے گھر سے دور انتظام، پانی، بجلی اور رسائی آب کی مستقل بے سروسامانی، مگر ہمت جواں اور حوصلے بلند، وہ دن ان قسمت کے ماروں نے کیسے گزارے اور لالو کھیت کیسے آباد ہوا، یادوں کی جھلمل کرتی چلمن بہت کچھ بیان کر جاتی ہے۔ایک تحریر میں شاہد منصور صاحب نے ان دنوں کو یاد کیا ہے، انکے بقول لالو کھیت کے اس ویرانے میں وہ لوگ آباد تھے جو ہندوستان میں بھرے پرے گھر اور آباد بستیاں چھوڑ کر آئے تھے، جب تک تین ہٹی کا پل تعمیر نہیں ہوا تھا صدر جانے کے لئے ندی میں اتر کر جانا پڑتا تھا، دن شہر میں تلاش معاش یا پھر دفتروں میں گزرتا تھا، پہلے تو پانی ہی نہیں تھا جب میونسپلٹی کے نل لگ گئے تو یوں تو آسانی ہوگئی مگر زندگی پھر بھی کٹھن ہی رہی، راتیں پانی کے حصول کے لئے مشترکہ نل پر لائن لگانے، باری کے لئے آپس میں جھگڑنے اور وقفے وقفے سے نیند کی جھپکیاں لینے میں گزرتی تھیں، مگر لوگوں نے حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا تھا۔

'لالو کھیت کے کھانے'

تحریر: شاہد نواب

گول گپے

کسی کا منہ کھلوانا ہو تو اُسے گول گپے کھلا دیجئے. آج کے لیاقت آباد میں شاکر کے گول گپوں کی دنیا بھر میں دھوم ہے. لالو کھیت میں اس نے ٹھیلے پر گول گپے بیچنا شروع کئے. آج بھی ملک کے سب سے بڑے شہر میں گلی گلی ٹھیلوں پر گول گپے بیچے جا رہے ہیں. احمد رشدی کا گانا 'گول گپے والا' بجا کر یہ محلے والوں کو اپنے آنے کی اطلاع دیتے ہیں. کوئی گول گپے نہ بھی کھائے تو یہ گانا شوق سے سُنتا ہے. زمانہ ہوا اسٹوڈنٹ بریانی, مزے دار حلیم والے بھی لالو کھیت کے گول گپے والے کی طرح ٹھیلہ ہی لگاتے تھے. پھر رازق ان پر ایسا مہربان ہوا آج ان سب کا ایک بہت بڑا کاروبار ہے. ماشاءاللہ. کچھ مہینے پہلے صوبائی و مقامی حکومتوں نے ٹھیلوں پر پابندی لگا دی. اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں. یوسف ٹھیلے والے کے انکشافات, یا پھر کوئی ایک ٹھیلے سے بڑا بزنس مین نہ بن جائے.

میر صاحب کی مچھلی

لالو کھیت میں کرفیو لگا ہوا تھا. نوجوان گلی میں گھومتے رہتے. پولیس فوج آتی تو بھاگ جاتے. لالو کھیتی لڑکے کرفیو ہو یا کرونا کب رکے ہیں. گھر میں کب ٹکے ہیں. میر صاحب بھی ان دنوں میں مین روڈ پر تو نہیں, چُھپ کر لالو کھیت اے ایریا کی گلی کے نکڑ پر توے پر مچھلی بیچ رہے ہوتے تھے. ایک دن شور ہوا بھاگو, سب دوڑے تو نہ پیچھے مڑ کے دیکھا اور نہ میر صاحب کے توَے اور مچھلی کو, پیروں تلے اسے گراتے ہوئے نکل لیے. میر صاحب جیسی لذیذ مچھلی اب نہیں ملتی. اس کی قیمت زیادہ نہیں تھی. رش اتنا ہوتا تھا کہ کافی دیر بعد نمبر آتا تھا.

کٹاکٹ مچھلی

ایک ڈاک خانہ تھا لالو کھیت میں. اب لیاقت آباد میں یہ نہیں, مرکزی امام باڑے کے ساتھ ایک پوسٹ آفس ہے. کٹاکٹ کی آوازیں آج بھی سُنائی دیتی ہیں. اچھے کھانے ان علاقوں میں جانے پر مجبور کر دیتے ہیں جہاں آپ جانا نہیں چاہتے. اُن میں کی ایک یہ لالو کھیت کی کٹاکٹ مچھلی ہے.

حکیم صاحب کے گولا کباب

"کچے دھاگے پل میں ٹوٹ جاتے ہیں" حکیم صاحب کے کبابوں میں مصالحوں کے ساتھ دھاگے بھی چڑھے ہوتے ہیں. اب یہاں تکہ, ملائی بوٹی بھی دستیاب ہے. کٹاکٹ مچھلی اور حکیم صاحب کے گولا کباب کی دکان مین ڈاک خانے پر برسوں سے قائم ہیں. انہی

کے پاس بسم اللہ کا بڑا اچھا پایاہوٹل پر ملتا تھا. ابا کی وفات کے بعد اب ٹھیلے پر بیٹا بیچتا ہے. والدِ مرحوم ذائقہ اپنے ساتھ لے گئے. لالوکھیت میں کچھ لوگ ہوٹل سے ٹھیلے پر بھی آئے ہیں. آج اگر پایا کھانا ہو تو نارتھ کراچی میں عدنان قریشی کا کھایئے. کس پائے کے پائے ہیں. بتایئے گا ضرور.

چٹنی

لالوکھیت کے ان روایتی و قدیمی کھانوں میں ان کی چٹنی کا بڑا دخل ہے. 'وجودِ چٹنی سے ہے ان کھانوں میں رنگ' پیپلز کالونی کا بند کباب والا ہو, برنس روڈ کا بند کباب والا یا بمبئی نمکو گلبرگ والا. سب اپنی چٹخارے دار چٹنیوں کی وجہ سے چھائے ہوئے ہیں. اللہ اور برکت دے.

مسکا بند

گھر کے پُرانے اور بے تکلف ملازم کو پیسوں کی ضرورت تھی. وہ ناشتہ لے کر آیا اور بولا, صاحب آپ بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں, نظر اتار دوں؟ صاحب بولے, مکھن ڈبل روٹی پر لگاؤ. کراچی میں مسکا بند بہت مشہور تھا. لالوکھیت میں بہت کھایا جاتا تھا. بند پر مکھن لگا کر اسے اس طرح کاٹا جاتا تھا کہ انگلیوں کی طرح کونے پر چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے, پھر ذرا بڑے اور درمیان میں سب سے بڑا پیس. لالوکھیت میں جب دوستوں میں مسکا بند آتا تو جو زیادہ پیسے دیتا تھا یا اسپانسر ہوتا تو بیچ والا پیس اُسی کو دیا جاتا. لالوکھیت میں چائے کے ساتھ گرم تندوری روٹی کھانے کا رواج تھا. بند نہ ملے تو روٹی پر ہی مکھن لگایا جانے لگا.

ماموں کے چھولے

بہت سے مومنین آج بھی سی ون ایریا لیاقت آباد کی اثناء عشری مسجد میں عیدین کی نماز پڑھنے آتے ہیں. اس کے بالکل سامنے روڈ پار کر کے ایک گلی جاتی ہے جہاں آگے جا کر پینتالیس سال پہلے ماموں چھولے والے اپنا ٹھیلہ لگاتے تھے. اب ان کے بیٹے اور پوتا یہاں ہوتا ہے. ماموں جب اپنے ٹھیئے پر جانے کے لیے گھر سے نکلتے تھے تو خریدار راستے ہی میں چھولے لینے کے لیے جمع ہو جاتے لیکن وہ غصہ کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے. بزرگ, خواتین اور بچوں کو راستے میں ہی دے دیا کرتے تھے. ممکن ہے کسی صحافی کو بھی اس طرح دیا ہو تو آج جو حکومت کی طرف سے کئی موقعوں پر جنھیں استثنٰی دیا جاتا ہے یہ لالوکھیت کے ماموں چھولے والے بہت پہلے دے چکے. ان کے چھولوں کی خاص بات جو ماموں کو دوسروں سے الگ کرتی تھی اور اب بھی کرتی ہے وہ ہے ان کی لال کٹی ہوئی مرچیں. لالوکھیت نرسری کے سعید چھولے والے اور بی ون ایریا کے نعیم بھائی ماموں کے شاگرد تھے. پروردگار استاد اور شاگردوں کی بخشش کرے. آمین.

پکی پکائی تازہ روٹی

بھٹو صاحب کے دور میں سرکاری اسکولوں میں دودھ فری میں بٹتا تھا. کچھ عرصے بعد پکی پکائی تازہ روٹی متعارف کروائی گئی. بابو کی عرفیت والے لالوکھیت میں سینکڑوں تھے. اُن میں کا ایک بابو حلیم والا بھی تھا جو سادہ بریانی کے ساتھ حلیم روٹی سندھی ہوٹل پر گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول اور دوسرے اسکولوں کے باہر بیچا کرتا تھا. اسی طرح ایک چڑچڑے بڑے میاں اسکولوں کے باہر دہی بھلے اور چھولے بیچتے

تھے. بابو کا تو معلوم نہیں یہ بڑے میاں جب چھولوں کے ساتھ پکی پکائی تازہ روٹی لڑ کے کھاتے توان کو یہ روٹیاں کھانے سے منع کرتے تھے. بولتے تھے مت کھایا کرو شادی کے قابل نہیں رہو گے.
پکی پکائی تازہ روٹیوں کا ایک پیکٹ ایک روپے میں ملتا تھا جس میں پانچ روٹیاں ہوتی تھیں. عمدہ روٹی تھی پراٹھے بنانے کے بھی کام آتی تھی. آج اس کے کھانے والے زندہ ہیں. ان کے بچے بھی ہیں. پوتے پوتیاں, نواسے نواسیاں بھی. مولاان سب کو سلامت رکھے.
آمین

مُلاجی کا حلوہ پراٹھا

شیش محل لالوکھیت پر مُلاجی کا حلوہ پراٹھا سب سے منفرد تھا. کلونجی والی آلو کی ترکاری, آج کی کئی پوریوں کے برابر ایک پراٹھا. چاہیں تو پورا خریدیں ورنہ لوز میں بھی ملتا تھا. حلوے کا ذائقہ اور رنگ سب سے جُدا. مُلاجی سیاست, ادب, مذہب پر بھی خوب بولتے تھے. گرج دار آواز تھی. شب برأت کے موقع پر لوگ بطور خاص ان سے حلوہ لیتے تھے.
دو دن سے سوشل میڈیا, واٹس اپ پر لوگ معافیاں مانگ رہے ہیں شب برأت ہے معاف کردو. سلسلہ اتنا بڑھا کہ کہنا پڑا, یار بس اب آپ ہمیں معاف کردو. کرونا کی وجہ سے اس سال شب برأت پر چنے کی دال کا حلوہ بہت گھروں سے آیا. یہ لالوکھیت کی روایات میں سے ایک ہے. جنھیں بلا ضرورت گھر سے نکلنے پر پولیس ورینجرز نے پکڑا ان گھروں سے سوجھی کا حلوہ بانٹا گیا.

ابو کا گولا گنڈا

تین قدم کے رن اپ اور لٹکی ہوئی توند کے ساتھ فاسٹ بولنگ. یہ ہیں, عبداللہ. پیار سے لالوکھیت بی ایریا, بی ون ایریا اور دوسری جگہوں والے ابو کہتے تھے. کرکٹ سے کوئی روزگار نہیں ملا تو ابو نے دل برداشتہ ہو کر سردیوں میں چھولے اور گرمیوں میں گولا گنڈے کا ٹھیلا لگانا شروع کیا. (ڈیڑھ سال پہلے ڈیپارٹمنٹ کرکٹ بند ہوئی تو محکموں نے اپنی کرکٹ ٹیمیں بند اور سینکڑوں کرکٹرز فارغ کردیئے. کسی نے کریم تو کسی نے سوزوکی چلائی. آخری خبریں آنے تک کسی نے ابھی تک گولا گنڈے کا ٹھیلا نہیں لگایا) ابو اپنی خوش مزاجی کی وجہ سے لوگوں میں مقبول تو تھے ہی مگر ان کے گولے گنڈے کے خاص شربت کی شہرت دور دور تک گئی. ابو روزلی مارکیٹ جاتے تھے (کھویا لینے) گڑ اور کھوئے کے ملاپ سے بنا شربت گولے گنڈے پر چھڑکتے تھے تو لوگ اسے مزے لے کر چوستے تھے. ان کا بھانجا اب یہ ٹھیلا لگاتا ہے. بہت عرصہ ہوئے شب برأت کو ابو کا انتقال ہو گیا.
پروردگار آپ کے ہمارے اور تمام مرحومین, شہدائے پاکستان کے درجات بلند فرمائے. آمین

کورنگی اور لانڈھی کی مختصر تاریخ

تحریر: پروفیسر سید علی عمران

کچھ ذکر کورنگی کے نام کا

کورنگی کے معنی ہندی زبان میں الائچی کے ہیں۔ اس نام کی مناسبت سے دو مفروضے قائم کیے جا سکتے ہیں۔
ایک تو یہ کہ کورنگی کی بندرگاہ سے کسی زمانے میں الائچی کا کاروبار ہوتا ہوگا یا پھر یہاں الائچی کی کاشت ہوتی ہوگی۔ مگر یہ دونوں باتیں یہاں کے طبعی حالات کے پیش نظر ناممکن ہیں۔ تیسری بات یہ ہو سکتی ہے کہ یہ کسی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ "کارنجا" یا "کرنجا" نام کی برصغیر میں 9 بستیوں کا ذکر ملتا ہے۔ "کارنجا" کے معنی تالاب یا پانی کی نالی یا کھاڑی کے دہانے کے ہیں۔ اس کے علاوہ کورنگی "کارنج" کی ایک بگڑی ہوئی شکل بھی ہو سکتی ہے۔ "کارنج" کے نام سے برصغیر میں 6 بستیاں آباد ہیں۔ جبکہ "کارنگ" کے نام سے برصغیر میں 5 بستیوں کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح سے "کارنگا" کے نام سے بھی برصغیر میں 3 بستیوں کا ذکر ملتا ہے۔ جبکہ "کورنگ" کے نام سے بھی 2 بستیاں موجود ہیں۔ "کورنگ" فارسی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد لال رنگ کا گھوڑا اور افواج کی مشق کا میدان ہے۔ اسی طرح سے "کورنگا" بھی فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی گھوڑوں کی خلیج یا گھوڑوں کا میدان ہے۔
کورنگی "رنگھوں" کی بگڑی ہوئی شکل بھی ہو سکتی ہے جس کے معنی زمینی راستہ یا خرگوش کے رہنے کی جگہ کے ہیں۔ ان سب کے علاوہ کورنگی "کورگی" سے بھی بہت قریب ترین معلوم ہوتا ہے جبکہ "کورگی" نام کی ایک قوم پرانے زمانے میں کراچی اور اس کے گردونواح میں آباد تھی اور اس قوم کا پیشہ سمندری قزاقی تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ سندھ میں گھوڑوں کو پال کر ان کا کاروبار کیا جاتا تھا۔ کراچی کے ساحل سمندر سے گزرنے والے جہازوں کو لوٹا جاتا تھا یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے۔
ریسرچ اسکالر پروفیسر امر گل کے نزدیک بلوچی زبان میں ندی کو کور کہتے ہیں اور ونگی کا مطلب ہے ندی کے پانی کے بہاؤ کے ایک حصے کو زمین کی طرف موڑنا، تاکہ وہ آس پاس کی زمینوں کو سیراب کر سکے۔ چونکہ ندی کا پانی زرخیزی کے لیے بہترین ہے، اس لیے ماضی میں ایسی 'ونگیاں' بنائی جاتی تھیں۔ کورونگی، ندی کا وہ حصہ تھا، جہاں یہ ونگی بنائی گئی تھی، اس لیے یہ علاقہ کورونگی کہلاتا تھا، جو اختصاراً کورنگی بن گیا۔
کورنگی ملیر ندی کے دوسرے کنارے پر آباد ہے اس لحاظ سے خلیج کورنگی فوجی لحاظ سے بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ دوسری عالمی

جنگ کے دوران یہاں ایک ہوائی اڈہ بھی تعمیر کیا گیا تھا جو برطانوی افواج کے لیے نہایت موزوں ثابت ہوا تھا۔ یہ ہوائی اڈا اب کورنگی کریک کا ہوائی اڈا کہلاتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کورنگی کا علاقہ کئی گوٹھوں پر مشتمل تھا مگر یہ ایک دوسرے سے بہت دور دور تھے اور آبادی انتہائی کم تھی۔

کچھ ذکر کورنگی کی تعمیر کا

قیام پاکستان کے بعد 1956ء میں مہاجرین کو کورنگی K ایریا میں سب سے پہلے لاکر آباد کیا گیا۔ یوں کورنگی میں مہاجرین کی سب سے پہلی آبادی K ایریا میں قائم ہوئی۔

1958 میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد فوجی حکومت نے تقسیم کے وقت ہندوستان سے آنے والے مہاجرین پر خصوصی توجہ دی۔ اس مقصد کے لئے لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان کو آبادکاری کے مرکزی وزیر کی ذمہ داریاں سونپی گئی جو پہلے ہی سے مہاجرین کی آبادکاری پر کام کر رہے تھے۔ انہیں ہنگامی بنیادوں پر مہاجرین کی مزید آبادکاری کی ذمہ داریاں دی گئیں۔ اعظم خان صاحب نے اس چیلنج کو قبول کیا اور اس سلسلے میں ایک بڑا کارنامہ انجام دیا جو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔ آپ نے کورنگی کے مقام پر آٹھ ماہ کے اندر 15 ہزار مکانات تعمیر کرائے۔ 5 دسمبر 1958ء کو صدر پاکستان ایوب خان نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا اور یکم اگست 1959ء کو ٹھیک 8 مہینے بعد اس بستی کا افتتاح کیا۔ آپ نے افتتاح کے وقت کورنگی کی اس نئی آبادی کے پہلے مکین جناب حاجی عظمت اللہ کو ان کے مکان کا الاٹمنٹ آرڈر اور راشن کارڈ عطا کیا۔ کورنگی کا علاقہ 3000 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی تعمیر میں اس وقت بارہ کروڑ روپے خرچ ہوئے جبکہ اس کا نقشہ یونان کے مشہور ماہر تعمیر نے تیار کیا تھا۔ یہ وہی ماہر تعمیر تھا کہ جس نے نارتھ ناظم آباد کا نقشہ بنایا تھا۔ اس ماہر تعمیر نے اپنے تمام تر تجربے کو بروئے کار لا کر کورنگی کا نقشہ بنایا تھا اور بڑی پلاننگ سے آبادکاری کی گئی تھی۔ ہر سیکٹر میں مارکیٹ، اسکول، پارک، کھیلوں کے میدان، لائبریریز اور کمیونٹی سینٹر کے لیے باقاعدہ جگہ مختص کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ کشادہ ڈبل روڈز اور ان کے ساتھ ساتھ سروس روڈز بھی موجود تھیں۔

کورنگی میں 80، 120 اور 128 گز کے کوارٹرز بنائے گئے تھے۔ 128 گز کے کوارٹرز کی لین میں گندی گلیاں نہیں تھیں جب کہ کواٹرز بھی دو طرح سے بنائے گئے تھے ایک 1/2 روم جس میں ایک کمرہ اور ایک برآمدہ شامل تھا جبکہ دوسرا ڈبل روم کا تھا جس میں 2 کمرے اور ایک برآمدہ شامل تھا۔

120 گز کے کوارٹر کی لائن میں گندی گلیاں دی گئی تھیں۔ ہر مکان میں ایک کمرہ اور ایک برآمدہ دیا گیا تھا۔ 80 گز میں سنگل کمرہ ہوا کرتا تھا یعنی برآمدہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ تینوں قسم کے کوارٹرز میں ایک باورچی خانہ، ایک غسل خانہ اور ایک واش روم شامل تھا۔ باورچی خانے میں ایک چمنی بھی دی گئی تھی تاکہ دھواں اوپر کی جانب نکل جائے جو کہ چھت پر باقاعدہ اونچا کر کے بنائی گئی تھی جیسے ٹھنڈے علاقوں میں گھروں پر بنتی ہے۔

کورنگی کہ رہائشی علاقے کو 6 بڑے حصوں میں بانٹا گیا جسے 1 نمبر سے 6 نمبر تک کا نام دیا گیا۔ پھر اس کو مزید بلاکس میں تقسیم کیا گیا جو A ایریا سے شروع ہو کر Y ایریا تک ہیں۔ اس میں کچھ جگہ پر ایکسٹینشن بھی ہوا جیسے J ایریا کا ایکسٹینشن ہوا تو اسے جے ون ایریا کا نام دیا۔ کراچی شہر کا سب سے بڑا صنعتی علاقہ کورنگی میں ہی ہے جہاں سیکڑوں کی تعداد میں چھوٹی اور بڑی فیکٹریاں موجود ہیں. مگر صنعتی علاقے کی وجہ سے مختص کیے گئے رفاعی پلاٹس پر کچی آبادیاں وجود میں آنا شروع ہو گئیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اب پکے مکانات بن گئے ہیں۔

کچھ ذکر ضلع کورنگی کا

کورنگی ہمیشہ سے ضلع شرقی کا حصہ تھا مگر اگست 2000ء میں بلدیاتی نظام کے تحت جب کراچی کے اضلاع کا خاتمہ کر کے کراچی کو 18 ٹاؤن میں تقسیم کر دیا گیا تو کورنگی کو بھی ایک ٹاؤن بنا دیا گیا۔ بعد میں جب سندھ حکومت نے دوبارہ ضلعی نظام کو بحال کیا تو نومبر 2013ء میں کورنگی کو کراچی کا چھٹا ضلع بنانے کا نوٹیفیکیشن جاری کر دیا. یوں اب کورنگی ایک باقاعدہ ضلع ہے اور اس کی چار تحصیلوں میں کورنگی، لانڈھی، شاہ فیصل اور ماڈل کالونی (اربن ملیر) شامل ہیں۔ ضلع کورنگی میں موجود خود کورنگی کا علاقہ جو کہ کورنگی ٹاؤن کہلاتا ہے اس کی آبادی اتنی زیادہ ہے کہ یہ خود اپنی ذات میں ایک شہر کے برابر ہے۔ ہمارے ملک کے بہت سے شہروں سے زیادہ اس کورنگی ٹاؤن کی آبادی ہے۔

کچھ ذکر مہاجرین کی کورنگی میں آبادکاری کا

قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے آنے والے مہاجرین زیادہ تر تین راستوں سے پاکستان میں داخل ہوتے تھے۔ ایک راستہ لاہور کا تھا دوسرا راستہ کھوکھرا پار، میرپور خاص کا تھا اور تیسرا راستہ بذریعہ سمندر بحری جہاز کا تھا۔ کیونکہ سب بغیر کسی آسرے کے پاکستان آگئے تھے تو جو لوگ لاہور اور میرپور خاص کی سرحد سے ٹرین کے ذریعے آتے تھے ہفتوں اسٹیشن پر ہی بیٹھے رہتے کیونکہ اسٹیشن کے سوا ان کے پاس کوئی رہائش کی جگہ نہیں تھی۔ اسی طرح سے جو لوگ بحری جہاز سے کراچی کی بندرگاہ کیماڑی پر آتے وہ بھی رہائش نہ ہونے کی وجہ سے کیماڑی کے آس پاس ہی نہایت تکلیف دہ حالت میں رہنے پر مجبور تھے۔ بس ان حالات میں حکومت کی طرف سے روزانہ پاؤ بھر ڈبہ چاول اور دال کا ملتا۔ مسئلہ یہاں ختم نہیں ہوتا کیونکہ نہ تو پکانے کے لیے آگ میسر تھی اور نہ ہی برتن۔ آگ جلانے کے لیے پورٹ کے قریبی علاقے سے لکڑیوں کو چن چن کر جمع کیا جاتا اور پھر آگ لگا کر کھانا بنایا جاتا۔

جیسے جیسے سرکار کو جگہ ملتی جاتی ان لوگوں کو خیمہ بستیوں میں منتقل کر دیا جاتا۔ کراچی میں موجود بڑی خیمہ بستیوں میں سے ایک قائد آباد کی خیمہ بستی بھی تھی جہاں اب قائداعظم کا مزار ہے۔

1959ء میں جب کورنگی آباد ہونے لگا تو جھونپڑیوں میں قیام پذیر مہاجرین کو محض صرف راشن کارڈ اور جاری کردہ رسید جس کی قیمت 47 روپے ہوتی تھی دیکھ کر کوارٹرز کی الاٹمنٹ شروع ہو گئی جبکہ بقیہ رقم ماہانہ 27 روپے کے حساب سے ادا کرنی تھی۔ روز

قائدہ آباد اور دیگر خیمہ بستیوں میں ٹرک آتے اور ایک ٹرک میں چار خاندانوں کو ان کے سامان سمیت سوار کیا جاتا اور ان کی جھونپڑیوں کو مسمار کر دیا جاتا اور ان لوگوں کو کورنگی کے مختلف علاقوں میں بنائے گئے کوارٹرز میں منتقل کر دیا جاتا۔ کیونکہ یہ لوگ کافی عرصے سے مختلف خیمہ بستیوں میں رہائش پذیر تھے اس لئے خاص شہر اور برادری کے لوگ ایک ساتھ پوری پوری گلیوں میں آباد ہو گئے۔ جن میں خاص طور پر الہ آباد، آگرہ، جونپور، امروہہ، سہارن پور، مظفر نگر، دہلی اور لکھنو وغیرہ کے لوگ شامل تھے۔

1958ء میں جنرل اعظم خان کے کورنگی میں بڑے پیمانے پر کواٹرز تعمیر کرانے سے پہلے ہی پورے کورنگی میں K ایریا ہی واحد علاقہ تھا جس میں پہلے ہی مہاجرین کو چھوٹے پیمانے پر لا کر بسایا جا چکا تھا۔ K ایریا کے کچھ کوارٹرز، پارک اور مارکیٹ کی تعمیر لانڈھی کے ساتھ ہی شروع ہوئی تھی اور 57 -1956 میں رہائش بھی ہو گئی تھی تاہم 1960ء کے لگ بھگ K ایریا میں مزید بڑے پیمانے پر کوارٹرز بنے جو 120 اور 128 گز کے تھے اور ان میں مہاجرین کو لا کر آباد کیا جانے لگا۔ زیادہ تر لوگ لیاقت بستی اور فار ور لائن کی خیمہ بستیوں سے تھے. جبکہ شروع کے لوگوں کا تعلق مزار قائد پر موجود خیمہ بستیوں سے تھا۔ K ایریا میں ہی پاکستان کا نابینا بچوں کا پہلا اسکول قائم کیا گیا تھا۔ اسی طرح جب پاکستان ٹیلی ویژن نے اپنی نشریات کو شروع کیا تھا تو کورنگی میں K ایریا کے پارک میں پہلی مرتبہ ٹی وی لگا کر نشریات دکھائی گئی تھی اور بہت بڑی تعداد میں لوگ اسے دیکھنے آئے تھے۔ اس کے علاوہ K ایریا کی ایک عظمت یہ بھی ہے کے صہبا اختر جیسے عظیم شاعر کا تعلق بھی K ایریا سے تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے بڑے دار العلوموں میں سے ایک جامعہ دار العلوم کراچی بھی کورنگی میں واقع ہے۔ اس جامعہ کی بنیاد 1951 میں شہر کے پرانے علاقے نانک واڑا کے ایک اسکول میں رکھی گئی تھی تاہم 17 مارچ 1957 کو اس کی موجودہ عمارت (جو 56 ایکڑ کے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے) میں منتقل کیا گیا۔

کچھ ذکر لانڈھی کے نام کا

لانڈھی سندھی زبان کا لفظ ہے جس کے کئی معنی ہیں: ایک معنی کوئی ایسی جگہ جسے مہمانوں کے قیام کے لیے یا سرائے کے طور پر استعمال کیا جائے یا محفل منعقد کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔ جبکہ دوسرا مطلب دیسی طرز کا کچی دیواروں اور گھاس پھوس کی چھت والے ایک وسیع کمرے کے ہیں۔ ایسے ہی کمرے کو دراصل لانڈھی کہا جاتا ہے۔ سندھ کے پرانے حکمرانوں نے سندھ کے تمام آمد و رفت کے بڑے راستوں پر ہر تھوڑے فاصلے پر مسافروں کے آرام کرنے کے لئے سادہ عمارتیں تعمیر کروائی تھیں۔ ایسی ہی عمارتوں کو دراصل لانڈھی کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی کئی لانڈھیوں کے آثار سہون شریف اور کراچی کے درمیانی راستے پر اب بھی موجود ہیں۔ اسکے علاوہ چچ نامہ جو سندھ کی تاریخ پر ایک معتبر کتاب تصور کی جاتی ہے، اس کتاب میں لانڈھی کی بستی کے لیے لانودھر، لانادھا اور لادھی کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو بگڑ کر لانڈھی کہلائے جانے لگا.

کراچی کے قریب ملیر ندی کے دوسرے کنارے پر اور شارہ فیصل پر موجود لانڈھی واقع ہے۔ پہلے اسے جمعدار (فوجی عہدیدار) کی

لانڈھی کہاجاتا تھا مگر بعد میں اسے صرف لانڈھی کہاجانے لگا۔ قیام پاکستان کے وقت یہ جگہ چند گوٹھوں پر مشتمل تھی یہاں ذکری اور دیگر بلوچ قبائل بڑی تعداد میں آباد تھے۔ یہ افراد جب ابراہیم حیدری سے ملیر اپنی اونٹ گاڑی پر جایا کرتے تھے تو رستے میں ایک ہوٹل آتا تھا جس پر یہ اونٹ گاڑیاں قیام کرتی تھیں. اس ہوٹل پر ایک چراغ رات میں لازمی جل رہاہوتا تھا اسی لیے چراغ ہوٹل کے نام سے مشہور ہو گیا. آج اس ہوٹل کے آس پاس کا پورا علاقہ چراغ ہوٹل کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح سے شرافی گوٹھ وغیرہ بھی یہاں کی قدیم آبادیاں ہیں۔

لانڈھی کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ یہ خطہ قدیم زمانے سے انسانوں سے آباد چلا آرہا ہے۔ لانڈھی کے قرب وجوار میں کچھ اوزار زمین سے برآمد ہوئے ہیں جو قدیم پتھر کے زمانے کے آخری دور کے ہیں۔

کچھ ذکر لانڈھی ٹاؤن کا

لانڈھی ہمیشہ سے ضلع شرقی کا حصہ تھا۔ مگر 2000ء میں نئے بلدیاتی نظام کے تحت جب کراچی ڈویژن کے اضلاع کو ختم کرکے 18 ٹاؤن میں تقسیم کیا گیا تو لانڈھی بھی ایک ٹاؤن بن گیا اور اسے 12 یونین کونسلوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ 2013 میں جب اس نظام کو ختم کر کے اضلاع دوبارہ قائم کیے گئے اور ضلع شرقی کو توڑ کر ضلع کورنگی بنایا گیا تو لانڈھی ضلع کورنگی کا حصہ بن گیا جو پہلے ضلع کورنگی کی تحصیل بنا اور اب دوبارہ ضلعی ٹاون سسٹم کے آنے کے بعد کورنگی ضلع کا ایک ٹاؤن بن گیا ہے مگر اس کا کچھ حصہ ضلع ملیر میں چلا گیا ہے اور اسے اب 8 یونین کونسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

لانڈھی کراچی کے مشرقی حصے میں واقع ہے اس کے شمال میں شاہ فیصل ٹاؤن اور ملیر ندی ہے جنوب میں بن قاسم ٹاؤن اور مغرب میں کورنگی ٹاؤن ہے۔

لانڈھی انڈسٹریل ایریا 1949 میں وجود میں آیا اور اس کا شمار قیام پاکستان کے بعد بننے والے پہلے انڈسٹریل ایریا میں ہوتا ہے اس میں بننے والی پہلی انڈسٹری کا نام فاروق ٹیکسٹائل مل تھا۔ اب لانڈھی انڈسٹریل ایریا میں بڑی تعداد میں فیکٹریاں موجود ہیں جبکہ کراچی ایکسپورٹ پروسیسنگ زون بھی لانڈھی میں ہی واقع ہے۔

لانڈھی کا قدیم ریلوے اسٹیشن کراچی کے تین بڑے ریلوے اسٹیشنوں میں سے ایک ہے۔ یہ کراچی کا دوسرا مصروف ترین ریلوے اسٹیشن ہے۔ یہ ایک جنکشن بھی ہے یہاں سے لانڈھی اور کورنگی انڈسٹریل ایریا کے لیے برانچ لائن بھی نکالی گئی ہے۔

پہلے پورا علاقہ لانڈھی ہی تصور کیا جاتا تھا مگر پھر سب اپنے اپنے ناموں سے مشہور ہو گئے۔ پہلے 89 نمبر کی بس چلتی تھی اس کا اسٹاپ اتنا مشہور ہوا کہ یہ پورا علاقہ 89 کے نام سے مشہور ہو گیا جہاں کراچی کی سب سے مشہور جلیبیاں ملتی ہیں۔ اسی طرح سے داؤد چورنگی، فیوچر کالونی، مانسہرہ کالونی، معین آباد وغیرہ پہلے لانڈھی ہی کہلاتے تھے مگر اب اپنے ناموں سے زیادہ مشہور ہو گئے ہیں تاہم اب ان میں سے بہت سے علاقوں کو لانڈھی ٹاؤن سے نکال کر ملیر ٹاؤن اور ابراہیم حیدری ٹاؤن میں شامل کردیا گیا ہے۔

کچھ ذکر لانڈھی میں مہاجرین کی آبادکاری کا

جس جگہ قائد اعظم کو دفن کیا گیا وہاں ہندوستان سے پاکستان کی محبت میں اپنے گھر بار چھوڑ کر آنے والے مہاجرین بہت بڑی تعداد میں کیمپوں میں رہائش پذیر تھے۔ قائد اعظم کے مزار کی وجہ سے یہ جگہ قائد آباد کے نام سے مشہور ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے مزار کی تعمیر کے لئے منصوبہ بندی ہوتی گئی مہاجرین کو بھی وہاں سے منتقل کیا جانے لگا۔ مزار قائد کے پاس رہنے والے ان مہاجرین کو بڑی تعداد میں سب سے پہلے ملیر ندی سے کچھ پرے لا کر آباد کیا گیا۔ کیونکہ ان لوگوں کو قائدہ آباد سے لا کر آباد کیا گیا تھا اس لئے ان لوگوں نے اس جگہ کو بھی قائد آباد کہنا شروع کر دیا اور پھر یہ پورا علاقہ قائد آباد کے نام سے ہی مشہور ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سوئی ڈش کالج سے قریب قائد اعظم نے کچھ کوارٹرز کا افتتاح کیا تھا اس مناسبت سے اس علاقے کو قائد آباد کہا جاتا ہے۔

قائد آباد سے کچھ آگے لانڈھی میں مہاجر بستیوں کا قیام 1956 میں عمل میں آیا۔ لانڈھی میں زیادہ تر 80 گز کے کوارٹر بنائے گئے تھے اور انتہائی منظم ٹاؤن پلاننگ کے تحت بنائے گئے تھے. مہاجروں کے لیے آباد کی گئی بستی کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا جسے ایک نمبر سے 6 نمبر تک کا نام دیا گیا۔ ان علاقوں میں مختلف اوقات میں آبادی کی جاتی رہی۔ ان چھ حصوں میں مختلف تقسیم ہوئی اور بہت سے نئے نام رکھ دیے گئے جیسے C1، C2 36B, 36C اور دیگر۔

یہاں بھی زیادہ تر قائد اعظم کے مزار کے پاس خیمہ بستی میں رہنے والے افراد لا کر بسائے گئے جب کہ سلطان آباد پرانا حاجی کیمپ میں موجود مہاجرین کی خیمہ بستی میں رہنے والے افراد اور ریلیکس سینما کے قریب موجود خیمہ بستیوں کے افراد بھی کافی تعداد میں لا کر بسائے گئے. کچھ علاقوں میں کوارٹرز بہت بعد میں بنے جیسے لیاقت بستی کی خیمہ بستی جو کہ پرانی سبزی منڈی کے پاس تھی وہاں سے زیادہ تر لوگوں کو 1963ء میں لا کر 36B میں آباد کیا گیا۔

لانڈھی میں آباد مہاجرین میں بڑی تعداد سلطانپور کے لوگوں کی تھی اس کے علاوہ فیض آباد، جونپور، امروہہ، الہ آباد، بہار، دہلی، آگرہ اور دیگر علاقوں کے لوگوں کی تھی۔

گلشن اقبال کراچی

پاکستان کا سب سے بڑا شہر کراچی آبادی کے لحاظ سے ایک ایسا شہر ہے جس میں ہر نسل، مذہب اور زبان کے لوگ بستے ہیں، چنانچہ اس شہر میں ہر علاقے کی اپنی پہچان اور خصوصیات ہیں۔ البتہ کئی علاقوں کی وجہ شہرت مشاہیر سے منسوب ان کے نام ہیں۔ کراچی کے مشرق میں واقع ایک ایسا ہی ایک علاقہ ''گلشن اقبال ٹاؤن شپ'' ہے جس کا شمار سابق صدر ایوب خان کے دور کے چند خوبصورت رہائشی منصوبوں میں ہوتا ہے۔ ادارہ ترقیات کراچی کی اسکیم کو رہائشی مقاصد کے لئے 1960 میں منظور کیا گیا تھا لیکن اس منصوبے پر عملدر آمد اگست 1965 میں شروع ہوا، جبکہ 16 اپریل 1966 کو اس وقت کے کمشنر وچیئر مین ادارہ ترقیات کراچی سید دربار علی شاہ نے اولڈ راوینز ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام یوم اقبال کے سلسلے میں نیشنل میوزیم باغ جناح فریئر ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں اس نئی رہائشی اسکیم گلشن اقبال کے قیام کا اعلان کیا تھا، جو کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی اصطلاحی زبان میں اسکیم 24 کہلاتی ہے، جس کا نام شاعر مشرق، حکیم الامت علامہ محمد اقبال کے نام پر رکھا گیا تھا۔ باغ جناح میں ہونے والی اس تقریب کا اہتمام اولڈ راوینز ایسوسی ایشن نے کیا تھا۔ دوروزہ تقریب میں علامہ محمد اقبال کے خطوط اور کتابوں کو بھی نمائش کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس تقریب کا افتتاح پاکستان میں متعین ایران کے سفیر ممتاز حسن ہوشنگ انصاری نے کیا تھا۔ نمائش میں ایران۔ عراق۔ ترکی اور روس کے مندوبین اور علامہ محمد اقبال کے عزیزوں ودوستوں نے شرکت کی تھا۔ نمائش میں شرکت کے لئے باقاعدہ اخبارات میں اشتہار دیا گیا تھا اور قومی اخبارات نے خصوصی نمبر شائع کئے تھے۔ گلشن اقبال کا علاقہ 12ہزار 664ایکڑ رقبے پر مشتمل ہے جو یونیورسٹی روڈ سابقہ کنٹری کلب روڈ کی دونوں جانب سوئی گیس ٹرمینل تک جاتا ہے۔ اس کے مشرق میں ملیر کنٹونمنٹ۔ مغرب میں فیڈرل بی ایریا۔ شمال میں لیاری ندی (گڈاپ) اور جنوب میں جمشید روڈ واقع ہے۔ گلشن اقبال کی آبادکاری کے لئے ادارہ ترقیات کراچی (کے ڈی اے) نے زمین محکمہ ریونیو اور قدیم زمینداروں سے نقد قیمتیں ادا کر کے خریدی تھیں۔ ادارہ ترقیات کراچی کی یہ اسکیم 1960 میں منظور ہوئی تھی لیکن ترقیاتی کام کا آغاز 1965 میں ہوا اسکیم کی تعمیری لاگت 4 کروڑ 30 لاکھ 76 ہزار روپے مختص کی گئی تھی۔ اس رہائشی علاقے کو 19 بلاکس میں تقسیم کیا گیا زمینوں کا رقبہ کم از کم دو سو مربع گز اور زیادہ سے زیادہ دو ہزار مربع گز رکھا گیا۔ کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی طرف سے یہاں ہاؤسنگ اسکیموں کو بھی زمین الاٹ کی گئیں۔ 1970 کی دہائی میں حکومت کی طرف سے بلاک 4اے میں کراچی کے جید صحافیون کو رہائشی پلاٹ الاٹ کئے گئے تھے۔

2017 کی مردم شماری میں گلشن اقبال ٹاؤن کی آبادی کا تخمینہ تقریباً 841,800 ہے جس میں سے 99.5 فیصد مسلمان ہیں۔ یہاں مردوں کی تعداد 433،347، خواتین کی تعداد 408,298 اور خواجہ سراوں کی تعداد 155 ہے جبکہ حالیہ آبادی ایک محتاط

اندازہ کے مطابق گیارہ لاکھ سے زائد ہے۔ یہاں کئی لسانی اکائیاں آباد ہیں۔ ان میں مہاجر، سندھی، پنجابی، کشمیری، سرائیکی، پشتون، بلوچی اور ہزارہ وال وغیرہ شامل ہیں۔ گلشن اقبال کو انتظامی طور پر گلشن اقبال پولیس اسٹیشن، عزیز بھٹی پولیس اسٹیشن، مبینہ ٹاون پولیس اسٹیشن، پی آئی بی پولیس اسٹیشن اور نیو ٹاون پولیس اسٹیشن کی حدود میں تقسیم کیا گیا ہے۔

گلشن اقبال بلاک 1 کا آغاز لیاری ایکسپریس وے سے ہوتا ہے 1960 کی دہائی میں بلاک 1 اور 2 میں لیاری ندی کے ساتھ دیہی زمینیں پھیلی ہوئی تھیں جہاں کاشت کاری کی جاتی تھی جبکہ کنٹری کلب کے نام سے ایک تفریحی کلب بھی ہوا کرتا تھا۔ اس کلب کی وجہ سے یونیورسٹی روڈ کا پرانا نام کنٹری کلب روڈ کہلاتا تھا تاہم اس زمین پر اب عابد ٹاؤن کے نام سے رہائشی بنگلے اور کثیر المنزلہ فلیٹس تعمیر ہو چکے ہیں۔ سابق صدر جنرل مشرف کے دور میں بلدیاتی نظام متعارف کرائے جانے کے ساتھ ہی کراچی ڈویژن اور اس کے اضلاع کا خاتمہ کر کے کراچی شہری ضلعی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔

اس نظام کے نتیجے میں شہر کو 18 قصبہ جات (ٹاؤنز) میں تقسیم کر دیا گیا۔ گلشن اقبال ٹاون کی سطح پر انتظامی لحاظ سے 13 یونین کونسلوں پر مشتمل تھا، جن میں دہلی سوسائٹی۔ سوک سینٹر۔ پیر الہی بخش کالونی (پی آئی بی کالونی)، عیسی نگری، گلشن اقبال، گیلانی ریلوے اسٹیشن، شانتی نگر، جمالی کالونی، گلشن اقبال ۲ پہلوان گوٹھ، میٹروول کالونی، گلزار ہجری اور صفورا گوٹھ شامل تھے۔ 2011 میں سابق صدر آصف علی زرداری کے دور حکومت میں اس نظام کو ختم کر دیا گیا لیکن 2015 میں جب کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن کا نظام دوبارہ متعارف کرایا گیا تو گلشن ٹاؤن کو کراچی ضلع شرقی کے حصے کے طور پر دوبارہ منظم کیا گیا۔ گلشن اقبال میں کراچی کی چھ اہم سڑکیں ہیں۔ ان میں یونیورسٹی روڈ سینٹرل جیل سے شروع ہو کر صفورہ چورنگی سے آگے ملیر کینٹ کی طرف جاتی ہے۔

سر شاہ سلیمان روڈ لیاقت آباد نمبر 10 سے شروع ہو کر نیشنل اسٹیڈیم پر ختم ہوتی ہے۔ راشد منہاس روڈ سہراب گوٹھ (سپر ہائی وے) سے شروع ہوتا ہے اور شارع فیصل تک جاتا ہے، شبیر احمد عثمانی روڈ یاسین آباد (لیاری ایکسپریس وے) سے شروع ہوتا ہے اور مسکن اپارٹمنٹ چورنگی تک جاتا ہے۔ صہبا اختر روڈ سر شاہ سلیمان روڈ سے شروع ہو کر براستہ گلشن اقبال بلاک 13 ڈی کے درمیان سے گزرتا ہوا موچی موڑ اسٹاپ تک جاتا ہے۔ ابوالحسن اصفہانی روڈ سپر ہائی وے (سہراب گوٹھ) سے شروع ہوتا ہے اور سفاری پارک فلائی اوور پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ بعض سڑکوں کی چورنگیاں ختم کر کے ان کو سگنل فری کر دیا گیا ہے اور چورنگی کی جگہ فلائی اوور اور انڈر پاس تعمیر کئے گئے ہیں لیکن اکثر مقامات کی شناخت اب بھی ان چورنگیوں نام سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ گلشن چورنگی اور نیپا چورنگی وغیرہ۔

ٹاؤن شپ میں فراہمی و نکاسی آب کا نظام دوسرے علاقوں کے مقابلے میں کافی بہتر ہے، زیادہ تر علاقوں میں واٹر بورڈ کی پائپ لائن کے ذریعے پانی تین دن کے وقفے سے سپلائی ہوتا ہے، بجلی کی ترسیل بھی دیگر علاقوں نسبت بہتر ہے، البتہ سوئی گیس کی لوڈ شیڈنگ

میں دن بہ دن اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔ پوش علاقوں میں نکاسی آب کا نظام بہتر ہے، جبکہ متعدد علاقوں میں سیوریج لائنیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ سڑکوں اور گلیوں میں جگہ جگہ سیوریج کا پانی کھڑا رہتا ہے۔ اپارٹمنٹ مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے انتہائی خراب اور بوسیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ بیشتر پرانے فلیٹوں کے سیوریج نظام خراب ہونے کی وجہ سے فلیٹس بدنما اور گندے ہوتے جارہے ہیں۔

یہاں ٹریفک کے مسائل دیگر علاقوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں اس کی بنیادی وجہ بڑی تعداد میں شاپنگ سینٹر، تفریحی مقامات، اسکول، یونیورسٹی اور نجی تعلیمی ادارے ہیں جبکہ سروس روڈ اور فٹ پاتھ اور گرین بیلٹ پر مافیا نے قبضہ کرکے ہوٹل، ریسٹورنٹ کھول لئے ہیں، جہاں شام اور رات کے اوقات میں بے پناہ رش ہوتا ہے۔ سڑکوں کی حالت زار بھی افسوسناک ہے۔ ٹوٹی پھوٹی سڑکیں اور پارکنگ کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ٹریفک کے مسائل روز بروز گھمبیر ہوتے جارہے ہیں۔ اسکول اور یونیورسٹی کے اوقات میں وین اور پرائیوٹ گاڑیوں کا ایک اژدہام ہوتا ہے۔

گلشن اقبال میں کھیلوں کا عالی شان میدان نیشنل اسٹیڈیم واقع ہے، جس کا شمار ملک کے چند اہم کھیل کے میدانوں میں ہوتا ہے۔ نیشنل اسٹیڈیم کراچی کو 26 فروری 1955 کو کرکٹ کلب آف انڈیا بمبئی کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ اس کا نقشہ ممبئی میں برابورن اسٹیڈیم کے آرکیٹیکٹ نے تیار کیا تھا جبکہ 1984 میں سابق صدر مملکت جنرل محمد ضیاالحق نے ایک صدارتی حکم کے ذریعے پلانیٹیریم بنانے کی ہدایت کی تھی۔ حکومت نے گلشن اقبال میں موجود اہم تعلیمی اداروں اور شہر کے مرکزی اور آسانی کے پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے یونیورسٹی روڈ پر پی آئی اے پلانیٹیریم (معلوماتی سیارہ گھر) تعمیر کیا تھا، تاکہ طالب علموں کی بڑی تعداد اسے دیکھ سکے لیکن مجاز اداروں کی غفلت کی وجہ سے پلانیٹیریم زبوں حالی کا شکار ہے۔

اس میوزیم میں داخل ہونے پر سامنے پی آئی اے کا پرانا جہاز کھڑا نظر آئے گا۔ پلانیٹیریم سے متصل ایکسپو سینٹر کراچی کی عمارت واقع ہے جو بنیادی طور پر نمائشوں کے لیے مخصوص ہے۔ 2000ء میں پہلی مرتبہ جنگی ساز و سامان کی بین الاقوامی نمائش آئیڈیاز شروع ہوئی تھی۔ دفاعی نمائش ہر دو سال کے بعد منعقد کی جاتی ہے، جس میں اسلحہ اور دفاعی مصنوعات بنانے والی کمپنیاں اور ادارے شرکت کرتے ہیں۔ 1980 کی دہائی میں گلشن اقبال کے رہائشیوں کو سرکلر ریلوے کی صورت میں صاف ستھری بہترین سفری سہولت میسر تھی، بعد ازاں اس منصوبے کو خسارے کا جواز بنا کر بند کردیا گیا۔ متروکہ گیلانی ریلوے اسٹیشن" اسی بہترین سروس کی اجڑی یادگار ہے۔ گلشن اقبال کے اہم مقامات میں ریڈیو پاکستان کراچی کی عمارت۔ ہیڈ آفس سوئی سدرن گیس۔ پی آئی اے پلانیٹیریم میوزیم۔ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن۔ دفتر سینٹرل بورڈ آف ریونیو۔ نیلاٹ۔ اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ۔ ہیڈ آفس سندھ ایمپلائز سوشل سکیورٹی انسٹیٹیوشنز۔ اے جی پی آر۔ موتمر عالم اسلامی۔ ابن سینا اسپتال۔ کینسر فاونڈیشن اسپتال۔ سندھ انفکیشن ڈزیز اسپتال اینڈ ریسرچ سینٹر۔ آغاخان اسپتال، لیاقت نیشنل اسپتال، رب میڈیکل سینٹر، اشفاق میموریل اسپتال، المصطفی میڈیکل

سینٹر، سر سید یونیورسٹی، وفاقی اردو یونیورسٹی، عثمان انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی خواتین اسلامک یونیورسٹی واقع ہیں، جبکہ تفریحی مقامات میں الہ دین پارک، عزیز بھٹی پارک، سفاری پارک، سندباد، جمشید انصاری پارک، وومن فٹبال اسٹیڈیم سمیت دیگر شامل ہیں، یہاں کی اہم مساجد میں جامع بیت المکرم، جامعہ اشرف المدارس، مسجد امام ابن تیمیہ، جامع مسجد فاروق اعظم، صدیق اکبر مسجد، مدنی مسجد جامع احسن العلوم، گیلانی مسجد اور مسجد ہدیٰ شامل ہیں۔ گلشن اقبال میں شانتی نگر مشہور علاقہ ہے، یہاں مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور عیسائی مذہب سے تعلق رکھنے والے بھی رہائش پذیر ہیں، اسی طرح عیسیٰ نگری کے نام سے ایک آبادی ہے یہاں کے رہائشیوں کی بڑی تعداد مسیحی مذہب سے تعلق رکھتی ہے اس علاقے میں 90 فیصد مسیحی اور 10 فیصد مسلمان ہیں۔ رومن کیتھولک چرچ اور مسیحی قبرستان بھی ہے، جبکہ یہاں اقلیتی برادری کے دیگر کئی چرچ اور عبادت گاہیں بھی ہیں۔ گلشن اقبال سے کراچی کے ہر علاقے میں بسیں اور ویگنیں جاتی ہیں۔

کراچی کی کیفے اسٹوڈنٹس کی بریانی: ایک مختصر تاریخ

تحریر: احمد سہیل

حاجی محمد علی (مرحوم) نے 1969 میں انتہائی شائستہ آغاز کے ساتھ کیفے طلباء کے قیام کا خیال پیش کیا تھا۔ یہ سب گھر سے پکی بریانی اور کچھ دیگر برتنوں سے شروع ہوا، جو شہر کے وسط میں واقع، صدر، کراچی کے وسط میں واقع ایک چھوٹے سے کھانے کے کنارے سے پیش کی گئیں۔ یہ بریانی کا مقبول اور منفرد ذائقہ ہے جس نے کیفے اسٹوڈنٹس کے کاروباری نام کو معروف و مقبول کیا، اور اب اسٹوڈنٹس بریانی شہرت کا عنوان بن چکا ہے۔ صبر اور مشقت کے نتیجے میں کاروبار میں مستحکم اور بتدریج اضافہ ہوا۔ منڈی کے تقاضوں کا جواب دینے کے نتیجے میں متعدد سنگ میل کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ 1976 میں، سب سے پہلے بنیادی ڈھانچے میں بہتری ایک سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش پیدا کر کے کی گئی۔ اس کے بعد، کاروبار کی ترقی، مقابلہ کو شکست دینے، تکنیکی بہتری کا استعمال کرنے عمدہ ار سادہ انتظامی نظام کے تحت ترقی کی منازل طے کی۔ اس کار بار کو حاجی محمد علی کے صاحب زادے جاوید صاحب چلا رہے ہیں۔ " کیفے اسٹوڈنٹس" کے اسوقت دنیا کے نقشے پر 12 ، 13 ریسٹورنٹ ہیں۔

گلستان جوہر
(بستی بستے بستے بستی ہے صاحب)
تحریر: یعقوب مرزا صاحب

1974/75 میں کے ڈی اے نے بے گھر افراد کے لئیے مین کی فراہمی کے لئے کچھ پراجیکٹس لانچ کئے، درخواستیں وصول کی گئیں اور قرعہ اندازی ہوئی، ان پراجیکٹس میں میٹروول، ون اور ٹو، گلستانِ جوہر، شاہ لطیف ٹاون، اس زمانے میں بظاہر یہ علاقے دور دراز اور بیکار سے لگتے تھے، شاہ لطیف ٹاؤن نیشنل ہائی وے تو بغیر قرعہ اندازی کے ہی درخواست دہندگان کو الاٹ ہو گیا، پھر بھی کچھ پلاٹ بچ گئے اور اس میں ریلوے سے تنازعہ بھی رہا کہ کچھ زمین ریلوے کی بھی شامل کر لی گئی تھی، میٹروول بھی تقریباً تمام ہی الاٹ ہو گئے، البتہ گلستان جوہر وہ علاقہ تھا جہاں دستیاب پلاٹس سے دگنی سے بھی زیادہ درخواستیں آئیں، اور یہاں پر فلٹ سائیٹ ایس ٹیز بھی سب سے زیادہ تھیں جو بعد میں آکشن ہوئیں، 90 کی دہائی تک یہاں کوئی خاص آبادی نہیں تھی، ایک تو اس کی اپروچ نہیں تھی داخلے کا واحد راستہ راشد منہاس روڈ جوہر موڑ تھا بعد میں یونیورسٹی روڈ موسمیات کے برابر سے سڑک نکالی گئی پھر کراچی ائیر پورٹ ٹرمینل ون سے ملایا گیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے عمارتوں کا جنگل کھڑا ہو گیا، سب سے پہلی اور پرانی عمارت جوہر چورنگی پر جوہر اسکوائر بنی۔

ایک زمانہ تھا کہ گلستان جوہر پرفیوم چوک کا شورہ پورے پاکستان میں تھا کراچی کے ہر دیوار در و دیوار کے ساتھ ساتھ کراچی سے ملتان تک رستے بھر کی ہر دیوار پر پرفیوم چوک نام ہی کافی ہے کی چاکنگ ہوتی تھی جس سے ایسا لگتا تھا کہ کوئی ایسا چوک ہے جہاں ہر وقت پھولوں کی مہکاراتی رہتی ہے لیکن در اصل یہ ایک اتر بیچنے والے مرسلین صاحب کا کارنامہ تھا جنہوں نے اپنے ٹھیے کو مشہور کرنے کے لیے نہ صرف پورے کراچی بلکہ پورے پاکستان میں اس کی چاکنگ کر دی اور یوں پرفیوم چوک پورے پاکستان میں مشہور ہو گیا اور ہر شخص اس کو دیکھنے کا متمنی رہا۔

ذکر اورنگی ٹاؤن کا

تحریر: اقبال اے رحمٰن

لفظ اورنگی کی تحقیق گروپ کے ساتھی غلام رسول کلمتی صاحب نے پیش کی ہے جسکے مطابق کراچی سمندر کی وجہ سے ایک جانب ماہی گیروں کی بستی تھی تو دوسری جانب یہاں زراعت وگلہ بانی کی تاریخ بھی قدیم ہے جسکے لئے لئے پانی زخیرہ کرنے کی روایت بھی اتنی ہی قدیم، مقامی آبادی سندھی، بلوچ اور بروہی اقوام پر مشتمل تھی، پانی کے حصول کے لئے جو نالے بنائے جاتے تھے انہیں مقامی زبان میں ''ونگی'' کہتے تھے، ونگی کے ساتھ لگا لفظ اسکی ہیئت بتاتا تھا، مثال کے طور پر ندی سے نکلے نالے کو رنگی اور بارش کے پانی کو زخیرہ کرنے کے لئے بنائے جانے والے نالے ''ہورنگی'' کہلاتے تھے، اورنگی کا لفظ ہورنگی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اتفاق سے اسکے معنی موجودہ زمانے سے یوں میل کھاتے ہیں کہ اورنگ صنعتی شہر کو کہتے ہیں، ۱۹۶۵ میں اورنگی ٹاؤن کی تشکیل کے وقت اسے صنعتی علاقے سے پار بسائے جانے کے سبب یہ نام دیا گیا، ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان سے آنے والے مہاجرین کو اورنگی ٹاؤن میں بسایا گیا، مہاجرین کی مسلسل آمد بلدیہ کراچی کے نظام اور بجٹ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لہذا اورنگی ٹاؤن کے انفرااسٹرکچر کی تعمیر ۱۹۸۰ تک تعطل کا شکار رہی، مقامی باشندوں کی بے چینی کے بعد ممتاز بینکار آغا حسن عابدی کے رفاحی ادارے انفاق کے تحت اورنگی کے بنیادی شہری ڈھانچے کی تعمیر ہوئی۔

آغا صاحب اورنگی پائلٹ پروجیکٹ کے روح رواں ہیں، پاکستان کے مایہ ناز شوشل سائنٹسٹ ڈاکٹر اختر حمید خاں صاحب جنہوں نے سابق مشرقی پاکستان میں کومیلا کے ترقیاتی منصوبے کی کامیابی سے شہرت پائی تھی 1980 میں جب کراچی آئے تو آغا صاحب نے انکو اورنگی ٹاؤن کی حالت زار بہتر بنانے کے لئے منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کی درخواست کی، ڈاکٹر صاحب نے اس شرط پر حامی بھری کہ وہ یہ کام اپنے انداز اور صوابدید پر کریں گے اور کسی کی بھی مداخلت قبول نہیں کریں گے حتی کہ آغا صاحب کی بھی نہیں جو اس منصوبے پر اربوں روپے بہادینے کو تیار تھے، آغا صاحب نے ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی سنہری مثال قائم کی اور ڈاکٹر صاحب کی شرط قبول کرلی، اورنگی پائلٹ پراجیکٹ عالمگیر شہرت کا حامل منصوبہ ثابت ہوا۔

سرجانی ٹاؤن کی مختصر تاریخ

تحریر: اقبال اے رحمٰن

سرجانی ٹاؤن کراچی کی نسبتاً نئی بستی، جسکے نام جیسکے انداز میں سحر ہے، یوں تو یہ نارتھ ناظم آباد یا نارتھ کراچی سے ملحق انہی کی طرز کا ایک قریہ ہے مگر غور کریں تو سرجانی میں داخل ہوتے ہی دونوں بستیوں میں جدید اور قدیم کا فرق نمایاں نظر آتا ہے۔ ہماری بزم کے منتظم طلعت قریشی صاحب لکھتے ہیں "سرجانی ٹاؤن کا رقبہ نارتھ کراچی، بشمول نئی کراچی سے دوگنا ہے۔ یہ ایشین ڈیولپمنٹ بینک کی اسکیم ہے۔ نارتھ کراچی میں 26 ہزار پلاٹ ہیں۔ جبکہ سرجانی میں 52 ہزار۔ صنعتی علاقہ اسکے علاوہ ہے۔ سرجانی بھی اپنے پڑوس کی طرح نیم متوسط، متوسط اور بالائی طبقات سے ضرور آباد ہو رہی ہے مگر نئے اور پرانے کے فرق کے ساتھ، نارتھ کراچی کا مکانات میں تقسیم کے بعد کے ابتدائی دنوں کا تعمیراتی حسن جھلکتا ہے تو سرجانی نئی آب و تاب سے مسکراتی ہے۔ نارتھ ناظم آباد پرانی کوٹھیوں کے انہدام کے بعد فلک بوس عمارتوں سے سج رہا ہے مگر سرجانی کی طرح عظیم الشان رہائشی منصوبوں سے محروم ہے، سرجانی میں مکانات بھی ہیں اور عمارات بھی، شہر کے دیگر علاقوں کی طرح سڑک پر دور تک دکانیں بھی چلی گئی ہیں مگر اس کا اصل حسن وہ ہمہ جہت [mega projects] رہائشی منصوبے ہیں جو کراچی کی نئی بستیوں ہی میں نظر آتے ہیں مگر اسکا کیا کیجئے یہ منصوبے ایسی زمینوں پر سر اٹھا رہے ہیں جو رہائشی مقاصد کے لئے مختص نہیں کی تھیں۔ جیسے بڑے بڑے قطعات جو مرغبانی یا گلہ بانی کے لئے تھے معماروں نے خلاف قانون ان پر تعمیراتی کا کام شروع کر دیا، انہیں کچی آبادی تو نہیں مگر اسکی انتہائی مکروہ صورت ضرور کہا جا سکتا ہے۔

بہت سے گھروں میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ مائیں شرارت کرنے پر بچوں کی سختی سے بازپرس کرنے کی بجائے محض اتنا کہنے پر اکتفا کرتی ہیں "بیٹا ایسا نہیں کرو" دوسرے الفاظ میں "بیٹا کئے جاؤ" تو ہمارا ترقیاتی ادارہ اور تعمیرات پر نظر رکھنے والے ادارے بھی بس اخباری اشتہارات پر اکتفا کرتے ہوئے عوام الناس کو سمجھاتے نظر آتے ہیں "بیٹا نہیں خریدو" اور منصوبہ دھڑا دھڑ بن رہا ہے، طریقہ واردات بڑا سادہ ہے، کسی مشہور اور بااثر خاندان کو ساتھ ملا لیجئے سرمایہ اور محنت معمار کی اور بد معاشی مشہور خاندان کی۔ کم از کم دو منصوبے ایسے دیکھے ایک سرجانی اور دوسرا دیہہ منگھوپیر میں، ایک میں سماجی کارکن اور دوسرے میں ایک مرحوم عالم دین کی دوسری پیڑھی معاون و مددگار۔

ہو یہ رہا ہے کہ منصوبہ شروع ہوا لوگوں نے پیسے لگانے شروع کر دئے، تعمیر مکمل ہوئی، لوگ رہائش پزیر ہو گئے، اب اداروں نے بیداری کا ناٹک رچایا مگر کس وقت جب سوتے میں پیشاب خطا ہونے پر بستر گیلا ہو چکا ہے، اب جاگنا بھی تو کیا جاگنا، عدالت سے حکم امتناعی آجائے گا" جا بچہ تیری خیر ہوئے"۔ لیکن کوئی عدالت ان اداروں سے نہیں پوچھے گی کہ آپ نے اتنے ناظر اور ان سے دوگنے افسر جو پال رکھے

ہیں وہ کیا کرتے ہیں مگر نہیں، مجبوراً سختی کرنا بھی پڑے تو برق پھر بھی معمار پر بھی نہیں بلکہ مکین پر گرے گی کہ منع کرنے کے باوجود کیوں خریدا۔

جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں
[سودا]

اسکے علاوہ چائنا کٹنگ کے اژدہے نے یہاں بھی بہت کچھ نگلا ہے، رہی سہی کسر قبضہ مافیا نے پوری کردی ہے پلاٹ سرکاری ہو یا کسی عام شہری نے پیٹ کاٹ کر رقم جوڑ کر، بچوں کے لئے سر چھپانے کے آسرے کا سامان کرنے کی کوشش کی ہو، مافیا کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ جہاں کوئی ویران پلاٹ نظر آیا تو ''ڈال دو جھولی میں'' بدقسمتی سے ان قبیح سرگرمیوں میں ہمارے دینی اکابر بھی پوری طرح ملوث ہیں جنکے لئے مسجد یا مدرسے کے نام پر جگہ گھیرنا معمول کی بات ہے، آپ کا پلاٹ ہے مگر آپ کچھ نہیں کرسکتے، ان عناصر کے لئے بڑی آسانی ہے مفت کا پلاٹ، چندے کی رقم سے تعمیرات، جس میں سے اپنا گھر تو نکل ہی آتا ہے اور ماہانہ مشاہرہ بھی لگے ہاتھوں دستیاب۔ ''ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ آئے چوکھا''
مگر یہ چوکھا رنگ کس قدر اوکھا ہے جب یہ پتہ چلتا ہے اس وقت تک دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

کراچی کی گلیاں اور چوراہے: دلچسپ نام، منفرد وجہ شہرت

پاکستان کا ساحلی شہر کراچی اپنے آپ میں بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے۔ان میں سے کچھ بہت انوکھی تو کچھ عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً یہاں کے علاقوں، گلیوں، محلوں اور چوباروں یعنی چوراہوں کے نام ہی دیکھ لیجئے۔ بعض نام بڑے منفرد تو بعض بہت عجیب و غریب ہیں۔ایسا کیوں ہے ؟اس کا صحیح صحیح جواب دیناتو شاید کسی کے بس میں نہیں البتہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نام خود ہی پڑتے چلے گئے۔ ان ناموں کو پڑھیے، ذرا سا غور کیجئے تو آپ خود بھی اندازہ لگالیں گے کہ ایسے دلچسپ اور انوکھے نام رکھنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔

حدود شہر میں۔۔دیہات، قصبے اور ٹاؤن

کہنے کو تو کراچی سب سے بڑا شہر ہے مگر اس شہر میں قصبے بھی ہیں اور ٹاؤن بھی۔ مثلاً قصبہ کالونی، قصبہ موڑ، اورنگی ٹاؤن، بلدیہ ٹاؤن، سرجانی ٹاؤن، پتھر ٹاؤن، گولڈن ٹاؤن، گرین ٹاؤن اور بھنگوریہ ٹاؤن !!! پھر سندھی زبان میں 'گوٹھ' کے معنی گاؤں یا دیہات ہیں اور بظاہر شہر اور دیہات ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں مگر کراچی 'شہر' ہونے کے باوجود کئی گوٹھوں کا مالک ہے۔ مثلاً سہراب گوٹھ، صفورہ گوٹھ، پہلوان گوٹھ، انگارہ گوٹھ، جمعہ گوٹھ، ناتھاخان گوٹھ، بلوچ گوٹھ، یوسف گوٹھ، فقرا گوٹھ، میمن گوٹھ، عبداللہ گوٹھ، ملاعیسی گوٹھ، ریڑی گوٹھ، صالح محمد گوٹھ، ابراہیم حیدری گوٹھ اور چنیسر گوٹھ۔

کچھ نام اور بھی زیادہ دلچسپ ہیں مثلاً 'گولی مار'۔۔لالوکھیت۔۔۔حالانکہ اب یہاں نہ لالو رہتا ہے اور نہ کھیت ہی موجود ہے۔

سوکوارٹر۔۔آدھی اردو آدھی انگریزی۔۔ایسی طرح ڈولی کھاتہ، گاڑی کھاتہ، چھوٹا میدان، بڑا میدان، منوڑہ، جٹ لین، برزٹہ لین، لیاری، کورنگی، لانڈھی، کیماڑی، کمہار واڑہ، چاکی واڑہ، لسبیلہ، نمائش، پرانی نمائش۔۔سب کے سب ایسے نام ہیں جو آپ کو کسی اور ملک یا شہر میں سنائی نہیں دیں گے۔

یہ گلیاں یہ چوبارہ۔۔۔

یہ اعزاز بھی شہر قائد ہی کو حاصل ہے کہ یہاں کی گلیاں اور محلے بھی منفرد ناموں کے حامل ہیں، مثلاً بوتل گلی، صرافہ گلی، موچی گلی، دوپٹہ گلی، قوال گلی اور۔۔فنکار گلی !!

چوراہے کی بات کریں تو سب سے پہلے یہ جان لیجئے کہ عام طور پر جس مقام پر چار راستے (یا راہیں) ایک جگہ آکر ملتے ہیں اسے 'چوراہا' کہا جاتا ہے مگر جانے کیوں کراچی میں ہر چوراہے کو 'چورنگی' کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کے معنی 'چار رنگ' ہونے چاہئیں لیکن باوجود اس کے شہر کا ہر چھوٹا بڑا چوراہا 'چورنگی' کہلاتا ہے۔ان 'چورنگیوں' کے بھی کچھ دلچسپ نام سن لیجئے جو ہو سکتا ہے آپ کو عجیب بھی لگیں مثلا، ناگن چورنگی، نورس چورنگی، چمڑا چورنگی، بینو چورنگی، غنی چورنگی اور ناظم آباد چورنگی !! دو ایک سادے سے نام والے چوراہے بھی ہیں مثلاً پاکستان چوک، بہادر آباد چورنگی اور حسن اسکوائر۔

عجیب و غریب 'موڑ'

دنیا کی شاید ہی کوئی ایسی جگہ ہو جہاں 'موڑ' یا ٹرننگ نہ آتی ہو مگر کراچی میں ایک دو نہیں متعدد موڑ ایسے ہیں جن کے باقاعدہ نام 'رجسٹرڈ' ہیں مثلاً موچی موڑ، انڈا موڑ اور ڈی کا موڑ!!!

آپ نے رنگ برنگی ڈھیروں چیزوں کے نام سنے ہوں گے۔۔ مگر کیا کبھی رنگ برنگے اسکولوں کے نام بھی سنے ہیں؟ نہیں ناں؟ مگر کراچی ایسا شہر ہے جہاں آپ کو رنگ برنگی بسیں، منی بسیں اور ٹرک کے ساتھ ساتھ اسکول بھی رنگ برنگے دیکھنے کو ملیں گے۔ مثلاً پیلا اسکول، لال اسکول، سفید اسکول۔ ایک اور اسکول بھی ہے مگر وہ 'بے رنگ' ہے۔ جی ہاں آپ میں سے کچھ لوگوں نے صحیح پہچانا۔ وہ ہے 'کھڈا اسکول'۔ یہاں تو ہوٹل بھی آپ کو عجیب و غریب ملیں گے مثلاً گاموکا ہوٹل، اپنا ہوٹل، اچانک ہوٹل اور دھماکا ہوٹل۔ پھر اس شہر میں 'فرنچائز' ہوٹلز کی بھی کوئی کمی نہیں مثلاً سندھی ہوٹل۔ جو نئی کراچی میں بھی ہے اور لیاقت آباد میں بھی۔

بھول جایئے ہوٹلوں اور اسکولوں کو۔۔ کراچی میں تو مارکیٹس کے بھی ایک سے بڑھ کر ایک نام ہیں؛ مثلاً کالی مارکیٹ، لال مارکیٹ، گھانس منڈی، پان منڈی، جیکسن مارکیٹ، کباڑی بازار، کھڈا مارکیٹ، شومارکیٹ، کاغذی بازار، کپڑا مارکیٹ، جامع کلاتھ، سولجر بازار اور باڑہ مارکیٹ!! باڑہ مارکیٹ حالیہ برسوں میں سامنے آنے والا نام ہے۔ حیدری، نیو کراچی اور دیگر علاقوں میں نئی نئی باڑہ مارکیٹس بن گئی ہیں۔ باڑہ مارکیٹ سے مراد ایسی مارکیٹ لی جاتی ہے جہاں نسبتاً کم داموں میں چیزیں ملتی ہوں۔ جبکہ باڑہ کے معنی چار دیواری کے ہیں۔ جہاں بھینس رکھی جاتی ہوں اور ان کا دودھ فروخت ہوتا ہو وہ مقام بھی باڑہ کہلاتا ہے۔ اب اندازہ لگایئے کہ نام باڑہ اور چیزیں عام استعمال کی۔ مثلاً الیکٹرونک و کپڑا مارکیٹ کے بھی اب باڑے ہونے لگے۔

اسی طرح 'اردو بازار' پر غور کیجئے۔ اردو زبان کا بازار سے کوئی گہرا تعلق نہیں مثلاً عام آدمی یہ سوچ کر ہی پریشان ہو جائے گا کہ اردو زبان کا بھی کوئی بازار ہو سکتا ہے یا اردو زبان بازار میں مل سکتی ہے۔ مگر کراچی میں ایک جگہ نہیں تین جگہ اردو بازار کھلے ہوئے ہیں اور ان سے مراد کتابوں اور اسٹیشنری کی تھوک مارکیٹ ہے۔

آرام سے مراد ریسٹ یا سکون کے ہیں اور آرام باغ کا نام سننے سے ذہن میں یہ آتا ہے کہ شاید یہ ایک ایسا باغ ہے جہاں انسان سکون کے چند لمحے گذار سکے۔۔ مگر جناب کراچی میں آرام باغ فرنیچر مارکیٹ کا نام ہے۔ بکرا منڈی، عیدالاضحی کے موقع پر لگتی ہے۔ مگر یہاں فروخت کے لیے زیادہ تر گائیں لائی جاتی ہیں۔ 'سولجر' دنیا میں کہیں فروخت نہیں ہوتے مگر کراچی میں سولجر بازار بھی ہے۔

نمبر گیمز

کراچی کے مقامات اور نمبرز ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ یہاں متعدد علاقوں کے نام نمبروں سے مربوط ہیں۔ مثلاً کورنگی ڈھائی نمبر، نیو کراچی پانچ نمبر، لانڈھی نمبر چھ، نیو کراچی چھ نمبر، لالوکھیت دس نمبر، فائیو اسٹار چورنگی، لانڈھی ساڑھے تین، پانچ، تین ایک، کورنگی کراسنگ، ناظم آباد ایک نمبر، دو، چار اور سات نمبر۔ اورنگی تیرہ، چودہ نمبر اور دومنٹ چورنگی۔

کراچی والوں کی پاور ہاؤس اور واٹر پمپس سے جانے کیا مناسبت ہے کہ دو سے زائد پاور ہاؤس اور اتنے ہی واٹر پمپس ہیں۔ پھر پٹرول پمپس کو بھی نہیں بخشا گیا۔ ناظم آباد پیٹرول پمپ کے نام کی بھی جگہ بنا ڈالی۔ 'پاڑے' بھی کیوں بیگانے رہتے۔ لہذا بھنگی پاڑہ، لاسی پاڑہ، بنگالی پاڑہ اور پٹیل پاڑہ بھی موجود ہے۔ 'گجر نالہ' اور چڑھائی' نام کی بھی جگہیں موجود ہیں۔

انوکھے اسٹاپس

شہر قائد کی ایک روایت اور بڑی عجیب ہے مثلاً یہاں جس علاقے کا نام نہ ہو وہاں جو بھی بس یا منی بس کا آخری اسٹاپ ہو اس کے نام سے اس جگہ کو منسوب کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً سیون سی کا اسٹاپ، ساٹھ کا اسٹاپ، ڈبلیو گیارہ کا آخری اسٹاپ، فور ایچ کا آخری اسٹاپ وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ کچھ اسٹاپس اس کے علاوہ بھی ہیں مثلاً نیو کراچی میں واقع کریلا اسٹاپ ! نالہ اسٹاپ۔

کالونیاں

آپ نے شاید دنیا کے کسی اور شہر میں جانوروں کی اتنی عزت و توقیر نہ دیکھی ہو جتنی آپ کو کراچی میں دیکھنے کو ملے گی۔ یہاں رہتے انسان ہیں مگر کالونیاں جانوروں کے نام سے منسوب ہیں۔ مثلاً گیڈر کالونی، مچھر کالونی، بھینس کالونی۔ کچھ اور کالونیاں بھی ہیں۔ مثلاً گودھرا کالونی، دھوراجی کالونی، موسیٰ کالونی۔ کچھ کالونیاں بھی اپنی مثال آپ ہیں مثلاً خاموش کالونی اور عامل کالونی۔

بھارتی ناموں کی ہجرت

ان ناموں کی کوئی تحریری تاریخ نہیں، کوئی روایت بھی زندہ نہیں مگر پھر بھی عشروں سے انہی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ چونکہ کراچی 1947ء کی تقسیم کے وقت ہندوستان سے پاکستان آنے والوں کی اکثریت کا شہر ہے لہذا کچھ نام انہی کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے ہیں، مثلاً بنارس کالونی، علی گڑھ کالونی، دہلی کالونی, بہار کالونی, ممبئی بازار، یوپی موڑ, انچولی وغیرہ۔ کچھ بھارتی/ہندوانہ طرز کے نام بھی ہیں جیسے رتن تلاؤ، رنچھوڑ لائن، گورومندر، رام سوامی، نانک واڑہ، گاندھی گارڈن، پٹیل پاڑہ، نارائن پورا، بھیم پورا، دریا آباد اور مستن داس مارکیٹ وغیرہ۔

انگریزی سے کیا گلہ

ہم نے جہاں آپ کو مقامی زبان میں اتنے سارے نام بتائے وہاں انگریزی کو کیوں ناراض کریں۔ جی ہاں! شہر قائد کے کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جو خالصتاً انگریزی نام رکھتے ہیں۔ مثلاً نیپئر روڈ، بولٹن مارکیٹ، ایمپریس مارکیٹ، پریڈی اسٹریٹ، جیکب لائن، سول لائنز، کاسموپولیٹن سوسائٹی، کلفٹن، ڈیفنس، باتھ آئی لینڈ، سی ویو، میری ویدر، لیبر اسکوائر، ویسٹ وہارف، ایسٹ وہارف، گارڈن ایسٹ، گارڈن ویسٹ۔

ان منفرد ناموں کی پہچان اس قدر عام ہے کہ لوگ معمول کے نام والی شاہراہوں اور علاقوں کو بھول سے گئے ہیں۔ مثلاً ہم کچھ شاہراؤں کے نام آپ کو بتاتے ہیں۔ ذرا ذہن پر زور ڈالیے کہ یہ کہاں واقع ہیں۔ کوئنز روڈ، مولوی تمیز الدین خان روڈ یا ایم ٹی خان روڈ، ہر چند رائے روڈ، سرور شہید روڈ، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ، میر کرم علی تالپور روڈ اور صہبا اختر روڈ۔۔۔!!!

سرکاری نوکریوں کے امتحانات سے متعلق مختلف سیمینارز کی تصاویر

قائداعظم کی پیدائش کراچی کے کس گھر میں ہوئی

تحریر و تحقیق: ڈاکٹر عقیل عباس جعفری

یہ تحریر پہلی مرتبہ 14 جولائی 2022 کو شائع ہوئی تھی جسے محمد علی جناح کے یوم پیدائش کی مناسبت سے آج دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔

بانی پاکستان محمد علی جناح کی جائے پیدائش کراچی میں واقع وزیر مینشن میں ہوئی یا علی منزل میں، اس حوالے سے تحقیق کرنے والے مختلف آرا کے حامل ہیں اور اپنی اپنی آرا کے حق میں مختلف تاریخی حوالے اور ثبوت پیش کرتے ہیں۔

بی بی سی نے اس حوالے سے موجود تاریخی کتب اور حوالوں کا جائزہ لیا ہے جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

محترمہ فاطمہ جناح اپنی کتاب 'میرا بھائی' میں لکھتی ہیں کہ 'میرے والدین (جناح پونجا اور مٹھی بائی) کی شادی سنہ 1874 کے لگ بھگ انجام پائی تھی۔ وہ اس وقت کاٹھیاواڑ کے شہر گونڈل میں قیام پذیر تھے مگر انھیں اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے گونڈل ایک بہت چھوٹا شہر دکھائی دیتا تھا۔'

اگرچہ بمبئی میں تجارت کے بڑے مواقع تھے اور اُن کا ذہن بھی وہیں جانے کے لیے اُکساتا تھا لیکن قدرت نے اُن کے لیے کچھ اور ہی فیصلہ کیا تھا اور اسی فیصلے کے نتیجے میں وہ ہجرت کر کے کراچی آ گئے۔'

وہ مزید لکھتی ہیں کہ ان کے والد نے کراچی میں کھارادر کے علاقے میں نیونہام روڈ پر دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر حاصل کیا۔

'یہ علاقہ شہر کا تجارتی دل سمجھا جاتا تھا۔ یہاں متعدد تجارتی خاندان آباد تھے اور ان میں سے کچھ خاندان گجرات اور کاٹھیاواڑ سے آئے تھے۔ جس عمارت میں ہمارا فلیٹ تھا وہ پتھر کی بنی ہوئی تھی، اُس کی چنائی میں چونے کا مصالحہ استعمال ہوا تھا جبکہ اس کی چھت اور فرش میں چوبی تختے استعمال کیے گئے تھے۔'

'ہمارا فلیٹ پہلی منزل پر تھا، اس میں خاصی گنجائش تھی۔ ایک آہنی بالکونی فٹ پاتھ کی طرف نکلے ہوئے چھجے پر بنی تھی، یہ بالکونی بہت ہوادار اور ٹھنڈی جگہ تھی۔ اس بالکونی اور کمروں کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔ کراچی میں یہ بہت اچھا رخ سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس سمت سے تمام سال سمندری ہوا کے تازہ اور ٹھنڈے فرحت بخش جھونکے آتے رہتے تھے۔'

اقبال احمد مانڈویا نے اپنی کتاب 'اس دشت میں اک شہر تھا' میں اس حوالے سے مزید تفصیل فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ 'یہ وہی عمارت ہے جو اب 'وزیر مینشن' کہلاتی ہے۔ یہ عمارت کھارادر کے ماتھے کا جھومر ہے۔ یہ عمارت 1860-70 میں تعمیر ہوئی تھی۔

(بیسویں صدی کے ابتدائی نصف میں) اس کے مالک سیٹھ گوردھن داس تھے جو راجستھان کی مارواڑی قوم کی مشہور مہیشواری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔'

اُن کی خاندانی شناخت موہٹہ تھی، وہ کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ وزیر مینشن سے چند قدموں کے فاصلے پر ان کی ملکیت کی عظیم الشان گوردھن داس مارکیٹ تھی جس کا نام اب لطیف کلاتھ مارکیٹ ہو گیا ہے۔ ان کے صاحبزادے شیور تن موہٹہ نے کراچی کا ہندو جم خانہ اور موہٹہ پیلس تعمیر کروایا۔ وزیر مینشن کی عمارت کے معمار ایچ سوہاک تھے۔ قائدِ اعظم کے والد نے سنہ 1876 میں دوسری منزل کرائے پر حاصل کی تھی۔ 1876 میں اسی عمارت میں قائدِ اعظم کی ولادت ہوئی تھی۔ جس مسہری پر ان کی ولادت ہوئی تھی وہ مسہری یادگار کے طور پر اس عمارت کی پہلی منزل کے ایک کمرے میں موجود ہے۔'

سنہ 1892 میں بانیِ پاکستان محمد علی جناح برطانیہ چلے گئے جہاں انھوں نے لنکنز ان میں داخلہ لیا اور قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ جناح کی برطانیہ روانگی کے بعد اُن کی والد کی زندگی میں کئی اتار چڑھاؤ آئے، اُن کا کاروبار ختم ہو گیا اور وہ انتہائی مقروض بھی ہو گئے۔ یہ صورتحال درپیش ہونے کے بعد وہ اپنے اہلخانہ کے ساتھ بمبئی منتقل ہو گئے، جہاں کچھ دن بعد سنہ 1896 میں اُن کی اہلیہ وفات پا گئیں۔ جناح نے وطن واپس آکر رفتہ رفتہ والد کے تمام قرضے ادا کیے اور پھر 17 اپریل 1902 کو جناح پونجا بھی وفات پا گئے۔

رضوان احمد نے اپنی کتاب 'قائدِ اعظم: ابتدائی تیس سال' میں تحریر کیا ہے کہ '1919 میں محمد علی جناح کراچی آئے تو اُن کی ملاقات اپنے بچپن کے دوست سلیمان لالن کے والد سیٹھ نور محمد لالن سے ہوئی۔ جناح نے ان سے کہا کہ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا ہوں جہاں میں پیدا ہوا تھا، آپ کے سوا کوئی اور بتا نہیں سکتا۔'

نور محمد لالن نے اپنے پوتے عاشق لالن سے کہا کہ 'جاوہ جگہ ان کو دکھا دے' چنانچہ عاشق لالن نے جناح کو ساتھ لیا اور نیونہام روڈ اور چھاگلہ سٹریٹ کے نکڑ پر واقع اس مکان تک پہنچایا جس کو اب آثارِ قدیمہ کے محکمہ نے بطور یادگار محفوظ کر لیا ہے۔ انھوں نے عاشق لالن سے مزید تصدیق کی کہ کیا تمھیں یقین ہے کہ یہ وہی گھر ہے؟ محمد علی جناح کو شبہ اس لیے ہوا کہ اس مکان کو انھوں نے جیسا دیکھا تھا ویسا اب نہیں تھا۔ اس میں بڑی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔'

محمد علی جناح کی وفات کے بعد اکتوبر 1948 میں پاکستان کے سرکاری جریدے 'ماہِ نو' نے بانیِ پاکستان نمبر شائع کیا۔ اس جریدے میں فضل حق قریشی کا ایک مضمون 'قائدِ اعظم کا گھرانہ' بھی شامل تھا۔

کراچی: ثقافتی وتاریخی اہمیت کا عکاس 'نیشنل میوزیم'

تدوین: شاہانہ احسان

انسان کا اس کی تہذیب و تمدن سے رشتہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ خود انسانی تاریخ کا۔ کسی بھی ملک کے عجائب گھر وہاں کی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔

ایسا ہی ایک عجائب گھر کراچی شہر میں 'نیشنل میوزیم آف پاکستان' کے نام سے بھی قائم ہے جہاں مختلف انواع واقسام کی تاریخی نایاب اشیا اور نوادرات رکھے گئے ہیں۔

نیشنل میوزیم آف پاکستان 1951ء کو تاریخی عمارت فریئر ہال میں قائم کیا گیا بعد میں حکومتِ سندھ کی جانب سے اس کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کے لئے ایک بلڈنگ مختص کر دی گئی اب کراچی کے برنس گارڈن کے احاطے میں 1969 سے قائم ہے۔ نیشنل میوزیم پورے پاکستان کی ثقافتی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے جہاں پتھر کے دور سے لے کر قیامِ پاکستان تک کے صدیوں پرانی نادر اشیا رکھی گئی ہیں۔

عجائب گھر کی 'انڈس سویلائزیشن گیلری' میں پاکستان میں بسنے والے افراد کے قدیم لائف اسٹائل کو دکھایا گیا ہے جس میں پنجابی، سندھی اور بلوچی طرز کے عکس نمایاں ہیں جنھیں مجسموں کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔

ایک جانب قدیم دور کے مصوروں کے فن کو نمائش کیلئے پیش کیا گیا ہے جبکہ کراچی میں قائم عجائب گھر میں قرآن گیلری بھی اپنی مثال آپ ہے

دوسری جانب لوہے کے نادر زیورات رکھے گئے ہیں جبکہ ایک جانب جنگی اشیا ہیں جو جنگ میں استعمال ہوا کرتی تھیں اس میں لوہے کی آہنی تلواریں، لوہے کی ٹوپی، تیر کمان، چاقو چھریاں شامل ہیں اس سمیت قدیم زمانے کے مٹی کے برتنوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔

ایک اور گیلری میں ہڑپہ کے کھنڈرات سے ملنے والے مجسمے اور موئن جودڑو کے نوادرات رکھے گئے ہیں جسے دیکھ کر قدیم ثقافت و طرز زندگی کو یاد کیا جا سکتا ہے۔

دوسری جانب ہندو گیلری میں گندھارا اور بُدھ مت کے مجسمے رکھے گئے ہیں جبکہ ان مجسموں میں ٹیکسلا کے مقام سے ملنے والے قدیم زمانے کے بدھا مجسمے بھی گیلری کی زینت بنے ہوئے ہیں مٹی کے مجسمے اور بدھ تاریخی اعتبار سے انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔

ایک جانب قدیم سکوں کی گیلری ہے جہاں چھ صدیوں پرانے چاندی، تانبے کے سکے اور مہریں رکھے گئے ہیں جو پرانے زمانے میں استعمال ہوا کرتے تھے جبکہ یونانی دور میں استعمال ہونے والے نادر سکے بھی یادگار کے طور پر رکھے گئے ہیں۔

دوسری جانب 'فریڈم گیلری' میں قیامِ پاکستان کے وقت قائدِ اعظم کو ملنے والے بیجز، دستاویزات اور اُن کی تصاویر رکھی گئی ہیں جبکہ شیشے کے ایک فریم میں پاکستان کی 'پہلی کابینہ اجلاس' کے اہم دستاویزات اور سپاس نامے بھی رکھے گئے ہیں۔
بانی پاکستان قائدِ اعظم کو آل انڈیا مسلم لیگ سے ملنے والا بڑے سائز کا بیج بھی ہے جس پر آل انڈیا مسلم لیگ کے عہدیداروں کے نام درج ہیں۔
اسی گیلری میں ایک جانب علامہ اقبال کی 'پگڑی' چھڑی، چھتری اور ان کی اہم دستاویزات شامل ہیں۔
یہی نہیں یہاں لیاقت علی خان کی زیرِ استعمال ان کی ذاتی اشیاء بھی رکھی گئی ہیں۔ جن میں ان کا قلم، لائٹر، چھڑی، بیجز اور گھڑی بھی شامل ہے۔ دوسری جانب پاکستان کی مشہور شخصیات نیشنل ہیروز کی تصاویر بھی دیوار پر نصب ہیں۔
نیشنل میوزیم آف پاکستان کے انچارج کا کہنا ہے کہ "کراچی میں قائم اس میوزیم کو قومی اہمیت حاصل ہے۔ نیشنل میوزیم آف پاکستان پورے ملک کی ثقافت کی عکاسی کرتا ہے اس میں جو اشیا اور نوادرات موجود ہیں وہ ملک کے کسی اور میوزیم میں موجود نہیں۔'
ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ اسی وجہ سے یہ میوزیم سیاحوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ اور یہ بھی کہ طالبعلموں اور تحقیق دانوں سمیت روزانہ کی بنیاد پر 300 کے لگ بھگ لوگ اس عجائب گھر کا رخ کرتے ہیں۔

کراچی چڑیا گھر کی دلچسپ تاریخ، جو مٹنے کو ہے

(پاکستان کے دوسرے قدیم ترین چڑیا گھر کی دلچسپ تاریخ جس میں کئی برادریوں اور طبقوں نے مل کر حصہ ڈالا)

تحریر: شیما صدیقی

کراچی چڑیا گھر میں سینکڑوں اقسام کے جانور موجود ہیں.

کراچی زولوجیکل گارڈن، جسے بچے چڑیا گھر اور بڑے گاندھی گارڈن کے نام سے یاد کرتے ہیں، اپنے اندر کئی گمشدہ تاریخی حوالے رکھتا ہے، جس کے کچھ نشانات آج بھی شہر کراچی کو جانوروں اور درختوں سے محبت کرنے والا شہر بناتے ہیں۔

کراچی چڑیا گھر کی تاریخ بھی شہر کراچی سے جڑی ہوئی ہے۔ شہر کراچی کا نام، 17 ویں اور 18 ویں صدی میں تاریخ کے صفحوں پر نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے تالپوروں، کلہوڑوں اور میروں کی توجہ حیدر اباد، سکھر، میر پور خاص اور خیر پور تک محدود رہی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ ساحلی پٹی 1795 تک خان آف قلات کی ملکیت تھی۔ تالپوروں نے اسے اپنی حدود میں شامل تو کر لیا لیکن اس کی اہمیت نہیں سمجھی کیوں کہ ان حکمرانوں کے پاس ٹھٹھہ اور بدین کی بندر گاہیں موجود تھیں۔

شاید اسی لیے تالپوروں کے زیر حکومت کراچی کی تعمیر کی کوئی خاص نشانیاں نہیں ملتیں، سوائے چند دروازوں کے، جو آج تک شہر کی پہچان ہیں، جیسے میٹھادر اور کھارادر۔ یہ دروازے کبھی شہر کی حدود کا تعین کرتے تھے۔ کراچی کو صحیح معنوں میں انگریزوں نے اپنی جیوسٹریٹیجک پالیسی کے تناظر میں سنوارا۔ انہیں اپنی حکومت کو برقرار رکھنے کے لیے نئے ساحل اور بندگاہ کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کی ابتدائی تعمیر و ترقی میں مقامی آبادیوں سے زیادہ صاحب اقتدار شخصیتوں کے نام آتے ہیں، جنہوں نے اس مچھروں کی بستی کو ایک بڑے شہر میں بدلنے کا بیڑا اٹھایا، یعنی انگریز اور پھر پارسی کمیونٹی۔

انگریزوں سے پہلے کراچی شہر منوڑا، کیماڑی، لیاری اور ملیر کے کچھ گوٹھوں پر مشتمل تھا۔ یہ ایک چھوٹی ساحلی بستی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے البرٹ ولیم ہیوز نے 1874 چھپنے والے سندھ کے گزٹیئر میں کراچی کو شہر نہیں بلکہ 'تعلقہ' لکھا ہے۔

کراچی کے تاریخ داں سہراب کڑک کے خیال میں انگریزوں کی جانب سے کراچی کو اس علاقے کی مرکزی شہر منتخب کرنے کی اہم وجوہات میں اس کی آب و ہوا اور محل و قوع بھی رہا ہو گا۔ سہراب نے اپنے مضمون 'برطانوی سندھ کا صدر مقام' میں رچرڈ برٹن کی چارلس جیم نیپیر کو بھیجی گئی رپورٹ حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ 'کراچی کا موسم حیدر آباد کی نسبت زیادہ متعدل ہے، پھر یہاں سمندر کے راستے خلیج فارس کے ساتھ تجارت کا بھی امکان ہے۔'

لہٰذا انگریزوں نے کراچی کی تعمیر و ترقی میں خاصی دلچسپی دکھائی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسے پورے خطے کا تجارتی مرکز بنا ڈالا۔

یہ چڑیا گھر کے قیام سے کم و بیش پون صدی پہلے کا قصہ ہے۔ 1799 میں تالپوروں نے موجودہ چڑیا گھر کی زمین ایسٹ انڈیا کمپنی کو تجارتی کوٹھی بنانے کے لیے دی۔ اسی دوران تجارتی کوٹھی کے احاطے میں ایک باغ یا کھیت کی بھی بنیاد ڈالی گئی۔ اگلے ہی سال یعنی 1800 میں یہ تجارتی کوٹھی غیر قانونی کاموں کی وجہ سے بند کر دی گئی اور اس کے احاطے میں قائم باغ کو حکومت کے تحت دے دیا گیا۔

1833 میں چارلس نیپیئر (جن کے نام پر کراچی میں نیپیئر روڈ ہے) نے کراچی کا نقشہ تیار کیا، جس میں اس احاطے کو 'سرکاری باغ' کے نام سے دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ کو پڑھ کر حیرت ہو گی کہ اس زمانے میں اس باغ کو 'دریائے لیاری' سے سیراب کیا جاتا تھا۔ آج کراچی والے دریائے لیاری کو ایک بدبودار، کالے، میلے برساتی نالے کے طور پر جانتے ہیں جہاں مون سون میں روانی اور کبھی کبھی طغیانی بھی آ جاتی ہے اور یہ بپھر کر آس پاس کے کچے پکے مکان ڈھا دیتا ہے۔

1843 تک پورا سندھ تالپوروں سے نکل کر تاج برطانیہ میں شامل ہو چکا تھا اور کراچی چھاؤنی میں موجود انگریز فوجیوں کے لیے تازہ پھل اور سبزیاں اسی باغ سے پہنچائی جاتی تھیں۔ اس کے سات برس کے اندر اندر انگریزوں نے کراچی کو میونسپلٹی بنا دیا۔ شہر میں ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے لوگ آ کر بسنے لگے، عمارتیں بننے لگیں، اور اسی دوران ایسٹ انڈیا کمپنی کے باغ کو بھی سجایا گیا۔

33 ایکڑ پر پھیلے باغ کا دفتری نام تو 'کوین وکٹوریہ پارک' تھا مگر یہ 'رانی باغ' کے نام سے عوام کی زبان پر چڑھ گیا۔ پہلے پہل یہ صرف انگریز خاندانوں کی تفریح کے لیے مخصوص تھا۔ انھوں نے یہاں مختلف پھل دار اور آرائشی درخت لگائے۔ ساتھ ہی یہاں جانور بھی لا کر چھوڑنا شروع کر دیے۔ 1878 میں اس باغ کو چڑیا گھر میں تبدیل کرنے کا سوچا گیا اور یوں سابق تجارتی کوٹھی کے باغ کو چڑیا گھر بنا دیا گیا، جو لاہور کے بعد پاکستان کا دوسرا قدیم ترین چڑیا گھر ہے۔ اس مقصد کے لیے باقاعدہ ایک ٹرسٹ تشکیل دیا گیا، جس نے اس کی تزئین اور آرائش کی اور شجر کاری کی ذمہ داری اٹھائی۔

یہ باغ ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصے کے بعد بھی سرسبز و شاداب ہے اور یہاں آج بھی سوڈیڑھ سو سال پرانے درخت ہیں۔ چڑیا گھر کے ہارٹی کلچرلسٹ ضامن عباس کا کہنا ہے کہ یہاں تقریباً سوڈیڑھ سو سال پرانے املی، بڑ اور دیگر اقسام کے درخت موجود ہیں اور سب سے قدیم، گھنا اور سایہ دار درخت برگد کا ہے جس کی عمر تقریباً دو سو سال ہے۔

قیام پاکستان سے قبل تک یہ گاندھی گارڈن کہلاتا رہا کیونکہ 1934 میں یہاں گاندھی جی نے ایک بڑے عوامی اجتماع سے خطاب کیا تھا۔ سرکاری دستاویزات کے مطابق 1954 میں اسے کراچی زولوجیکل گارڈن کا نام دے دیا گیا، لیکن کئی دہائیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی بہت سے لوگ اسے گاندھی گارڈن کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

لاک ڈاؤن کے دوران ایک رپورٹ کے سلسلے میں ہمارا وہاں جانا ہوا۔ اسی دوران ہماری نظر کچھ پنجروں پر پڑی جن کی دیوار پر ان مخیر اور جانور دوست حضرات کے نام کی تختیاں نصب تھیں، جنھوں نے ان پنجروں کی تعمیر کے لیے سرمایہ مہیا کیا تھا۔ ہماری ان تختیوں

میں دلچسپی دیکھ کر کراچی چڑیاگھر کی زولوجسٹ عابدہ رئیس اور ویٹرینن ڈاکٹر عامر اسمٰعیل نے چڑیاگھر میں موجود کئی اور تاریخی حوالوں سے آگاہی فراہم کی۔

انہوں نے بتایا کہ ڈیڑھ سو سال قبل جب وکٹوریہ گارڈن کو چڑیاگھر میں تبدیل کیا گیا تو بہت سی مقامی کمیونٹیوں کے سماجی اور مخیر حضرات نے اس کی تزین و آرائش میں حصہ لیا۔

سیٹھ ننھے مل بنارسی داس نے پنجرہ عطیہ تو کیا لیکن ان کے بارے میں تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں.

مقامی صحافی غفور کھتری کے مطابق چڑیاگھر کے ابتدائی تمام پنجرے مخیر حضرات کی مالی مدد سے بنائے گئے۔

کچھ تختیاں شاید وقت کے ہاتھوں ضائع ہو چکی ہیں کیوں کہ ہمیں کراچی چڑیاگھر میں صرف تین پنجرے ملے جن پر ایک ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ اس تختی پر سنہ تعمیر اور عطیہ کرنے والے مخیر حضرات کے نام درج ہیں۔

مثال کے طور پر بنگال ٹائیگر 'ریجل' کے پنجرے کے ساتھ لکھا ہوا ہے کہ 'اس پنجرے کے لیے دیا گیا لوہا سیٹھ ننھے مل بنارسی داس' نے عطیہ کیا۔' ساتھ میں سنہ تعمیر 1903 درج ہے۔ ننھے مل بنارسی داس کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کی گئیں لیکن کوئی خاطر خواہ تفصیل معلوم نہیں ہو سکیں کہ یہ کون تھے اور کس پس منظر کے حامل شخصیت تھے۔ کم از کم چڑیاگھر کے پاس یا پھر بلدیہ عظمیٰ کراچی کے پاس ننھے مل کے بارے میں تفصیلات ہونا چاہئیں تھیں۔

والیان خیرپور ریاست کی بھی جانوروں سے دلچسپی اور محبت کا اظہار ہمیں کراچی چڑیاگھر میں ملتا ہے۔ والی ریاست خیرپور سر فیض محمد خان تالپور نے 1905 میں لومڑی کے پنجرے کی تعمیر کرائی۔ سنہ 1934 میں دوسرے والی ریاست خیرپور اور سر فیض محمد خان کے پوتے علی نواز خان نے گیڈر کے پنجرے کی تعمیر کی۔ قیام پاکستان سے قبل خیرپور ریاست کے آخری شہزادے میر علی مراد خان ثانی نے بھی اسے آگے بڑھایا۔ یہ بھی اپنے بزرگوں کے طرح جانوروں سے محبت رکھتے تھے اور ان کی افزائش نسل میں خصوصی دلچسپی لیتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ تقسیم کے وقت برصغیر کی سب سے بڑی چرہ گاہ بھی ان کی ملکیت میں تھی۔

اسماعیلی کیمونٹی کے سربراہ امام آغا علی شاہ) آغا خان اول (نے گارڈن کے علاقے میں 'پیر جی وادی' کی تعمیر کی جو آج بھی چڑیاگھر کے دروازہ نمبر 4 کے بالکل سامنے واقع ہے۔ جہاں پیر جی وادی میں گھروں کی تعمیر ہو رہی تھی وہیں 1882 میں آغا خان نے چار لیس نیپیئر کی منظوری سے چڑیاگھر کے صدر دروازے کی تعمیر کی۔

کئی اخباری حوالوں کے مطابق چڑیاگھر کے داخلی دروازہ نمبر 4 کے ساتھ جناب آغا علی شاہ کا نصب کردہ سنگ بنیاد چند سال پہلے تک موجود تھا لیکن جب ہم اسے کھوجنے پہنچے تو یہ کہیں نظر نہ آیا۔ جب اس بارے میں، کراچی چڑیاگھر کے، ویٹرن ڈاکٹر عمران اسماعیل سے پوچھا گیا تو ان کا کہنا تھا کہ یہ سنگ بنیاد ان کی نظر سے نہیں گزرا، البتہ سینیئر مقامی صحافی غفور کھتری نے بتایا کہ انھوں نے یہ سنگ بنیاد دیکھا تھا اور اپنی تحریر میں اس کے بارے میں لکھا بھی تھا۔ ان کا مزید کہنا تھا کہ شاید حالیہ ترقیاتی کاموں میں اسے ہٹا دیا گیا ہے۔

ان پنجروں کے بعد ہمیں چڑیا گھر کے بیچوں بیچ ایک فوارہ کی طرف لے جایا گیا۔ 1883 میں تعمیر کردہ یہ فوارہ پارسی کمیونٹی کی طرف سے چڑیا گھر کو تحفے میں دیا گیا۔ اس کے سنگ بنیاد پر درج ہے کہ اسے بلدیہ عظمیٰ کراچی اور این این پوجاجی نے ممبئی کے سماجی رہنما کاؤس جی جہانگیر ریڈی منی کی یاد میں تعمیر کیا تھا۔

کاؤس جی جہانگیر ممبئی کے ایک مخیر پارسی تاجر تھے۔ 15 سال کی عمر میں کلرک کی حیثیت سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کرنے والے کاؤس جی جہانگیر نے اتنی ترقی کہ 1846 میں اپنی کمپنی شروع کی اور انہیں تاج برطانیہ کی طرف سے Knight Bachelor کا خطاب بھی دیا گیا۔ انھوں نے ممبئی کے کئی تعلیمی اداروں کی تعمیر بھی کی۔

18 فٹ اونچا یہ فوارہ پارسی طرز تعمیر کے عین مطابق ہے، جیسے اکثر پارسی کمیونٹی کی عمارتوں اور گھروں میں داخلی دروازے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ چار طرف شیر کے منہ اور پھولوں کے ڈیزائن سے مزین یہ فوارہ چڑیا گھر میں موجود پانی کے کنوؤں سے منسلک کیا گیا تھا۔

چڑیا گھر کے عملے نے بتایا کہ کنویں موجود ہیں لیکن اب قابل استعمال نہیں اور فوارے کے شیروں کے منہ پانی سے خالی ہیں۔ بظاہر یہ فوارہ بھی کراچی کے دوسرے علاقوں کی طرح پانی کی کمیابی کا شکار ہو گیا ہے۔ اس کے ارد گرد جھاڑ جھنکار اگا ہوا ہے۔ حکام کو توجہ دینی چاہیے۔

کراچی چڑیا گھر کراچی کی پہچان ہے اور اہل کراچی کے لیے ایک اچھی اور سستی تفریح ہے۔ اگر اس میں موجود تاریخی حوالوں کو بہتر اور نمایاں کر لیا جائے تو چڑیا گھر اور محکمہ کا نام مزید روشن ہو گا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ تاریخ اور سماجی کام ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔
اگر حکام توجہ کریں اور ان تاریخی آثار کو مٹنے سے بچالیں تو کراچی کی تاریخ آنے والے برسوں میں بھی زندہ رہے گی۔
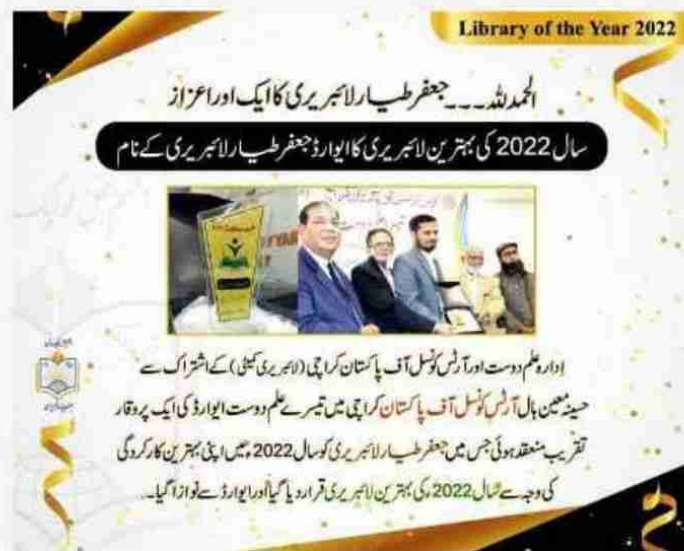
کراچی میں کہاں کیا اچھا ملتا ہے

1. نہاری. جاوید نہاری دستگیر
2. بریانی. نصیب بریانی محمود آباد
3. سنگاپورین رائس. فوڈ بریک بہادر آباد
4. حلیم. مزیدار حلیم سمن آباد
5. گولہ گنڈہ. انکل گولہ دھوراجی
6. نمکین بوٹی. الحرمین. الاصف اسکوائر
7. گول گپے. لیاقت آباد پل
8. چلپی کباب. اے ون. شاہ فیصل کالونی
9. مٹن کڑاہی. انور بلوچ ملیر
10. چرغہ. کیفے لذیز برنس روڈ
11. کھٹا کھٹ. طیبی حسین آباد
12. برین مسالہ. نورانی خالد بن ولید روڈ
13. ہنٹر بیف. حنیفیہ. بنوری ٹاؤن
14. مرغ چھولے. غوثیہ سٹی کورٹ
15. بلوچی تکہ. مدینہ 2 ہائی وے
16. چکن اینڈ چٹنی رول ہاٹ اینڈ سپائسی کھڈا مارکیٹ
17. بہاری تکہ. میرٹھ
18. ملائی بوٹی. غفار کباب ہاؤس پورٹ لینڈ
19. بن کباب. حنیف بن کباب پاکستان چوک
20. فش تکہ. یادگار جمشید روڈ
21. بیف برگر. خان بروسٹ نصیر آباد
22. لچھہ پراٹھا. کیفے کوئٹہ عالمگیر روڈ
23. ربڑی. دہلی ربڑی صدر

24. گلاب جامن. شاداب سوئٹ. بلاک 11 ایف بی ایریا
25. دہی بڑے. فریسکو برنس روڈ
26. فرائی کباب. وحید برنس روڈ
27. حلوہ پوری. دھتمل عائشہ منزل
28. چلو کباب. کیفے سیستانی صدر
29. فروٹ چاٹ. پاکستان فروٹ چاٹ. نرسری
30. لسی. اسلم لسی ہاؤس واٹر پمپ
31. سجّی. بولان سجی حسن اسکوائر
32. بیف چانپ. یونائٹڈ غریب آباد
33. آئس کریم. پشاوری آئس کریم حیدری
34. ریشمی کباب. چوہدری متین. 2 کے اسٹاپ
35. کچوری. پاسپورٹ آفس
36. شاورمہ. جسٹ شاورمہ شان سرکل
37. ڈوسا. ڈوسا ہوائنٹ بہادر، آباد
38. گولہ کباب. قریشی کباب حسین آباد
39. کیلجی. 2 کے اسٹاپ
41. کھیر. فوڈ سینٹر صدر
42. قلفی فالودہ. جان بلوچ صدر
43. میٹھا پان. پی آئی ڈی سی
44. بہاری بوٹی. الکباب بہادر، آباد
45. سوپ. الحسن ناظم آباد
48. قلفی. ، رحمت شیریں طارق روڈ
49. مچھلی کا کٹا کٹ. یونس مچھلی کٹا کٹ ڈاکخانہ لیاقت آباد
50-مال پوڑہ. حنان کھارادر
51. نمکو. رتن تلاؤ پاک کالونی

ٹرام اور کراچی

ٹرام کا آغاز 1776ء میں انگلستان کی کوئلے کی کانوں میں ہوا۔ ایسی گاڑیاں ابتداً گھوڑوں سے کھینچی جاتی تھیں۔ بجلی سے چلنے والی ٹرامین سب سے پہلے امریکا کے شہر نیویارک 1832ء چلیں۔ اس کے بعد انگلستان اور دیگر ممالک میں رائج ہوئیں۔ بھارت کے شہروں بمبئی اور کلکتہ اور پاکستانی شہر کراچی کے مخصوص علاقوں میں عرصے تک چلتی رہی ہیں 1880ء تک شہر میں آمدورفت کا کوئی خاطر خواہ نظام نہ تھا۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد کراچی کے شہریوں کی آمدورفت کو جدید سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے یورپ کے شہروں کی طرز پر کراچی میں بھی ٹرامیں چلانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ 1881ء میں کراچی میونسپلٹی کے سیکریٹری اور انجینئر جیمز اسٹریچن نے اس کا خیال پیش کیا تھا۔ پروجیکٹ پر کام شروع ہوا اور 1881ء میں پروجیکٹ کے لئے ٹینڈر طلب کئے گئے۔ لندن سے تعلق رکھنے والے ایڈورڈ میتھئیوز نے ٹرام سازی کا ٹینڈر پیش کیا۔ 8فروری 1883ء کو اس پروجیکٹ کی تکمیل کے ساتھ ہی کراچی میں ٹرامیں چلانے کے لیے حکومتِ بمبئی کی منظوری حاصل کی گئی اور 1884ء میں شہر میں ٹرام کی پٹری بچھانے کے کام کی ابتدا ہوئی، 20اپریل 1885ء میں کمشنر سندھ ہنری نیپیئر بی ایرکسن نے کراچی میں پہلی ٹرام کا وکٹوریہ روڈ موجودہ عبداللہ ہارون روڈ کے سامنے سینٹ اینڈریو چرچ کے قریب اس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ اکتوبر 1884ء میں اسٹیم پاور سے ٹرام بنانے کا کام شروع ہوا اور پھر کراچی کی سڑکوں پر ٹرام چلنے لگی۔ عام طور پر 12سے 15 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا کرتی تھی، لکڑی سے بنی ہوئی نشستیں بیک ٹو بیک نصب کی گئی تھیں اور ایک نشست پر 6افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہوتی تھی لیکن اسٹیم ٹرام میں سب بڑی فنی خامی یہ تھی کہ ہر پندرہ منٹ کے بعد اس میں اسٹیم کے انتظامات کرنا پڑتے تھے، جس سے مسافروں اور شہریوں کو مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ اس مسئلے کے باعث اسٹیم ٹرام جلد ہی ناکام ہو گئی۔ کراچی کے شہریوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔ کیوں کہ کراچی کے تجارتی اور آبادی والے علاقے سے ہر آدھے گھنٹے کے بعد ایک ٹرام گزرتی تھی، اس کے شور کی وجہ سے کراچی کے باسی بہت پریشانی کا شکار تھے۔ اس کے بعد گھوڑوں سے چلنے والی ٹرام متعارف کرائی گئی، ہر ٹرام میں دو گھوڑوں کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں گھوڑوں کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے ان کے سروں پر خاص قسم کے ہیٹ پہنائے جاتے تھے۔ جو ہر دو میل کے فاصلے کے بعد گھوڑے تبدیل کر دیے جاتے تھے۔ ہر چوراہے پر گھوڑوں کے پینے کے لیے پانی کے بڑے بڑے حوض بنائے گئے تھے، جس میں صاف وشفاف پانی ہمہ وقت بھرا رہتا تھا۔ ان کی سج دھج کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ لوگ شوق سے اس کی سواری کیا کرتے تھے۔ یہ ٹرامیں ایسٹ انڈیا ٹراموے کمپنی لمیٹڈ نے چلائی تھیں، آج کے ریما پلازہ کے قریب ٹراموے کا ہیڈ کوارٹر واقع تھا، جو ایک کمپائونڈ کی شکل میں تھا۔ اسی کمپائونڈ میں ٹراموے کمپنی کے ملازمین کے کوارٹر اور گھوڑوں کے اصطبل ہوا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں کراچی میں اس کے علاوہ آمدورفت کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ ذاتی ٹرانسپورٹ صرف چند انگریز افسران کے پاس ہی ہوا کرتی تھیں۔ گھوڑوں سے چلنے والی ٹرامیں کئی سال تک چلتی رہیں۔ گھوڑوں سے چلنے والی ٹراموں میں سفر نسبتاً زیادہ وقت لیتا تھا۔

اگرچہ ہر دو میل کے بعد گھوڑے بھی تبدیل کر دیے جاتے تھے، لیکن جانور تو پھر جانور ہے، لہٰذا 1902ء میں پیٹرول کے ذریعے چلنے والی ٹرامیں چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان کے انجن تیز رفتار تھے۔ ان کے لیے از سر نو پٹریاں بچھائی گئیں۔ ٹرام کی پٹریاں ریل کی پٹریوں سے مختلف تھیں۔ یہ سڑک کی سطح کے برابر ہوتی تھیں۔ 1910ء میں پٹرول سے چلنے والی ٹرام باقاعدہ متعارف کرائی گئی، ایک گیلن پٹرول میں 8 میل یا 12 کلو میٹر چلتی تھی۔ اس زمانے میں ایک روپے میں چار گیلن پٹرول فروخت کیا جاتا تھا۔ اس ٹرام کو جان ایبٹ نامی انجینیئر نے ڈیزائن کیا تھا۔ اس کے بعد 1945ء میں شہر میں ڈیزل سے چلنے والی ٹرامیں متعارف کرائی گئیں جو آخر وقت تک چلتی رہیں۔ یہ ٹرامیں ایسٹ انڈیا ٹراموے کمپنی کے تحت چلا کرتی تھیں۔ اس کمپنی کے چیف انجینیئر کا نام جان برنٹن تھا، اسی کی زیر نگرانی کراچی اور کوٹری کے درمیان ریلوے لائن بچھائی گئی تھی۔ کراچی میں تین عشروں سے زائد عرصے تک ایسٹ انڈیا ٹراموے کمپنی کے تحت کراچی کی سڑکوں پر ٹرامیں چلتی رہیں۔ کراچی میں ٹرام کی تاریخ 90 سال یعنی 1885ء تا 1975ء پر محیط ہے۔ ٹرامیں دو طرح کی چلا کرتی تھیں، ایک منزلہ اور دو منزلہ۔ یہ ٹرامیں عوام میں بہت مقبول ہوئیں۔ جو لوگ ملک کے دوسرے شہروں سے اُس زمانے میں کراچی آتے تھے، اُن کی دو فرمائشیں ہوتی تھیں، پہلی سمندر دیکھنے کی اور دوسری ٹرام میں سفر کرنے کی۔ اُس وقت دو پیسے کے ٹکٹ میں شہر کے بعض اہم حصّوں کی سیر کی جا سکتی تھی۔

ابتدا میں دو پیٹرول انجن استعمال کیے گئے۔ 1913ء تک کراچی میں چلنے والی ٹراموں کی کل تعداد 37 تک پہنچ گئی تھی۔ آج کے بس ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ کر بس چلاتے ہیں، لیکن ٹرام کا ڈرائیور کھڑے ہو کر اسے کنٹرول کرتا تھا۔ اس میں اسٹیئرنگ کے بجائے گھومنے والا لیور استعمال کیا جاتا تھا۔ اسے دائیں جانب گھمانے سے رفتار تیز اور بائیں جانب گھمانے پر رفتار کم ہو جاتی تھی، ہارن کی جگہ پیتل کی گھنٹی لگی ہوتی تھی، جس کا پنڈولم ایک ڈوری کے ذریعے کنٹرول ہوتا تھا۔ وہ ڈوری ڈرائیور کے ہاتھ میں ہوتی تھی، گھنٹی کی ٹن ٹن سے ٹرام اپنی آمد سے لوگوں کو خبردار کرتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد انگریز یورپ واپس جانے لگے تو انہوں نے اسے بھی فروخت کرنے کا اعلان کیا۔ اس وقت تاجر محمد علی نے ٹرام وے کمپنی 32 لاکھ روپے میں خرید لی تھی اور اس کا نام بدل کر محمد علی ٹرام وے کمپنی رکھ دیا تھا۔ یہ ٹرامیں چار روٹس پر چلتی تھیں، ایک سولجر بازار سے بولٹن مارکیٹ تک۔ دوسری صدر سے کینٹ اسٹیشن تک، تیسری گاندھی گارڈن اور کیماڑی کے درمیان چلائی جاتی تھی۔ چوتھی بولٹن مارکیٹ سے چل کر لی مارکیٹ پر ختم ہو جاتی۔ ان ٹراموں کا جنکشن بولٹن مارکیٹ پر تھا۔ اس وقت اس کا کرایہ دو پیسے سے پانچ پیسے تک ہو گیا تھا۔ 31 اپریل 1975ء کراچی کی تاریخ کا ایک اہم دن ہے۔ اُس روز کراچی کے شہریوں کے لیے ٹرام کی سہولت بند کر دی گئی تھی۔ یہ فیصلہ اُس وقت کی حکومت کا تھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ کراچی تیزی سے پھیل رہا ہے، آمد و رفت کے نئے نئے ذرائع اور وسائل استعمال ہونے لگے ہیں۔ جس کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک بڑھ گیا ہے اور چوں کہ شاہراہوں پر ٹرامیں دو طرفہ چلتی ہیں، لہٰذا ان کی وجہ سے حادثات کے خطرے بڑھ گئے ہیں۔ محمد علی ٹرانسپورٹ کمپنی کو اس حکم کی پاس داری کرتے ہوئے ٹرام سروس بند کرنی پڑی تھی۔ اس وقت کراچی کی سڑکوں پر 65 ٹرام وے چلا کرتی تھیں۔ ٹرام سروس بند ہونے سے کراچی کا اپنے ماضی سے ایک اہم رشتہ منقطع ہو گیا۔

کراچی کی بسیں

تحریر: زاہد احمد

مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن (سنہ ساٹھ کی دہائی کے اواخر اور سنہ ستّر کی دہائی کے اوائل) میں کراچی والوں کے بہت بڑی اکثریت بسوں میں سفر کرتی تھی۔ بس کا سفر معمولاتِ زندگی کا حصّہ ہوا کرتا تھا اس لئے لوگوں کو شہر کراچی کی ان نجی اور سرکاری شعبوں میں چلنے والی بسوں سے ایک خاص رومانس اور اُنسیت تھی۔ شہر میں روٹ نمبر 1 سے لے کر روٹ نمبر 60 تک، مختلف روٹس نمبر کی ہزاروں بسیں روزانہ کراچی کے باسیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے ہموار اور پختہ سڑکوں پر رواں دواں رہتی تھیں۔ کراچی کے شہریوں کی زندگی میں بسوں کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی، حتّٰی کہ لوگ نجی محفلوں میں بھی بسوں اور انکے سفر کے حوالے سے گفتگو کرتے نظر آتے تھے جس سے کراچی کی بسوں کی کراچی کے شہریوں کی زندگی میں اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس دور میں کراچی میں چلنے والی نئی اور پرانی برانڈ کی 'فورڈ'، 'بیڈ فورڈ'، 'ڈاج'، 'لی لینڈ' اور 'تھیمس' میکس کی بسیں شامل تھیں، ''گندھارا انڈسٹریز'' کی مقامی طور پر اسمبلڈ 'بیڈ فورڈ' کی نسبتاً چھوٹے سائز کی کم نشستوں والی بسیں جنہیں عرفِ عام میں 'راکٹ' کہا جاتا تھا، بہت مقبول تھیں۔ یہ بسیں عموماً امریکی اور برطانوی کمپنیوں کی ساختہ ہوتی تھیں، البتّہ سنہ ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں سویڈن کی حکومت کی جانب سے بھی کچھ جدید اور طویل اٹلی ساختہ تین دروازوں والی 'فئیٹ' بسیں پاکستان کو تحفتاً دی گئیں جو آٹو میٹک (بغیر کلچ) تھیں اور کراچی شہر کے کچھ روٹس (صدر تا ملیر، لانڈھی کورنگی اور چاکیواڑا تا ملیر، سعود آباد) پر سرکاری شعبے میں ''اومنی بس سروس'' کے نام سے چلا کرتی تھیں۔

کراچی شہر میں سرکاری شعبے کے تحت ''کراچی روٹ ٹرانسپورٹ کارپوریشن'' (کے آر ٹی سی) کے نام سے 'سنگل' 'ڈبل ڈیکر' بسیں بھی چلتی تھیں جن کا مرکزی ڈپو 'فیڈرل کیپٹل ایریا' میں عین اس جگہ واقع تھا جہاں اب ''الکرم اسکوائر'' واقع ہے، علاوہ ازیں نجی ٹرانسپورٹ کمپنیاں بھی مختلف ناموں مثلاً 'گجرات ٹرانسپورٹ کمپنی'، 'منگھی ٹرانسپورٹ کمپنی'، 'بلند شہر والا'، 'عبّاس ٹرانسپورٹ کمپنی'، 'ہوٗ کنا' وغیرہ کے نام سے بسیں چلاتی تھیں۔ سائز اور بناوٹ کے اعتبار سے بھی مختلف میکس کی بسوں میں تفاوت دیکھنے میں آتا تھا، کچھ بسیں سائز میں چھوٹی اور کم نشستوں والی تو کچھ بڑے سائز میں زیادہ نشستوں کی حامل ہوا کرتی تھیں۔ بعض بسوں میں خواتین کمپارٹمنٹ کو مردوں کے کمپارٹمنٹ سے جُدا کرنے والے پارٹیشن پر مردوں کی جانب گول آئینہ نصب ہوتا تھا۔ بسوں کے عقبی حصّے سے، ڈرائیور کی نشست تک ایک ڈوری جاتی تھی جو ڈرائیور کے سر پر لگی ایک پیتل کی گھنٹی سے منسلک ہوتی تھی جب بھی کسی مسافر کو بس سے اترنا ہوتا تھا تو کنڈیکٹر یا مسافر اس ڈوری کو کھینچ کر ہلا دیتا تھا جس سے ڈرائیور کے سر پر لٹکی گھنٹی بج جاتی تھی اور وہ سمجھ جاتا تھا کہ کسی مسافر کو بس سے اُترنا ہے اور وہ بس کو روک لیتا تھا۔ مذکورہ بالا میکس کی بسوں میں 'تھیمس' میک کی بسیں بہت پرانے ماڈل کی ہوتی

تھیں جنہیں عموماً عمر رسیدہ ڈرائیور ہی چلاتے نظر آتے تھے، یہ بسیں اکثر چلتے چلتے بند ہو جاتی تھیں تو ان کا کنڈیکٹر ڈرائیور کی نشست کے نیچے رکھے ایک مخصوص آہنی لیور کے ذریعے بس کے اگلے حصّے میں انجن کے ساتھ منسلک ایک مخصوص مقام میں وہ لیور پھنسا کر اسے گھما کر بس کو دوبارہ اسٹارٹ کرتا تھا۔ بسوں میں انواع واقسام کے ہارن لگانا بھی فیشن تھا۔ بسوں کے اندر لازمی طور پر ان اسٹاپس کے نام ضرور تحریر ہوتے تھے، جہاں جہاں سے ان بسوں کا گزر ہوتا تھا۔

علاوہ ازیں مردانہ کمپارٹمنٹ میں ''ایک روپیہ سے زائد ریزگاری نہیں ملے گی''اور خواتین کے کمپارٹمنٹ میں ''خواتین کا احترام کریں''، جیسی تحریریں بھی لازمی درج ہوتی تھیں۔ بسوں کے کنڈیکٹر اور ڈرائیور عام طور پر خاکی وردی میں ملبوس ہوتے تھے۔

کنڈیکٹر کے گلے میں ایک ایک بیگ لٹک رہا ہوتا تھا جس میں اوپر کے حصّے میں مختلف مالیت کے ٹکٹ گڈّیوں کی صورت میں لگے ہوتے تھے اور نیچے ریزگاری (مختلف مالیت کے دھاتی سکے) رکھے جاتے تھے۔ کنڈیکٹر مسافر سے مطلوبہ کرایہ وصول کر کے ٹکٹ ضرور دیتا تھا۔ سرکاری شعبے میں چلنے والی بسوں میں اکثر محکمہ ٹرانسپورٹ کے سرکاری اہلکاروں کی جانب سے بسوں پر ''چھاپہ'' بھی پڑتا تھا جس کے دوران بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے مسافروں اور کرایہ وصول کر کے ٹکٹ نہ دینے والے کنڈیکٹروں کے خلاف قانونی کاروائی بھی عمل میں لائی جاتی تھی۔

کچھ روٹس پر چلنے والی بسوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی تھی کہ ان روٹس پر چلنے والی بسوں کے درمیان مسابقتی 'ریس' بھی دیکھنے میں آتی تھی جو ایک جانب مہلک حادثات کا سبب بنتی تھی تو دوسری جانب عوام کی تفریح کا سامان بھی فراہم کرتی تھی۔1 روٹ نمبر 1: اس روٹ پر چلنے والی بسیں صدر تااِک اِک اسکول، دہلی کالونی (موجودہ پنجاب چورنگی) براستہ کینٹ اسٹیشن تک جاتی تھیں۔ فاصلے کے اعتبار سے یہ نسبتاً چھوٹا روٹ تھا۔ روٹ نمبر 1C: یہ روٹ قصبہ کالونی سے براستہ بنارس کالونی، حبیب بینک، پرانا گولیمار، ریکسر لائن، گارڈن، صدر، سٹی اسٹیشن، ٹاور سے ہوتا ہوا کیماڑی پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 1D: یہ روٹ ابتدا میں اورنگی ٹاؤن سیکٹر دس تا براستہ بنارس کالونی، حبیب بینک، پیٹرولپمپ ناظم آباد، لیاقت آباد، تین ہٹی، گرومندر، صدر سے کینٹ اسٹیشن پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ پہلے اس روٹ پر صرف گجرات کے معروف سیاسی خاندان ''پگانوالہ گروپ'' کی ملکیت ''گجرات ٹرانسپورٹ کمپنی'' کی بسیں چلتی تھیں۔ روٹ نمبر 1E: یہ روٹ بھی اورنگی ٹاؤن سے براستہ بنارس کالونی، حبیب بینک، پرانا گولیمار، گارڈن، رنچھوڑ لائن، بولٹن مارکیٹ تا ٹاور پر مشتمل تھا۔ اس روٹ پر بھی ''گجرات ٹرانسپورٹ کمپنی'' کی بسیں چلتی تھیں۔

روٹ نمبر 2: یہ بہت مصروف روٹ تھا جس پر بسوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی اور ہر چار منٹ کے وقفے سے بسیں چلتی تھیں یہ بسیں بھی اچھے معیار کی ہوتی تھیں۔ یہ روٹ پاپوش نگر (خلافت چوک) سے براستہ عبّاسی اسپتال، پیٹرولپمپ، لسبیلہ، گرومندر، صدر سے ٹاور پر مشتمل تھا۔ روٹ نمبر 2D: یہ روٹ نسبتاً بعد میں متعارف ہوا جو النور سوسائٹی تا صدر براستہ گلبرگ، عباسی اسپتال، ناظم آباد، پیٹرولپمپ، لسبیلہ، گرومندر، صدر سے ٹاور تک تھا۔ روٹ نمبر 2K: یہ بھی خاصا مصروف روٹ سمجھا جاتا تھا جو سخی حسن، حیدری، پاپوش نگر، ناظم آباد، پیٹرولپمپ، لسبیلہ، گرومندر، صدر، ٹاور سے ہوتا ہوا کیماڑی تک تھا۔ روٹ نمبر 3: اس روٹ پر بسوں کی

تعداد بہت کم ہوتی تھی اور اس پر سرکاری شعبے کی بسیں چلتی تھیں یہ روٹ حسین ڈی سلوا سے براستہ عبداللہ کالج، پاپوش نگر، بڑا میدان ، ناظم آباد، پیٹرولپمپ، لسبیلہ، گرومندر، جامع کلاتھ مارکیٹ، ٹاور سے کیماڑی تک تھا۔ روٹ نمبر 4: یہ روٹ صبا سینما، نئی کراچی، ناگن چورنگی، پیٹرولپمپ، لسبیلہ، رنچھوڑ لین، جونا مارکیٹ، بولٹن مارکیٹ سے ٹاور تک ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 4B: یہ روٹ بھی نئی کراچی سے براستہ سخی حسن، پیٹرولپمپ، لسبیلہ، گرومندر، صدر سے ٹاور تک تھا۔ روٹ نمبر 4H: یہ روٹ سندھی ہوٹل نیو کراچی سے براستہ سہراب گوٹھ، کریم آباد، لیاقت آباد، گرومندر، صدر سے کینٹ اسٹیشن تک تھا جسے بعد میں وسعت دے کر چمڑہ چورنگی کورنگی تک کر دیا گیا تھا۔ روٹ نمبر 4G: یہ روٹ بہت کم عرصے فعال رہا مگر ناکامی پر ختم کرنا پڑا، یہ نئی کراچی سے براستہ سہراب گوٹھ، واٹر پمپ، کریم آباد، لیاقت آباد ڈاکخانہ سندھی ہوٹل (لیاقت آباد) تک تھا۔ روٹ نمبر 4J: اس روٹ پر پہلے ''ناصر لمیٹڈ'' نامی ٹرانسپورٹ کمپنی کی بسیں چلتی تھیں جنکی تیز رفتاری کی بڑی شہرت تھی یہ روٹ ابتدا میں نئی کراچی اور بعد میں نارتھ کراچی سے براستہ سہراب گوٹھ، واٹر پمپ، کریم آباد، لیاقت آباد، تین ہٹی، گرومندر، جامع کلاتھ مارکیٹ سے ہوتا ہوا ٹاور پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 4K: ابتدا میں اس روٹ پر بھی ''ناصر لمیٹیڈ'' کی تیز رفتار بسیں چلتی تھیں اور یہ روٹ بھی نارتھ کراچی سے براستہ ناگن چورنگی، سخی حسن، پیٹرولپمپ، لسبیلہ، گرومندر، صدر سے ٹاور اور آگے کیماڑی تک تھا۔ یہ روٹ آج بھی فعال ہے اور اس پر خاصی تعداد میں آج بھی بسیں چل رہی ہیں۔

روٹ نمبر 5: یہ روٹ النور سوسائٹی تا کیماڑی، براستہ گلبرگ، واٹر پمپ، کریم آباد، لیاقت آباد، تین ہٹی، جیل روڈ، جمشید روڈ، گرمندر، جامع کلاتھ مارکیٹ، ٹاور سے کیماڑی تک محیط تھا روٹ 5A: یہ روٹ فیڈرل کیپٹل ایریا سے براستہ لیاقت آباد، تین ہٹی، گرومندر، جامع کلاتھ مارکیٹ، ٹاور سے ڈاکیارڈ پر مشتمل تھا۔ اس روٹ پر چلنے والی ''تھیمس'' ماڈل کی بسیں عموماً سنہ چالیس کے عشرے کی ساختہ ہوا کرتی تھیں جنہیں عمر رسیدہ ڈرائیور ہی چلاتے تھے۔ ان بسوں کی سست رفتار اور انجن کے قریب پیدا ہونے والی تکلیف دے گیس کی وجہ سے ان بسوں میں سفر کرنا خاصا تکلیف دے ہوتا تھا۔ شپ یارڈ اور ڈاکیارڈ میں کام کرنے والے بحالتِ مجبوری ان بسوں میں بادلِ ناخواستہ سفر کرتے تھے۔ اس روڈ پر چلنے والی زیادہ تر بسوں پر ''بلند شہر والا'' اور ''منزلِ مقصود'' تحریر ہوتا تھا۔

روٹ نمبر 5B: یہ روٹ فیڈرل کیپیٹل ایریا سے براستہ لیاقت آباد، تین ہٹی، لسبیلہ، گارڈن، رنچھوڑ لین، لی مارکیٹ، چاکیواڑہ، شیر شاہ سے مہاجر کیمپ تک تھا۔ اس روٹ پر یوں تو کئی ٹرانسپورٹرز کی بسیں چلتی تھیں مگر زیادہ بسیں ''ہوکنا'' نامی ٹرانسپورٹ کمپنی کی ہوتی تھیں جو سفید باڈی پر ایک سبز اور ایک نیلی پٹّی کے ساتھ نمایاں نظر آتی تھیں روٹ 5C: یہ روٹ پہلے گلبرگ تا ٹاور تک تھا مگر بعد میں اس کو وسعت دے کر شفیق موڑ، انچولی تک کر دیا گیا تھا گلبرگ سے یہ بسیں براستہ واٹر پمپ، دستگیر، عائشہ منزل، کریم آباد، لیاقت آباد، تین ہٹی، گرومندر، نمائش، صدر، برنس روڈ سے ہوتی ہوئی ٹاور تک جاتی تھیں۔ اس روٹ پر بسوں کی تعداد زیادہ اور نسبتاً بہتر بسوں کی وجہ سے یہ روٹ عوام میں بہت مقبول تھا روٹ 5D: یہ روٹ موسیٰ کالونی، فیڈرل کیپیٹل ایریا، لیاقت آباد، تین ہٹی، گرومندر، نمائش، صدر،

ٹاور سے ڈاکیارڈ تک تھا۔اس روٹ پر بسیں کم اور پرانی ہوتی تھیں جو سست رفتار سے چلتی تھیں مگر ڈاکیارڈ اور شپ یارڈ میں کام کرنے والے ان میں سفر کرنے پر مجبور تھے۔ روٹ نمبر 6: یہ روٹ بھی ابتدا میں دستگیر نمبر 9 سے ٹاور تک تھا جسے بعد میں فیّاض پلازہ یوبی ایل کمپلکس تک توسیع دے دی گئی تھی، یہ روٹ فیّاض پلازہ (موجودہ لگی ون کے سامنے) سے شروع ہو کر براستہ دستگیر، حسین آباد، لیاقت آباد، تین ہٹی، گرومندر، نمائش، صدر اور برنس روڈ سے ہوتا ہوا ٹاور پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔اس روٹ کو کراچی کا شہرت یافتہ روٹ تصوّر کیا جاتا تھا کیونکہ اس روٹ پر بسوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، بسیں بھی عمدہ کنڈیشن میں ہوتی تھیں اور فاسٹ فریکیونسی کی وجہ سے ان میں مسابقانہ ریس کا رجحان بھی پایا جاتا تھا۔یہ روٹ گزشتہ سال ہی بند ہوا ہے۔

روٹ نمبر 6A: یہ روٹ علی آباد (موجودہ ثبہ اسپتال) سے براستہ حسین آباد، کریم آباد، لیاقت آباد نمبر دس، پیٹرلیمپ ناظم آباد، گولیمار، لسبیلہ، گرومندر، نمائش، صدر، برنس روڈ ٹاور پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔روٹ نمبر 6B: یہ روٹ ڈسکو بیکری گلشن اقبال، سے براستہ موتی محل، سہراب گوٹھ، واٹر پمپ، لیاقت آباد نمبر دس، پیٹرولمپ ناظم آباد، گولیمار، لسبیلہ، گرومندر، نمائش، صدر، برنس روڈ سے ٹاور تک تھا۔ یہ روٹ محض چند سال تک فعال رہا اور جلد ہی ختم ہو گیا۔روٹ نمبر 7: یہ ایک مختصر روٹ تھا جو سندھی ہوٹل لیاقت آباد سے شروع ہو کر براستہ ڈاکخانہ لیاقت آباد، تین ہٹّی، گرومندر، نمائش، صدر، برنس روڈ سے ہوتا ہوا ٹاور پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔روٹ نمبر 7A: یہ روٹ سندھی ہوٹل لیاقت آباد سے براستہ ڈاکخانہ، دس نمبر، پیٹرولیمپ ناظم آباد، گولیمار، لسبیلہ، گارڈن، رنچھوڑلین، سعید منزل، بولٹن مارکیٹ سے ٹاور پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔روٹ نمبر 7B: یہ روٹ بھی سندھی ہوٹل لیاقت آباد سے براستہ ڈاکخانہ، دس نمبر، پیٹرولیمپ ناظم آباد، گولیمار، لسبیلہ، گارڈن، رنچھوڑلین، جونامارکیٹ، ڈینسوہال، ٹاور سے ہوتا ہوا کیماڑی پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔

روٹ 7C: سنہ 1982 سے پہلے یہ روٹ لیاقت آباد ڈاکخانہ تا کیماڑی براستہ رنچھوڑلین تھا تھا مگر سنہ اسّی کی دہائی کے اوائل میں اس روٹ کو از سرِ نو ترتیب دیا گیا اور اُسے بفر زون سے کیماڑی براستہ رشید ترابی روڈ، موسیٰ کالونی، کریم آباد، لیاقت آباد، گولیمار، بڑابورڈ، سائٹ ایریا، شیر شاہ، ٹاور اور کیماڑی تک کر دیا گیا۔یہ روٹ آج بھی فعال ہے۔روٹ نمبر 7D: یہ روٹ لیاقت آباد ڈاکخانہ سے براستہ دس نمبر، پیٹرولیمپ ناظم آباد، گولیمار چورنگی، بڑابورڈ، ریکسرلین، گارڈن، سعید منزل، بولٹن مارکیٹ تا ٹاور تک تھا۔روٹ نمبر 7H: ابتدا میں یہ روٹ سندھی ہوٹل لیاقت باد سے براستہ ڈاکخانہ، گولیمار، لسبیلہ، گارڈن، رنچھوڑلین، سعید منزل، جامع کلاتھ مارکیٹ، بولٹن مارکیٹ، ٹاور سے کیماڑی تک تھا مگر بعد میں اسے سندھی ہوٹل لیاقت آباد سے آگے پرانی سبزی منڈی، حسن اسکوئر، نیپا چورنگی، گلشن چورنگی، ضیا کالونی سے گلشن بلاک 13 سی تک وسعت دے دی گئی تھی۔روٹ نمبر 8: یہ بھی ایک مختصر روٹ ہوتا تھا جو پیر الٰہی بخش کالونی بس ٹرمینل سے براستہ جمشید روڈ، گرمندر، نمائش، جامع کلاتھ مارکیٹ، بولٹن مارکیٹ سے ٹاور پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔

روٹ نمبر 8A: یہ روٹ بھی پیر الٰہی بخش کالونی سے شروع ہو کر براستہ جمشید روڈ، گرومندر، نمائش، صدر، ہائیکورٹ، میکلوڈ روڈ (موجودہ آئی آئی چندریگر روڈ)، سٹی اسٹیشن، ٹاور سے کیماڑی پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 8D: یہ روٹ خاصا طویل اور اہم

روٹ ہوتا تھا جو پیر الٰہی بخش بس ٹرمینل سے شروع ہو کر براستہ تین ہٹی، لیاقت آباد، ناظم آباد، حبیب بینک، سائٹ ایریا، شیر شاہ، گلبائی، کھارادر، ٹاور سے ہوتا ہوا کیماڑی پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 9C: یہ ایک منفرد اور مختصر روٹ تھا جو ملیر ہالٹ سے شروع ہو کر ملیر کینٹ پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 10: یہ بڑا دلچسپ قسم کا روٹ تھا جو زگ زیگ کی صورت راستوں پر مشتمل تھا اس روٹ کا آغاز نرسری خیّام سینما (پی ای سی ایچ ایس) سے ہوتا اور براستہ طارق روڈ، جگر مراد آبادی روڈ، خداداد کالونی، گرومندر، نمائش، جامع کلاتھ مارکیٹ، بولٹن مارکیٹ سے ہوتا ہوا ٹاور پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ مشہور گلوکار احمد رشدی کا مقبولِ عام گیت "کاش کوئی مجھ کو سمجھاتا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا"، روٹ نمبر 10 کی بس میں ہی فلمایا گیا تھا۔

روٹ نمبر 11A: یہ ایک مختصر روٹ تھا جو صدر سے شروع ہو کر براستہ محمود آباد، اختر کالونی پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 11B: یہ بھی ایک طویل روٹ تھا جو محمود آباد سے براستہ صدر، نمائش، گرومندر، جیل چورنگی، سبزی منڈی، حسن اسکوائر، گلشن اقبال، موتی محل، فضل مل (موجودہ لکّی ون)، واٹر پمپ پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 11C: ابتدا میں یہ روٹ صدر سے براستہ محمود آباد، اعظم بستی پر اختتام پذیر ہو جاتا تھا مگر بعد میں اسے توسیع دے دی گئی اور اب یہ روٹ اعظم بستی سے براستہ محمود آباد، صدر، جیکب لائن، جیل چورنگی، حسن اسکوائر، نیپا، کراچی یونیورسٹی، محکمہ موسمیات سے گلستانِ جوہر تک ہے اور اس روٹ پر آج بھی کچھ بسیں رواں دواں نظر آتی ہیں۔

روٹ نمبر 15: یہ روٹ صدر تا سعود آباد براستہ شارعِ فیصل، ملیر 15 پر مشتمل تھا۔ روٹ 15A: یہ روٹ بھی صدر سے براستہ شارعِ فیصل، ائیرپورٹ، ناتھا خاں گوٹھ، کالا بورڈ، ملیر ٹنکی، سعود آباد پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 15C: یہ ایک طویل روٹ تھا جو چاکیواڑہ، لیمارکیٹ، رنچھوڑ لین، گارڈن، لسبیلہ، تین ہٹی، جیل روڈ، ڈالمیا، ڈرگ روڈ، ناتھا خاں گوٹھ، ائیرپورٹ، کالا بورڈ، ملیر ٹنکی، تا سعود آباد پر مشتمل تھا۔ روٹ نمبر 16: یہ روٹ صدر تا لانڈھی قائدآباد براستہ، شارعِ فیصل ائیرپورٹ، ناتھا خان گوٹھ، کالا بورڈ، ملیر 15، لانڈھی قائدِ آباد پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ روٹ نمبر 17, 17 , 17 K , 17C , 17B, 17A اور 17J: ان روٹس پر چلنے والی تمام بسیں صدر سے کورنگی کے مختلف سیکٹرز اور لانڈھی بابر مارکیٹ اور قائدآباد تک چلتی تھیں۔ روٹ نمبر 18: یہ بھی ایک مختصر روٹ ہوتا تھا جو صدر دواخانے سے شروع ہو کر براستہ کالا پل، محمود آباد پر اختتام پذیر ہو جاتا تھا۔

کراچی: پارسی برادری کا تاریخی 'آتش کدہ'

تحریر: وسیم صدیقی

یہ عمارت 'اگیاری' ہے۔ یعنی پارسی برادری کا 'آتش کدہ'۔۔۔ جس کا پورا نام 'ایچ جے بہرانہ پارسی دار مہر' ہے۔ اس کے دروازے پر ہی آپ کو یہ عبارت لکھی نظر آ جائے گی کہ 'اندر آنا منع ہے'۔۔ اور۔۔۔ 'صرف ممبران کے لئے'

کراچی

'صدر'۔۔ شہر قائد کا وہ علاقہ ہے جہاں ہفتے کے ساتوں دن اور دن کے چوبیس گھنٹے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے لیکن اسی بازار میں ایک عمارت ایسی بھی ہے جہاں یہ بورڈ لگا ہے کہ 'اندر آنا منع ہے'۔۔ اور۔۔۔ 'صرف ممبران کے لئے۔'

یہ عمارت 'اگیاری' ہے۔ یعنی پارسی برادری کا 'آتش کدہ'۔۔۔ جس کا پورا نام 'ایچ جے بہرانہ پارسی دار مہر' ہے۔ ڈاکٹر داؤد پوتہ روڈ پر بوہری بازار کے قریب واقع یہ ایک قدیم عمارت ہے جو عشروں پہلے تعمیر ہوئی تھی۔ لیکن، اس کی صاف صفائی اور چمکتا ہوا رنگ و روغن دیکھ کر کہیں سے اس کی درازی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا۔ آتش پرست یا پارسی برادری کا یہ عبادت خانہ کئی لحاظ سے سب سے منفرد اور اپنی اایک الگ پہچان رکھتا ہے۔

جس جگہ یہ عمارت واقع ہے وہاں لوگوں اور گاڑیوں کا اس قدر رش ہوتا ہے کہ نہ تل دھرنے کو جگہ ملتی ہے اور نہ کان پڑی آواز سنائی دیتی ہے۔ گوکہ عمارت کے نگراں جان آہو والیہ کی جانب سے وائس آف امریکہ کے نمائندے کو عمارت کے محدود حصے تک دورے کی اجازت ملی تھی۔ تاہم، اس حصے سے ہی پوری عمارت میں پھیلی خاموشی اور ہر سو پھیلے سکوت کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ ہر شے ایک ترتیب سے رکھی ہوئی ہے اور کہیں گرد و غبار کا شائبہ تک نہیں۔

ایک سنگین مسئلہ

پارسی برادری کو مسلسل کمی کا سامنا ہے۔ یہاں تک کہ یہ مسئلہ نہایت سنگین اور حل طلب ہے۔ کراچی انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اینڈ انٹرپرینوشپ نامی ادارے کی ایک رپورٹ کے مطابق 'کراچی میں اس وقت پارسی کمیونٹی کے صرف 1800 افراد باقی رہ گئے ہیں اور ان میں سے بھی 60 فیصد 60 سال سے زیادہ عمر کے ہیں۔'

رپورٹ کے مطابق 'گزشتہ پانچ سے آٹھ سالوں کے درمیان نسبتاً کم عمر پارسی افراد عمر رسیدہ والدین کے علاوہ اپنے تمام اہل خانہ کے ہمراہ کراچی کو خیر باد کہہ گئے ہیں اور چونکہ پارسی برادری کی شرح خواندگی 100 فیصد ہے اور یہ شہر کی امیر کمیونٹی میں شمار ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا جانا ملک کے لئے نقصان کا باعث ہے۔'

تحقیقی حوالے بتاتے ہیں کہ پارسی مذہب کو اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ پارسی صرف پیدائشی ہی ہو سکتے ہیں۔اس لئے اس مذہب کی تبلیغ بھی نہیں کی جاتی۔اس وجہ سے بھی پاکستان ہی نہیں پوری دنیا میں ان کی آبادی گھٹ رہی ہے۔

شہر بھر میں نو پارسی کالونیز ہیں۔زیادہ تر افراد پرانے ایریاز میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ نئ جنریشن زیادہ تر انگریزی بولتی اور سمجھتی ہے جبکہ آبائی زبان گجراتی سے بھی بخوبی واقف ہے۔شہر میں پارسی برادری کے دو ہی عبادت کدے ہیں ایک صدر میں اور دوسرا پاکستان چوک پر واقع ہے۔شہر کی بیشتر آبادی پارسی مذہب، پارسی برادری اور طریقہ عبادت سے لاعلم ہے اس لئے یہ تمام شے ان کے لئے 'اسراریت 'کا درجہ رکھتی ہیں۔کچھ ذوق بھی کم ہے ورنہ کتابوں اور شہر کی تاریخ پارسی برادری کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔

کراچی کی معمار برادری

تاریخ شاہد ہے کہ یہ برادری کراچی کی معمار ہے۔شہر کو لیڈی ڈیفرن اسپتال، اسپنسر آئی ہوسپیٹل، ماما پارسی اسکول، این ای ڈی یونیورسٹی اور پارسی ہائی اسکول جیسے ادارے اسی برادری کی دین ہیں۔شہر کے پہلے میئر جمشید نسروانجی رستم جی مہتا، ادے شیر کاؤس جی اور ایڈولجی ڈنشا بھی پارسی ہی تھے۔

پارسی کمیونٹی میں ایک چیز جس کا اعلان باقاعدگی سے کیا جاتا ہے وہ ہے کسی کی موت کا اعلان۔۔ تقریباً ہر مہینے کسی نہ کسی کی موت کا اعلان سامنے آتا ہے جو پارسی کالونی کے اندر رکھے بلیک بورڈ پر چاک سے لکھا جاتا ہے۔جو پہلا شخص اس اعلان کو دیکھتا ہے وہ اسے آگے بڑھ دیتا ہے اور یوں پوری کمیونٹی کو خبر ہو جاتی ہے۔اس کے برعکس پیدائش کی خبر 'سرپرائز' کے طور پر سامنے آتی ہے۔

رنچھوڑ لائن کی "سندھ یونیورسٹی" سے، "جامعہ کراچی" تک (منتقلی)

تحریر: مختار احمد

زندہ قومیں اپنے ماضی، حال اور مستقبل سے غافل نہیں ہوتیں۔ قوموں کی تباہی اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے تابناک ماضی کو بھلا دیتی ہیں۔ جو لوگ تاریخ کو بھول جاتے ہیں تاریخ بھی انہیں بھول جاتی ہے اور پھر نہ تو ان کا ماضی ہوتا ہے اور نہ ہی حال یا مستقبل۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہوا ہے۔

ہم نے اپنے ماضی کو فراموش کرتے ہوئے انگریزوں کو سب سے مہذب، سب سے ترقی یافتہ قوموں میں شمار کرنا شروع کر دیا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہم انگریزوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب قوم ہیں جس کی زندہ مثال یہ ہے کہ جس وقت انگریز لباس اور کھانے کے طور پر پتوں اور گھاس پھوس کا استعمال کرتے تھے، رہائش کے لیے غار اور آگ جلانے کے لیے پتھر کو آپس میں ٹکرا کر آگ جلاتے تھے۔

5ہزار سال قدیم موئن جودڑو ایک تہذیب یافتہ شہر تھا جسے دریافت بھی ایک انگریز ماہر آثار قدیمہ سر جان مارشل نے کیا تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ خطہ ایک مہذب اور شائستہ قوم کی قدریں رکھتا ہے۔ 5ہزار سال بعد دریافت کئے جانے والے اس شہر میں نہ صرف رہنے کے لیے مکانات، عبادت کے لیے عبادت گاہیں، بازار، فراہمی و نکاسی آب کے موثر انتظامات تھے بلکہ وہاں علمی درس گاہوں کی بھی نشانیاں دریافت ہوئی ہیں جن میں سے ایک عمارت کو باقاعدہ طور پر "موئن جودڑو" کالج کا نام دیا گیا ہے۔

اس تہذیب و تمدن والے شہر کو، جو ہمارا ورثہ ہے، عالمی سطح پر یونیسکو نے بھی عالمی ورثے میں شامل کر رکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ بابل، عراق اور ایران میں بھی قدیم تعلیمی اداروں کی واضح نشانیاں ملی ہیں۔ ان کے علاوہ ٹیکسلا سے بھی ایک قدیم یونیورسٹی کے آثار ملے ہیں جو وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی تھی جہاں 300 سے زائد لیکچر ہالز و دیگر سہولیات موجود تھیں۔ اسے دنیا کی پہلی یونیورسٹی بھی قرار دیا جاتا ہے۔

ماہرین آثار کے مطابق اس یونیورسٹی میں 68 مضامین پڑھائے جاتے تھے جن میں تجارت، طب، فلسفہ اور سرجری سمیت دیگر کئی شعبہ جات و موضوعات شامل تھے؛ اور جہاں دنیا بھر سے آئے ہوئے 10ہزار طلبہ کو 200 سے زائد اساتذہ (پروفیسرز) تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے تھے۔ اس قدیم یونیورسٹی کو آج "نلندہ یونیورسٹی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر ان دونوں مقامات کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے کہ دنیا کی پہلی یونیورسٹیاں یا علمی درسگاہیں اسی خطے میں واقع تھیں تو یہ قطعی طور پر غلط نہ ہوگا کیونکہ ان ہی یونیورسٹیوں کو دیکھتے ہوئے آج دنیا بھر میں، جامعہ الاظہر سے لے کر یونیورسٹی آف کیمبرج تک، نہ جانے کتنی ہی جامعات قائم کی گئی ہیں۔

اب اگر سندھ کی بات کی جائے تو موئن جو دڑو اسی خطے کا حصہ تھا جہاں سب سے پہلے تعلیم کا فروغ ہوا۔ یہ تہذیب قدرتی آفات کے نتیجے میں تباہ ہو گئی مگر اس کے باوجود یہاں ہر دور میں تعلیم کے فروغ کے لیے کام ہوتا رہا اور تالپور دور تک یہاں مدارس اور اسکول قائم تھے جہاں تمام مذاہب کے طلبہ وطالبات تعلیم سے آشنا ہو رہے تھے۔ جب انگریزوں نے سندھ پر 1839 میں قبضہ کیا تو چونکہ اس وقت سندھ میں تالپوروں کا نظام تعلیم رائج تھا لہذا انہوں نے سب سے پہلے اس تعلیمی نظام کو اپنے لئے خطرہ سمجھتے ہوئے ختم کر دیا؛ اور کیونکہ اس وقت فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی لہذا انہوں نے اسے بھی ختم کرتے ہوئے سندھی کو سرکاری زبان قرار دے دیا۔ پھر اپنی انگریزی کتابوں کو سندھی میں ترجمہ کر کے اسکولوں میں بطور نصاب استعمال کرنا شروع کر دیا اور 1841 میں صدر میں (جو اُس وقت فوجی چھاؤنی کا علاقہ تھا) انگریز فوجیوں کی 40 ویں رجمنٹ کے لیے ایک اسکول قائم کیا لیکن اس اسکول میں صرف انگریز فوجیوں کے بچے ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے، مقامی بچوں کے لیے یہ اسکول شجر ممنوعہ تھا۔

اس کے بعد 1845 میں کلکٹر کراچی کیپٹن پریڈی کی کوششوں سے چرچ مشن اسکول قائم ہوا (جہاں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی)۔ اس کے بعد گویا کراچی شہر میں اسکولوں کے قیام میں تیزی آگئی اور کراچی گرامر اسکول، این جے وی اسکول، ٹیکنکل ہائی اسکول، بائی ویرجی سپاری والا اسکول، سینٹ جوزف کانوینٹ ہائی اسکول، سینٹ پیٹرک اسکول، ہملے اسکول منوڑہ، گجراتی اسکول، محمڈن گرلز اسکول، ہندو سندھی اسکول، دھن پاٹ شالہ، ورنا کیولر اسکول، وسطانی اسکول، ماما پارسی اسکول، کراچی اکیڈمی، ٹیچر ٹریننگ اسکول، تعلیم بالغان اور کمرشل اسکول قائم ہو گئے۔ اور علم کے پیاسوں کی علمی پیاس بجھائی جانے لگی۔

1887 تک شہر میں اعلی تعلیم کا کوئی ادارہ قائم نہیں تھا اور صرف میٹرک تک کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس صورتحال کے پیش نظر 1887 میں پہلا سندھ آرٹس کالج قائم کیا گیا جسے بعد میں ڈی جے کالج کا نام دے دیا گیا اور اسی کے ساتھ این ای ڈی کالج، ایس سی شاہانی لاء کالج، ڈاؤ میڈیکل کالج، سندھ مسلم گورنمنٹ سائنس کالج، ایس ایم لاء کالج بھی قائم ہو گیا جہاں طلبہ وطالبات کو اعلی تعلیم کی سہولیات حاصل ہو گئیں۔

اس وقت تک سندھ بھر میں کوئی یونیورسٹی قائم نہیں تھی اور سندھ کو صوبہ بنانے کی تیاریاں کی جارہی تھیں۔ تب ایک انگریز دانشور مسٹر جیکسن نے سندھ میں یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی جسے ہندوؤں کی مخالفت کے سبب مسترد کر دیا گیا اور پھر جب 1936 میں سندھ کو صوبہ قرار دیا گیا تو ایک دانشور میراں محمد شاہ کی سربراہی میں یونیورسٹی کے قیام کے لیے پھر سے کمیٹی قائم کی گئی مگر پھر یونیورسٹی قائم کرنے کی قرارداد کو مسترد کر دیا گیا لیکن تعلیم دوست لوگوں کی یونیورسٹی کے قیام کی جدوجہد کا سلسلہ جاری رہا اور بالآخر 1946 میں سندھ یونیورسٹی کا بل منظور کر لیا گیا اور اس طرح قیام پاکستان سے قبل، 13 اپریل 1947 کے روز، کراچی کے گنجان علاقے رنچھوڑ لائن میں پرنسس اسٹریٹ کے مقام پر سندھ یونیورسٹی قائم کر دی گئی۔ یہ موجودہ چاند بی بی روڈ ہے جو سول اسپتال کے عقب میں واقع ہے۔ یہاں کراچی گرلز کالج کی بلڈنگ ہے جہاں ماضی میں کبھی گورنمنٹ اسکول واقع تھا۔ اسکول تو کوتوال بلڈنگ میں منتقل کر دیا گیا اور

یہاں سندھ یونیورسٹی بنادی گئی۔اس کے اطراف قدیم عمارتیں،جوڈاؤمیڈیکل کالج ہاسٹلز کے طور پر زیر استعمال تھیں،وہاں بمبئی، اندرونِ سندھ،پنجاب ودیگر علاقوں سے آنے والے طلبہ وطالبات کے لیے ہاسٹلز قائم کیے گئے۔

چونکہ اس وقت تک پاکستان کا قیام عمل میں نہیں آیاتھااور انگریزوں کی حکمرانی تھی،لہذااس یونیورسٹی کاپہلاچانسلر سر فرانسس موڈی کو بنایاگیاجبکہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وائس چانسلراور آغاتاج محمد کور جسٹرار مقرر کیاگیا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وقت میٹرک اور انٹر بورڈ کا کوئی وجود نہیں تھالہذاسندھ یونیورسٹی ہی میٹرک اور انٹر کے امتحانات کاانعقاد بھی کرواتی اوران کے نتائج جاری کرتی تھی۔

اس وقت کراچی شہر کی آبادی بھی بہت زیادہ نہیں تھی اس لیے یونیورسٹی میں طلبہ کی تعداد بھی خاصی کم ہوا کرتی تھی لیکن کیونکہ اس وقت کے اساتذہ کی تمام تر توجہ طلبہ کو تعلیم دینے پر مرکوز ہوتی تھی،لہذاپڑھائی کامعیار شاندار تھا۔اس یونیورسٹی میں گو کہ زیادہ مضامین تو نہیں تھے لیکن اس وقت اردو،سندھی،انگریزی اور اردو لازمی مضامین میں شامل تھے۔

جہاں تک جامعہ کراچی (کراچی یونیورسٹی) کا تعلق ہے توجب 1951 میں سندھ یونیورسٹی کوجامشورو،حیدرآباد منتقل کردیاگیاتوپہلے پہل جامعہ کراچی کوایک "وفاقی یونیورسٹی" کے طور پر موجودہ اردو یونیورسٹی،عبدالحق کیمپس(سابقہ اردو آرٹس کالج) کے سامنے ایک عمارت میں قائم کیاگیاجبکہ اسے 1960 میں کنٹری کلب روڈ(حالیہ یونیورسٹی روڈ)پراس جگہ منتقل کیاگیاجہاں ماضی میں جنگل، باغ اور کھیتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہواکرتاتھا۔یونیورسٹی کی جگہ ملیر کے باغات تک کی گزرگاہ تھی لہذایہاں ڈملوٹی کنویں کے ذریعے پانی کی فراہمی کی جاتی تھی جس کاسلسلہ تاحال جاری ہے۔اس کی نشانی کے طور پر یونیورسٹی کے اندر ہی متعدد چھوٹی چھوٹی برجیاں موجود ہیں جن میں سے آج بھی پانی بہنے کی آوازیں آتی ہیں جبکہ گزرگاہ کے ساتھ ساتھ کئی پتھروں کی چھوٹی چھوٹی قدیم عمارتیں بھی قائم ہیں جن کے بارے میں کہاجاتاہے کہ یہ کوٹھی نماکوٹھڑیاں ماضی میں ناکے ہواکرتے تھے جن کامقصد چنگی وصولی تھاجبکہ بعض دوسری کوٹھڑیاں بطور حفاظتی چوکی استعمال کی جاتی تھیں۔

تاریخ کے مطابق 1950 میں جب یونیورسٹی ایکٹ پارلیمنٹ سے منظور ہواتوجامعہ کراچی کے لیے نئی جگہ تلاش کی گئی اوراس وقت کے کنٹری کلب روڈپر 1279 ایکڑپر محیط قطعہ اراضی کوجامعہ کراچی کے لیےالاٹ کیاگیا۔ابتدائی ماسٹر پلان میں اس وقت یہ منصوبہ بندی کی گئی کہ اس پورے خطے کوایجوکیشن سٹی بنایاجائے۔اسی بناءپر یونیورسٹی کے ساتھ ساتھ این ای ڈی کو(جوماضی میں این ای ڈی کالج کے نام سے،ڈی جے کالج کے عقب میں واقع تھی)انجینئرنگ یونیورسٹی کادرجہ دے کراسی جگہ منتقل کردیاگیا۔

کیونکہ کراچی یونیورسٹی تیار ہوچکی تھی لہذااسے مرحلہ وار رنچھوڑلائن سے موجودہ یونیورسٹی میں منتقل کیاگیا۔یہاں کلیہ فنون،کلیہ تعلیم، کلیہ علوم،کلیہ علم الادویہ،کلیہ قانون،کلیہ طب اوران کے تحت درجنوں شعبے قائم کردیئے گئے تھے،لہذاطلبہ وطالبات کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔اس سلسلے میں بعض مؤرخین رنچھوڑلائن سے کراچی یونیورسٹی کی منتقلی کی داستانیں بھی سناتے ہیں۔ان کاکہنایہ ہے کہ جب یونیورسٹی تیار ہوگئی تور نچھوڑلائن کیمپس میں پڑھنے والے طلبہ نے باقاعدہ طور پرایک پیدل جلوس نکالااور مارچ کرتے ہوئے

اس وقت کے وائس چانسلر کے ساتھ (جو جلوس کے آگے آگے اپنی گاڑی میں چل رہے تھے) کراچی یونیورسٹی پہنچے۔ آج ہماری اس جامعہ کراچی کو ایک اعلیٰ یونیورسٹی کے طور پر جانا جاتا ہے۔

اس یونیورسٹی سے لگ بھگ 145 کالجز کا الحاق ہے اور ہر سال اس جامعہ سے 50 ہزار سے زائد طلبہ وطالبات فارغ التحصیل ہو کر نکل رہے ہیں۔ اس یونیورسٹی کی ڈگریوں کو دنیا بھر میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سندھ یونیورسٹی/جامعہ کراچی کے قیام اور ان کی اہمیت اور افادیت کے حوالے سے مختلف ماہرین سے رابطہ کیا تو ان میں سے جامعہ کراچی میں اس وقت شماریات کے ایک پروفیسر محترم زاہد محمود نے تصدیق کی کہ کراچی میں سب سے پہلے سندھ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور یہ یونیورسٹی رنچھوڑ لائن کے علاقے میں پہلے سے موجود قدیم عمارتوں میں قائم کی گئی جہاں آج کراچی گرلز کالج کی عمارت موجود ہے، جبکہ اطراف کی قدیم عمارتوں کو بطور ہاسٹل استعمال کیا گیا۔

پروفیسر زاہد محمود کے بقول، ان کے بڑے بھائی سید حامد محمود اس ہاسٹل کے وارڈن تھے اور انہیں ان کی سخت گیر طبیعت کے سبب اس وقت کے طلبہ جارج پنجم کے نام سے بلاتے تھے۔ مگر کیونکہ پاکستان بنتے ہی جامعہ کراچی کا قیام عمل میں آ گیا لہٰذا ان کے بھائی بھی جامعہ کراچی منتقل ہو گئے۔ موجودہ یونیورسٹی کے "اسٹاف ٹاؤن" میں ملازمین کے لیے بنائے جانے والے مکانات میں سب سے پہلا مکان بھی انہیں الاٹ کیا گیا جہاں وہ آج بھی رہائش پذیر ہیں۔

جامعہ کراچی کے حوالے سے ان کا کہنا تھا کہ ابتداء میں یہاں جنگل ہی جنگل تھا جس کے خاتمے کے باوجود زرخیز زمین ہونے کی وجہ سے یہاں سب طرف ہریالی تھی اور خونخوار درندوں کے علاوہ چھوٹے موٹے جانور بھی دکھائی دیتے تھے جبکہ خاص موسم میں یہاں بیر بہوٹی کی بہتات ہوا کرتی تھی (جو جامنی کلر کا مخملی کیڑا ہوتا ہے) اور اسٹاف ٹاؤن کے بچے اس سے کھیلا کرتے تھے۔

انہوں نے اپنے دفتر میں کراچی کا پرانا ماسٹر پلان دکھاتے ہوئے، رنچھوڑ لائن کی سندھ یونیورسٹی کی جگہ دکھانے کے ساتھ ساتھ یہ وضاحت بھی کی کہ رنچھوڑ لائن کیونکہ ایک گنجان آباد علاقہ تھا، اس لیے کسی بھی طور پر وہ جگہ یونیورسٹی کے لیے مناسب نہیں تھی۔ اس بات کے پیش نظر، سندھ یونیورسٹی کی حیدرآباد منتقلی کے بعد، جامعہ کراچی کو ماضی کے کنٹری روڈ اور آج کے یونیورسٹی روڈ کے ساتھ منتقل کیا گیا۔ چونکہ ماسٹر پلان کے مطابق اس تمام رقبے کو "ایجوکیشن سٹی" کے نام سے استعمال کیا جانا تھا، لہٰذا جلد ہی این ای ڈی یونیورسٹی بھی اس کے برابر میں منتقل کر دی گئی۔ اس سلسلے میں مزید پروگرام بھی ترتیب دیئے گئے تھے مگر ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکا۔

اس حوالے سے اردو یونیورسٹی میں شعبہ ابلاغ عامہ کے پروفیسر، ڈاکٹر سعید عثمانی نے اپنی گفتگو میں کہا کہ قیام پاکستان سے چند ماہ قبل یونیورسٹی ایکٹ منظور کر لیا گیا تھا لہٰذا سندھ یونیورسٹی کو عارضی طور پر رنچھوڑ لائن کے علاقے میں لب سڑک، پتھروں کی قدیم عمارتوں میں قائم کیا گیا مگر جگہ کی تنگی کے سبب یہ یونیورسٹی اس وقت بالکل قابل استعمال نہیں رہی جب بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے مہاجرین کے بچوں کا اضافہ ہوا۔ لہٰذا اسے جلد ہی موجودہ جامعہ کراچی منتقل کر دیا گیا۔ وہ دن کراچی کے طلبہ وطالبات کے لیے انتہائی خوشی کا دن تھا، لہٰذا وہ پیدل ہی رنچھوڑ لائن سے کراچی یونیورسٹی تک، جو اس جگہ سے 12 میل دور واقع تھی، جلوس کی شکل میں

گئے۔ تب اُس وقت کے اخبارات میں باقاعدہ طور پر کالم چھاپے گئے جن کا عنوان ''شہر سے 12 میل دور'' تھا۔
یونیورسٹی کے حوالے سے شہر کراچی کی تاریخ پر کتاب لکھنے والے مصنف عثمان دموہی نے کچھ اس طرح اظہار خیال کیا کہ ماضی میں رنچھوڑلائن میں، جہاں ہر طبقے کے لوگ آباد تھے، سندھ یونیورسٹی قائم کی گئی جس سے یہاں کے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا جس سے اس علاقے کے نوجوانوں نے سب سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ سلاوٹہ برادری جو رنچھوڑلائن گزدر آباد کے قدیمی باسی ہیں اور پیشے کے اعتبار سے سل بٹا کوٹنے کے ساتھ ساتھ پتھروں کی عمارت تعمیر کرنے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ان کے کئی نوجوانوں نے اسی یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کر کے ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔
ایک اور محقق سید نعمت اللہ بخاری کا کہنا تھا کہ ان کے والد رائل انڈین نیوی میں تھے اور وہ قدیم ترین اوجھا سینی ٹوریم کے نزدیک ہی رہائش پذیر تھے۔ لہٰذا انہیں موجودہ جامعہ کراچی کو ماضی میں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ اس وقت یونیورسٹی کے اطراف میں جنگلات اور چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی؛ اور کیونکہ یہاں کھیتی باڑی ہوا کرتی تھی اس لیے انگریز سرکار نے زرعی زمینوں کی حدود تعین کرنے کے لیے یہاں چھوٹی چھوٹی برجیاں بنا رکھی تھیں، جو آج بھی یونیورسٹی کے اندر موجود ہیں۔ برجیوں سے مقامی لوگوں کو اس بات کا پتا چلتا تھا کہ ان کی زمین کہاں سے کہاں تک ہے۔
ان کے مطابق، ویسے تو کراچی یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی کی رنچھوڑلائن سے حیدر آباد منتقلی کے بعد ہی مرحلہ وار منتقل کرنا شروع کر دی گئی تھی اور ابتدا میں آرٹس لابی اور ایڈمنسٹریشن بلاک کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ مگر 1956-1957 کے بعد جامعہ کراچی میں تعلیمی سرگرمیاں مکمل طور پر شروع کر دی گئی تھیں۔ اسی حوالے سے آثار قدیمہ کے سابق ڈائریکٹر اور ماہر آثار قدیمہ قاسم علی قاسم نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ رنچھوڑلائن کو اس بات کا اعزاز حاصل تھا کہ سب سے زیادہ تعلیمی درسگاہوں کے ساتھ ساتھ پہلی لائبریری، جسے ''نیٹو لائبریری'' کہا جاتا تھا، اسی علاقے میں قائم ہوئی اور سندھ یونیورسٹی کے قیام کا اعزاز بھی اسی علاقے کو حاصل ہوا۔ مزید یہ کہ اس علاقے کو اس بات کا بھی اعزاز حاصل رہا کہ قیامِ پاکستان کے بعد، جب بھارت سے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے سندھ کی جانب ہجرت کی تو انہیں سندھ یونیورسٹی اور اس کے ہاسٹل کی پرانی عمارتوں میں نہ صرف ٹھہرایا گیا بلکہ ان کی بھرپور طریقے سے مہمان نوازی بھی اسی علاقے کے مکینوں کے حصے میں آئی۔
انہوں نے موجودہ جامعہ کراچی کے علاقے کو ایک قدیم ترین علاقہ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ماضی میں جب یونیورسٹی کے سامنے اور کیمپس کے اطراف میں کھدائی کی گئی تو یہاں سے پتھر کے آخری دور کے اوزار اور نوادرات دریافت ہوئے جن سے اس جگہ کی قدامت کا اندازہ پتھر کے آخری دور تک لگایا گیا۔ مگر چونکہ یہاں جامعہ کراچی کی تعمیرات ہو چکی تھیں، لہٰذا اس پر مزید تحقیق نہیں ہو سکی۔
سندھ یونیورسٹی کی تاریخ کے حوالے سے ایک ضعیف العمر شخص سید سخاوت الوری نے (جو شعبہ صحافت سے تعلق رکھتے ہیں) اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ رنچھوڑلائن میں کراچی گرلز کالج کی جگہ جہاں ماضی میں سندھ یونیورسٹی قائم تھی، اس سے قبل وہاں

ایک سرکاری اسکول قائم تھا جس میں وہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مگر پھر اس اسکول کو سول اسپتال کے عین سامنے کوتوال بلڈ نگ میں منتقل کر دیا گیا (جسے آج بھی "کوتوال بلڈ نگ اسکول" کہا جاتا ہے) جہاں انہوں نے بقیہ تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے کہا کہ ماضی میں یہ کوئی پر رونق علاقہ نہیں تھا بلکہ یہاں بڑے بڑے میدان قائم تھے جہاں مہاجرین کو بسایا گیا تھا، جبکہ سول اسپتال کا مردہ خانہ، جو آج اندر کی جانب موجود ہے، ماضی میں چاند بی بی روڈ پر پتھروں والی ایک گول عمارت میں واقع تھا۔ آس پاس رہنے والے لوگ خوف کے باعث اس مردہ خانے کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی گھبراتے تھے۔

مسئلہ فلسطین کی مناسبت سے تصویری نمائش اور مقابلہ مصوری کی تقسیم انعامات

اولڈ کراچی کی نہاریاں

اے نہاری تیرے چکر میں کہاں کہاں نہ گئے

اظہر عزمی

نہاری سے پہلا رابطہ بچپن میں پہلی چورنگی ناظم آباد کی کیفے ذائقہ کی نہاری سے ہوا۔ گھر اور اسکول دونوں اس کے قریب تھے۔ گھر والے نہاری مانگتے تو دوڑے چلے جاتے۔ یہاں اصلی گھی کا ٹکڑا لگایا جاتا تھا جس کی اشتہا انگیز خوشبوناک سے اتر کر پیٹ کو دیوانہ کر دیتی۔

فیڈرل بی ایریا واٹر پمپ پر جہاں اب للی بینکوئٹ ہے وہاں گلستان ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ اس کی نہاری کا مزا ابھی یاد رہے گا۔ جیب میں پیسے نہ ہوتے تو کسی کو گھیر گھار کر وہاں لے جاتے۔ صفدر مرزا اس وقت ملازمت پر تھے۔ سو جیب ان کی اور پیٹ ہمارا ہوتا لیکن سننی بہت پڑتی تھیں۔ عام طور پر ویک اینڈ پر مغرب کے بعد صفدر مرزا کو گھیرنے کا آغاز ہوتا ہے اور تقریباً ایک گھنٹے کی زبردست بے عزتی کے بعد گلستان ہوٹل پہنچ جاتے۔ وہاں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ لیموں کے ٹکڑے ہر وقت پلیٹ رکھے ہوا کرتے تھے۔ بعد میں گلستان ہوٹل نے ہی دو تین بنگلے چھوڑ کر تاج محل ریسٹورنٹ کھول لیا تھا۔ یہاں کا کھانا ٹرک ڈرائیور کو بہت مرغوب تھا۔ تعمیر اور سج دھج میں یہ گلستان سے بہتر تھا۔ کڑاہی اور دیگر مرغن کھانے خوب ملا کرتے تھے۔

کالج کے زمانے میں بڑا امید ان کی ممتاز نہاری بھی دل اور پیٹ بھر کر کھائی۔ اسٹین لیس اسٹیل کی چھوٹی پلیٹ میں ممتاز نہاری منہ موہ لیا کرتی تھی اور اس کے بعد عمر کا پان۔۔۔ واہ کیا دن تھے۔ ایک دوست اس کے قریب رہا کرتا تھا۔ کالج کے بعد بھی جانا ہوتا تو واحد لالچ ممتاز نہاری ہوتی۔

اردو بازار جانا ہو اور جیب میں پیسے ہوں تو پہلے حساب لگا لیتے کہ کتابوں سے اتنے پیسے بچ جائیں کہ صابری کی نہاری ہو جائے۔ کبھی تو کتاب ہی غائب کر دیتے اور نہاری پر ہاتھ صاف کرتے اور اس کے بعد چہچہاتی، پرانے گانے سناتی W 11 میں گھر آتے۔ جاوید کی نہاری کا ڈنکا بجا تو وہاں بھی پہنچے اور زندہ و جاوید نہاری کو خوب منہ لگایا۔ مزیدار حلیم نے نہاری شروع کی تو بھاگ بھاگ وہاں پہنچے۔ اب بھی جانا ہوتا ہے ۔مزیدار نہاری خالی تیز مرچوں والی ہوتی خود کھاؤ تو مرچیں لگیں۔ کسی کو بتاؤ کہ کھا کر آئے ہیں تو اسے مرچیں لگیں۔ ہر دو طرح مرچیں لگانے کا ہنر صرف نہاری کو آتا ہے۔

نثار نہڑی کھانے کا اتفاق ہو تو آس کی لذت ہی نرالی تھی۔ شہید ملت روڈ پر ناہید سپر مارکیٹ سے سیدھے ہاتھ پر ڈاکٹر محمود حسین روڈ جاتے ہوئے ایک گلی میں غفار کی نہاری کا ذائقہ سب سے جدا ہے۔ مصالحے تیز نہیں لیکن ایک عجب سا تیکھا پن ہے۔ لکھتے ہوئے بھی منہ میں پانی آرہا ہے۔ یہاں کے کباب بھی بڑے لذیذ ہیں۔ ذرا چشم تصور میں سوچیں کہ نہاری کھا رہے ہوں اور کتابوں کی خوشبو آرہی ہو۔

بندہ کس کس نعمت سے انکار کرے۔ایک صاحب نے لالو کھیت میں فردوس سینما کے پیچھے 8 نمبر میں جمیل نہاری کا بتایا۔ آج تک زبان کو وہ ذائقہ یاد ہے۔

صدر اور طارق روڈ پر زاہد نہاری اور اب بہادر آباد جاتے ہوئے جاوید نہاری۔۔۔ کہاں کہاں نہ گئے۔زندگی میں سب سے بدمزا نہاری مال روڈ مری میں کھائی۔بہت چاہ سے منگوائی اور بڑی آہ سے کھائی۔کوئی دلی والا ہوتا تو تھانہ مطبخ میں نہاری کے قتل عمد کے کیس کا اندراج کر دیتا اور دلی کے کلو خان تو دھرنا ہی دے ڈالتے۔اپنے سفید براق کپڑوں پر راکھ ڈال لیتے۔

یہ تو وہ نہاریاں ہیں جو مشہور ہیں اس کے علاوہ لاتعداد جگہوں پر نہاری کھائی ہے۔لوگ نہاری پر بڑی بڑی تباہ آزمائیاں کرتے رہتے ہیں مگر نہاری صرف دلی والوں کی ہے اور وہ بھی گائے کے گوشت کی۔ بکرے اور مرغی کے گوشت کی نہاری چائنا نہاری ہے۔اگر آپ کا کبھی نہاری کا پروگرام بنے تو ضرور بتائیے گا۔

آرٹیفیشل انٹیلیجنس پر منعقدہ سیمینار کی تصاویر

سہ ماہی برقی مجلہ

تفکر (کراچی نمبر - حصہ دوم)

اپریل - جون 2024

جعفر طیار لائبریری

 www.jtlibrary.org

 JaffareTayyarLibraryOfficial

 +92 317 24 86 365

فہرست

جعفر طیار لائبریری

حرف آغاز

جعفر طیار لائبریری کی جانب سے سہ ماہی برقی مجلے تفکر کا اس بار کراچی نمبر نکالا جا رہا ہے جو 3 حصوں پر مشتمل ہے۔اور یہ تینوں حصے ایک ساتھ جاری کیے جا رہے ہیں۔

پہلا حصہ

پہلے حصے میں صرف ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی طریقے سے کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ان مضامین کو بھی ایک خاص ترتیب سے رکھا گیا ہے پہلے کراچی کی تاریخ سے متعلق اور براہ راست کراچی سے متعلق مضامین رکھے گئے ہیں۔اس کے بعد کراچی شہر کی مختلف آبادیوں کی تاریخ اور ان کے بارے میں مضامین ترتیب وار رکھے گئے ہیں۔اور آخر میں وہ مضامین رکھے گئے ہیں جو کراچی کی کسی مخصوص تاریخ یا شناخت سے متعلق ہیں۔

دوسرا حصہ

دوسرے حصے میں کراچی شہر پر لکھی جانے والی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ کراچی شہر اور اس کے باسیوں پر لکھی جانے والی تمام کتابوں کا تعارف پیش کیا جائے.اس لیے شہر کے کسی مخصوص علاقے پر لکھی جانے والی کتابیں اور مخصوص عنوانات پر بھی لکھی گئی کتابوں کے تعارف کو بھی شامل کیا گیا ہے.دوسری جانب کراچی شہر پر وفویات کے موضوع پر لکھی گئیں کتابوں کا تعارف بھی اس حصے میں موجود ہے۔

تیسرا حصہ

تیسرے حصے میں کراچی شہر کے وفات پا جانے والے مشاہیر کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے وہ بھی ان کی وفات کی تاریخ کے اعتبار سے۔

کوئی بھی شخص ان تینوں حصوں کا مطالعہ کر کے کراچی شہر سے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔یہ مجلہ انشاءاللہ کراچی شہر کو جاننے کا شوق رکھنے والوں اور کراچی پر لکھنے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے کافی مددگار ثابت ہوگا۔
کراچی شہر پر لکھے جانے والے کچھ مضامین جو سوشل میڈیا پر موجود تھے ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔مگر کچھ پر مضمون لکھنے والے کے نام کا تحریر نہ ہونے کی وجہ سے نام نہیں دیا گیا۔کیونکہ یہ ایک برقی مجلہ ہے اس لیے مضمون کے لکھنے والے کے نام کا پتہ چلتے ہی ان کا نام تحریر کر دیا جائے گا۔کسی بھی مضمون میں پیش کی گئی رائے مصنف کی زاتی رائے ہوتی ہے، جس سے برقی مجلہ تفکر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

کتاب: کراچی گزیٹر
مصنف: جے ڈبلیو اسمتھ
ترجمہ: یاسر جواد
تبصرہ نگار: اشفاق احمد

کراچی کی تاریخ پر اب تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں مگر ان میں قدیم ترین کتابوں میں سے ایک کراچی گزیٹر ہے جو 1919ء میں لکھا گیا اور اس کے مصنف جے ڈبلیو اسمتھ ہیں۔ حال ہی میں جناب یاسر جواد نے اس کا ترجمہ کیا ہے اس کتاب کے صفحات کی تعداد 216 ہے۔ جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انہوں نے یہاں بڑے بڑے شہروں کی زراعت، تہذیب، موسم، لوگ اور قبائل سے متعلق تمام معلومات کو حاصل کیا اور کتابی شکل میں چھوڑ گئے۔ یاسر جواد صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور تمام شہروں سے متعلق گزیٹرز کا اردو ترجمہ شروع کر دیا اور یوں کراچی گزیٹر کا بھی اردو ترجمہ ہو گیا۔

اس کتاب میں آپ کو 1919 تک کا کراچی نظر آئے گا۔ عام لوگوں کے لیے یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ اس وقت کے کراچی میں ٹھٹہ، مانجھنڈ، کے ٹی بندر، میر پور ساکرو، سجاول، جامشورو، سن، کوہستان (تھانہ بولا خان) اور جھمپیر بھی شامل تھے۔ اس گزیٹر میں کراچی میں موجود ان تمام علاقوں کی ساخت، پہاڑیاں، ندیاں، آب وہوا، بارش اور درجہ حرارت وغیرہ سب کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔

اس کتاب میں کراچی ڈسٹرکٹ کا 1880ء سے لے کر 1919 تک کا مکمل ڈیٹا موجود ہے۔

1880 سے لے کر 1919 تک ہر مردم شماری میں آبادی کو بڑی تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ آبادی میں کتنے لوگ کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں کون سے قبیلے اور خاندان سے ان کا تعلق ہے سب کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ ہر مردم شماری میں ان کی تعداد میں کتنے فیصد اضافہ یا کمی ہو رہی ہے اور یہاں تک بھی بتایا گیا ہے کہ کس مذہب کے لوگوں میں کتنے فیصد لوگ خواندہ ہیں۔ 1919ء تک کے تمام تعلیمی اداروں اور تمام ہسپتالوں تک کا اس کتاب میں مکمل ذکر ہے۔

کتاب میں آگے جا کر پانی کی فراہمی کے منصوبے وغیرہ کی بھی تفصیل دی گئی ہے اور کس طرح سے ڈملوٹی کے کنوں سے پانی نکال کر شہر تک لایا گیا اس کی بھی پوری تفصیل دی گئی ہے اس کے ساتھ ساتھ مکلی کے پہاڑیوں پر جو مقبرے ہیں اس کے بارے میں بھی تفصیل سے بتایا گیا ہے اور کراچی ڈسٹرکٹ میں موجود مساجد، چرچز اور درگاہوں کا بھی پورا احوال ہے۔

یوں اس کتاب میں انگریزوں نے ہر طرح کی معلومات فراہم کی ہے اور زیادہ تر اعداد و شمار جدول کی صورت میں پیش کیے ہیں جن کا جائزہ پچھلے اور اگلے سالوں سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ کراچی کی تاریخ پر اہم ترین دستاویز ہے اور کراچی کی تاریخ کو پڑھنے والے ہر شخص کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔
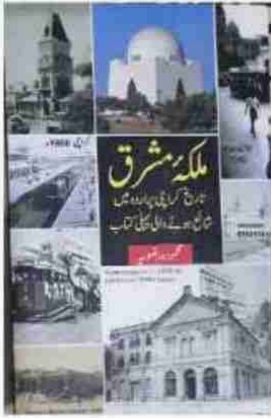
کتاب: ملکہ مشرق

مصنفہ: محمودہ رضویہ

تبصرہ نگار: زید محسن

کل یہ کتاب مکمل کی جو کہ کراچی کہ حوالے سے اردو می لکھی جانے والی پہلی کتاب ہے....
اس کتاب میں اپنے قارئین کیلیئے بہت دامواد موجود ہے چونکہ یہ کتاب تحقیقی مواد پر مشتمل ہے اور اس میں تقریبا ابتداء تخلیق انسانی سے لے کر سن 1947ء تک کراچی اور سندھ کے متعلق اہم تاریخی مواد موجود ہے...
کتاب کی ابتدا "ابتداء تہذیب انسانی" ہوتی ہے اور پھر سکندر اعظم، عراق و بابل، ایران و عرب سے ہوتی ہوئی ترکی و یورپ تک پھیلی ہوئی ہے جس میں کئی تواریخ اور واقعات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ کراچی ایک قدیم شہر ہے جو 300 سال قبل مسیح موجود تھا اور اس جگہ "ماسکل" نامی سکندر اعظم کا جرنیل پہنچا تھا اس کے بعد "محمد بن قاسم" سکندر اعظم کے تقریبا ہزار سال بعد اس شہر کے کنارے اپنے لشکر کے ساتھ آئے اس کے بعد سولہویں صدی عیسوی میں ایک ترکی کپتان "سعید علی" بھی یہاں آیا اور بالآخر اٹھارویں صدی کے اوائل میں (1729ء میں) یہاں "بھوجو مل" نے شہر بسایا اور اس کا نام اپنے جد امجد "کراچو یا قلاچو" نام پر رکھا....
یوں "موہانے" کراچی کے پہلے باسی اور آباد کار بنے اور یہی اس کے سردار ہوئے یہاں تک کہ "شاہ بندر" کے "کلہوڑوں" نے یہاں قبضہ کر لیا جو بعد میں یہ شہر بطور قصاص "خان آف قلات" کو دے گئے لیکن کچھ ہی عرصے میں 1783ء میں "ٹالپوروں" نے حملہ کیا اور یوں "میروں کی حکومت" قائم ہو گئی جو انگریزی کی دغابازیوں سے بالآخر 1842ء میں ختم ہوئی اور "چارلس نیپیئر" سے انگریزی دور شروع ہوا جو 1947ء میں آزادی کے ساتھ اختتام کو پہنچا...
اس کتاب میں اس وقت کے کراچی کے حوالے سے "کراچیات" نامی ایک مضمون لکھا گیا ہے جس میں اس شہر کے مختلف اداروں، شخصیات، مساجد، اسکول، کالجز، ہوٹلز، کتب خانوں، باغات، ساحل سمندر، اہم بلڈنگوں، شاہراہوں اور قوموں کا ذکر کیا گیا ساتھ ساتھ اشیائے خورد و نشا کی بڑھتی قیمت اور قلت کا بھی ذکر ملتا ہے اور ساتھ ہی کراچی کے نواحی اور مضافات کا ذکر ہے جس میں "منگھو پیر، ملیر، ماڑی پور، شانتی نگر/ڈالمیا، کیماڑی، منوڑا وغیرہ کا ذکر ہے جن میں سے اکثر آج کراچی کی آبادی کا حصہ ہیں اور مستقل علاقے سمجھے جاتے ہیں...
مجموعی طور پر کتاب بہت سی معلومات سے بھری ہوئی ہے.... جس میں کچھ ترتیب کی ضرورت ہے جس سے کتاب کے حسن کو چار چاند لگ جائیں گے.

کتاب: کراچی کی کہانی
ترتیب: اجمل کمال
تبصرہ نگار: مریم فاطمہ
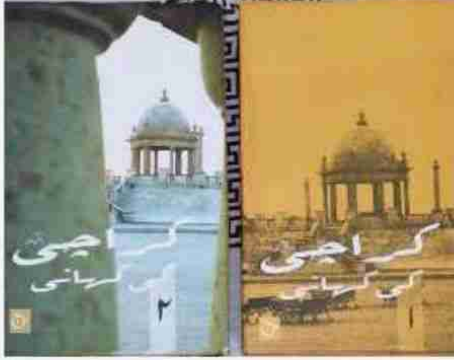
اجمل کمال صاحب نے 1980ء کی دہائی کے آخر میں ایک ادبی انتخاب پر مبنی کتابی سلسلہ شروع کیا۔ جسے 1989ء میں باقاعدہ کتابی سلسلے کی شکل دے دی گئی۔ آج اس لحاظ سے اردو کا منفرد جریدہ ہے جس کے ذریعے اجمل کمال صاحب نے دنیا بھر کے ادب سے اردو قارئین کو متعارف کرایا ہے۔ کتاب کراچی کی کہانی بھی دراصل اجمل کمال صاحب کے رسالے آج میں چھپنے والے مختلف مضامین ہیں جن کو دو جلدوں میں جمع کر کے شائع کیا گیا ہے. اسے کراچی کی تاریخ پر لکھی جانے والی مستند ترین کتابوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ ان مضامین کو لکھنے والوں میں مسلمان، ہندو اور انگریز سب ہی شامل ہیں۔ دونوں جلدیں ملا کر یہ کتاب 950 صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب کا انتساب کراچی شہر کے پہلے مئیر جناب جمشید نسروانجی کے نام کیا گیا ہے۔

پہلی جلد میں قیام پاکستان سے پہلے کے کراچی اور قیام پاکستان کے بعد مہاجروں کی آمد کے بعد کے کراچی پر مختلف مشاہیر کے 28 مضامین بہت تفصیل سے مکمل جزیات کے ساتھ تحریر کیے گئے ہیں۔ کتاب کراچی کی کہانی کی ابتدا سیٹھ ناومل ہوت چند کی منتخب یادداشتوں (1878 - 1804) سے ہوتی ہے جو دراصل کراچی شہر کی تاریخ کا سب سے اہم ماخذ تصور کی جاتی ہیں کیونکہ اس میں کراچی شہر کے بسنے کی کہانی بیان کی گئی ہے جو کم و بیش پہلا تحریری ثبوت بھی ہے۔ اس کتاب کی اہم ترین بات یہ ہے کہ اس میں کراچی میں رہنے والی ہندو برادری کی بڑے پیمانے پر کراچی و سندھ سے ہندوستان ہجرت کی بھی کہانیاں انہی کی زبانی تحریر کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ مہاجرین کی آمد اور ان کے رہائشی مسائل اور دیگر پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسری جلد 14 مضامین پر مشتمل ہے۔ دوسری جلد 1996ء میں شائع ہوئی اور کیونکہ 1996 میں کراچی شہر لسانی اور مذہبی فسادات کی لپیٹ میں تھا اور قتل و غارت گری اپنے عروج پر تھی اس لیے یہ پوری جلد انہی حالات کی عکاسی کرتی ہے اور ان کی وجوہات پر مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ کچھ مضامین میں تو اپنی انکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے کہ کیسے سڑکوں اور گلی محلوں میں خون خرابہ ہوا کرتا تھا۔
1996ء کے بعد اس جلد کی اشاعت دوم 2007 میں ہوئی لہذا نئے ایڈیشن کے آخر میں پانچ ضمیمے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ جس میں کراچی کے بدلتے ہوئے مثبت حالات اور 1998ء کی مردم شماری کے نتائج پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

یہ کتاب قیام پاکستان سے پہلے کراچی کی اور قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آمد کے بعد کے کراچی کی تاریخ جاننے کا شوق رکھنے والوں کے لیے اور 1980 کے بعد کے کراچی میں ہونے والے واقعات کے جاننے کے متلاشی لوگوں کے لیے بہت اہم ہے۔
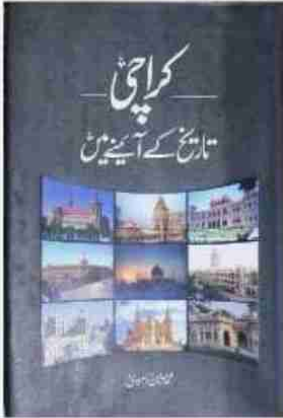
کتاب: کراچی تاریخ کے آئینے میں

مصنف: محمد عثمان دموہی

تبصرہ نگار: سید علی عمران

روشنیوں کا شہر کراچی جو اب ایک بین الاقوامی شہر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور دنیا کے چند بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ شہر ہر لحاظ سے پھیل رہا ہے ویرانے آباد ہوتے جا رہے ہیں نئی نئی بستیاں وجود میں آتی جا رہی ہیں۔ مگر اس شہر کی تاریخ پر عام طور پر سوال اٹھتے رہے ہیں لیکن کوئی مستند کتاب موجود نہیں تھی جس سے اس عظیم الشان شہر کی تاریخ کو ثابت کیا جائے۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے جناب عثمان دموہی صاحب نے ایک منفرد کتاب "کراچی تاریخ کے آئینے میں" لکھی جو کراچی کی تاریخ کا قبل از مسیح سے لے کر قیام پاکستان تک کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ کتاب آپ کی 10 سال کی مسلسل محنت اور ریسرچ کا ثمر ہے۔ اس کتاب میں کل 15 ابواب ہے جن میں پہلی مرتبہ کراچی کی مکمل تاریخ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں کراچی کی تاریخ کو نہ صرف زمانہ قبل از مسیح سے شروع کیا گیا ہے بلکہ اسے زمانہ قبل از تاریخ کے دھندلکوں سے تلاش کر کے منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں کراچی کے حوالے سے خاص طور پر عرب، مغل، کلہوڑو، تالپور اور برطانوی ادوار کی تاریخ کو نہایت تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس اہم خطاب میں کراچی کے حوالے سے برصغیر میں چلنے والی تمام تحریکوں، کراچی کی سیاسی، سماجی، علمی، ادبی اور مذہبی سرگرمیوں، کراچی میں تعلیمی اور سیاسی اداروں کا قیام، اولیائے کراچی، پرانی عمارات، عبادت گاہوں اور قبرستانوں وغیرہ کے تفصیلی احوال سمیت کراچی سے متعلق دیگر بے شمار موضوعات پر بھی تحقیقی مضامین رقم کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں موجودہ شہر کراچی کے مختلف ادوار میں پڑنے والے 30 مختلف ناموں کا ذکر، سکندر اعظم کے زمانے کے نام "کروکالا" (karokala) سے لے کر "کراچی" کے نام سے جدید شہر کی بنیاد رکھنے والے اٹھارویں صدی کے ہندو سیٹھ بھوجو مل تک تفصیل سے موجود ہے۔ بدلنے والے ہر نئے نام کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ کب کب اس شہر کا نام کیا کیا تھا۔

یہ کتاب کراچی کی تاریخ کے حوالے سے ایک مکمل اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب تک کراچی کے بارے میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں ماخذ اس کتاب ہی کو بنایا جاتا ہے۔ اس کتاب کو لکھنے میں عثمان دموہی کی محنت کا اندازہ ان کے انتساب سے لگایا جا سکتا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں "اپنے بیٹے محمد نعمان اور بیٹیوں کے نام جنہیں اس تاریخی کام کو انجام دینے کے جنون میں دس سال تک وہ وقت اور توجہ نہ دے سکا جس کے وہ مستحق تھے"۔

یہ کتاب راحیل پبلی کیشنز نے شائع کی ہے اور اب تک اس کے 3 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔
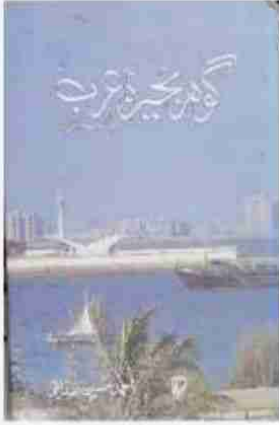
کتاب: گوہر بحیرہ عرب
مصنف: احمد حسین صدیقی
تبصرہ نگار: سید محمد سلمان

احمد حسین صدیقی صاحب کا نام کراچی کی تاریخ کے حوالے سے کوئی نیا نہیں۔ کراچی سے محبت آپ کی روح تک اتر کر جسم کے انگ انگ میں رچی ہوئی ہے۔ کراچی سے متعلق اس کتاب کے علاوہ آپ نے "دبستانوں کا دبستان کراچی" پانچ جلدوں میں تحریر کیا ہے جس میں آپ نے 800 سے زیادہ مشاہیر کا تذکرہ کیا ہے۔
زیر نظر کتاب گوہر بحیرہ عرب آپ کی کراچی سے محبت کی ایک اور گواہی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اول 1995 میں ہوئی تھی اور یہ کتاب 262 صفحات پر مشتمل ہے جس میں انتہائی نایاب کلر تصاویر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں ضرورت کے مطابق نقشے بھی دیے گئے ہیں.
کتاب کے آغاز میں پہلے ہی باب میں آپ قدیم کراچی کی تاریخ بیان کرتے ہیں اور اسے مائی کلاچی سے شروع کرکے قیام پاکستان تک لے کر جاتے ہیں اس میں آپ نے تالپوروں اور انگریزوں کے دور کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دوسرے باب میں کراچی کے ترقیاتی مراحل کا ذکر کیا گیا ہے اور خاص طور پر انگریزوں کے دور میں آباد ہونے والی 26 کالونیاں جنہیں بعد میں کوارٹرز کا نام دیا گیا جیسے لی کوارٹرز، لیاری کوارٹرز، نیپیر کوارٹرز، بندر روڈ کوارٹرز، رنچھوڑ لائن کوارٹرز، رام سوامی کوارٹرز، آرٹیلری میدان کوارٹرز، صدر بازار کوارٹرز اور پریڈی کوارٹرز وغیرہ۔
اسی طرح سے آگے کے ابواب میں آپ نے کراچی کی تجارتی سرگرمیاں جو 1860ء سے چیمبر آف کامرس کے قیام سے شروع ہوتی ہیں بیان کیا ہے. جبکہ اگلے ابواب میں کراچی پورٹ ٹرسٹ اور کراچی میونسپل کارپوریشن کو بھی انگریزوں کے دور سے بیان کیا گیا ہے۔ عمارتیں اور ان کا طرز تعمیر کے باب میں آپ نے انگریزوں کے دور میں تعمیر ہونے والی تمام عمارتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ وہ کب تعمیر ہوئیں کس طرح تعمیر ہوئیں اور کس مقصد کے لیے تعمیر کی گئی تھیں۔
جناب احمد حسین صدیقی صاحب نے اگلے ابواب میں کراچی کے آب رسانی کے ذرائع، تعلیمی ادارے، ٹرانسپورٹ کا نظام، ترقیاتی ادارے، بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی اور تفریح گاہوں کا ذکر بہت تفصیل سے کیا ہے۔
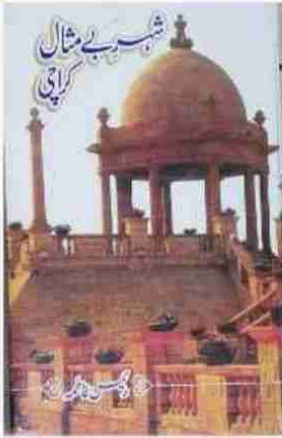
کتاب: شہر بے مثال کراچی
مصنفہ: رئیس فاطمہ
تبصرہ نگار: مریم فاطمہ

یوں تو کراچی پر مختلف حوالوں سے لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد اب بہت زیادہ ہو چکی ہے اور پچھلے پانچ سالوں میں اس تعداد میں تین گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ ان ہی کتابوں میں سے ایک کتاب "شہر بے مثال کراچی" ہے جو معروف مصنفہ محترمہ پروفیسر رئیس فاطمہ صاحبہ کی تحریر کردہ ہے۔ محترمہ رئیس فاطمہ صاحبہ اس سے پہلے 15 مختلف عنوانات پر کتابیں لکھ چکی ہیں اور روزنامہ ایکسپریس پاکستان میں کالم لکھتی ہیں۔

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ یہ انتہائی مختصر اور جامع ہے۔ یہ کتاب محترمہ رئیس فاطمہ نے نیشنل بک فاؤنڈیشن کے سابق ایم ڈی جناب مظہر الاسلام صاحب کے کہنے پر ترتیب دی ہے جو چاہتے تھے کہ کراچی کے متعلق ایک ایسی کتاب شائع کی جائے جو دوسرے شہروں سے کراچی آنے والوں کے لیے گائیڈ کا کردار ادا کرے اور مختصر الفاظ میں کراچی شہر کے حوالے سے تمام بنیادی معلومات اس میں جمع کر دی جائیں۔

اس کتاب میں تھوڑی سی تاریخ بیان کرنے کے بعد جدید کراچی کے بانی جناب سیٹھ بھوجومل کے دور کے کراچی کا احوال بیان کیا گیا ہے اور کس طرح سے سیٹھ بھوجومل نے ایک گاؤں کو شہر کی صورت دی اس کا مختصر احوال تحریر کیا ہے جو بہت دلچسپ انداز میں ہے۔ سیٹھ بھوجومل کے دور کے بعد انگریزوں نے جو کراچی شہر کو بنانے کے لیے کار گزاریاں کیں اور تجارتی اہمیت کو دیکھتے ہوئے جو مختلف برادریاں ہندوستان سے یہاں منتقل ہونا شروع ہوئیں اور جو پہلے سے موجود تھیں ان سب کا احوال بہت جامع انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد قیام پاکستان کے بعد کے کراچی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

تاریخ بیان کرنے کے بعد اس کتاب کی اندر کراچی کی اہم سڑکیں، درسگاہیں، تاریخی عمارتیں، تفریح گاہیں، مختلف اخبارات، اسپتال، شاپنگ سینٹرز، نامور شخصیات، مشہور ہوٹلز، مدفون اولیاء کرام، خفتگان کراچی اور کراچی کے نئے اور پرانے قبرستانوں کا احوال بھی مختصر انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ کتاب انتہائی مختصر رکھنے کی سوچ کی وجہ سے یہ کتاب پورے کراچی کا احاطہ نہیں کر پاتی مگر جس کا ذکر آ گیا وہ بہت جامع انداز میں کیا گیا ہے۔

کتاب: کراچی سندھ کی ماروی
مصنف: گل حسن کلمتی
تبصرہ نگار: پروفیسر علی نواز جو کھیو
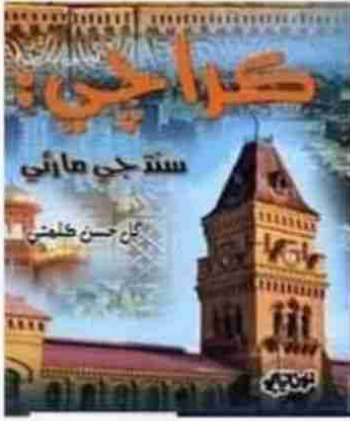
یہ کتاب کراچی کی تاریخ پر ماخذ کتابوں میں سے ایک ہے. اس کے اب تک دو ایڈیشن آ چکے ہیں دوسرا ایڈیشن 2014ء میں آیا تھا جبکہ کتاب کے مصنف نامور محقق جناب گل حسن کلمتی صاحب ہیں. اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنے والد محمد خان بلوچ کے نام کیا ہے۔

2023 میں اس کتاب کا انگریزی زبان میں ترجمہ the glory East of کے نام سے ہوا۔ جبکہ اردو ترجمہ اسی سال 2024 میں آنے والا ہے کتاب پروف ریڈنگ سے آگے نکل کر پرنٹنگ پر جانے والی ہے۔ اردو ترجمے کا دیباچہ معروف دانشور امر جلیل صاحب نے لکھا ہے۔

کتاب کے پہلے باب میں کراچی کی تاریخ اور اس کے ناموں پر بحث کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں انتظامی تاریخ بیان کی گئی ہے کہ کب کب کراچی پر کون حکمران رہا۔ رائے گھرانے سے لے کر کلھوڑا دور اور تالپور دور سے لے کر انگریز دور میں مقرر کمشنروں کا احوال۔ بمبئی سے الگ ہو کر صوبہ بننے کے بعد منتخب ہونے والے وزرائے اعلی، سندھ اسمبلی کے اسپیکرز کا احوال، کلیکٹرز، عدالتی نظام اور کراچی جیل کی شروعات سب کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ انتظامی تاریخ 2014 تک کی ہے۔ تیسرے باب میں کراچی بلدیہ کی تاریخ اور اس کے وارڈ، شہری حکومت کے ٹاؤن کونسلوں کا ذکر، مختلف سالوں میں بلدیاتی حکومتوں کی معلومات اور مخصوص نشستوں کا احوال منتخب ممبران کے نام صدور اور چیئرمین کے نام سب کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس کتاب میں چوتھا باب نہایت اہم ہے کیونکہ اس میں سیاسی تاریخ کو بیان کیا گیا ہے۔ ریشمی رومال کی تحریک ہو یا خلافت تحریک الگ صوبے کی تحریک ہو یا سندھ اسمبلی کے پہلے چناؤ کے معاملات اور اس کے نتائج سب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کا احوال اور کراچی رائل نیوی کی بغاوت، قیام پاکستان کے وقت کراچی میں موجود ہندوؤں کا احوال اور ان کی ہجرت۔ لسانی فسادات، 1977 کے انتخابات اور اس کے ساتھ ساتھ کراچی میں بائیں بازو کی سیاست کا ذکر۔ 1985 سے لے کر 2013 تک کے انتخابات کا تفصیلی جائزہ اور اس کے علاوہ کراچی میں ہونے والی تمام سیاسی بڑی سرگرمیوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔

پانچویں باب میں کراچی میں پینے کے پانی کی تاریخ لیاری ندی کے کنوں اور ملیر ندی کے کنوں سے پانی کی ترسیل سے لے کر کلری جھیل سے آنے والی پانی کی نہر اور حب ڈیم تک تمام احوال موجود ہے۔ اس کے علاوہ اگلے ابواب میں انگریزوں کے دور سے لے کر 2014

تک کراچی میں تعلیم و صحت سے متعلق تمام معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے دور سے اب تک تمام تعمیر ہونے والے ہسپتال اور تعلیمی اداروں کا مکمل ذکر موجود ہے۔ اگلے مزید ابواب میں قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد اردو اور سندھی صحافت اور ادب پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انگریزوں کے دور سے لے کر 2014 تک مختلف ادوار میں جو کراچی میں مردم شماری ہوئی ہے اس پر بھی بہت تفصیلی بحث اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ 1857ء کی جنگ اور بغاوت میں کراچی کا کردار، مکھی اور متارہ جو ملیر کی مشہور لوک داستان ہے اور ان کی قبریں گڈاپ میں موجود ہیں ان کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ لیاری، ملیر، منگھوپیر، کوہستان اور چوکنڈی کے قبرستان پر الگ الگ باب باندھے گئے ہیں جس میں تفصیل کے ساتھ ان تمام کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اس کتاب میں کراچی کی ماحولیاتی گندگی کراچی کی فلموں اور تھیٹر کی شروعات اور سینماؤں کی مکمل تاریخ اور ساتھ ساتھ سماجی تنظیموں اور یہاں کے لافانی کرداروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ اس کتاب میں اولڈ کراچی میں موجود ہر تاریخی عمارتوں جو انگریزوں کے دور میں یا اس سے پہلے بنی ہے اس کی مکمل تاریخ کہ وہ کب بنی کس نے بنائی اور کس کام کے لیے بنائی گئی تھی بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے اردو میں شائع ہونے کے بعد یہ کراچی کی تاریخ پر اردو زبان میں لکھی جانے والی کتابوں میں ایک بہترین اضافہ ہوگا۔

تقریب تقسیم اسناد

ایمازون اور درازا اسکل ڈویلپمنٹ کورس کے اختتام پر جعفر طیار لائبریری میں Branducer کے تعاون سے ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں کورس مکمل کرنے والے لوگوں میں سرٹیفکیٹ تقسیم کئے گئے. اس کورس میں 60 افراد شریک ہوئے تھے.
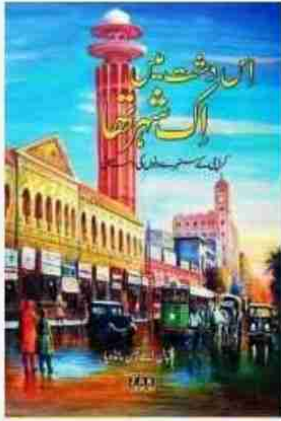
کتاب: اس دشت میں ایک شہر تھا

مصنف: اقبال اے رحمن

تبصرہ نگار: رئیس فاطمہ

اس کتاب میں تذکرہ ہے ان گم بے روز گار کا جنھوں نے اس شہر کو تعمیر کیا اور عالم اسلام کا دوسرا اور دنیا کا چوتھا بڑا شہر بنادیا۔"" اس نیپیئر روڈ کا ایک کوچہ ایسا ہے جس سے شہر کے حلوائی خوب واقف ہیں۔ کھویا گلی یا کھویا منڈی، تازہ دودھ کا ٹکڑ سامنے رکھا ہے مگر کھویا کہلاتا ہے۔

کھویا فارسی اور ماوا عربی سے آیا ہے۔ اس کھویا گلی میں روز کے روز تازہ کھویا آتا ہے، اتنا تازہ اور میٹھا کہ اس کا ٹکڑا منہ میں رکھیں تو قلا قند کا گمان ہوتا ہے۔ یہ بہت جلد خراب ہونے والی شے ہے۔ فریزر میں بھی نہیں سنبھلتی۔ بھینس کے دودھ کا کھویا سفید اجلا اور گائے کے دودھ کا مٹیالا، جو گلاب جامن بنانے کے کام آتا ہے۔"

"کھویا منڈی میں ایک بڑے صاحب ہیں، ان سے یاد اللہ ہے کھویا بھی اچھا اور آدمی بھی قاعدے کے۔ بڑی دلچسپ باتیں بتاتے ہیں۔ "دیکھو وہ جو سامنے کواڑ نظر آرہا ہے، اب تو اس میں دریوں کا گودام ہے، کبھی اس میں چنی بائی کا کوٹھا تھا، جب وہ گاتی تھیں یا تو لوگ مبہوت ہو جاتے تھے یا واہ واہ کرتے، مگر جب تک چنی گاتیں اپنی جگہ سے ہل نہ سکتے تھے۔

جودھپور کے ایک راجہ بھی گانا سننے کو اس کوٹھے پر آچکے ہیں، یا پھر جو سامنے گیلری ہے یہ شمیم آرا کا گھر تھا، جہاں سردار رند آتے تھے، جنھوں نے بعد میں شمیم آرا سے شادی بھی رچالی تھی۔ شادی پر یاد آیا کہ شمیم آرا کی شادیوں نے بھی خوب شہرت پائی۔

ہمارے ایک دوست عید کے دنوں میں اس علاقے میں کھڑے تھے، کیا دیکھتے ہیں کہ چار خوبصورت لڑکیاں چست لباس میں سڑک پار کر رہی ہیں، جن میں سے ایک نے سر پہ دوپٹہ جما رکھا تھا، لوگ ان کی جانب متوجہ تھے اور انھیں یہ حیرت ہو رہی تھی کہ ایسے نظارے تو یہاں عام ہیں پھر اتنی دلچسپی کیوں۔ اصل بات یہ تھی کہ جو لڑکی دوپٹہ سر پہ جمائے تھی وہ بابرہ شریف تھی، جو اپنی خالہ سے عید ملنے آئی تھی۔ اس بازار میں رشتے داروں میں بس خالہ ہی کا رشتہ پایا جاتا ہے، باقی سارے رشتے غلام گردشوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ بابرہ شریف فلموں میں کامیاب ہو کر لاہور منتقل ہونے سے قبل اسی محلے کی شمشاد منزل کی دوسری منزل پر رہتی تھی۔

کراچی، لاہور اور ملتان کی طرح کوئی تاریخی شہر تو ہے نہیں، لیکن اس کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ مچھیروں کی اس بستی کو انگریزوں نے بسایا، پارسیوں نے اس کی آبیاری کی۔

میمن برادری نے سرمایہ لگایا، صنعتیں لگائیں، سر آدم جی اور باوانی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اقبال صاحب اہل زباں نہیں ہیں لیکن اردو اہل زباں والی لکھی ہے۔ اس موقع پر وہ محاورہ یاد آتا ہے "جمال ہم نشیں در من اثر کرد۔"

اب آگے چلیے تو کبابوں کا مشہور نام بندو خاں کا ذکر آتا ہے جو پرانی نمائش سے قبل پارسی کالونی کے بالکل سامنے قدیم زمانے سے آباد ہے۔ بندو خاں میرٹھ کے تھے، ٹھیلے کی منزل سے آگے بڑھے تو بندو خاں کی اصل اور قدیم دکان ابتدا میں لکڑی سے بنے ایک وسیع ڈھابے کی صورت قائم ہوئی جیسے امریکا میں ساحل سمندر پر ہوتے ہیں۔ بندو خاں کے عکس میں الحمرا کھل گئی تھی جو بہاری کبابوں کا ہوٹل تھا، اس طرح شہر میں دہلی، میرٹھ اور بہار تینوں طرح کے کباب ملنے لگے۔"

لیکن یہاں یہ وضاحت کر دوں کہ بندو خاں کے اب کئی ہوٹل کھل گئے ہیں اور جس ہوٹل کا ذکر اقبال صاحب نے کیا ہے وہ اب بند ہو گیا ہے۔ اب سپر ہائی وے، گلشن اقبال، کلفٹن، گلستان جوہر وغیرہ میں بندو خاں کا نام چمکتا نظر آتا ہے، لیکن اب وہ ذائقہ نہیں جو وہ ان کے ٹھیلے والے کبابوں میں تھا، اس کے علاوہ یہ یاد رہے کہ بندو خاں نے اپنا کاروبار برنس روڈ پر وحید کے سامنے والی پٹی پہ شروع کیا تھا۔ ایمان دار اور محنتی آدمی تھے، اس لیے ٹھیلے سے ہوٹل تک کا کامیاب سفر انھوں نے جلد طے کر لیا۔ اب پتا نہیں چلتا کہ اصلی کون ہیں؟ اور کون فرنچائز ہیں۔

بلڈنگ کا کھلنڈرا ماحول برٹش راج کے زیر اثر کلچر کا عکاس تھا، برداشت تھی، رکھ رکھاؤ تھا، نہ تو انتہا پسندی تھی اور نہ ہی بات بے بات اسلامی لاحقے لگتے تھے۔ مگر خرابیاں بھی بہت تھیں، بلڈنگ کے مالک کریم سیٹھ اسی بلڈنگ کے پینٹ ہاؤس میں رہتے تھے۔ مگر جب کسی کو پینٹ ہاؤس کہنا نہ آتا تھا، کہا جاتا تھا کہ چھت پر سیٹھ نے بنگلہ بنا رکھا ہے۔ سیٹھ صاحب کی ایک بہن مریم کے نام پر یہ بلڈنگ تھی یعنی "میری محل" تھی اور دوسری بہن ممتاز جسے پیار سے وہ ملانی کہتے تھے۔

دوسری بلڈنگ ملانی مینشن تھی۔ معروف اداکار وحید مراد کے والد معروف فلمی تقسیم کار نثار مراد کے کریم سیٹھ سے مراسم تھے۔ انھی کی نسبت سے وحید مراد نے ممتاز ملانی کو بہن بنا لیا تھا اور تادم مرگ اس رشتے کو نبھایا بھی۔ ممتاز ملانی معروف ٹی وی آرٹسٹ انیتا ایوب اور امبر ایوب کی والدہ ہیں۔ فلموں کے ایک اور تقسیم کار ایوررینڈی پکچر کے مالک جگدیش چند آنند بھی کریم سیٹھ کے حلقہ ارادت میں شامل تھے۔ بہت نرم خو اور خوش گفتار تھے، ہندوستان کے معروف اداکار دیو آنند ان کے کزن تھے۔ معروف اداکارہ جوہی چاؤلہ جگدیش صاحب کی نواسی ہیں۔"

""یہی وہ دن تھے جب صدر ایوب خان نے بی ڈی ممبران کے انتخابات کروائے تھے، کراچی کی ایک ایک گلی اور ایک ایک کونہ، فاطمہ جناح کے انتخابی نشان لالٹین سے آویزاں تھا۔ 1965 کی پاک بھارت جنگ بھی اسی دور کا قصہ ہے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب بکرے کا گوشت ایک روپے اور گائے کا گوشت آٹھ آنے سیر تھا۔ فارم کی مرغی تو تھی نہیں، دیسی مرغی بہت مہنگی سمجھی جاتی تھی یعنی 5 روپے سیر۔ بقر عید آتی تو بکرا 35 روپے میں اور گائے 40 روپے کی آتی تھی۔"

ایسا لگتا ہے قبل مسیح کے زمانے کی بات ہو رہی ہے، کتنی قدر تھی ہماری کرنسی کی، لیکن ہمارے حکمرانوں اور سیاست دانوں نے اپنے خزانے بھرنے کے لیے مسلسل کرنسی کو پچھاڑ دیا ہے۔ ڈالر کو اوپر لے گئے ہیں اور ہمارے روپے کی کوئی اوقات ہی نہیں۔ اب تو فقیر بھی 50 روپے مانگتے ہیں۔ پتا نہیں کرنسی کی یہ گراوٹ کہاں جا کر دم لے گی۔

کتاب: ''بلدیہ کراچی سال بہ سال 1844-1979

مصنف: بشیر سدوزئی

تبصرہ نگار: اشفاق احمد
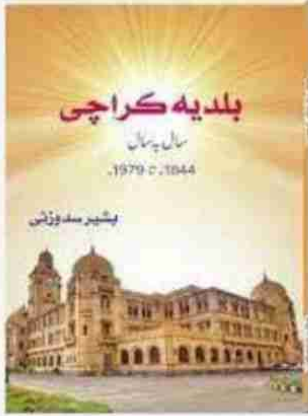
انگریزوں کے کراچی پر قبضے سے پہلے کراچی ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں اپنی مدد آپ کے تحت چند تاجر سمندر کے راستے تجارت کیا کرتے تھے۔ انگریزوں نے اس شہر کی اہمیت کو سمجھا اور بمبئی سے قریب ہونے کے باعث اس قصبے کو شہر کی شکل دینا شروع کی۔ اسی سلسلے میں بلدیہ کراچی کا قیام عمل میں آیا۔
یہ کتاب اسی بلدیہ کی تاریخ بیان کرتی ہے۔
یہ کتاب بتاتی ہے کہ کس طرح انگریزوں۔ پارسیوں۔ ہندوؤں اور چند مسلمانوں نے اس شہر کی تعمیر و ترقی کے لیے دن رات ایک کیا۔ شہر میں سڑکیں ہوں۔ پُل۔ تفریحی مقامات۔ تجارتی سہولیات۔ تعلیم کے فروغ کے اقدامات ہوں۔ شہریوں کے لیے پانی۔ روشنی صفائی ستھرائی کے مسائل ہوں یا کہ شہر میں ٹرانسپورٹ اور جانور گاڑیوں یا کروں بار برداروں تک کے لیے قوانین۔ یہ سب کام بلدیہ نے کیے۔
کس کس طرح بلدیہ کے سربراہان و ممبران نے اس شہر کو روشنیوں کا شہر بنانے میں اپنا اپنا اہم کردار ادا کیا۔
جمشید نسروانجی مہتا ہوں یا کراچی روشن کرنے والے ہرچند رائے وشن داس۔ اور انہی کی طرح کے فرزند شہر انہوں نے اس شہر کو اپنا سمجھا اور اس سے حاصل کردہ وسائل کو اسی شہر میں استعمال کیا۔
یہ کتاب اس شہر کے عروج کی داستان بتاتی ہے۔
پھر اس کتاب سے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ یہ شہر زوال کا شکار کس طرح ہوا؟
شہر کی بلدیہ اور اس کے منتخب نمائندوں پر کس طرح سول اور فوجی بیوروکریسی کے ذریعے ''قبضہ'' کیا گیا؟
سیاست دانوں نے کس کس طرح سیاسی فائدوں کے لیے اپنے اپنے ادوار میں شہر میں کچی آبادیوں کے فروغ ان کو سہولتیں دینے اور ان سے ٹیکس نہ لینے کی داغ بیل ڈالی اور شہر میں قبضہ گروپوں کے ذریعے زمینوں پر قبضوں کو جائز ٹھہرایا۔
اور یوں شہر کے وسائل کم اور مسائل زیادہ ہوتے چلے گئے۔
کس کس طرح اس شہر و ملک کے حکمرانوں نے بلدیہ کے اختیارات کم سے کم کیے اور صوبائی و وفاقی حکومتوں نے اس شہر کے وسائل تو خوب استعمال کیے مگر اس کے مسائل کے حل کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔
اب حالت یہ ہے کہ دنیا کے پانچ بدترین شہروں میں اس کا شمار ہوتا ہے اور کہاں وہ زمانہ جب برصغیر کے سب سے خوب صورت شہر ہونے

کا اس کو اعزاز ملا تھا۔
جناب بشیر سدوزئی چونکہ خود بلدیہ کے اہم ترین عہدوں پر فائز رہے ہیں اس لیے انکی رسائی بلدیہ کے ریکارڈ اور اہم دستاویزات تک رہی ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں بلدیہ کراچی کی مفصل اور مستند تاریخی حوالوں سے داستان بیان کر دی ہے۔
بشیر سدوزئی صاحب اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی لکھ رہے ہیں جو کہ 1980 سے 2020 تک بلدیہ کی تاریخ پر مبنی ہوگا۔امید ہے دوسری جلد بھی جلدی سامنے آجائے گی۔
بہر حال اس شہر کے عروج وزوال کی داستان لکھ کر بشیر سدوزئی صاحب نے فرزند کراچی ہونے کا حق ادا کر دیا۔
کتاب فرید پبلشرز کراچی پر دستیاب ہے۔

ایڈوانس مائیکروسافٹ ایکسل کورس کا تعارفی سیمینار اور کورس کا آغاز
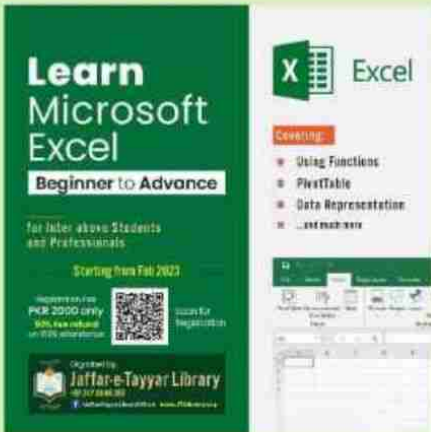
جعفر طیار لائبریری میں کو مائیکروسافٹ ایکسل کورس کا تعارفی سیشن منعقد ہوا، جس میں محترم کرار صاحب جو کہ گذشتہ 15 سال سے ایک نجی ملٹی نیشنل کمپنی کے ہیومین ریسورس (HR) میں خدمات انجام دے رہے ہیں، کورس کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ آخر میں لائبریری کی طرف سے دی گی آفر کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ جن شرکاء کی حاضری 100% فیصد ہو گی ان کی 50% فیصد فیس کورس کے اختتام پر سرٹیفیکیٹ کے ساتھ واپس کر دی جائے گی۔
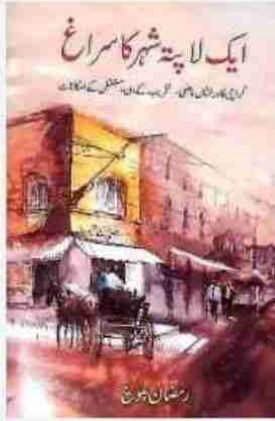
کتاب: ایک لاپتہ شہر کا سراغ

مصنف: رمضان بلوچ

تبصرہ نگار: اقبال اے رحمن

یکم مئی 2024 کا دن بڑا خوبصورت رہا، کوئی 11 بجے استاد محترم Ramazan Baloch رمضان بلوچ صاحب کا فون آیا کہ وہ چائے والی سرکار کو شرف آمد سے نوازنا چاہتے ہیں، یہ واقعتاً خوشی کی بات تھی مگر خوشی اس وقت دوچند ہوگئی جب استاد نے کراچی کے بارے میں اپنی تازہ ترین تصنیف ''ایک لاپتہ شہر کا سراغ'' کا اولین نسخہ لے کر نمودار ہوئے اور وہ نسخہ ہمیں عنایت کرکے خوشگوار حیرت میں مبتلا کردیا۔ بلاشبہ یہ انکی ذرہ نوازی ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں ایسے مواقع بھی آئے کہ استاد نے ہم سے مشورہ طلب کیا۔ کتاب تیار ہوگئی لیکن رمضان صاحب نے اسے راز رکھا، اور جیسے ہی کتاب کے کچھ نسخے ان تک پہنچے، ہمیں فون کیا۔ کتاب تھامے درخشاں چہرے کے ساتھ استاد کی قدم رنجائی نے دل خوش کردیا۔

یہ کتاب ''ادارہ تحقیق برائے تاریخ و معاشرت'' نے شائع کی ہے، جسکے روح رواں ڈاکٹر جعفر احمد ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اشاعت سے قبل مضامین کی صحت پر خصوصی توجہ دی ہے اور تاریخی حقائق کو اس قدر سخت تحقیقی مراحل سے گزارا ہے کہ اس تحقیق پر استاد رمضان بلوچ ہی پورے اتر سکتے ہیں ہم جیسا تو کب کا فرار ہوچکا ہوتا۔

بہت خوشی کی بات ہے، رمضان صاحب کے لئے ڈھیروں مبارکباد۔

کتاب ویلکم بک پورٹ پر دستیاب ہوگی

کتاب: کراچی کی کہانی، تاریخ کی زبانی

مصنف: کھتری عبدالغفور کانڈاکریا

تبصرہ نگار: شبیر احمد ارمان
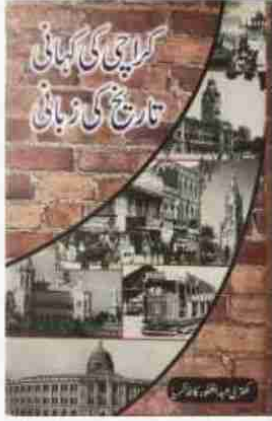
"کراچی کی کہانی، تاریخ کی زبانی"، پہلی فرصت میں بغور مطالعہ کیا۔ جو عہد قدیم تا1965 تک کی تاریخ کا احاطہ کرتی ہے کہ ان ادوار میں کراچی کی تاریخ، معاشرت، معیشت، تعلیم، فن و ثقافت، سیاست اور دیگر معاملات کیسے تھے۔ بلاشبہ اس کتاب کے مصنف کھتری عبدالغفور کانڈاکریا نے شبانہ روز عرق ریزی کی ہے اور اس میں شامل قدیمی تصاویر کتاب کو جلا بخشتی ہیں۔ کتاب کا انداز بیان میں تسلسل ہے جو قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ 622 صفحات پر مشتمل یہ کتاب نئی نسل کے لیے ریفرنس ہے۔

کھتری عبدالغفور کانڈاکریا کراچی کے علاقے لی مارکیٹ (لیاری) میں 17 جولائی 1949 کو پیدا ہوئے، 1975 میں گریجویشن تک تعلیم حاصل کی۔ ینگ کھتری اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کے بانیوں میں سے ہیں جس کے تحت پندرہ روزہ اخبار "نوائے کھتری" کے ایڈیٹر رہے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بجلی کے سامان کے کاروبار سے وابستہ رہے لیکن ساتھ ہی ساتھ علمی، ادبی اور سماجی خدمات میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ مسلم کچھی کھتری جماعت کراچی کے مختلف عہدوں پر فائز رہے، کچھی کھتری ایجوکیشن سوسائٹی کے چیئرمین اور فنانس سیکریٹری کے علاوہ مصالحتی کمیٹی میں بھی شامل رہے ہیں۔

مذکورہ کتاب کی اشاعت سے قبل کراچی کی تاریخ پر مبنی ان کے تحقیقی مضامین وقتاً فوقتاً ایک موقر اخبار میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ کتاب کے 21 ابواب ہیں ہر باب تاریخی اہمیت کا حامل ہے خاص طور پر کراچی کے قدیمی علاقوں کا ذکر معلومات کا خزانہ ہے۔ یہاں ہم ان علاقوں کے اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔

لیاری: لیاری نے اپنے سینے میں چھپے قدیم آثار کی ایک جھلک دکھلا کر اپنی ندامت کا تعین تو پہلے ہی کر دیا ہے۔ یہاں آثار قدیمہ کی تلاش کے دوران ایک ایسی تہذیب کے آثار ملے ہیں جو ساڑھے چار ہزار سال قبل مسیح میں لیاری سے اورنگی، منگھوپیر اور حب ندی تک پھیلی ہوئی تھی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ انھوں نے دریائے لیاری یا لیاری ندی اس کی معاون ندیوں اور حب ندی کے برساتی پانی کو قریب واقع سمندر میں گرنے سے قبل بھرپور طور پر اسے زراعت کے لیے استعمال کیا۔

پانی کی کمی نے زراعت کے پیشے کو متاثر کیا تو یہاں جینے والوں نے زندگی کی گاڑی کو چلانے کے لیے دوسرے ہنر سیکھ لیے۔ اب یہاں لہلہاتے کھیتوں کی جگہ چھوٹی موٹی صنعتیں نظر آنے لگیں۔ یہاں چمڑا رنگنے کے کارخانے، چمڑے اور کپڑے کے رنگ تیار کرنے کے

کارخانے اور بیجوں سے تیل نکالنے کی چکیاں قائم ہونے لگیں۔ گڈاپ سے شروع ہونے والی اس ندی کے اطراف میں بڑی تعداد میں ننھے لیس دار اور لذیذ میوے کے درخت تھے، جنھیں سندھی زبان میں لیار اور بلوچی زبان میں لیوار کہا جاتا ہے۔

اس مقام کو لیار یا لیوار والا علاقہ کہا جاتا تھا جو بعد میں لیاری کہا جانے لگا۔ محنت کشوں اور ہنر مندوں کی اس بستی ''لیاری'' نے کراچی کو مایہ ناز کھلاڑی، نام ور سیاستداں، ممتاز مذہبی علما، تحریک پاکستان میں سرگرم کردار ادا کرنے والے رہنما، اعلیٰ پایے کے ادیب، خوش گلو گائیک اور فنون لطیفہ سے تعلق رکھنے والے کئی جوہر دیے۔

لسبیلہ چوک، ناظم آباد: لارنس روڈ پر پاکستان کوارٹرز کے چوک سے آگے لسبیلہ چوک ہے۔ یہاں بائیں ہاتھ پر ندی کے اس پار کھیت اور باغات کا علاقہ تھا۔ مگر ان دنوں یہ علاقہ خالی میدانوں پر مشتمل ہے، یا کہیں کچے اور کہیں سیمنٹ کی دیواروں اور ٹین کی چھتوں کے پکے گھر نظر آرہے ہیں۔ 1965 کے دوران اس گزرگاہ پر آگے کی طرف حکومت سندھ نے وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کے نام سے ایک بستی ''ناظم آباد'' کے قیام کا اعلان کیا ہے (سابقہ نام ''لالو کھیت'' جو ایک بلوچ لال محمد کے نام سے منسوب تھا) پرانے شہر میں اپنی مرضی کا ایک منزلہ مکان یا بنگلہ بنانے کے لیے زمین دستیاب نہیں ہے اور اگر سولجر بازار، جمشید روڈ وغیرہ کے پوش علاقوں میں موجود ہے تو وہاں زمین کی قیمت زیادہ ہے۔

لہٰذا پرانے شہر کے متوسط طبقے کے وہ لوگ جنھوں نے کچھ رقم پس انداز کی ہوئی ہے، وہ یہاں کا رخ کر رہے ہیں۔ لسبیلہ سے ناظم آباد پہنچنے کے لیے ندی پر بنے کچے پل کی جگہ 1950 میں نیا پختہ پل تعمیر کیا گیا۔ اس نئی بستی کا رخ کرنے والے لوگوں کا مطمع نظر یہ ہے کہ بڑھتے ہوئے خاندان کے افراد کو مستقبل میں پیش آنے والی رہائش کی مشکلات کا حل بھی یہاں نکل آئے گا، اور شہر کے ہنگاموں اور ٹریفک کے شور و دھوئیں سے مبرا ایک پر فضا مقام بھی میسر آجائے گا۔ اس وقت ناظم آباد میں تعمیری کام جاری ہے، حسب استطاعت سادہ مکان اور بنگلے زیر تعمیر ہیں۔

☆ پٹیل پاڑہ، گرومندر، جمشید روڈ، سولجر بازار: گارڈن سے لسبیلہ چوک پہنچ کر اگر داہنے ہاتھ پر رخ کیا جائے تو یہ سڑک پٹیل پاڑہ سے ہوتی ہوئی ''گرومندر'' کے علاقے کی طرف جا رہی ہے۔ گرو پنج مکھی ہنومان مندر کی یہاں موجودگی کی وجہ سے یہ علاقہ گرومندر کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ گرومندر اور جمشید روڈ کا علاقہ کلفٹن کے بعد دوسرا پوش رہائشی ایریا کہلاتا ہے۔ یہاں کاروباری سرگرمیاں نہیں ہیں۔ مین روڈ اور گلیوں میں رہائش بنگلوں کی صورت میں ہیں۔ جمشید روڈ پر قیام پاکستان سے قبل کے خوب صورت طرز تعمیر کے حامل بنگلے موجود ہیں۔ ''جمشید نسروانجی مہتا'' جن کے نام سے جمشید روڈ موجود ہے۔ وہ 1922 سے 1933 تک کراچی میونسپلٹی کے منتخب صدر اور کراچی کے پہلے میئر رہے ہیں۔

انھی کے دور میں بندر روڈ پر کراچی میونسپل کارپوریشن کی موجودہ عمارت کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس عمارت میں منتقل ہونے سے قبل بلدیہ کے تمام امور میکلوڈ روڈ پر کرائے کی عمارت میں سرانجام دیے جاتے تھے۔ گرومندر چوک سے ایک چوڑی اور طویل سڑک سولجر بازار

کی طرف جارہی ہے یہ علاقہ صدر کے ساتھ ہی آباد ہوا۔ انگریزوں نے کراچی آمد کے بعد بندر روڈ کے پچھلے حصے (موجودہ ہولی فیملی اسپتال) کے آس پاس فوجی ڈپو اور فوجیوں کے لیے بیرکس تعمیر کیے۔

کچھ عرصہ گزرنے پر یہاں فوجیوں کے لیے سنگل اسٹوری کوارٹر تعمیر ہوئے تو ان فوجیوں کی روزمرہ ضروریات زندگی کی اشیا کی خرید کے لیے قریب ہی ایک بازار تعمیر کیا گیا۔ بعد ازاں سولجروں (فوجیوں) کا یہ بازار اور علاقہ ''سولجر بازار'' کے نام سے معروف ہوا۔ یہاں 1885 سے 1935 تک پتھروں سے بنی عمارتیں اور 1940 کے بعد سیمنٹ سے بنی دومنزلہ عمارتیں اور بنگلے بھی تعمیر ہوئے۔ اس طرح یہ علاقہ ملے جلے طرز تعمیر کا حامل رہا۔ جمشید روڈ کی طرح سولجر بازار کے بنگلوں اور اس کے آس پاس کھلے اور خوب صورت ایریا میں رہائش قابل فخر سمجھی جاتی ہے۔

تین ہٹی، لالو کھیت: لارنس روڈ پر لسبیلہ چوک سے آگے تین ہٹی کا چوک آجاتا ہے، ''ہٹی'' مقامی زبان میں چھوٹی کیبن نما دکان کو کہا جاتا ہے۔ ان دنوں جب ندی پار باغات تھے اور ان باغات کے کاشت کار اور کارکنوں پر مشتمل بلوچوں کا ایک گوٹھ ندی کے اس طرف (جہانگیر روڈ) آباد ہوا تو ان خاندانوں کی ضروریات زندگی کی چھوٹی موٹی چیزوں کی فروخت کے لیے یہاں تین چھوٹی کیبن نما کانیں وجود میں آگئیں۔ گوٹھ سے تھوڑے فاصلے پر سنسان علاقے میں یہ تین کیبن، بلکہ تین ہٹیاں مرکز نگاہ بن گئیں، یوں یہ علاقہ تین ہٹی کے نام سے معروف ہو گیا، جو آج تک مروج ہے۔

اس وقت تین ہٹی سے ندی کی دوسری طرف جانے کے لیے شاید کوئی کچا کاشتکاروں نے اپنی مدد آپ کے تحت پتھروں اور لکڑی کے تختوں کی مدد سے بنالیا ہو گا۔ ندی کے اس پار بڑے رقبے پر باغات کے پھیلے ہوئے سلسلے میں آم اور املی کے درخت بکثرت تھے۔ باغوں کے اس سلسلے میں تین ہٹی پر ندی کے دوسری طرف کے باغات لال محمد عرف لالو کی ملکیت ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ ''لالو کھیت'' کے نام سے مشہور تھا۔ (جسے آج لیاقت آباد کہا جاتا ہے)۔''

الغرض کراچی کی کہانی، تاریخ کی زبانی۔ نئی نسل کے لیے ایک حوالہ جاتی کتاب ہے اور ساتھ ہی بزرگ شہریوں کو ماضی کی یادوں میں لے جاتی ہے۔ جہاں ہر سو سکھ و چین تھا، بھائی چارگی کی وجہ سے لوگوں کو غربت کا احساس نہیں ہوتا تھا جب کہ آج لوگ خوشحال ہونے کے باوجود روحانی طور پر بے سکون دکھائی دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مادیت پرستی، بھائی چارگی پر غالب ہے۔ ہماری دعا ہے کراچی کا حسن پھر سے لوٹ آئے جہاں راتیں جاگتی تھیں، جان و مال کا تحفظ ہوتا تھا، ہمارا تمہارا کس کا کراچی کے زہریلے نعرے نہیں تھے، کراچی، سب کا کراچی تھا۔ اے کاش! پھر وہی دور لوٹ آئے!
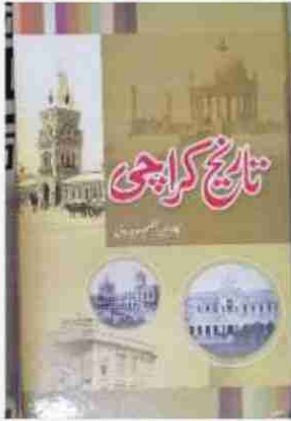
کتاب: تاریخ کراچی
مصنف: کامران اعظم سوہدروی
تبصرہ نگار: سید محمد سلمان

سندھ کی تاریخ کے حوالے سے کامران اعظم کافی عرصے سے کام کر رہے ہیں اور ان کی کئی کتابیں اس حوالے سے شائع ہو چکی ہیں. اس کتاب تاریخ کراچی سے پہلے آپ 50 کے قریب کتابیں لکھ چکے ہیں جن میں سندھ کے حوالے سے تاریخ گھوٹکی، تاریخ سکھر، اور سندھ کے اضلاع کے نام سے کتابیں تحریر کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخ لاہور اور تاریخ کوئٹہ بھی تحریر کر چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی کراچی کی تاریخ اور موجودہ انتظام کراچی کے مشاہر اور کراچی سے متعلق دیگر معلومات۔

کتاب کے شروع میں سٹی ڈسٹرکٹ گورنمنٹ 2000 کے زمانے کے 18 ٹاؤنز اور ان میں موجود یونین کونسلوں کا مختصر احوال ہے مگر اب یہ نظام ضلعی ٹاؤن سسٹم میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کتاب میں کراچی کی تاریخ کو بیان کرنے کے لیے محمد عثمان دموہی صاحب کی کتاب کراچی تاریخ کے ائینے میں اور محترمہ محمود رضویہ صاحبہ کی کتاب ملکہ مشرق کو بنیادی ماخذ بنایا گیا ہے اور کراچی کی تاریخ بیان کرنے کے لیے ان ہی دو کتابوں پر زیادہ انحصار کیا گیا ہے۔

کیونکہ یہ کتاب 2013 کی ہے اس لیے 2013 تک کے کراچی کے اضلاع اور کنٹونمنٹس کی بھی تفصیل اس میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ کراچی شہر میں رہنے والی قوموں کے اعداد و شمار بھی بڑے مختصر اور جامع انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔

اس کتاب میں 750 سے زیادہ مشاہیر کا تذکرہ موجود ہے جو مختلف عنوانات کے تحت کتاب میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کراچی سے متعلق بہت ساری معلومات جدول کی صورت میں دی گئی ہیں جیسے کراچی کی اہم شاہراہیں اور کراچی کی لائبریریز بڑے خوبصورت انداز سے جدول میں کالم کے ذریعے بیان کی گئی ہیں. اس کے علاوہ بھی اکثریت معلومات اسی طرح فہرست کی صورت میں بیان کی گئی ہیں۔

کتاب: شہروں میں شہر کراچی: ایک مطالعاتی جائزہ

مصنّفہ: نسرین اسلم شاہ

23 فروری 2020 کو سنڈے میگزین میں چھپا تبصرہ

ناشر: رائل بُک کمپنی
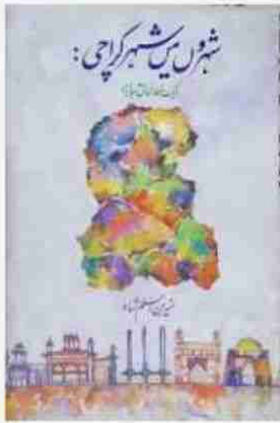
کراچی اپنے اندر ایک عجیب کشش رکھتا ہے۔ مختلف نسلوں، قوموں، مذاہب، رسوم ورواج اور تہذیبوں کو اپنے اندر سمونے والے اس بین الاقوامی شہر کا مزاج اس ملک کی قومی زبان اُردو کے عین مماثل ہے کہ دونوں ہی جذب و قبول کی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ ایک زمانے تک ملک کا اوّلین دارالحکومت قرار پانے والے اس شہر کی اہمیت آج بھی جوں کی توں ہے کہ ملکی معیشت کے چلنے والے پہیّے کی اصل قوّتِ محرکہ یہی شہر ہے۔ بانیِ پاکستان قائدِاعظم محمدّ علی جناح کے مولد و مسکن و مدفن شہر نے ساحلی سے صنعتی شہر بنتے بنتے وقت کے کتنے جبر اپنے سینے پر سہے، یہ بجائے خود ایک طویل تاریخ ہے۔ رئیس امروہوی نے اپنے قطعات میں محض اس ملک ہی کی نہیں، بلکہ اس عظیم شہر کی بھی تاریخ تحریر کردی ہے کہ جب انہوں نے کراچی میں قدم رکھا، تو اس شہر کی وسعت پر مختلف تہذیبوں کے اثرات دیکھتے ہوئے کمالِ فن کی بلندی پر قطعہ کہا، ''لالو کھیت وملیر کو احمق...لالو کھیت وملیر کہتے ہیں...ہم تو ان میں سے ہر علاقے کو...ایک برِّصغیر کہتے ہیں''۔ جب کراچی مصائب و آلام میں گھرا اور لاشوں پر لاشیں اُٹھنے لگیں، تو اُن کے قلمِ معجز نما نے یوں کلام کیا، ''پہلے تھا ہم کو ناز کہ اپنا ہے ایک شہر...سایوں کا شہر اور سویروں کا شہر ہے... لیکن ہے اب یہ حال کہ یہ روشنی کا شہر...اندھوں کا شہر اور اندھیروں کا شہر ہے''۔ ممتاز شاعر شبنم رومانی نے ''مثنوی سیرِ کراچی'' بھی تحریر کی تھی۔ یہ سب باتیں ''شہروں میں شہر کراچی: ایک مطالعاتی جائزہ'' کے ''اوراقِ جانفشانی'' پر نظر ڈالتے ہوئے بے ساختہ یاد آگئیں۔ رئیس کلّیہ فنون و سماجی علوم، میریٹوریس پروفیسر، شعبہ سماجی بہبود، ڈائریکٹر، سینٹر آف ایکسی لینس فار ویمنز اسٹڈیز، جامعہ کراچی، ڈاکٹر نسرین اسلم شاہ نے برسوں اس شہر کی کُوچہ گردی کی۔ گلیوں اور محلّوں کی خاک چھانی۔ سرکاری و غیر سرکاری دفاتر اور علاقوں کا دورہ کیا۔ بلا مبالغہ اَن گِنت افراد سے ملاقاتیں کیں، تب کہیں جا کر اُنہوں نے اس شہر کو ''شہروں میں شہر کراچی'' قرار دیا۔ یہ ایک ایسی تحقیق ہے، جس پر سرسری بات کرنے کی بجائے تفصیل سے گفتگو مقصود ہے۔ جو لوگ تحقیق کی دشوار گزار راہوں، گھاٹیوں سے گزرنے کا تجربہ رکھتے ہیں، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ایسی جگہوں میں ''دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں۔'' تعلیم وتدریس کا وسیع تجربہ رکھنے والی، بارہ اہم کتابوں کی مصنّفہ، بے شمار اداروں کے ادارتی عملے میں شامل، بہت سے طلبہ کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کروانے والی ہمہ وقت ''وقت کی استعمال کنندہ'' ڈاکٹر نسرین اسلم شاہ کو کراچی سے عشق ہے اور جس

طور پر 2016ء میں جب ان کے بلاگز کا پہلا مجموعہ کتابی صورت میں سامنے آیا تو اس میں محمد علی جناح اور رتی کے درمیان شادی کا پیغام دینے کے واقعے نے قارئین کی دلچسپی حاصل کی۔ اس واقعے کی تصدیق کے لیے ہمارے اختر بلوچ نے شریف الدین پیرزادہ کی کتاب تلاش کا ثبوت اُن کی تحریر کردہ یہ پیشِ نظر کتاب ہے کہ جسے کراچی کے بارے میں معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ قرار دینے میں کوئی تکلّف نہیں، بلکہ اسے کسی حد تک کراچی کا انسائیکلوپیڈیا بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے مندرجات کو دو حصّوں میں پیش کیا گیا ہے۔ اوّل حصّے میں کراچی سے متعلق وہ مضامین شامل ہیں، جن میں اس شہر کی وجہِ تسمیہ سے لے کر محلِ وقوع، خُوب صُورت مقامات، عبادت گاہوں، قبرستان، مزارات، لائبریریز، مردم شماری، منصوبوں، اہم شخصیات وغیرہ کا احوال ہے۔ تاہم، یہ مروّجہ مضامین کی شکل میں نہیں ہیں، محض ابتدائی معلومات کی فراہمی تک محدود ہیں، البتہ کتاب کا دوسرا حصّہ کراچی کے مختلف ٹاؤنز اور اُن سے وابستہ اہم باتوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ جس میں ٹاؤنز کے ساتھ اہم مقامات کی، جن میں تعلیمی و فلاحی ادارے، شفاخانے، بینکس، فیول اسٹیشنز، گاڑیوں کے شورومز، شادی ہالز، پولیس اسٹیشنز، کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کی اہم جگہیں شامل ہیں، تمام تر تفصیل بھی شامل کی گئی ہے۔ مصنّف نے ”پیش لفظ“ میں ایک جگہ تحریر کیا ہے، ”اس شہر سے مجھے ایک عجیب اُنسیت ہے، جس کی وجہ سے میں کبھی اسے چھوڑنے کا تصوّر نہ کر سکی۔ باوجود کئی مواقع ملنے کے، کراچی ہی میں رہنے کو ترجیح دی۔“ اور یہ کتاب لکھ کر اُنہوں نے اس شہر سے اُنسیت کا حق ادا کر دیا ہے۔ نیز، کتاب کے آخر میں شامل تصاویر نے بھی کتاب کی افادیت مزید بڑھا دی ہے۔

کمپیوٹر کورسز اور انگلش لینگوتج کورس

جون جولائی کی چھٹیوں میں طلباء کے لیے خصوصی طور پر اہم کمپیوٹر کورسز اور انگلش لینگوتج کے پروگرام جعفر طیار لائبریری نے مختلف اداروں کے تعاون سے شروع کروائے

کرانچی والا
تحریر: اختر بلوچ
تبصرہ:

اختر بلوچ جنرل ضیاء الحق دور کی اس نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے جو سیاست میں سر گرم رہی اسی میں وہ جوان عمری میں جیل گئے، میر پور خاص سٹیزن کلب جیمخانہ ہو یا کوئی ادبی علمی سر گرمی وہ وہاں سر گرم رہے جب انسانی حقوق کمیشن کا جنم ہوا تو وہ اس کا متحرک حصہ بن گئے اور یوں میر پور خاص سے حیدر آباد آ گئے جہاں صحافت سے بھی منسلک ہو گئے، ان دنوں جبری مشقت کے خلاف تحریک زور پر تھی عاصمہ جہانگیر اور ان کے ساتھیوں پر نگرانی اور ناراضگی تھی ایک روز اختر بلوچ اٹھا لیے بھی گئے. کراچی میں وہ انسانی حقوق کمیشن سے زیادہ ایک بلاگر کے طور پر مشہور ہوئے اس سے قبل وہ خواجہ سراؤں پر ایک کتاب لکھ چکے تھے اور اس کے علاوہ کرانچی والا کے نام سے ان کی تین کتابیں ہیں جو ان کے بلاگز پر مشتمل ہیں، کراچی کی تاریخ پر کس نے کیا لکھا ہے کب لکھا ہے اور یہ کتاب دستیاب ہے یا نہیں انکوائری نمبر وہ ہی تھے، ریگل چوک اور فریئر ہال مارکیٹ میں پرانی کتابوں کے اسٹالز پر ہر اتوار کو وہ منڈلاتے رہتے، انہوں نے کراچی کی تاریخ کو کرید کر نوجوانوں کو اس سے روشناس کرایا، قدیم عمارتوں، مقامات اور واقعات کو زبان، آنکھیں دیں جو قاری سے مخاطب ہوتے تھے، قادو مکرانی ہو یا سیٹھ ناؤمل انہوں نے سب کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔

اختر بلوچ صاحب نے کرانچی والا میں کراچی کے مختلف علاقوں قبرستانوں عمارتوں اور دیگر کراچی کی تاریخی حیثیت کی حامل علاقوں پر قلم اٹھایا اور صرف یہی نہیں کیا کہ کتابوں سے یا لوگوں سے سن کر مختلف تاریخی عنوانات پر مضامین لکھے بلکہ خود متعلقہ جگہ پر گئے اور تفصیلی جائزہ اور متعلقہ افراد کا انٹرویو کرنے کے بعد مضامین بنائے جو مسلسل اخبارات میں چھپتے رہے انہی مضامین کو جمع کر کے اپ نے کرانچی والا کے نام سے کتاب تحریر کی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی 3 جلدیں منظر عام پر آگئی جن کی مقبولیت اتنی ہوئی کہ آپ کے نام کے ساتھ کرانچی والا لگ گیا.
آپ کی تحریریں انٹرنیٹ پر بیک وقت انگریزی، اردو اور سندھی زبان میں شائع ہوتی تھیں۔ اس وجہ سے بلوچستان میں انتخاب اخبار اور آزادی اخبار اور لاہور اور پشاور میں مشرق اخبار ان کی تحریریں شائع کرتے۔ تاریخی درستگی کے لیے ان کی کوششیں بے مثال تھی کیونکہ وہ انتہائی غیر متوقع لوگوں اور مقامات سے حوالہ جات تلاش کرتے تھے۔ ان کے منفرد انداز نے انہیں علمی برادری کے اندر بھی ایک معتبر حوالہ بنا دیا تھا۔
ان بلاگز میں تاریخ کے ان موضوعات کا بھی احاطہ کیا گیا جنہیں بہت سے لوگ ممنوع سمجھتے تھے یا بحث کے قابل نہیں سمجھتے تھے۔ مثال کے

کی اور اس کا صحیح حوالہ دیا۔ انہوں نے اس واقعے کو بغیر کسی سنسنی کے بیان کیا۔
حقائق کی چھان بین کرنا ان کی خاصیت تھی اور بعض اوقات اپنے بلاگز میں استعمال ہونے والے ذرائع کی تصدیق کے لیے مواد کی تلاش میں وہ ہفتوں بلکہ بعض اوقات تو مہینوں تک کوشش کرتے۔ چونکہ وہ اپنی جستجو میں پُرجوش اور اپنے تجزیے میں بالکل غیر جذباتی ہوتے تھے اس وجہ سے ان کی تحریریں غیر جانبدارانہ ہوتی تھیں۔ اپنے بلاگز کے آخر میں وہ قارئین سے کہتے کہ وہ اس موضوع کے حوالے سے انہیں اضافی معلومات سے روشناس کروائیں۔ یہ چیز انہیں فکری طور پر ایک لچکدار شخص کے طور پر پیش کرتی ہے۔ وہ اکثر ڈاکٹر مبارک علی، حسین نقی، آئی اے رحمٰن، صباد شتیاری اور توصیف احمد خان کے حوالے دیا کرتے تھے جنہیں وہ اپنا سرپرست اور رہنما بھی سمجھتے تھے۔
ان افراد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہی انہوں نے تاریخ کے اس عمومی راستے سے مختلف راستہ اختیار کیا جو پاکستان کی درسی کتابوں میں بتایا جاتا ہے۔ ان کی اس کوشش نے تاریخ کے حوالے سے ایک غیر روایتی انداز کو جنم دیا جو ماضی قریب کے کچھ کھوئے ہوئے صفحات کو دریافت کرنے کا باعث بنا۔ ان کی سب سے زیادہ دلچسپی ان عمارتوں اور لوگوں کو سامنے لانا تھی جو ہماری تعریف اور توجہ کے مستحق ہیں۔
اختر بلوچ کا تمام کام ہمارے ماضی کو مسخ کرنے والے تاریخ سے متعلق تمام سرکاری بیانیے کی مزاحمت اور اسے چیلنج کرتا ہے۔ انہوں نے اپنے کام کے ذریعے تاریخ کے حوالے سے غلط فہمیوں کو دُور کیا ہے۔ انہوں نے جو کام کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ وہ سندھ میں عوام کی تاریخ کے حقیقی حامی تھے اور انہوں نے اپنے ساتھی محققین اور طلبہ کے لیے ایک متبادل راستہ ہموار کیا جو غیر موافقت پسندانہ تھا۔
اختر بلوچ کو تحقیق کا جنون تھا لیکن وہ اکثر دوسرے نام نہاد صحافیوں اور اینکر پرسن کی جانب سے سرقے کا نشانہ بنتے تھے۔ اس کی ایک قابل ذکر مثال یہ ہے کہ ایک اینکر پرسن نے حوالہ دیے بغیر کراچی میں یہودی عبادت گاہ پر لکھے گئے اختر بلوچ کی مکمل تحقیق کا سرقہ کیا۔ حتیٰ کہ اختر بلوچ نے جو تصاویر لی تھیں اور اپنے بلاگ کے لیے استعمال کی تھیں وہ بھی بغیر کسی حوالے یا اجازت کے ڈاؤن لوڈ اور استعمال کی گئیں۔
یہ کوئی اکیلا واقعہ نہیں تھا کیونکہ اسی اینکر نے بعد میں فاطمہ جناح کے جنازے پر لکھے گئے اختر بلوچ کے بلاگ کو نقل کیا تھا۔ اسے بعد میں بہت سے اخبارات نے دوبارہ پیش کیا، جن میں سے کچھ نے اختر بلوچ کے کام کو تسلیم کیا جبکہ دوسروں نے نہیں کیا۔ اسی طرح ایک شخص نے تو فاطمہ جناح کے جنازے کے حوالے سے 36 صفحات پر مشتمل کتابچہ بھی شائع کیا جس میں اختر بلوچ کا بلاگ استعمال کیا گیا، مگر اس میں اختر بلوچ کا کوئی حوالہ نہیں تھا۔
اختر بلوچ خوش تھے کہ ان کا کام بڑے پیمانے پر شائع ہو رہا ہے لیکن یہ بدقسمتی تھی کہ اس کی داد دوسروں کو مل رہی تھی۔ آدرش ایاز لغاری اور عارف انجم نے ڈان کے لیے لکھے گئے ان کے اردو بلاگز کا انگریزی میں ترجمہ کیا جبکہ کچھ دیگر سندھی میگزینوں نے بھی ان کے بلاگز ترجمہ کر کے شائع کیے۔
دوسری جانب اختر بلوچ کا حال یہ تھا کہ اگر کسی نے ان کے بلاگ کے لیے ذرا سا بھی تعاون کیا ہوتا تو وہ اس کا حوالہ ضرور دیتے۔ اس کے حوالے سے وہ ہمارے مرحوم دوست مصدق سانول کا ذکر کرتے تھے جن سے انہوں بہت کچھ سیکھا تھا۔
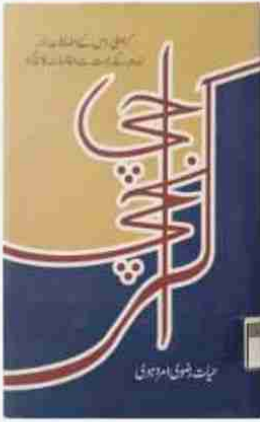
کتاب: کراچی کرانچی
مصنّف: حیات رضوی امروہوی

گو کہ جدید کراچی کی بنیاد 1728ء میں پڑی، مگر اِس شہر کا حوالہ سکندرِ اعظم کے زمانے میں بھی ملتا ہے۔ یہ شہر دو، ڈھائی سو سال میں چند جھونپڑیوں سے فلک بوس عمارتوں تک کا سفر طے کر گیا اور جہاں چند سو لوگ بستے تھے، وہاں آج کھوّے سے کھوّا چھلتا ہے۔ ملک کے اِس سب سے بڑے شہر کے بہت سے مسائل ہیں اور سب ہی اہم ہیں، مگر المیہ یہ بھی ہوا کہ کسی نے اِس کا ماضی کھوجنے اور تاریخ محفوظ کرنے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی۔ پورے شہر میں سرکاری یا نجی سطح پر ایک بھی ایسا ادارہ موجود نہیں، جہاں کراچی کی تاریخ پر مواد دست یاب ہو۔ البتہ اِس ماحول میں یہ غنیمت ہے کہ چند افراد نے کسی سرکاری یا ادارہ جاتی معاونت کے بغیر محض اپنے شوق، محنت اور ہمّت سے تاریخ کو کھنگالا، اسے ترتیب دیا اور عوام کے ملاحظے کے لیے پیش کر دیا۔ زیرِ نظر کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ اِس میں شامل مضامین روزنامہ جنگ اور دیگر اخبارات و جرائد میں شایع ہوتے رہے ہیں، جنھیں اب ضروری ترامیم کے ساتھ کتابی شکل دی گئی ہے۔ فاضل مصنّف نے کراچی کے مختلف علاقوں، محلّوں، عمارتوں، بازاروں، عبادت گاہوں، بعام گاہوں، قبرستانوں اور صنعتوں وغیرہ کے بارے میں عمدہ معلومات فراہم کی ہیں، جب کہ کراچی کے مضافات اور صوبے کے بعض دیگر مقامات کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ مصنف کا بنیادی تعلق گولیمار کے علاقے سے ہے اس لیے اس کتاب میں فطری سی بات ہے کہ گولیمار اور اس کے اطراف کا ذکر زیادہ تفصیل سے ہے بلکہ حیات صاحب نے گولیمار کے علاقے کی تاریخ کو بہت تفصیلی انداز سے بیان کیا ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام ان کی انکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا جو اب تاریخ کا حصہ ہے. اس کے علاوہ مصنف نے کتاب کے شروع میں اپنے 08 بلاگز کو شامل کیا ہے جس میں قیام پاکستان کے بعد کراچی کی ابتدائی کالونیوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے.
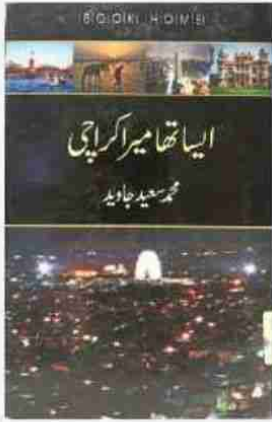
کتاب: ایسا تھا میرا کراچی

مصنف: محمد سعید جاوید

تبصرہ نگار: اے ایچ ظفر

بہت پرانی بات ہے جب اس خاکسار نے لاہور شہر پر دو کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ایک تھی ''لاہور جو شہر تھا'' اور ایک تھی ''میرا شہر لاہور''۔ ''لاہور جو شہر تھا'' انیس ناگی نے تحریر کی تھی اور ''میرا شہر لاہور'' بابا یونس ادیب کی تخلیق تھی۔ کے حوالے سے بھی اس کتاب میں بہت معلومات ملتی ہیں۔ نامی گرامی پہلوانوں اور بد معاشوں کے بارے میں بھی قارئین کو آگاہ کیا گیا۔ اس زمانے کی معاشرتی اقدار کے بارے میں بھی بابا یونس ادیب نے بڑی تفصیل سے خامہ فرسائی کی چونکہ شہر کی آبادی بہت کم تھی اس لئے زیادہ تر لوگ ایک دوسرے سے آشنا تھے۔

نامور لکھاری محمد سعید جاوید نے کراچی کے بارے میں کچھ ایسی ہی کتاب تصنیف کی ہے جس کا عنوان ہے ''ایسا تھا میرا کراچی''۔انہوں نے قیام پاکستان کے بعد کا کراچی ہماری آنکھوں کے سامنے رکھا ہے۔ آج کے نوجوان جب اس کتاب کو پڑھیں گے تو یقیناً وہ حیرت کے سمندر میں ڈوب جائیں گے کہ کیا پاکستان کا معاشی مرکز کبھی ایسا بھی تھا؟

محمد سعید جاوید نے جو کراچی دیکھا وہ کمال کا شہر تھا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں۔ اگر میں کہوں کہ وہ ناسٹیلجیا(Nastalgia) کا شکار ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ لیکن یہ ناسٹیلجیا ہجرت کے حوالے سے نہیں ہے جیسے کہ عظیم افسانہ نگار انتظار حسین کے ہاں ملتا ہے۔ یہ ناسٹیلجیا شہر کی بربادی کے حوالے سے ہے۔ کہاں وہ عمارتیں، وہ ثقافتی وسیاسی سرگرمیاں، ادبی اور فلمی شخصیات، سماجی اقدار اور کھیلوں کے میدان اور کہاں اب ہر شعبے میں تنزلی۔ ٹرانسپورٹ کا نظام کتنا شاندار تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ سستا اور غریب پرور شہر تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ایک روپے میں بہترین ناشتہ مل جاتا تھا۔ یہ خاکسار 1974 میں پہلی بار کراچی گیا۔ اس وقت اس شہر کی آبادی 20 لاکھ کے قریب تھی۔ لیکن نظم وضبط بہت تھا، لاہور سے سستا تھا۔ اس وقت کراچی میں 180 سے زیادہ سینما گھر تھے۔ برادران کراچی سے لاہور منتقل ہو گئے۔

اُس زمانے میں بزرگوں کا بڑا احترام کیا جاتا تھا اور وہ نوجوانوں کو تلقین کرتے کہ صراط مستقیم پر چلیں، گھروں کا ماحول بہت شاندار ہوتا تھا۔ مختلف مذاہب کی شادیاں کیسے ہوتی تھی اس کا بھی مکمل احوال بیان کیا گیا۔ مزار قائد کی تعمیر کیسے ہوئی اور اس کے علاوہ دیگر عمارتوں کا ذکر ملتا ہے۔ خواتین کیسا لباس پہنتی تھیں، اس بارے میں بھی خاصی معلومات ملتی ہیں۔ ان معلومات کے ساتھ نادر تصاویر کے اضافے نے گویا کتاب کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ پھر ایوب خان کے مارشل لاء کا ذکر بھی ملتا ہے اور 1965ء میں جس طرح مادرِ ملت فاطمہ جناحؒ کو

دھاندلی سے ہرایا گیا، مصنف نے اس کا بھی محاکمہ کیا ہے۔ 1965ء کی جنگ میں کراچی کے عوام نے جس جوش و جذبے کا اظہار کیا خاص طور پر ایوب خان کی تقریر نے جس طرح عوام کے دلوں کو گرمایا وہ بھی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔

محمد سعید جاوید کی ہر تصنیف پہلے سے زیادہ اچھی، پر کشش اور معلومات افزاء ہوتی ہے۔ قارئین سے ان کا پہلا تعارف ان کی مشہور زمانہ کتاب "مصریات" کے حوالے سے ہوا تھا۔ یوں تو وہ فورٹ عباس کے نواحی گاؤں کے رہنے والے ہیں لیکن جہاں گردی کے بعد اب انہوں نے پھولوں اور باغات کے شہر لاہور کو اپنا مستقل مسکن بنالیا ہے۔ تصویر کشی کا شوق تحریر و تحقیق سے کہیں زیادہ انکی شخصیت میں پایا جاتا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب جو اُن کی سوانح عمری ہے وہ "اچھی گزر گئی" کے نام سے شائع ہوئی اور ادبی دنیا میں بہترین سوانح عمریوں میں شمار ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا ان کی سوانح عمر کبھی نہ بھولنے والی کتاب ہے اور جہاں جہاں بھی ہوگی اپنے مصنف کا بہترین تعارف کرواتی رہے گی۔ زیر نظر کتاب "ایسا تھا میرا کراچی "اُس شہر کے متعلق ہے جو کبھی فن و ثقافت اور امن کا گہوارہ ہوا کرتا تھا۔

سیمینار باعنوان اسلام کے مالیاتی اور بینکنگ کے قوانین

جعفر طیار لائبریری نے الصادق انسٹیٹیوٹ آف بینکنگ، فائنانس اینڈ تکافل کے تعاون سے "اسلام کے مالیاتی و بینکنگ قوانین" کے عنوان سے جعفر طیار لائبریری کے محمد علی جناح ہال میں ایک سیمینار منعقد کیا جس میں ریسرچ اسکالر "سید مظہر عباس زیدی صاحب" نے پاکستان میں بینکنگ، انشورنس اور دیگر مالیاتی اداروں میں اسلامی مالیاتی قوانین کے اطلاق اور اس کے مستقبل کے بارے میں نہایت مدلل گفتگو کی. اس پروگرام میں بینکنگ اور دیگر مالیاتی اداروں کے لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی. سیمینار کے آخر میں سوال و جواب کا انتہائی معلوماتی سیشن بھی ہوا.

SEMINAR
ISLAMIC BANKING
Presenter:
Syed Mazhar Abbas Zaidi
Place:
M. Ali Jinnah Hall
Jaffar-e-Tayyar Library
on Saturday
4th March
8pm
Who should attend?
Organized by
Jaffar-e-Tayyar Library
AL-Sadiq Centre of Islamic Economics

میرے شہر والے

مصنف: عبدالشکور پٹھان

تبصرہ نگار: ڈاکٹر عقیل عباس جعفری

(شکور پٹھان صاحب کی اس کتاب کی رونمائی پر کی گئی ڈاکٹر عقیل عباس جعفری صاحب کی تقریر)

جب یہ شہر قاری زاہر قاسمی کی تلاوت پہ جاگتا تھا اور بندو خان کی سارنگی سن کر سوتا تھا۔ جب رشید ترابی، احتشام الحق تھانوی اور شفیع اوکاڑوی خطابت کے جوہر دکھاتے تھے اور مفتی محمد شفیع اور بابا ذہین شاہ تاجی علم کے گوہر رولتے تھے۔
جب شاہد احمد دہلوی موسیقی کے سبق یاد کرواتے تھے اور استاد جھنڈے خان کے قصے سناتے تھے۔ جب مولوی عبدالحق مشفق خواجہ کو تحقیق کے گر سکھاتے تھے اور جمیل جالبی اور ابوالخیر کشفی تنقید کے نئے نئے دبستانوں سے روشناس کرواتے تھے۔ جب کرار حسین، سید سبط حسن اور حسن عسکری علم کے دریا بہاتے تھے اور سلیم احمد اور قمر جمیل نئی شمعیں جلاتے تھے۔ جب سیماب اکبر آبادی وحی منظوم لکھتے تھے اور آرزو لکھنوی سریلی بانسری بجاتے تھے۔ جب جوش ملیح آبادی یادوں کی برات سناتے تھے اور قمر جلالوی شاگردوں کی منڈلیاں سجاتے تھے۔
جب ابن صفی عمران اور فریدی کی داستان سناتے تھے اور شکیل عادل زادہ استاد بٹھل اور بابر زماں خان کے قصے رولتے تھے۔
جب ملا واحدی دلی کی بھولی بسری کہانیاں سناتے تھے اور بہزاد لکھنوی، لکھنو کے حکیم بڈھن سے ملواتے تھے۔
جب ابراہیم جلیس، ابن انشا اور مشتاق احمد یوسفی گدگداتے تھے اور ظریف جبل پوری، سید محمد جعفری اور دلاور فگار پھلجھڑیاں چلاتے تھے
جب خواجہ معین الدین اور احمد علی اسٹیج پر مسکراہٹ بکھیرتے تھے اور حسینہ معین اور کمال احمد رضوی چھوٹی اسکرین پر۔
جب حکیم مولانا مولوی مرزا ماہر بیگ ماہر جابہ جاہر مسافر پہ ہے لازم صبر کرنا چاہیے کے مصرعے لکھتے پھرتے تھے اور سلطنت مغلیہ کے چشم و چراغ اور وارث اصلی استاد محبوب نرالے عالم شہر کی سڑکوں پر چناجور گرم کی صدائیں لگاتے تھے۔
جب فضل احمد کشمیر والا کو سیجن کو نہرو کی یتیم بٹی کو سمجھانے کے لیے خطوط لکھتے تھے اور علامہ مشرقی کے فرزند شہر کی دیواریں سیاہ کر کے شفاف تحریک چلاتے تھے۔ جب ماہر القادری اور ادیب رائے پوری آمنہ کے لال کی مدح سرائی کرتے تھے۔ اور آل رضا اور نسیم امروہوی محمد کے نواسے کے مرثیے سناتے تھے۔

جب وحید ظفر قاسمی اور خورشید احمد نعتوں کی نواسنجی کرتے تھے اور کجن بیگم سوز و سلام اور سچے بھائی نوحے پڑھتے تھے۔
جب غلام فرید صابری عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر بھر دو جھولی مری یا محمد کا نذرانہ پیش کرتے تھے اور ان کے بعد ان کا بیٹا امجد، علی کے ساتھ زہرا کی شادی کی روایت سناتا تھا۔
جب شوکت صدیقی خدا کی بستی آباد کرتے تھے اور قرۃ العین حیدر ہاوسنگ سوسائٹی کی بنیادیں رکھتی تھیں۔
جب ہاجرہ مسرور اور فردوس حیدر کہانیاں سناتی تھیں اور زہرا نگاہ اور پروین شاکر اپنی غزلوں سے شاعری کو مالامال کرتی تھیں۔
جب سراج الدین ظفر اور عزیز حامد مدنی غزل کو نیا لہجہ عطا کرتے تھے اور رسا چغتائی اور جون ایلیا غزل کے پرانے مضامین کو تازگی عطا کرتے تھے۔
جب محسن بھوپالی نظمانے اور حمایت علی شاعر ثلاثی ایجاد کرتے تھے اور احمد ہمیش، قمر جمیل اور افتخار جالب نثری نظم کی تحریک چلاتے تھے۔
جب تابش دہلوی اور محشر بدایونی دن کو رات بناتے تھے اور عبیداللہ علیم اور جمال احسانی راتوں کو دن میں بدلتے تھے۔
جب رئیس امروہوی روز ایک تازہ قطعہ لکھ کر عوام اور ارباب حکومت کو آئینہ دکھاتے تھے اور شوکت تھانوی اور مجید لاہوری طنز و مزاح کے تیر برساتے تھے۔
جب جمیل الدین عالی جیوے جیوے پاکستان اور دوہے سناتے تھے اور صہبا اختر میں بھی پاکستان ہوں، تو بھی پاکستان ہے اور نظموں سے مشاعروں کو گرماتے تھے۔
جب وحید مراد اور ندیم بڑی اسکرین پر جگمگاتے تھے اور مہدی حسن اور احمد رشدی پس پردہ گنگناتے تھے۔ جب زیبا، دیبا اور شمیم آرا فلموں میں چھپھاتی تھیں اور شہناز اور مہناز بیگم سر بکھراتی تھیں۔
جب علن فقیر اور عابدہ پروین شاہ کی وائی گاتے تھے اور عالم گیر اسپین اور شہکی اور حسن جہاں گیر ایرانی دھنوں پر دھوم مچاتے تھے۔
جب فضل احمد کریم فضلی فلمی دنیا میں چراغ جلاتے تھے اور الیاس رشیدی ان کی روشنی اپنے نگار خانے میں محفوظ کرتے تھے۔
جب سہیل رعنا کو کورینا کی دھن بناتے تھے اور مسرور انور اسے شاعری سے سجاتے تھے۔
جب ظہیر عباس سنچریوں پر سنچریاں اور جاوید میاں داد چھکوں پر چھکے لگاتے تھے۔ اور عمر قریشی اور جمشید مارکر اس کا آنکھوں دیکھا حال سناتے تھے۔
جب انوار احمد خان اور اصلاح الدین تمغوں پر تمغے جیت کر وطن کی جھولی میں ڈالتے تھے اور روشن خان اور جہاں گیر خان ریکارڈز پر ریکارڈز توڑتے چلے جاتے تھے۔
جب اتوار کی صبح کا آغاز حامد میاں کے گھر سے ہوتا تھا اور عاشور کی شام غریباں کا اختتام ناصر جہاں کے سلام آخر پر۔

جب صادقین مصوری میں شاعری کرتے تھے اور گل جی، آذر زوبی، بشیر مرزا اور علی امام نئے دبستانوں کی کھوج لگاتے تھے۔
جب رتھ فاؤ جذامیوں کے علاج کے لیے ہسپتال بناتی تھیں اور جمشید نصروانجی بابائے کراچی کہلاتے تھے۔
جب ایدھی نوزائیدہ بچوں کو جھولے اور نازائیدہ بچوں کو کفن دیتا تھا اور حکیم محمد سعید اور سرجن جمعہ مسیحائی کرتے تھے۔
جب محمد علی حبیب اور آغا حسن عابدی نئے نئے بنک بناتے تھے اور آدمجی، عائشہ باوانی اور داود صنعتوں کے ساتھ ساتھ شہر میں تعلیمی ادارے بھی قائم کرتے تھے۔
جب بیکن ہاوس اور سٹی اسکول نہیں بلکہ پیلے اسکولوں میں پڑھنا باعث افتخار سمجھا جاتا تھا اور اے ایم قریشی اور مولوی ریاض الدین اسلامیہ اور جناح کالج جیسے کالجوں میں مستقبل کے معمار تیار کرتے تھے۔
جب زیڈ اے بخاری، ضیا محی الدین اور طلعت حسین آواز کا جادو جگاتے تھے، عرش منیر، صفیہ معینی اور رینو کا دیوی بیگم خورشید مرزا کے روپ میں ہر گھر میں احترام کا مرکز بن جایا کرتی تھیں اور ہمارے لطف اللہ خان چپکے چپکے ان کی آوازیں محفوظ کرتے تھے۔
جب فاطمہ جناح آمریت کو لکارتی تھیں اور بے نظیر بھٹو مارشل لا کی سختیاں سہتی تھیں۔
جب علی مختار رضوی صدر کے قہوہ خانوں میں چائے کی پیالی میں طوفان برپا کرتے تھے اور معراج محمد خان تن تنہا انقلاب کی آمد کی چاپ سنتے تھے۔
جب ادیب الحسن رضوی مشتاق احمد گورمانی کی کار کو آگ لگاتے تھے اور کشور غنی، منور غنی، خوش بخت عالیہ، شفیع نقی جامعی، ظہور الحسن بھوپالی اور دوست محمد فیضی کی کامیابی ہر گھر کے بچوں کی کامیابی سمجھی جاتی تھی۔
آپ میں سے بیشتر نے وہ زمانہ دیکھا ہے اور کچھ نے یقینا'' نہیں۔ جنہوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے ان کے لیے شکور پٹھان کی کتاب میرے شہر والے، ایک شہر آشوب ہے اور جن لوگوں نے وہ زمانہ نہیں دیکھا ان کے لیے ایک جہان حیرت۔ اسے پڑھیے اور سوچیے کہ ہم نے بیسویں صدی سے اکیسویں صدی میں قدم رکھا ہے یا شاید اچانک کئی صدی پیچھے چلے گئے ہیں۔
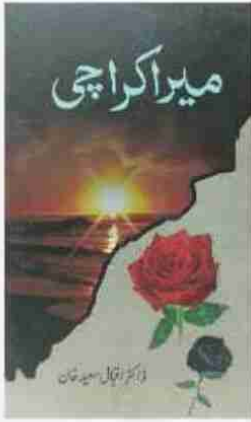
کتاب: میرا کراچی

مصنف: ڈاکٹر اختیار سعید خان

تبصرہ نگار: سیما علی

"میرا کراچی" کینیڈا میں مقیم ہمارے دوست ڈاکٹر اقبال سعید خان کی تصنیف ہے، دیار غیر میں جب وطن کی یاد آتی ہے تو وطن کی باتیں اور رطب_اللسانی بہت مزہ دیتی ہے، مگر دیار غیر میں آدمی سنائے بھی تو کسے؟ ایک ہی طریقہ رہ جاتا ہے کہ قلم سنبھال لے اور لکھنا شروع کر دے، ایک ڈھارس سی بندھ جاتی ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہا ہے لوگ اسے پڑھیں گے گویا لوگ ہمہ تن گوش ہیں سو وہ لکھتا چلا جاتا ہے مگر کیا لکھے اور کیا نہ لکھے

لکھ چکے ہم جا بجا خط گر یہی حالت رہی
ہاتھ میں آیا قلم اور شوق کا دفتر کھلا!

اقبال سعید صاحب نے بھی شوق کا دفتر کھولا ہے اور ان کے ذہن کے نہال خانے میں محفوظ کراچی، جہاں سے نظر آیا ہے وہیں سے لکھنا شروع کر دیا ہے بعد میں تانے بانے سلجھتے چلے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کراچی کی معروف شخصیات کا ذکر دلچسپ معلومات کے ساتھ کیا ہے، قائداعظم، مولانا ایدھی اور حکیم سعید صاحب کا تذکرہ تو معمول کی بات ہے مگر معروف صنعتکار ڈاکٹر اشتیاق بیگ، انکی شخصیت اور خدمات کا تذکرہ بہت ہی شاندار ہے۔

اردو ڈاکٹر صاحب کی مادری زبان ہے، پاکستان میں اردو کی زبوں حالی انہیں گراں گزرتی ہے مگر اسکے مستقبل سے مایوس نہیں، میر منشی بہادر کی "اخلاق ہندی" اور گوجرانوالہ کے منشی محبوب عالم اور انکے اخبار "پیسہ کا ذکر خوب ہے۔

تقریبات کے حوالے سے آج سے 40 سال قبل کے کراچی کی ان تقریبات کا ذکر ہے جنہیں مصنف بھول نہیں پائے، یہ تقریبات برصغیر پاک و ہند میں اسلامی ثقافت اور اسلامی مہینوں کے حوالے سے مروج تھیں جن میں سے اکثر آگہی کے سبب متروک ہو چکی ہیں، بنیادی تہوار عید براءت و محرم کا ذکر خاندانی و تہذیبی روایات کے پس منظر میں کیا گیا ہے، ایک تقریب خالصتاً سماجی ہے یعنی گڈے گڑیا کی شادی، جو انتہائی دلچسپ پیرائے میں مذکور ہے اور اسکا سبب بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ تعلق اور ملاقات کو قائم رکھنے کا ایک ذریعہ اور ایک دوسرے کے گھر جانے کا ایک بہانہ تھا جو معاشرے میں ایثار و الفت کے فروغ کی بنیاد تھا۔

دیکھا ہے مجھے جن نے سو دیوانہ ہے میرا
میں باعث آشفتگی طبع جہاں ہوا۔!!

کتاب میں گلیوں بازاروں کے کردار ہیں جن میں گلی گلی گھوم کر کھیل تماشے دکھا کر روزی کمانے والے، سودا بیچنے والے جن میں منہارن کا ذکر دلچسپ ہے، بچوں کے لئے چیزیں بیچنے والے جن میں چورن چٹنیاں اور آگ چورن سب کچھ ہے، ویڈیو اور نیٹ سے قبل کے مشاغل جن میں صید اور قلمی دوستی کا ذکر ہے مگر فیس بک پر تنقید بیجا ہے۔

چشم ماہ روشن دل ماہ شاد: شادی بیاہ کی تقریبات کا تذکرہ ہجرت کر کے آئی ایک ایسی برادری کا آئینہ بردار ہے جسکی نشست و برخاست میں تہذیبی روایات و شائستگی کی چاشنی ہے، ڈاکٹر صاحب نے ناتہ داری سے لیکر شادی خانہ آبادی تک کا جو نقشہ کھینچا ہے اس نے ہمارے لئے تو یادوں کے دیپ جلا دیئے مگر نئی نسل کے لئے حیرت کا سامان ضرور ہوگا۔ ابتدا میں مکلاوہ کے ذکر کی چاشنی ہے تو انتہا آرسی مصحف کے خوبصورت ذکر سے مزین ہے، ساری تفصیلات ہیں مگر دولہا کے منہ میں پان کا بیڑا ٹھونسنے کا ذکر نہیں کہ یہ لواب تم سے بات نہیں کی جائیگی نہ صرف آج بلکہ تا عمر ثانی، اب انہیں بولنا ہے اور آپکو سننا ہے اور کرارے پان کو کلے میں دبا کر ہاتھ نچا نچا کے ہوئی جاتی انکی گفتگو کا لطف لیتے ہوئے سر ہلائے چلے جانا ہے اور بلآخر سر تسلیم خم کر لینا ہے۔

اگلے دو باب وہی ہیں جو ہونے چاہئیں یعنی گود بھرائی اور بچے کی ولادت، جن میں شکرانہ، ناریل کے چاند، بی بی سیدہ کی نذر، مخانہ، گوند، اچھپانی اور چھلا نہائی جیسی گھریلو اصطلاحات اور گرہستنوں کا ذکر عہد رفتہ کا وہ باب ہے جو نئے زمانے اور مہنگائی کے ہاتھوں بند ہو گیا، گوند کی جگہ اب سپلیمنٹ 32 نے لے لی ہے۔

کتاب میں کراچی اور اسکا قرب جوار مصنف کے ذاتی تجربات کے ساتھ مذکور ہے، مساجد، عمارتیں، ہسپتال، سینما گھر، تعلیمی ادارے، نائٹ کلب و میخانے، یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے انکا قلم انتھک روانی سے دوڑے چلا گیا ہے۔

کراچی میں رہنے والی غیر مسلم کے اقوام کے باب میں بہت ساری اقوام کا ذکر ہے جسکی لپیٹ میں بہت ساری قومیں آگئی ہیں جن میں ہم میمن لوگ بھی شامل ہیں، کراچی کے سات صوفی اور حالات حاضرہ کا موازنہ بھی کتاب میں شامل ہے۔

تعلیمی زندگی کے ذکر میں جامعہ ملیہ جیسی مادر علمی کا سرسری تزکرہ گراں گزرتا ہے، عملی زندگی، کینیڈا منتقلی و کینیڈا کے شب و روز اور کینیڈا کے فرسٹریشن سے آزاد معاشرے کا ذکر دلچسپ ہے۔

بادشاہ شہاب الدین غوری کی 17 ویں پشت کے خاندان سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر اقبال سعید خان نے "ملیر سے مونٹی کارلو" کے سفر کی داستان کے زریعے کتاب کا اختتامیہ ترتیب دیا ہے، جو انکے خاندانی پس منظر اور ذاتی و عملی زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کتاب تحریر کرنے کی سعادت پر مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں۔

کتاب: ایام رقص طاؤس

مصنف: ڈاکٹر اقبال ہاشمانی

تبصرہ نگار: عمران اشرف جونانی

جس طور کسی فن کار پر ایک عروج کا دور آتا ہے اور اس کا ایک کے بعد ایک کام مقبولیت کی سند پاتا چلا جاتا ہے اسی طرح ادباء اور شعراء حضرات پر بھی تسلسل کے ساتھ لکھتے ہوئے ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے۔ ڈاکٹر ہاشمانی کا قلم کے ساتھ رشتہ دو چار برس نہیں کئی دہائیوں پر محیط ہے لیکن خواب نگر کا آخری نوحہ، دھند کی چادر اور اب ایام رقص طاؤس اوپر تلے شائع ہونے والی یہ تین کتابیں ہاشمانی صاحب کا ماسٹر پیس قرار دی جا سکتی ہیں۔ دراصل یہ سلسلہ مضامین ماضی کا نوحہ نہیں اس کی سلونی یاد ہے، وہ تمام قصہ جو ہماری نسل نے اپنے بزرگوں سے متفرق انداز میں سنے ہاشمانی صاحب نے کمال خوبی کے ساتھ انہیں ایک خاص مترنم انداز میں یکجا کر دیا، یہ تین نسلوں کے لیے تحفہ ہے۔ ایک وہ جن کے سامنے یہ سب بیتا، ایک ہم جنہوں نے ماضی قریب کا یہ دل نشیں احوال اپنے بڑوں سے سنا اور اس کے گم گشتہ آثار دیکھتے ہوئے بڑے ہوئے اور اب یہ آنے والی نسل جوان شاء اللہ ایک مرتبہ پھر کراچی کا اخلاقی عروج دیکھے گی، آخر انہیں بھی تو علم ہو کہ چن چی کے شور میں گم لوڈ شیڈنگ کے اندھیرے میں ڈوبے شہر سے قبل کے زمانے میں ہمارا عروس البلاد آخر کیسا تھا۔

کیسی تھیں اس کی وہ سلونی شامیں جن کے بعد آنے والی شب میں اس کی سڑکیں دھلا کرتی تھیں، مزار قائد سے چند فرلانگ پہلے جہاں گرین بس کا اسٹاپ ہے یہ علاقہ پرانی نمائش کیوں کہلاتا تھا، یہ جو آج ہم جیب میں اسکرین لئے گھومتے ہیں اس سے کئی دہائیوں قبل 17 انچ کے ٹیلی ویژن کی آمد کیونکر ہوئی تھی، وہ شب و روز آخر قسم کے تھے جب "صبح" کا مطلب فجر سے متصل اور "رات گئے" کا مطلب خبر نامہ کے فوراً بعد ہوا کرتا تھا، کزنز چھٹیاں گزارنے ایک دوسرے کے گھر جاتے تھے تو انہیں کیسے برداشت کیا جاتا تھا، نانی اماں کا گھر حیدر آباد میں بھی ہو تو جون جولائی میں وہاں جانا کیوں ضروری تھا، ایک دن چھوڑ کر پابندی کے ساتھ لائبریری کا پھیرا لازم تھا تو کیوں؟ ہفتہ کی رات اور اتوار کی شام دوستوں کی منڈلی کن کاموں میں وقت گزارتی تھی، محلہ کے کسی ایک گھر میں فوتگی ہو تو سارا عالم کیوں پریشان محسوس ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر اس دور 3G اور 4G وائی فائی نامی جنات نہیں تھے تو لوگ زندہ کیوں تھے انتقال کیوں نہ فرما گئے۔

ایسے اور ان جیسے بہت سے سوالات کے جواب اور ان سے منسلک ان گنت دل چسپ قصوں سے محظوظ ہونے کے لیے اس رپورتاژ کا مطالعہ از حد ضروری ہے۔ اگر تارڑ کی لاہور آوارگی، اے حمید کی امرتسر کی یادیں اور اقبال اے رحمن کی اس دشت میں اک شہر تھا نشہ ہیں تو ایام رقص طاؤس بھی اس صف میں کسی سے کم نہیں۔

جملہ معترضہ: 236 صفحات پڑھنے کے بعد بھی تشنگی باقی ہے کئی مقامات پر محسوس ہوا کہ یہاں مزید تفصیل دل چسپی سے خالی نہ ہوتی یار زندہ صحبت باقی
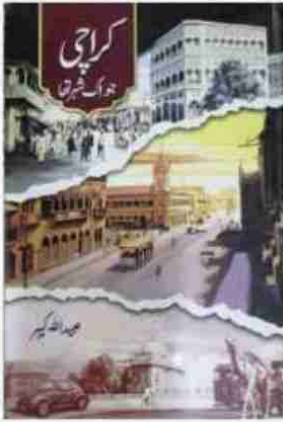
کتاب: کراچی جو ایک شہر تھا

مصنف: عبید اللہ کیہر

کراچی کبھی ایک شہر تھا، اب تو یہ خس و خاشاک ہوا، راکھ ہوا، قصہ ماضی ہوا، مگر مایوسی نہیں، عین ممکن ہے ققنس کے مانند، یہ پھر اپنی راکھ سے جی اٹھے.

اسی کراچی کی ایک کہانی عبید اللہ کیہر نے بیان کی ہے، جو اپنے قابل مطالعہ سفر ناموں کے وسیلے، کتابوں کی اشاعت کے انوکھے طریقوں اور انھیں سمعی و بصری سہولت سے ہم آہنگ کر کے اپنے قارئین پیدا کر چکے ہیں.

یہ کتاب شہر کراچی سے متعلق ان کی یادداشت، مشاہدات، تجربات سے مزین ہے، جس میں اس شہر کے ماضی سے متعلق بھی، تفصیلی نہ سہی، مگر اہم معلومات ملتی ہے.

کتاب کا آغاز افسانوی ہے، جو دلچسپی کو مہمیز کرتا ہے، عبید اللہ کیہر اپنی بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں، زبان کو ابلاغ کے لیے کیسے برتا جائے، انھیں خبر.

اس مختصر سی کتاب میں جہاں ہمیں پرانے کراچی کے وہ رنگ دکھائی دیتے ہیں، موجودہ نسل جن سے لاعلم، وہیں ان کرب ناک مناظر سے بھی ہمارا سامنا ہوتا ہے، جنھوں نے کراچی کو آگ میں جھونک دیا، شہر خموشاں بنا دیا.

بھٹو کی پھانسی، جنرل ضیا الحق کے طیارے کی تباہی، سانحہ علی گڑھ اور پھر بگاڑ کا ایک بے انت سلسلہ، مصنف نے ہر واقعے کو اپنی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کے زاویے سے بیان کیا ہے۔

سن 1972 میں خیر پور میرس سے ہجرت کر کے کراچی آنے والے عبید اللہ کیہر سن 2001 میں، شہر کے حالات اور سفر کی خواہش کے باعث، قسمت کی انگلی تھامے اسلام آباد پہنچ جاتے ہیں، جہاں اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے.

12 مئی کے بعد لسانیت کے جس عفریت نے انگڑائی لی، 27 دسمبر 2007، الیکشن کے بعد ہونے والی خوں ریزی، سانحہ بلدیہ، ان ہولناک واقعات کا کتاب احاطہ نہیں کرتی۔ ممکن ہے، کسی اور کتاب میں مصنف ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں.

ان کا بہ طور مصنف تجربہ، نقطہ نگاہ اور اردو سے عشق متقاضی ہے کہ وہ اس شہر پر مزید لکھیں۔ یوں بھی اس شہر میں ہر قدم پر، ہر موڑ پر، ہر پتھر کے نیچے ایک کہانی ہے. ایک کرب ناک کہانی.

کتاب کا نام بامعنی، ٹائٹل جاذب نظر، یادگار تصاویر بھی کتاب میں شامل، نشر و اشاعت کے تقاضے پورے کیے گئے ہیں. البتہ 152 صفحات کی اس کتاب کی قیمت خاصی زیادہ ہے.

کتاب: دبستانوں کا دبستان، کراچی

مصنف: احمد حسین صدیقی

تبصرہ نگار: ڈاکٹر رئیس صمدانی

تذکرہ نگاری اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے کہ جس کی اہمیت اور افادیت روزِ اول سے ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ضرورت اور افادیت کا احساس بڑھ رہا ہے۔ ادب میں شعراء، ادباء، ادیبوں اور دانشوروں کے تذکروں کو کلیدی اہمیت حاصل ہے۔ یہ تاریخ بھی ہوتے ہیں اور تنقید بھی۔ اگر تذکرہ نگاری نہ ہوتی تو آج ماضی کے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں حال کے بے خبر ہوتا، اسی طرح اگر حال کے شاعروں اور ادیبوں کے تذکرے مرتب نہیں ہوں گے تو مستقبل کے شاعر اور ادیبوں کے آج کے شاعروں و ادیب گم نام رہیں گے۔ ایسے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد بے شمار ہے کہ جن کا کلام طباعت پذیر نہیں ہوا، نہ ہی ان کی کوئی نثری تصنیف شائع ہوئی، یہ تذکرہ ہی ہیں کہ جنہوں نے ایسے گم نام شاعروں اور ادیبوں کو پہچان دی اور انہیں گمنامی سے محفوظ رکھا۔ اردو میں تذکرہ نگاری سے قبل فارسی میں کچھ تذکرے تاریخ میں ملتے ہیں۔ تذکرہ سے مراد دررکسی بھی کتاب یا مضمون میں شعراء و ادباء کا ذکر یا علیحدہ سے ایسی کتاب جس میں شاعروں، ادیبوں اور محققین و مصنفین کے بارے میں معلومات درج ہوں۔ 1490ء میں دولت شاہ کی تصنیف میں شعرا کے بارے میں معلومات درج ملتی ہیں۔ اردو تذکرہ نگاری میں میر تقی میرؔ کا نام سرِ فہرست ہے۔ میرؔ نے اردو شاعروں کا پہلا تذکرہ ''نکات الشعرا'' کے عنوان سے مرتب کیا تھا جو 1751ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تذکرے میں ستر یا بہتر (70-72) شاعروں کا تذکرہ تھا۔ تذکرہ نگاری میں میر تقی میرؔ کے علاوہ جو بڑے نام تاریخ میں ملتے ہیں ان میں شفیق اور نگ آبادی، مصحفیؔ، قایم چاند پوری، نواب مصطفی خان شیفتہ شامل ہیں۔ افضل بیگ قاشقال کا تذکرہ ''تحفہ الشعرا' 1752ء، حمید اورنگ آبادی کا تذکرہ ''گلشن گفتار' 1752ء، فتح علی گردیزی کا تذکرہ 'ریختہ گویان' 1753ء، میر حسن دہلوی کا تذکرہ تذکرہ شعرائے اردو'، غلام ہمدانی مصحفی کا تذکرہ تذکرہ ہندی' 1795ء، مصطفی خان شیفتہ کا مرتب کردہ تذکرہ 'گلشن بے خار' 1835ء، قابل ذکر تذکرے ہیں۔ محمد حسین آزاد کی کتاب ''آب حیات'' بھی تذکرہ نگاری کی ایک کڑی ہے۔ لالہ سری رام کی مرتب کردہ پانچ جلدیں ''خم خانۂ جاوید'' کو مشفق خواجہ نے اپنے وقت کے بہترین تذکرہ کہا ہے۔ امروہہ کے شاعر غلام ہمدانی مصحفیؔ کے مرتب کردہ تین تذکرے ''عقدِ ثریا''، ''تذکرہ ہندی گویا'' اور ''ریاض الفصحا' تذکروں کی فہرست میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی جامعہ موہن لال کھاڑیا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر رئیس احمد نے اپنی تحقیقی کتاب ''اردو تذکرہ نگاری۔1835ء کے بعد'' جو 2011ء میں شائع ہوئی، ریختہ کی ویب سائٹ پر مکمل متن کے ساتھ موجود ہے میں بہت ہی تفصیل سے اس اچھوتے موضوع کو خوبصورت طریقے سے سمیٹا ہے۔

پاکستان میں بھی اس موضوع پر بہت کام ہوا ہے، بے شمار تذکرے شعرا اور ادیبوں نے مرتب کیے۔ میرے دوست پروفیسر سراج الدین قاضی نے حیدر آباد سندھ کے ادیبوں، شاعروں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کا تذکرہ مرتب کیا، محمد خاور نوازش جن کا تعلق ملتان سے ہے نے ''مشاہیر ادب: خار زارِ سیاست میں'' کے عنوان سے ایک تذکرہ مرتب کیا جسے مقتدرہ قومی زبان نے 2012ء میں شائع کیا۔ اسی طرح بے شمار تذکرے وقت کے ساتھ ساتھ مرتب ہوتے رہے اور منظر عام پر آتے رہے۔

دبستانوں کا دبستان، کراچی ادیبوں، محققین، نقادوں، شاعروں، مصوروں، مورخین، سیاحوں، سماجی اور علمائے دین کا ایک مسلسل تذکرہ ہے جس کی چار جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ کراچی سے تعلق رکھنے والے احمد حسین صدیقی پیشہ کے اعتبار سے آرکیٹیکچر ہیں اس تذکرہ کی تدوین گزشتہ 13 سالوں سے کر رہے ہیں۔ اس کی اولین جلد 2003ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ احمد حسین صدیقی صاحب کی خوش نصیبی کے انہیں استاد الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے رہنمائی کرنے والوں کی خصوصی توجہ حاصل ہوئی۔ احمد حسین صدیقی نے تذکرہ کی اولین جلد میں لکھا ''میرے ذوقِ ادب کو مہمیز دینے والے ڈاکٹر فرمان فتح پوری ہی ہیں، ڈاکٹر صاحب کی تحریک پر ہی یہ کام شروع کیا''۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس ادبی کام کی سرپرستی فرمان فتح پوری صاحب نے کی ہو اس کے معیار اور افادیت کی کیا بات ہوگی۔ احمد حسین صدیقی صاحب ادبی ذوق کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ ان میں ادبی ذوق و شوق ہی ہے کہ جس نے اس تذکرہ کو اب تک جاری و ساری رکھا ہوا ہے۔ وہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کے ساتھ ان کے رسالے ''نگارِ پاکستان'' میں بھی مدیر کی حیثیت سے شامل رہے۔ یہ ادبی جریدہ جو نیاز فتح پوری کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی پہچان تھا ڈاکٹر صاحب کی رحلت کے ساتھ ہی خاموش ہو گیا۔ یعنی اس کی اشاعت جاری نہ رہ سکی۔ باوجود اس کے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری مرحوم کے صاحبزادے بھی تعلیمی ادارے سے منسلک ہیں ان کی دو بیٹیاں بھی جامعہ کراچی میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ ڈاکٹر عظمیٰ فرمان تو شعبہ اردو میں ہی استاد ہیں، صدر شعبہ بھی رہیں۔ احمد حسین صدیقی، سید محمد اصغر کاظمی جو رسالے کے مدیران میں شامل تھے سب کے سب ڈاکٹر فرفان فتح پوری کے جاری کردہ جریدے کو زندہ نہ رکھ سکے۔ اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ یہ بھی سنا گیا تھا کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے انتقال پر شیخ الجامعہ نے اس ادبی جریدے کی اشاعت کے حوالے سے کہا تھا کہ جامعہ کراچی اس رسالے کو 'گود' لے لی گی یا لے لیا ہے'۔ اس کے باوجود یہ پرچہ ڈاکٹر فرمان مرحوم کی طرح خاموش ہو گیا ہے۔

احمد حسین صدیقی کا تعلق ہندوستان کے شہر امروہہ سے ہے جہاں پر وہ 1937 میں پیدا ہوئے۔ بلدیہ اعظمیٰ کراچی سے ملازمت کا آغاز کیا۔ کراچی بلڈنگ اتھارٹی کے چیف کنٹرولر ہوئے، 1994 سے 1997ء تک کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے ڈائریکٹر جنرل رہے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ادبی و علمی ذوق ہونے کے باعث ادب کے مختلف موضوعات پر لکھتے رہے۔ اپنی خود نوشت ''سیاحتِ ماضی'' کے عنوان سے لکھی، امروہہ کی تاریخ 'کشورِ اولیاء' کے عنوان سے لکھی۔ کراچی کی تاریخ 'گوہر بحیرۂ عرب' کے نام سے مرتب کی۔ احمد حسین صدیقی کا تصنیفی سفر تذکرہ کے حوالہ سے 2003 سے شروع ہوا۔ ''دبستانوں کا دبستان'' (کراچی) کی اولین جلد اسی سال منظر

عام پر آئی۔ اس جلد میں 194 ادیبوں، شاعروں، ممتاز ادبی شخصیات کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی ادبی خدمات کا تذکرہ ہے۔ پہلی جلد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس جلد کی کمپوزنگ انہوں نے کمپیوٹر پر از خود کی۔ یہ ایک مشکل کام ہوتا ہے لیکن شوق کے آگے کوئی بھی کام مشکل نہیں۔ مجھے اس بات کا بخوبی اندازہ ہے اور احساس ہے کیوں کہ میں بھی گزشتہ کئی برس سے اپنے مضامین اور کتابیں از خود کمپیوٹر پر کمپوز کرتا ہوں۔ اس میں سہولت ہی سہولت نظر آتی ہے۔ کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑتا اور کام جلد ہو جاتا ہے۔

'دبستانوں کا دبستان' کراچی کی پہلی جلد کی اشاعت کے دو سال بعد ہی دوسری جلد 2005ء میں منظر عام پر آگئی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ احمد حسین صدیقی کے تذکرہ کو پذیرائی حاصل ہوئی۔ اس جلد میں پہلی جلد کے مقابلے میں زیادہ ادبی شخصیات کے بارے میں معلومات درج ہیں۔ یہ جلد 439 ادیبوں، شاعروں، محققین کے بارے میں مختصر اطلاعات فراہم کرتی ہے۔ اردو کے معروف شاعر راغبؔ مراد آبادی نے اس جلد کی اشاعت پر اپنے مخصوص شاعرانہ انداز سے کتاب اور صاحب کتاب کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا۔

تذکرہ اہل علم و ادب کا اب تک ایسا کوئی نہیں
جس میں ہو شامل شاعر، ناشر، صحب تصنیف اور فنکار
شاعر ناثر عالم فاضل بزم کی زینت ہیں راغبؔ
یہ ہے دبستانوں کا دبستان بزم آرئی کا شہکار

معروف ادیب مشفق خواجہ مرحوم نے دبستانوں کا دبستان، کراچی کی دوسری جلد پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ 'اردو کا سب سے بڑا تذکرہ "خم خانۂ جاوید" جس کی پانچ جلدیں گزشتہ صدی کی پہلی چار دہائیوں کے درمیان شائع ہوئی بلاشبہ نامکمل رہ جانے کے باوجود زبردست اہمت کی حامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تذکرے کے مرتب لالہ سری رام کو متعدد اہل علم کی معانت حاصل تھی۔ لیکن احمد حسین صدیقی کا کام بھی جاری ہے جو انہوں نے تن تنہا انجام دیا اور یہ بات بلاخوف و تردید کہی جاسکتی ہے کہ کسی اہم شہر کے حوالے اتنے بڑے پیمانے پر کوئی دوسرا کام اب تک نہیں ہوا'۔ مشفق خواجہ مرحوم کا کہنا تھا کہ دبستانوں کا دبستان، کراچی ایک ایسی تصنیف ہے جو اپنے مؤلف کو زندہ رکھے گی۔

2010ء میں 'دبستانوں کا دبستان'، کراچی کی تیسری جلد منظر عام پر آئی۔ یہ جلد سابقہ دونوں جلدوں کا تسلسل تھا۔ اس کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ گو اس کی اشاعت میں پانچ سال لگ گئے۔ مؤلف اپنے تذکرہ کو بہتر سے بہتر کی جانب لے جانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس جلد میں 181 ادیب، محقق، نقاد، مصور اور مورخ شامل ہو سکے۔ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس جلد پر اپنی رائے جسے پیش لفظ ہی کہا جاسکتا ہے لکھا انہوں نے اپنی بات کی ابتدا غالبؔ کے اس شعر سے کی۔

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

ڈاکٹر فرمان نے لکھا ''احمد حسین صدیقی کی ''دبستانوں کا دبستان''کراچی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اردو شاعر و ادب کی تقریباً ستر اسی سالہ تاریخ کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔اس کا کینوس صرف تنقیدی شذرات یا مختصر مبصرانہ جائزوں تک محدود نہیں بلکہ اس میں مذکور جملہ شاعروں اور ادیبوں کے اصل نام،نسبت،تاریخ ولادت وجائے پیدائش،ہجرت و مسافرت اور خانوادوں درسگاہ کی تفصیل رومانی، تعلیمی نسبتوں کی توضیحات کو ضروری سوانحی کوائف وعصری میلانات کی نشاندھی کے ساتھ اس طرح سمیٹ لیا گیا ہے کہ تذکرہ نگاری و تاریخ نویسی دونوں کا حق ادا ہو گیا ہے۔دبستانوں کا دبستانکا حیرت انگیز وصف یہ ہے کہ یہ آغاز سے لے کر انجام تک مصور ہے یعنی اس میں جن ادیبوں اور شاعروں تذکرہ آیا ہے ان کی تصویریں بھی دی ہوئی ہیں۔اس طرح کا کوئی دوسرا تذکرہ اردو اور فارسی ادب کی تاریخ میں نظر نہیں آتا اور اس لیے میں نے اسے ''مثالِ بے مثال''کا نام دیا ہے''۔انجمن ترقی اردو دہلی کے ڈاکٹر خلیق انجم نے اس تذکرہ پر اپنے خیالات کا اظہار 'حرفِ آغاز' کے عنوان سے کرتے ہوئے لکھا کہ ''احمد حسین صدیقی صاحب نے بڑی محبت، لگن اور جستجو سے یہ تذکرہ لکھا یہ ہر شاعر کا ذکر قدیم تذکروں کی طرح دو تین سطروں میں نہیں بلکہ تذکرے میں شامل شاعروں اور ادیبوں کے اتنے حالات درج کر دیے ہیں کہ مستقبل کا مورخ اس تاریخ سے بھرپور مواد حاصل کر سکتا ہے۔یہ تذکرہ تحقیق اور تنقید کا بہت اچھا نمونہ ہے''۔

چار سال کے وقفے کے بعد 'دبستانوں کا دبستان' (کراچی) کی پانچویں جلد 2014ء میں منظر عام پر آئی۔دبستان کی یہ جلد 355 شاعروں،ادیبوں،دانشوروں،مصوروں، محققین کے تذکرے پر مشتمل ہے۔راقم الحروف کا بھی یہ سعادت حاصل ہو سکی کہ دبستان کی اس جلد کے صفحہ نمبر 132-133 پر میرا تذکرہ بھی شامل ہو سکا۔جس کے لیے میں مؤلف کے علاوہ مؤلف کے معاون سید محمد اصغر کاظمی کا بھی ممنون ہوں کے انہوں نے ہی میرے بارے میں دو صفحات تحریر کیے۔اس سے قبل وہ مجھ پر ایک مضمون بعنوان ''اردو کے خوش فکر ادیب و محقق'' بھی لکھ چکے ہیں جو اردو کی معروف ویب سائٹ 'ہماری ویب' پر آن لائن موجود ہے۔

فراست رضوی نے۔'دبستانوں کا دبستان' اور اس کے مؤلف کو منظوم خراج عقیدت اس طرح پیش کیا۔

اس شہر کی یادوں کو کیا رخشندہ
ہر لفظ ہے موتی کی طرح تابندہ
اے احمد حسین ادب کے محسن
تجھ سے ہے دبستانِ کراچی زندہ

دہلی سے تعلق رکھنے والے شاعر احمد علی برقیؔ اعظمی نے 'دبستانوں کے دبستان' کو منظوم خراج تحسین ان اشعار میں پیش کیا۔

ہے 'دبستانوں کا دبستان' اک کارِ عظیم
ہو دنیائے ادب میں برقیؔ سب کا یہ منظورِ نظر

یہ علمی شہکار نہ ہو بس کراچی تک محدود
جاری رکھیں اس تاریخی کام کو سب اربابِ نظر

'دبستانوں کا دبستان' (کراچی) اردو زبان کے تذکروں میں ایک قیمتی اور منفرد اضافہ ہے۔ جس انداز سے اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے اگر یہ اسی طرح جاری و ساری رہا تو اب تک مرتب ہونے والے تمام تذکروں کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ یہ بلاشبہ ایک محبت طلب کام ہے ساتھ ہی تحقیق و جستجو کا طالب بھی۔ احمد حسین صدیقی کو اللہ ہمت اور صحت دے کہ وہ اس اہم ادبی کام کو جاری و ساری رکھ سکیں۔

کتاب خود شناسی کی تقریب رونمائی

سید علی عمران کی کتاب "خود شناسی" کی تقریب رونمائی جعفر طیار لائبریری کے محمد علی جناح ہال میں منعقد ہوئی. اس تقریب میں نظامت کے فرائض جناب سید محمد حیدر صاحب نے انجام دیئے. پروگرام کا باقاعدہ آغاز جناب پروفیسر عدیل صاحب نے قرآن مجید کی تلاوت سے کیا جبکہ نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پروفیسر فرمان صاحب نے پڑھی.

اس تقریب میں ماہر نفسیات جناب پروفیسر امتیاز علی منگی، ممتاز ادیب اور دانشور پروفیسر محمد علی پٹھان، معروف شاعر اور ماہر تعلیم پروفیسر اقبال حماد صاحب، معروف ماہر تعلیم اور دانشور جناب پروفیسر ڈاکٹر ابو بکر بلوچ اور نامور شاعر اور ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر سلمان ثروت صاحب نے کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا. اس پروگرام میں بڑی تعداد میں ماہرین تعلیم نے خصوصی شرکت کی جن میں پروفیسر کاظم نقوی، پروفیسر قاسم قنمبر، پروفیسر رفیق انصاری، پروفیسر اقبال نقوی، پروفیسر احسان اللہ، پروفیسر فاروقی، پروفیسر آصف نقوی، پروفیسر سکندر رند، پروفیسر اظہر زیدی، پروفیسر ریاض مہدی، پروفیسر بابر عسکری، پروفیسر ڈاکٹر نوازش، پروفیسر عامر جیمز، پروفیسر ڈاکٹر فیصل افضال، پروفیسر عباس علی شاہ، پروفیسر علی نواز جوکھیو، پروفیسر گل حسن، پروفیسر دانش ظہیر پروفیسر رحیم خان، پروفیسر محمد ظفر، پروفیسر عبدالجبار، پروفیسر شارق کمال، پروفیسر سبطین، پروفیسر ریاض بلوچ، پروفیسر ناصر، پروفیسر شایان، پروفیسر سلمان نقوی اور پروفیسر سعد محمود وغیرہ شامل تھے.

کراچی میں اردو غزل اور نظم
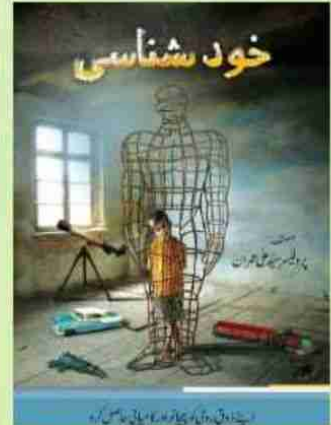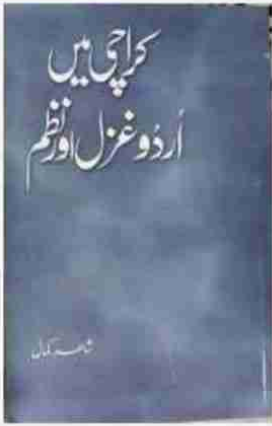
کتاب: کراچی میں اردو غزل اور نظم
مصنف: پروفیسر شاہد کمال

پروفیسر شاہد کمال طویل عرصے سے اردو ادب کی تدریس، تحقیق، تنقید اور تخلیق سے جُڑے ہوئے ہیں، اس کا ثبوت ان کی کتب اور مضامین ہیں جو طباعت کے مرحلے سے گزر کر قارئین کی داد وصول کر چکے ہیں۔ ان کا شمار ان اشخاص کی فہرست میں ہوتا ہے جو صاحبِ مطالعہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی رائے بھی رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین اور کتب ادبی ناقدین کے چبائے ہوئے نوالے نہیں بلکہ افکارِ تازہ ہیں۔ ان میں اتنی اخلاقی جرات موجود ہے کہ وہ بے لاگ اور دوٹوک رائے دینے میں باک محسوس نہیں کرتے، اسی لیے ان کی تحریروں میں خوشامدانہ اور بے جا تعریفی انداز نظر نہیں آتا۔ ''کراچی میں اردو غزل اور نظم'' بھی ان کی ایک ایسی ہی کتاب ہے جو انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی سے ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے کراچی میں شاعری کی تاریخ کو ناقدانہ انداز میں قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔

''کراچی میں اردو غزل اور نظم''، تین ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل ''تاریخی وادبی پس منظر'' کے عنوان سے کتاب میں شامل ہے۔ اس باب میں کراچی میں پروان چڑھنے والے شاعری کے اسالیب، شہر کی سماجی صورتِ حال، تاریخی پس منظر اور تقسیمِ ہند کے بعد کراچی کی معاشرتی صورتِ حال کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ بقول مصنف کراچی کی شعری روایت میں تین اسالیب نمایاں ہیں، روایتی اسلوب، نیم روایتی اسلوب اور نثری نظم کی روایت، سوائے سارا شگفتہ، افتخار جالب اور ذیشان ساحل کی نثری نظموں کے، مصنف نثری نظم کی صورت حال سے غیر مطمئن ہیں جب کہ غزل اور نظم کی ہئیت میں ہونے والی شاعری ان کے لیے کسی حد تک اطمینان بخش ہے۔ تقسیم ہند سے قبل کراچی شہر کی سماجی بنت اور انسانی رویوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے جس کے تحت کراچی کا معاشرہ تین طبقات میں منقسم ہے۔''۱۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہجرت کر کے آنے والے لوگ، ۲۔ وہ لوگ جو اندرون سندھ، پنجاب یا سرحد، بلوچستان سے یہاں آکر آباد ہوئے۔ ۳۔ وہ لوگ جو یہاں کے مقامی باشندے تھے اور جن کی تعداد بہت معمولی تھی۔'' لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اس صورتِ حال میں یکسر تبدیلی رونما ہوئی اور ہندوستان کے مہاجرین کی کثیر تعداد کراچی میں رہائش پذیر ہوئی۔ نئے مہاجرین متنوع تہذیبوں سے علاقہ رکھتے تھے، جن میں دلی، لکھنو اور علی گڑھ کے علاقے نمایاں ہیں۔ مختلف جغرافیے اور متنوع تہذیبوں سے متعلقہ آبادی اپنے اپنے تہذیبی ورثے کی حفاظت میں جٹی رہی جس کے باعث کراچی کی مشترکہ تہذیب پروان نہ چڑھ سکی جس کا نقصان یہ ہوا ہے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود کراچی کی تخلیقی سرگرمیوں میں کوئی مجموعی تاثر نہیں ابھرا جو اس شہر کی خاص پہچان بن سکتا۔ کتاب کے

پہلے باب میں زبان کی تاریخی صورتِ حال کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔اس ضمن میں محمد بن قاسم کی آمد، سندھ سے دیگر اقوام کے تجارتی تعلقات، مغلوں کے دورِ حکومت میں فارسی اور عربی زبانوں کے سرکاری زبان کا درجہ اختیار کرنے پر سندھ کی زبان پر اثرات، سندھی کے رسم الخط کا عربی رسم الخط سے متاثر ہونا اور کراچی کا ساحلی بندرگاہ ہونا جیسے عوامل کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ مزید براں کراچی اور اس کے ملحقہ علاقوں کے شعرا کو قدیم اردو سے متاثر دکھایا گیا ہے اور اس حوالے سے اشعار کی مثالیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ پرانے دور کے نمائندہ شعرا میں میر صابر محمود، محمد عظیم الدین عظیم، حاجی محمد فضل ماتم، مرزا مراد علی بیگ بڑھل، میر عبدالحسین سانگی اور مرزا قلیچ بیگ کے نام شامل ہیں۔ یہ شعراادب کے دہلوی دبستان سے متاثر ہیں۔

دوسرا باب ''روایت سے تصوف تک'' کے زیر عنوان کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ اس باب میں اردو شاعری کے روایت سے تصوف تک کے سفر کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں تقسیمِ ہندوستان کے بعد کراچی میں جن شعرا نے اردو غزل اور نظم کو فروغ دیا ان میں عارف جلالی، قمر جلالوی اور بہزاد لکھنوی کے نام نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری میں کلاسیکی روایت کا رنگ جدت کی نسبت زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ انھوں نے معاشرتی مسائل کو مخصوص استعارات اور تشبیہات کے پیرائے میں نظم کیا ہے۔ تقسیمِ ہند کے کچھ عرصے بعد تخلیق کاروں کی زندگی سے آزادی کی سرشاری کا عنصر کم ہونے لگا اور زندگی کے جملہ شعبہ جات میں شناخت کا احساس شدت اختیار کر گیا۔ خواب وخیال کی دنیا کو خیر باد کہ کر حقیقت سے تعلق استوار کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس احساس کے علم بردار محشر بدایونی، رئیس امروہی اور تابش دہلوی ہیں۔ یہ وہ شعرا ہیں جن کو روایتی اور نیم روایتی اسالیب کا نمائندہ شاعر کہا جاسکتا ہے۔ ان کے اشعار ماضی کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ مستقبل کے آئینہ دار بھی ہیں۔ محشر بدایونی نے اپنے مخصوص استعاروں میں مذکورہ صورتِ حال کو پیش کیا ہے مثلاً ان کے ہاں ''دیے'' کا استعارہ بار بار استعمال ہوا ہے جو مختلف جگہوں پر مختلف معانی کا حامل ہے۔ رئیس امروہی کی شاعری میں روایتی مضامین کے ہمراہ فلسفیانہ مسائل اور تصوف سے متعلق مضامین کثرت سے موجود ہیں وہ خدا اور بندے کے تعلق، عظمتِ آدم اور کائنات کی دیگر حقیقتوں سے پردہ کشائی کرتے ہیں۔ تابش دہلوی نے اپنی شاعری میں میر کے سوز و گداز، سودا کی گھن گرج اور درد کے عارفانہ مضامین کو مہارت سے پیش کیا ہے۔ نظم اور غزل کے علاوہ انھوں نے گیت، سلام، منقبت اور بھجن بھی تحریر کیے ہیں۔ کراچی کی اس شعری روایت کو شکیل احمد ضیا نے برقرار رکھا۔ یوں تو ان کا شعری سفر آزادی سے پہلے ہی شروع ہو گیا تھا لیکن ان کی بطور شاعر شناخت تقسیم کے بعد ابھری۔ ان کی غزل میں کلاسیکیت بھی ہے اور جدید فکری احساس بھی ہے۔ نیم سیاسی اور نیم رومانوی رجحانات کے دور میں جس شاعر نے سیاست اور رومانویت کو الگ الگ دائروں میں قید کر کے دیکھا وہ سراج الدین ظفر تھا، ان کی شاعری کے جہاں مضامین میں انفرادیت تھی وہیں وہ منفرد لفظیات کے استعمال میں بھی ماہر ہیں۔ سراج الدین ظفر کی اس روایت کو صبا اکبر آبادی نے برقرار رکھا انھوں نے غزل کہنے کے ساتھ ساتھ مرثیہ ایسی صنف میں بھی خامہ فرسائی کی جہاں مشاقی کے باوجود تخلیقیت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں قنوطیت نہیں بلکہ رجائیت کا عنصر نمایاں ہے، اسی لیے وہ اپنے عہد کے جبری نظام کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتے ہیں۔ کراچی کی تخلیقی فضا میں جون ایلیا

کا نام اور کام اسقدر ہے کہ اس سے صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔اس کی شاعری نے قرطاسِ وقت پر اتنے گہرے اثرات مرتسم کیے ہیں کہ دیگر جملہ مباحث اس کے سامنے ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔جون ایلیا نے اس دور میں اپنی شناخت کو مستحکم کیا جب غزل روایتی انداز سے اپنا دامن بچاتی ہوئی کمیونزم اور سیکولرزم کے تجربات سے اپنے مزاج کو مستحکم کر چکی تھی،غزل میں عصرِ حاضر کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کا بیان زور و شور سے جاری تھا۔انھوں نے اپنی شاعری میں جدت کے ساتھ ساتھ کلاسیکیت سے بھی رابطہ استوار رکھا،ان کی شاعری میں زبان و بیان کے ہمراہ محاورہ بندی تک جملہ اوصاف کلاسیکی شاعری کی غمازی کرتے ہیں۔ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ زندگی کے حقائق کو وجود کی کسک سے ہم آہنگ کر کے بیان کرتے کرتے قاری کو حیرت زدہ کر دیتے ہیں۔میر کے اسلوب کا حامل شاعر رسا چغتائی بھی کراچی کے تخلیقی منظر نامے میں اہم نام ہے۔چھوٹی سے چھوٹی بحر میں وسیع ترکیفیات کو بیان کرنے کی مثال کسی ہی اور شاعر کے ہاں ملتی ہو۔لفظوں کو تخلیقی سطح پر ایسے استعمال کرتے ہیں کہ ان کی معنوی وسعت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ان کی شاعری میں معاشرتی شکست وریخت عصری حسیت سے مملو ہو کر احساسات کو انگیخت کرتی ہے یہی چیز ان کی شاعری میں پراسراریت اور ڈرامائیت کا باعث بھی بنی ہے۔رسا چغتائی نے میر کے اسلوب کو اپنایا تو عزیز حامد مدنی کے ہاں غالب کا رنگ غالب رہا۔ان کی شاعری میں خیالات اس قدر مربوط ہوتے ہیں کہ ان غزل کے بارے میں کلیم الدین احمد کی رائے کہ غزل "نیم وحشیانہ" صنفِ سخن ہے، جھوٹ معلوم ہوتی ہے۔ان کی شاعری کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ ان کے شعری موضوعات کسی بھی طرح لفظیات کے زیرِ اثر نہیں آتے۔غزل کے لہجے اور غزل کی لفظیات میں نظم کہنے کا رواج جو اردو شاعری میں موجود رہا ہے اس روایت کو عزیز حامد مدنی نے برقرار رکھا ہے۔

کی شاعری اپنے اندر زندگی کی حقیقتوں سے ایک رشتہ رکھتی ہے جس نے ان کی شاعری کو زندگی کی تصویر بنا دیا ہے اس حوالے سے "سمندر"، "ترانہ زندگی"، "محبت"، "بھوکی دنیا کی آواز"، "دیواریں" اور "کتابیں" جیسی نظموں کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے جس میں زندگی کے مسائل کو خوب صورتی سے پیش کیا گیا ہے۔کراچی میں نظم نگاری کے حوالے سے ایک اور اہم نام قمر جمیل کا ہے، جنھوں نے منفرد تشبیہات واستعارات سے اردو شاعری کا دامن وسیع کیا۔پھول، آئینہ اور خواب کے استعارات ان کی شاعری میں جابجا ملتے ہیں ۔مصنف نے ان کی شاعری کو خوابوں کی شاعری قرار دیا ہے جو خواب دکھانے کے بجائے اسے لفظوں میں ڈھال کر قاری کے خوابوں تک منتقل کر دیتے ہیں۔فہمیدہ ریاض کی شعری کائنات نے عورت کی تصویر کشی کے لیے ایسے رنگ استعمال کیے ہیں جن کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے انھیں پہلی کتاب "پتھر کی زبان" سے ہی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا اور یہ سلسلہ ان کی بعد میں آنے والی کتب تک جاری رہتا ہے۔انور خالد کو تجریدی نظموں کا شاعر کہا جاتا ہے ان کی نظموں سے حظ کشید کرنے کے لیے قاری کو درونِ ذات صلاحیتوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔سلیم احمد کی شاعری معاشرتی مایوسیوں اور احساسِ محرومی کی آئینہ دار ہے۔سحر انصاری نے کلاسیکی روایت سے جڑے ہونے کے باوجود عصرِ حاضر سے بھی خود کو ہم آہنگ رکھا ہے جو انھیں دیگر شعرا سے ممیز کرتا ہے۔زبان و بیان کی پختگی، اسلوب کی تازہ کاری اور تخیل کی کارفرمائی ان کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔افتخار عارف نے عصرِ حاضر کی سچائیوں کو بے

ساختگی کے ساتھ اپنے منفرد استعاراتی و تلمیحاتی نظام کے ذریعے قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ سہل ممتنع کی جس روایت کا چلن میر سے شروع ہوا تھا اسے انور شعور نے آگے بڑھایا۔ ان کی شاعری کی بنیاد زندگی کی آفاقی اقدار اور حقائق پر رکھی گئی ہے جنھیں وہ سادہ اور عام فہم انداز میں قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ خواتین شاعرات میں پروین شاکر کو شہرت اور قبولیت میسر آئی وہ کم کم شعرا کو نصیب ہوتی ہے۔ ان کی غزلیں روایتی انداز کی حامل ہونے کے ساتھ گیتوں کے آہنگ کو اپناتی ہیں اسی لیے ان میں غنائیت کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے۔ انھوں نے خوشبو کے استعارے کو بار بار اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے کہ یہ استعارہ ان کی تخلیقات میں پیوست ہو کر رہ گیا ہے۔ کراچی کے شعری منظر نامے میں ثروت حسین نے کم وقت میں ادبی دنیا میں اپنے نقوش ثبت کیے۔ ڈرامائیت، مجذوبیت اور بے یقینی ان کی شاعری کی خاص پہچان بنتے ہیں۔ صابر ظفر، سلیم کوثر اور جمال احسانی کا خمیر تو پنجاب کی مٹی سے اٹھا لیکن انھوں نے کراچی شہر کی مٹی کا قرض دلجمعی اور مہارت سے اتارا کہ وہ قابل داد ٹھہرے۔ کراچی کی شعری فضا میں جاوید صبا نے ہجر و وصال کے متنوع زاویوں سے شعری کائنات تخلیق کی ہے جن کا ذکر کتاب کے تیسرے باب کے آخر میں کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں ''متعلقات'' کے عنوان کے تحت شعرا کے نام اور ان کے شعری مجموعے درج کیے گئے ہیں، مزید براں اشاریہ بھی کتاب کا حصہ بنا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو کتاب میں محض شعرا کے کوائف اکٹھے نہیں کیے گئے بلکہ شعرا کے کلام کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو پروفیسر شاہد کمال کی تنقیدی بصیرت پر دال ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے مذکورہ شعرا کی شاعری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور اس کے بعد ان پر رائے قائم کی ہے، بصورتِ دیگر سطحی رائے تو دی جا سکتی ہے لیکن شاعری کے باطن میں اتر کر اس کی بصیرت سے قاری کو روشناس نہیں کرایا جا سکتا۔ یہاں شاہد کمال بصیرت افروز نقاد ہی نہیں بلکہ محنتی محقق کے طور پر بھی سامنے آئے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت نے کراچی کے ادبی منظر نامے کا تعارف ان قارئین تک پہونچا دیا ہے جو کراچی سے دور ہیں لیکن کراچی کے تخلیقی منظر نامے سے باخبر رہنا چاہتے ہیں۔
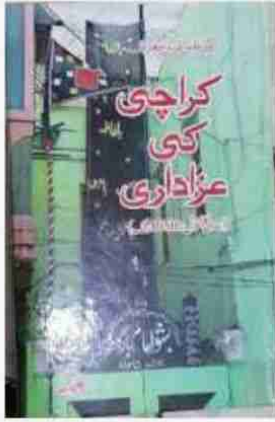
کراچی کی عزاداری
مصنف: ڈاکٹر عقیل عباس
تبصرہ نگار اقبال اے رحمٰن

ڈاکٹر عقیل عباس جعفری ممتاز دانشور ہیں، یوں تو علم وادب کا کوئی شعبہ انکی دسترس سے باہر نہیں مگر موضوع خاص تحقیق اور اس ضمن میں انکی ضخیم تصنیف ''پاکستان کرونیکل'' اسکی مثال خاص ہے۔
سنہ 2016 تا 2019 اردو لغت بورڈ کراچی سے وابستگی کے دوران 22 جلدوں پر مشتمل اردو لغت کے ڈیجیٹل ورژن کی تیاری انکا کارنامہ بلکہ احسان عظیم ہے۔
عقیل بھائی علم وادب کی دنیا میں جتنا بڑا نام ہیں اسی قدر انکساری اور درد مندی کا پیکر ہے، نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی انکا وطیرہ خاص ہے اسی لئے ہم جیسے نو آموز کو بھی انکا نیاز حاصل رہتا ہے، ''کراچی کی عزاداری'' انکی تازہ ترین تصنیف ہے جو آپ نے بڑی محبت سے ہمیں دست خاص سے عنایت کی۔ خوشی یہ ہوئی کہ اس کتاب میں کچھ حوالہ جات ہماری کتاب ''اس دشت میں اک شہر تھا'' کے بھی ہیں جو ہمارے لئے واقعتاً فخر کی بات ہے۔
کتاب کیا ہے، انکے نام کی مناسبت سے تحقیق و معلومات کا دریا ہے۔ اس کتاب کا آغاز سندھ کی تاریخ سے ہوتا ہے جہاں المیہ کربلا سنہ 61 ہجری مطابق 680 عیسوی کے فوراً بعد ہی سے عزاداری کا آغاز ہو گیا تھا، جس طرح عزاداری کے لئے مخصوص احاطے کو امام باڑہ کا نام دیا گیا اسی طرح سندھ میں یہ احاطہ ''پڑ'' کہلایا، یعنی وہ احاطہ جہاں علم نصب ہو، اسی لئے سندھ میں لوگ پڑ کے معنی علم کے بھی لیتے ہیں۔
کتاب کے مطابق ''جس دن حضرت امام حسینؑ اور آپ کے اہل بیت اطہار اور اعوان و انصار کی شہادت کی خبر سندھ میں پہنچی اسی وقت سے اہل سندھ مظلوم کربلا کے غم میں شریک ہیں۔ اسکی ایک وجہ وہ رشتے تھے آل رسول ﷺ کے سندھ میں بسنے والے خاندانوں سے تھے۔ سندھ کی اہل بیت سے الفت کی بابت عقیل بھائی رقم طراز ہیں ''امام زین العابدین کی والدہ محترمہ شہر بانو کا انتقال سنہ 34ھ میں انکی ولادت کے وقت ہو گیا تھا جسکے بعد آپ کی دیکھ بھال کی زمہ داری نبھانے والی سلافہ نامی خاتون سندھی تھیں۔ امام زین العابدین انکی بہت عزت فرماتے، سلافہ کربلا میں بھی موجود تھیں۔
کتاب میں خوجہ شیعہ اثنا عشری جماعت کی مکمل تاریخ اور راہ حسینیت میں انکی قربانیاں، کراچی میں تقسیم سے قبل کے امام باڑے اور محدود پیمانے پر عزاداری اور تقسیم کے بعد عزاداری کا فروغ، یہ سب کچھ تاریخی حوالوں کے ساتھ دلچسپی کا حامل ہے۔ ''کراچی میں عزاداری کے فروغ میں ذاکرین کا حصہ'' اس عنوان کے تحت ذاکرین کے مختصر تعارف کے ساتھ علامہ رشید ترابی کا تفصیلی ذکر بھی بہت لائق مطالعہ ہے۔

کراچی میں مجالس تحت اللفظ قیام پاکستان تک عنقا تھیں، قیام پاکستان کے تقریباً ۴ماہ بعد مشہور مرثیہ گو شاعر سید آل رضا نے کراچی کا محرم کس طرح برتا اسکا اظہار انکی اس رباعی میں ہے۔

تسکین دہ اندوہ نہاں مجلس ہے
غم اپنا بہلتا ہے جہاں مجلس ہے
اللہ رے غریب الوطنی کا عالم
ہم پوچھتے پھرتے ہیں کہاں مجلس ہے

سید آل رضا ہی کراچی کے پہلے تحت اللفظ مرثیہ نگار ہیں اس معلومات کے ساتھ کراچی میں تحت اللفظ مرثیہ کی پوری تاریخ ہے ساتھ ہی زیڈ اے بخاری صاحب کا ذکر اور اس زمانے کی زبان و بیاں اور ادب واحترام کے ضمن میں ذمہ زاری اور وضعداری کے اہتمام کا بیان بہت خوب ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آباد اور وسعت پزیر کراچی کی ہر بستی کی عزاداری کا تفصیلی ذکر نے کتاب کو تاریخ بنادیا ہے۔

انجمن عابدیہ کاظمیہ کے صاحب بیاض استاد صادق حسین لکھنوی عرف چھجن صاحب کا ذکر بھی کتاب کی جان ہے، اسکے ساتھ ہی سید محمد ہادی صاحب کا سنہ 1949 کا سفر جو ضمیمہ کی صورت کتاب کا حصہ ہے، اس برس کے محرم میں کراچی کی روایتوں کا بیان بہت دلچسپ ہے، انکے اس مختصر سفر نامے کا ایک دلچسپ اقتباس ملاحظہ ہو۔
''ایک نازک سا علم اور اس پر حریر کا ٹپکا۔ اگر انجمن امامیہ کراچی قوسین میں لکھنؤ نہ لکھواتی تو بہتر تھا کیونکہ علم کی نفاست و نزاکت صاحبان علم کا پتہ خود بتارہی تھی''۔
کتاب ورثہ پبلیکیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے اور اسکے تقسیم کار فضلی بک سپر مارکیٹ اردو بازار ہیں۔
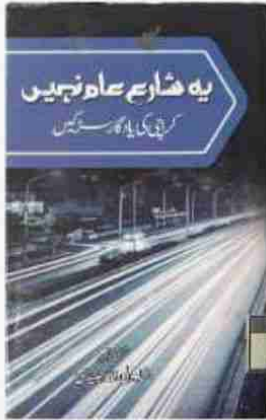
کتاب: یہ شارع عام نہیں
مصنف: شاہ ولی اللہ جنیدی
تبصرہ نگار: اقبال اے رحمن

ے "کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
...ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
...دلّی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
...رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
...جس کو فلک نے لوٹ کے برباد کر دیا
...ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے"

۔اُردو شاعری کے سرتاج، میر تقی میرؔ نے تو دلّی کے بار بار اُجڑنے اور تاراج ہونے کا شکوہ کرتے ہوئے اُس کی بربادی کا الزام فلک کو دیا تھا، مگر اہلِ کراچی، ملک کے اوّلین دار الحکومت کے اُجڑنے اور برباد ہونے کا شکوہ فلک سے توہر گز نہیں کر سکتے۔ یہ بحث اب کارِ فضول کے زُمرے میں آئے گی کہ اتنے خُوب صُورت شہر کی بربادی میں کس کس کا حصّہ ہے یا یہ "حصّہ بقدرِ جثّہ" کے مصداق ہے۔ اب اصل کام یہ ہے کہ شہر کو اُس کا سابقہ رنگ ورُوپ کس طرح لوٹایا جائے، جو اس آپا دھاپی کے وقت میں بظاہر تو ممکن نظر نہیں آتا، مگر بنیادی بات یہ ہے کہ اس کے لیے خلوص سے کوشش کی جائے اور اگر ایسا ہو جائے تو بقول منیرؔ نیازی "چلے تو کٹ ہی جائے گا سفر آہستہ آہستہ"۔

تاہم، فی الوقت تو شاہ ولی اللہ جنیدی کی تحقیق و کاوش کی تحسین مقصود ہے کہ جنھوں نے "یہ شارعِ عام نہیں: کراچی کی یادگار سڑکیں" کے عنوان سے یہاں کی سڑکوں کے بارے میں جامع معلومات یک جا کر دی ہیں۔ قاری سڑکوں کے ناموں کی مدد سے نہ صرف بہت سے واقعات بلکہ شخصیات اور تاریخ سے بھی جزوی حد تک آگاہی حاصل کر لیتا ہے۔ صاحبِ کتاب نے بہت محنت اور تحقیق سے اپنے موضوع پر مواد مہیّا کیا ہے۔ نیز، کتاب میں تصاویر اور اخباری تراشوں کے عکس بھی شامل ہیں.

شاہ ولی اللہ جنیدی کہنہ مشق صحافی ہیں، محمد خلیل اللہ کے صاحبزادے، الہ آباد کے علمی و ادبی خانوادے اور غازی پور ہندوستان کے جنیدی پیر طریقت سلسلے کے سپوت ۵۵ سالہ شاہ ولی اللہ ادب کی میدان کے نامور کھلاڑی ہیں، عملی زندگی کا آغاز فطری رجان کے تحت صحافت سے کیا، خوبی یہ ہے کہ انکی صحافتی رپورٹنگ بھی ادبی چاشنی لئے ہوئے ہوتی ہے۔ شاہ صاحب کراچی کو دردمند آنکھ سے دیکھتے ہیں، مختلف علاقوں میں رپورٹنگ کرتے وقت انکی دور بینی نگاہیں علاقے کے تاریخی اور سماجی پہلوؤں کا جائزہ لیتی رہتی ہیں جو تحقیق کا سبب بنتی ہیں اور

جامع مضامین کی صورت منعکس ہو کر باآخر کتاب کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ انکی پہلی مختصر کتاب ''نارتھ کراچی نصف صدی کا قصہ'' ۲۰۱۷ میں شائع ہوئی جسکے بعد یہ مکمل اور جامع کتاب ''یہ شارع عام نہیں'' ہمارے ہاتھ میں ہے۔

''یہ شارع عام نہیں'' ایک منفرد دیبانیہ ہے، انہوں نے قریباً سوا سو سڑکوں کو اٹھایا ہے اور ان سے متعلق معلومات یکجا کر کے اسے تاریخ بنا دیا ہے، اولاً سڑک جس شخصیت کے نام پر ہے اس سے متعلق معلومات، دوم سڑک کا حدود اربعہ اور سوم سڑک پر واقع علاقے، عمارات اور علاقے کی مشہور شخصیات کا تذکرہ، یہ ہے کتاب کا انداز جو کراچی اور اسکی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے خوبصورت تحفہ ہے۔

کتاب پڑھ کر مصنف کی شخصیت کو پرکھنا بہت آسان ہو جاتا ہے، بہت ساری سڑکیں ہیں جن کے بیان میں وقوع پزیر واقعات وحادثات کا تذکرہ مصنف کو کلی طور پر ایک متحرک ''میڈیا پورٹر'' کے طور پر ابھارتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں خواجہ رضی حیدر، نادر شاہ عادل اور اختر بلوچ صاحب کے تعارفی مضامین ہیں، تقریباً ڈھائی سو صفحات کی اس کتاب کی قیمت پانچ سو روپے ہے

جعفر طیار لائبریری کا ایک منفرد قدم

رمضان المبارک کے دوران عام طور پر نوجوان پوری پوری رات گلی کوچوں میں بیٹھ کر ٹائم ضائع کر دیتے ہیں۔ اس مسئلے کو مد نظر رکھتے ہوئے جعفر طیار لائبریری نے فیصلہ کیا کہ رمضان المبارک میں لائبریری رات 9 بجے سے لیکر سحری تک کھلی رہے گی تاکہ طلباء اپنا ٹائم ضائع کرنے کے بجائے اسٹڈیز کی طرف آئیں۔ الحمدللہ لائبریری کا یہ فیصلہ کارگر ثابت ہوا اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد لائبریری میں پڑھنے کے لئے رات گئے تک موجود رہی۔
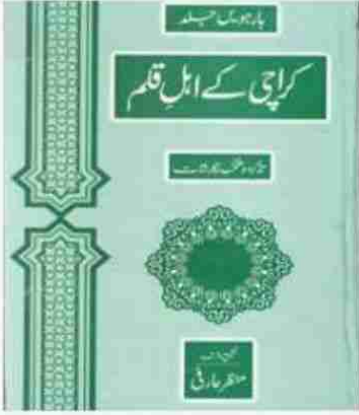
کتاب: کراچی کے اہلِ قلم
تحقیق و ترتیب: منظر عارفی
تبصرہ نگار: اختر سعیدی
ناشر: رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی

صاحب کتاب اپنے دور کے معروف شاعر، عارف رئیسی اکبر آبادی کے قابلِ ذکر شاگردوں میں شامل ہیں۔ ادبی سفر کا آغاز غزلیہ شاعری سے کیا، لیکن اب خود کو تقدیسی شاعری تک محدود کرلیا ہے۔ ان کی حمدوں، نعتوں، منقبتوں اور سلاموں پر مشتمل کئی مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ نیز، نثری کاوشوں سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اس وقت ''کراچی کے اہلِ قلم'' کی بارہویں جلد ہمارے سامنے ہے، جس میں تقریباً ایک سو اہلِ قلم کا تذکرہ اور کلام شامل ہے۔ تحقیق بہت دقّت طلب کام ہے، جس کے لیے خود سپردگی ضروری ہے۔ صاحبِ کتاب مضبوط اعصاب کے مالک ہیں، اسی لیے یہ کام خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں۔ یہ کتاب حروفِ تہجّی کے مطابق ترتیب دی گئی ہے، تاکہ تقدیم و تاخیر کا مسئلہ سَر نہ اُٹھا سکے۔ شاعر علی شاعر بھی خراجِ تحسین کے حق دار ہیں کہ انہوں نے اتنے وسیع اور جامع تحقیقی کام کا آغاز اپنے ادارے کی جانب سے کیا۔ ایک موضوع پر کتابوں کا تسلسل ایک تاریخی دستاویز بن گیا ہے۔ یہ بات بھی بہت اہم ہے کہ چھوٹے، بڑے کی تخصیص نہیں برتی گئی، ہر اُس شخص کو اِس کتاب کا حصّہ بنایا گیا، جس کو ''قلم قبیلے'' کی شہریت حاصل ہے۔ کتاب کا پیش لفظ ممتاز شاعر، محقّق اور دانش وَر سعید الظّفر صدیقی نے لکھا ہے۔

کراچی اور اس کی بندرگاہ

تحریر: سید ادیب حسین

تبصرہ نگار: ڈاکٹر نبی بخش بلوچ
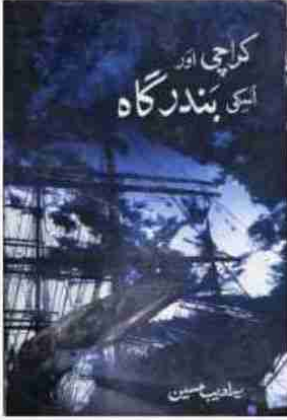
شہر کراچی اور کراچی بندرگاہ کی ایک طویل تاریخ ہے جس پر مزید تحقیق کی ضرورت ہے تاکہ اس تاریخ کے جملہ خدوخال روشن ہو سکیں۔ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ جو کچھ ہمارے علم میں ہے اس کو صحیح طریقے اور سہل زبان میں نوجوان نسل کے سامنے لایا جائے۔ سید ادیب حسین صاحب نے اردو زبان میں یہ کتاب مرتب کر کے قابل تعریف خدمت سرانجام دی ہے یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ مؤلف نے کراچی بندرگاہ پر گزارے ہوئے 35 سالوں کے اپنے تجربات کے ساتھ وہاں کے ریکارڈ اور مختلف کتابوں میں سے ان حوالوں کو جو بندرگاہ سے متعلق تھے احسن طریقے سے جمع کر دیا ہے۔

ساحلی تجارت کے لیے کراچی کے محلے وقوع کی اہمیت کو پہلی بار میر علی خان تالپور کے عہد میں محسوس کیا گیا اور بندرگاہ کی حفاظت کے لیے میر صاحب کے حکم سے قلعہ منوڑا تعمیر ہوا۔ مصنف نے اس کتاب میں تالپوروں کے زمانے کے ترقیاتی تعمیری دور اور بعد میں برطانوی حکومت کی سیاسی مصلحتوں اور منصوبوں کی تکمیل کے لیے بندرگاہ کے ترقیاتی کاموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مزید تحقیق اور تدقیق کی گنجائش کے باوجود یہ کتاب شہر کراچی اور اس کی بندرگاہ کے بارے میں تاریخی حوالوں سے بھرپور اور نئی نسل کے لیے مشعل راہ کا درجہ رکھتی ہے۔ مصنف سید ادیب حسین صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے سہل اردو میں اتنی جامع کتاب لکھ کر شہر کراچی کے ساتھ اور اپنے ادارے کے پی ٹی کا حق بھی احسن طریقے سے ادا کر دیا ہے۔
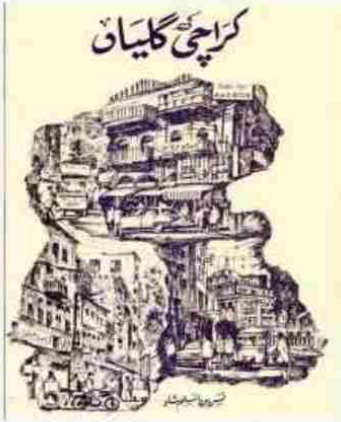
کتاب: کراچی کی گلیاں

مصنفہ: نسرین اسلم شاہ

تبصرہ نگار: نوید اقبال انصاری

میرے سامنے اس وقت کتاب "کراچی کی گلیاں" رکھی ہوئی ہے، جس کی تحقیق وتدوین نسرین اسلم شاہ کی ہے۔ نسرین اسلم شاہ، سینٹر آف ایکسیلینس فار ویمینز اسٹڈیز، کراچی یونیورسٹی کی سابق ڈائریکٹر اور جامعہ کراچی کی ایک معروف استاد ہیں۔اس کتاب میں کراچی کی تقریباً تمام ہی پرانے علاقوں اور گلیوں کا ذکر ہے۔

ان میں اورنگی ٹاؤن کی پھول والی گلی، بنے میاں کا ہوٹل، سائٹ ٹاؤن کی تانبے وپیتل والی گلی شیر شاہ، آٹو پارٹس والی گلی شیر شاہ، مزار والی گلی گارڈن، چیلارام گلی (بند گلی) گارڈن ویسٹ، پتنگ گلی، چھالیہ گلی، مرچی گلی جوڑیا بازار، ٹھوکر گلی جونامارکیٹ، بوتل گلی، طور بابا والی گلی عیدو لین، دھاگہ گلی لانڈھی، پیتل گلی، پھول والی گلی گلبہار، دوپٹہ رنگائی گلی لیاقت آباد، مکھڑا گلی، ممباسا گلی بغدادی لیاری ٹاؤن، وغیرہ جیسی اہم گلیوں کا بھی ذکر ہے۔بنیادی طور پر یہ کتاب ان گلیوں کا ایک تعارف ہے جس پر یہ شہر کراچی آباد ہے، یعنی یہ نئی نسل اور کراچی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے والوں کے لیے ایک اچھا ذریعہ ہے۔

اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے راقم کو بھی اپنے ماضی کی کچھ حسین یادیں پھر سے یاد آگئیں۔ گوہر آباد کے محلے میں ایک بوڑھا شخص اپنے ٹھیلے پر آٹا فروخت کرنے کے لیے آواز لگاتا "سفید آٹا پچاس پیسے کلو" گھر سے کچھ دور ایک باغ، باغ قاسم کے نام سے مشہور تھا جہاں ہم دوستوں کے ساتھ جاکر جنگل جلیبی اور کھٹارے درختوں کے نیچے سے چنتے اور کبھی کوئی پتھر تلاش کرکے درخت پر مارتے کہ کچھ اور جلیبی، کھٹارے حاصل کرلیں۔

اس باغ کے قریب ہی ایک خوبصورت ندی بہتی تھی جس میں چھوٹی چھوٹی رنگین مچھلیاں ہوتی تھی اور پانی اس قدر شفاف ہوتا ہے پانی کے اندر زمین پر پڑے پتھر تک صاف نظر آتے۔ یہ ہرا بھرا ماحول بہت پر سکون ہوتا تھا، مگر آج اس علاقے کا باغ ختم ہوچکا، اب یہاں ٹریفک کا شور اور دھواں دکھائی دیتا ہے اور یہ ندی کالے سیاہ بدبودار پانی سے بھری دکھائی دیتی ہے۔

مجھے آج بھی لیاقت آباد کی پھول والی گلی، دوپٹہ گلی، پیلی بھیت سمیت وہ گلیاں بھی یاد ہیں۔ لیاقت آباد میں سیاسی مظاہرے اور احتجاج ہوا کرتے تھے اور لوگ دن بھر کی ہنگامہ آرائی اور احتجاج کی صورتحال جاننے کے لیے رات کو بی بی سی اردو سے خبریں اور سیر بین پروگرام سنتے تھے جس میں مارک ٹیلی اپنی تازہ رپورٹ پیش کرتا تھا، شفیع نقی جامی کی آواز بھی سنتے تھے۔

لوگ تفریح کے لیے یہاں فردوس اور نیر نگ سنیما کا بھی رخ کرتے تھے جہاں ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے لمبی قطار نظر آتی اور ایک گھنگریالے بال والا مکرانی ہاتھ میں پائپ لیے لوگوں کو ڈراتا کہ سیدھی قطار نہیں بناؤ گے تو پائپ کی مار پڑے گی۔ سنیما کا یہ کلچر تو کراچی شہر کے تمام سنیماؤں میں ملتا تھا کیونکہ اس وقت فلم دیکھنے کے شائقین بڑی تعداد میں سنیما کا رخ کرتے تھے اور اس قدر رش ہوتا تھا کہ اکثر ٹکٹ کی فروخت وقت سے پہلے ہی ہو جاتی تھی اور سنیما والے ہاؤس فل کا بورڈ لگا دیتے تھے جب کہ بلیک میں ٹکٹوں کی فروخت بھی ہوتی تھی، لیکن اب منظر نامہ بدل چکا ہے، ٹیکنالوجی کے انقلاب نے ماحول کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔

پہلے عید یا شادی بیاہ کے موقع پر تصاویر بنوائیں جاتی تھیں اور فلم کا رول پروسسنگ اور پرنٹ کے لیے فلم اسٹوڈیو بھیجا جاتا تھا، لیاقت آباد میں ڈاکخانے کے اسٹاپ کے پاس ایک فلم اسٹوڈیو میں ہم اپنے فلم کا رول دے کر آتے تھے اور انتظار کرتے تھے کہ کب تصاویر "دھل" کر آئیں گی۔ عام طور پر لوگ ان فلم اسٹوڈیو میں جا کر اپنی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں بھی بنواتے تھے۔ آج یہ فلم اسٹوڈیو پہلے کی طرح عام نہیں رہے سب جدید ٹیکنالوجی میں ڈھل چکے ہیں۔

تفریح کے لیے گھروں میں ریڈیو سنا جاتا تھا، لوگ اپنی پسند کے فلمی گیت سننے کے لیے ریڈیو پاکستان کو خط لکھتے کہ ہمیں فلاں فلم کا مہدی حسن وغیرہ کا فلاں نغمہ سنوادیں۔ ریڈیو پاکستان اپنے فلمی گیتوں کے پروگرام "آپ کی فرمائش" میں ان خطوط لکھنے والوں کے نام پڑھ کر گانے نشر کرتا تھا۔ بچپن میں یہ نام جو سنے تو حافظے میں محفوظ ہو گئے مثلاً شمع آرزو، ایم آر زو وغیرہ۔ کراچی کی گلیاں اس وقت ویران محسوس ہونے لگتیں جب ریڈیو پاکستان سے "اسٹوڈیو نمبر نو" ڈرامہ براڈکاسٹ ہوتا۔ بلاشبہ ریڈیو سے اس قدر جاندار اور شاندار ڈرامہ نشر ہوتا کہ سننے کے لیے لوگ گھروں میں مقید ہو جائیں، اس کا سہرا ریڈیو پاکستان اور اس کی ٹیم کو جاتا ہے۔

بہر کیف تفریح کے حوالے سے کراچی کا ماضی ایک اپنا ہی کلچر رکھتا تھا، جہاں کسی کی شادی ہو تو بڑے سے لاؤڈ اسپیکر پر ہفتے بھر صبح تا رات گانے چلتے جس سے دور تک محلے والے بھی لطف اندوز ہوتے۔ کسی کی ختنے ہو تو بھی گلی میں دو بانس گاڑھ کر ایک سفید چادر تان دی جاتی اور کسی فلم پروجیکٹر والے کو بلا کر پاکستانی فلم چلائی جاتی جیسے سب محلے کے لوگ سڑک پر چادر بچھا کر یا گھروں کے باہر قائم چبوتروں وغیرہ جیسے جگہوں پر بیٹھ کر دیکھتے۔ دلچسپ منظر اس وقت اور دلچسپ ہو جاتا کہ جب کوئی پولیس والا ادھر آ ٹپکتا اور کہتا "فلم چلانے کا پرمٹ دکھاؤ" یوں جوڑ توڑ ہوتا کچھ دیر فلم رکتی، اور پھر دوبارہ سے چلنے لگتی تو لوگ خوشی سے تالیاں بجاتے۔

سندھی ہوٹل سے صدر، ٹاور تک بسیں بھی چلتی تھیں، ایک کا نمبر سات تھا اور دوسری سیون ای کے نام سے جانی جاتی تھی۔ سفر کی صورتحال یہ تھی کہ بس اسٹاپ پر لوگ خود قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جیسے ہی بس آتی نہایت مہذب انداز میں ایک ایک کر کے سوار ہو جاتے اور جب تمام نشستیں پر ہو جاتیں تو باقی رہ جانے والے یا تو نیچے اتر کر دوسری بس کا انتظار کرتے یا پھر کھڑے ہو کر سفر کرتے، طلبہ کو اسٹوڈنٹ کارڈ دکھانے پر رعایت ملتی اور وہ محض پچیس پیسے دیکر سفر کرتے۔ سڑکیں اور فٹ پاتھ صاف ستھری دکھائی دیتی جب کہ وقفے وقفے سے ان کی دھلائی بھی ہوتی۔ سفر کے لیے ڈبل ڈیکر بسیں اور ٹرام سروس بھی دستیاب تھی۔

خیر اب کراچی کی وہ گلیاں اور ماحول ماضی کا ایک کتابی حصہ ہی بن گیا ہے، نئی نسل اس ماضی کا تصور بھی نہیں کر سکتی کہ محلے میں دور تک کوئی میڈیکل اسٹور ہی نہیں ہوتا تھا، جب بھی بیمار پڑے محلے ہی کے ڈاکٹر سے نیلی، پیلی اور سفید قسم کی دو تین گولیاں اور ایک عجیب ذائقے والا شربت لے کر دو تین دن میں چنگے بھلے ہو جاتے تھے۔

شادی بیاہ کے لیے پلاؤ اور زردے کی دو دیگیں ہی کافی ہوتی تھیں اور کسی شادی ہال کی بکنگ کا بکھیڑا تھا نہ کسی شادی دفتر کا، بس بزرگوں نے رشتہ طے کیا، تاریخ آئی اور محلے ہی کی گلی یا قریبی خالی میدان میں شامیانے لگا کر تقریب کر ڈالی وہ بھی سورج کی روشنی میں، بہت اچھی فضول خرچی والی شادی ہوئی تو بارات کے ساتھ بینڈ باجے والوں کو بلا لیا اور "ایک پیسہ، دو پیسہ یا پانچ پائی" کے سکے دلہے کی بارات پر برسا دیے جسے محلے کے بچے بھاگ بھاگ کر لوٹ تھے اور تقریب میں ہلچل مچا دیتے۔ یہ تھیں کراچی کی وہ گلیاں اور ماحول جسے ہم نے شہری منصوبہ بندی نہ کر کے، غلط سیاست کر کے اور کچھ جدیدیت و ٹیکنالوجی نے کہیں گم کر دیا، ہمیشہ کے لیے

اخبار رفتگان کے 3 سال مکمل ہوئے

یکم مئی 2023ء کو اخبار رفتگان کے تین سال مکمل ہو گئے۔ اس دوران سہ روزہ اخبار کے 360 شمارے باقاعدگی کے ساتھ پورے تین سال تک ہر 3 دن بعد آن لائن شائع کیے گئے۔ اب تک اخبار رفتگان میں 1500 سے زیادہ مشاہیر کے مختصر حالات زندگی پیش کئے گئے۔ اب اس سلسلہ کو کچھ عرصے کے لیے معطل کیا جا رہا ہے اور کوشش کی جائے گی کہ اس پورے کام کو کتابی شکل میں لایا جائے۔

جعفر طیار لائبریری ان تمام افراد کی ممنون ہے جنہوں نے اس اخبار کے سلسلے میں ہر قدم پر حوصلہ افزائی کی اور بہتری کے لئے مفید مشورے دیے۔ ذیل میں اخبار رفتگان کے ایک سال مکمل ہونے پر یکم مئی 2021 میں خصوصی طور پر شائع ہونے والے اخبار کے پہلے پیج کا عکس دیا جا رہا ہے جس میں خیال سے اشاعت تک کا سفر بیان کیا گیا ہے۔

کتاب: کراچی کی عزاداری
مصنف: پروفیسر سید عمران ظفر
تبصرہ نگار: اقبال اے رحمن

""کراچی کی عزاداری""نوجوان دوست پروفیسر سید عمران ظفر کی تصنیف ہے، یہ کتاب اس موضوع پر ابتدائیہ ہے جس میں کراچی کے علاقے شاہ فیصل ٹاؤن اور ملیر ٹاؤن میں برپا عزاداری کو تاریخی حوالوں سے رقم کیا گیا ہے۔ عقیدہ اخلاص سے عبارت ہے، یہ اخلاص جب سَرایت کر جائے تو ایثار و قربانی کی تاریخ رقم ہوتی ہے، تقسیم سے قبل ہندوستان میں لکھنؤ عزاداری کا مرکز تھا، ساتھ پورے ہندوستان میں جہاں جہاں شیعہ آبادی تھی عزاداری دلوں کی دھڑکن تھی، اس کتاب میں عزاداری سے وابستہ جذبات کا ذکر ہے، جب خوشحالی تھی اور عزاداری کی روایات بھرپور طور پر نبھائی جاتی تھیں، قیام پاکستان کے بعد عزاداروں کی اکثریت پاکستان چلی آئی، یہاں مسلمان جس حال میں پہنچے تھے اس سے کون واقف نہیں، عزادار بھی اسی اکائی کا حصہ تھے جنکے لئے سابقہ عزاداری ممکن نہ رہی تھی۔ اسکے باوجود قیام پاکستان کے بعد کے پہلے کے محرم میں لٹے پٹے مومنین نے جسطرح سے وضعداری نبھائی وہ تاریخ کا حصہ ہے، دن مہینے سال گزرتے چلے گئے، گمشدہ خوشحالی پھر سے لوٹ آئی تو عزاداری بھی کراچی کی روایات کا حصہ بنتی چلی گئی، وہی گم گشتہ روایات جس کا اہتمام بزرگ کیا کرتے تھے، کتاب کی خوبی یہ ہے کہ شاہ فیصل اور ملیر کے ضمن میں گفتگو کرتے ہوئے مصنف نے ہندوستان اور قیام پاکستان کے بعد کی تاریخی حقیقتوں کو خوبی سے بیان کیا ہے۔

آسودہ لوگ کیسے پاکستان آئے، کیسے رہے، پرانے کراچی میں جھگیاں باندھ کر کیسے دن گزارے، کیسے نئے علاقوں میں منتقل ہوئے، یہ سب کچھ بیان کرتے ہوئے مصنف نے تاریخ کے طلباء کو مفید معلومات دی ہیں۔ ہر علاقے اور آبادی کی تاریخ از خود نمایاں ہو گئی ہے۔ ہر علاقے کی نو تعمیر شدہ امام بارگاہوں کی مجالس، گھریلو مجالس، جلوس اور وماتم کی تاریخ کتاب کا حصہ ہے۔ امام بارگاہیں، انکی تعمیر، انتظام و انصرام اور معمولات کو مصنف نے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے، جب لوگوں کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے تو تعمیر مسجد و روضہ کے لئے مٹھی بھر آٹا بھی لوگوں نے دیا جو قبول کیا گیا گویا تعمیرات میں ہر چھوٹے بڑے جو شامل کیا گیا۔

ایک اقتباس کا خلاصہ ملاحظہ ہو""عقیل حیدر صاحب بہت بڑی انجمن تنظیم العزاء کے ساتھ نوحہ خوانی کرتے تھے، انکے نوحے اتنے جمے ہوئے انداز میں ہوتے کہ آغاز ہی سے رقت طاری ہو جاتی، یہ تمام نوحے سید اشتیاق حسین رضوی کے تخلیق کردہ تھے جو اپنے نام کے ہر پہلے لفظ کی رعایت سے ساحر تخلص کرتے تھے اور ساحر فیض آبادی سے مشہور تھے، تنظیم العزاء ان دنوں لمبے فاصلے پیدل طے کرتی مگر نوحہ خوانی کی مجلس میں پہنچتی ضرور، اور اگر بہت دور جانا ہو تو بجری کے ٹرکوں کا سہارا لیتی۔ انجمن میں پولیس والے کثرت سے تھے اس مناسبت سے یہ ""پولیس والی انجمن بھی کہلاتی تھی۔ کتاب زہراء آکادمی پاکستان نے شائع کی ہے۔
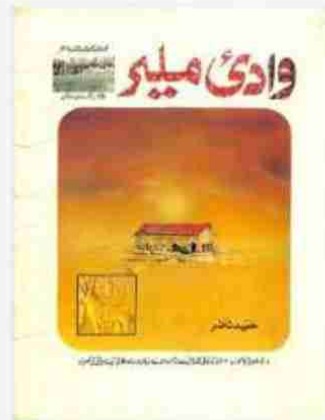
کتاب: وادئ ملیر
مصنف: حمید ناضر
تبصرہ نگار: سید علی عمران

کراچی کی تاریخ پر اب تک مختلف حوالوں سے لکھی گئی کتابوں کی نصف سینچری تو ہو چکی ہو گی لیکن ہر معتبر کتاب کے حوالوں میں دو کتابوں کا نام ضرور ہوتا ہے یعنی "وادی ملیر" اور "وادی لیاری"۔ ان دونوں کتابوں کے مؤلف حمید ناضر صاحب ہیں. گو کہ حمید ناضر صاحب اسٹیل مل سے ریٹائرمنٹ کے بعد اب ملیر مندر کے پاس اپنی پرانی رہائش گاہ پر تحقیق کا تمام کام چھوڑ کر گوشہ نشینی کی زندگی انتہائی سادگی کے ساتھ بسر کر رہے ہیں. اس کے باوجود اگر کوئی تحقیق کا طالب علم ان کے پاس چلا جائے تو وہ ہر طرح سے اس کی مدد کرتے ہیں.

ان کی کتاب وادی ملیر 1987 میں شائع ہوئی اور یہ کراچی کے ایک خاص علاقے کی پہلی تاریخی دستاویز ہے. یہ کتاب اب نایاب ہے اور بہت کم لائبریریز میں دستیاب ہو گی. حمید ناضر صاحب نے اس کتاب کو 9 ابواب میں تقسیم کیا ہے. 8 ابواب کو آپ نے مختلف محققین سے ان کی فیلڈ کے مطابق تحریر کروایا ہے جبکہ آخری باب کو خود تحریر کیا ہے.

پہلا باب ملیر وادی کی ارضیاتی تاریخ پر ہے جب کہ دوسرے باب میں ملیر کی جغرافیائی حیثیت پر ایک تفصیلی مضمون ہے جس میں کراچی کا پورا مضافات یعنی ڈرگ کالونی، ملیر، سکھن ندی کا اطراف، لانڈھی اور کورنگی سب وادی ملیر کا حصہ بتایا گیا ہے۔

تیسرے مضمون میں وادی ملیر کے قدیم آثار بیان کیے گئے ہیں اور بتایا گیا ہے کہ ملیر کی تاریخ قدامت کے اعتبار سے قدیم پتھر کے وسطی دور سے شروع ہوتی ہے جبکہ چوتھے مضمون میں چوکنڈی کے قبرستان کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے۔ پانچواں اور چھٹا باب ملیر کے دیہی مکانات اور اس وادی میں آب رسانی پر ہے جس میں ملیر ندی اور اس کی معاون ندیوں کا تفصیل سے ذکر ہے۔ ساتویں باب میں دبستان علم و دانش یعنی ملیر سے تعلق رکھنے والے ادیب، شعراء اور دیگر مشاہیر کا تفصیل سے ذکر ہے۔ اسی طرح سے اٹھویں باب میں ملیر کے صوفیائے کرام کے حالات زندگی ہیں۔ آخری باب میں حمید ناضر صاحب نے تمام مضامین کو خلاصے کی صورت میں انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا ہے اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے یہاں رہنے والی اقوام اور قبائل کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

یہ ایک بہترین تاریخی دستاویز ہے۔ کراچی کی تاریخ بیان کرنے والا ہر مورخ و محقق اس کتاب سے استفادہ کرتا ہے مگر ظلم اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنی تحقیق میں اس کتاب سے استفادہ تو کرتا ہے مگر اس کتاب کا نام نہیں لیتا۔

یہ کتاب عام دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے جناب حمید ناضر صاحب کی اجازت سے جعفر طیار لائبریری نے پی ڈی ایف بنا کر اپنے پاس محفوظ کر لی ہے. خواہش مند افراد جعفر طیار لائبریری سے اس کتاب کی پی ڈی ایف واٹس ایپ پر منگوا سکتے ہیں۔
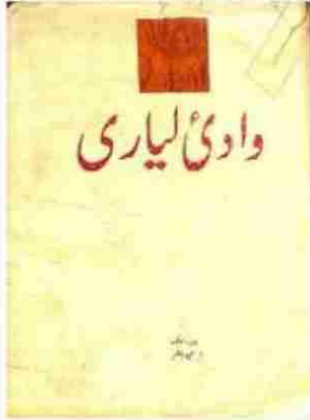
کتاب: وادی لیاری

مدیر و مولف: حمید ناضر

تبصرہ نگار: امجد محمود

یہ نام ہے اس کتاب کا کہ جس کا تعارف آج پیشِ خدمت ہے. دراصل یہ تین کتابوں

۱....وادیءِ ملیر

۲....وادیءِ لیاری

۳....وادیءِ اورنگی

کے ایک سلسلے کی دوسری کتاب ہے.

موجودہ لیاری کے علاقے اور ندی کی صورتِ حال کے تناظر میں دیکھیں تو سب سے پہلے اس کتاب کا خوب صورت نام ہی دل موہ لیتا ہے، لیکن باقی تفصیلات پڑھ کر دل جلد اداس بھی ہو جاتا ہے کہ جس بے دردی سے اس وادی کو آلودہ اور گندا کیا گیا ہے وہ بہت مایوس کن ہے.

لندن کے درمیان بہنے والے چھوٹے سے نالے کو انگریز نے آلودگی سے بچا کر اسے "دریائے ٹیمز" کا نام دے رکھا ہے اور ہم نے ایک اچھے بھلے (برساتی) دریا کو سیوریج اور صنعتی فضلے کے نالے میں تبدیل کر کے برباد دیا ہے.

("اس دشت میں اک شہر تھا" پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت رہتی تو لیاری اور ندی بلکہ شہر کا یہ حشر نہ ہونے دیتی. لیکن "آزادی ہزار نعمت ہے")

بہر کیف عروس البلاد کراچی کی پر پیچ زلفوں کو سنوارنے کے لیے کچھ نہ کچھ گیسو سنوار دیوانے بھی میسر آتے رہتے ہیں. انھی میں سے ایک نام حمید ناضر (ناظر نہیں) صاحب بھی ہیں، جن کا نام بطور مدیر اور مؤلف اس کتاب کے سرورق پر درج ہے. یہ کتاب فاضل مدیر کی برسوں کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے. اس میں لیاری کے نام کی وجہِ تسمیہ سے لے کر اس کی

....ارضیاتی تاریخ

....آثار قدیمہ

....لیاری میں آباد قبائل

....داستانِ لیاری ادب

وغیرہ وغیرہ پر مشتمل مختلف محققین کے مضامین شامل کئے گئے ہیں، نیز درجنوں نقشے اور رنگین تصاویر حوالہ جات کے طور پر شامل کی گئیں ہیں.

کتاب پر اعلیٰ درجے کے چمکدار کاغذ کا گرد پوش دیا گیا ہے جبکہ معیاری کاغذ پر بڑے سائز میں شائع کی گئی ہے. عالمی معیار کی یہ خوبصورت کتاب ۱۹۹۲ میں کراچی سے ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی، قیمت ۲۸۰ روپے درج ہے.

مدیر و مؤلف حمید ناضر صاحب کی یہ دوسری کاوش تھی جس کی کامیابی کے بعد انہوں نے مزید ایک کتاب

...وادیءاورنگی (حب ندی سے متعلق)

مرتب اور شائع کی.

حمید ناضر صاحب اس حوالے سے بھی داد وستائش کے خصوصی طور پر حق دار ہیں کہ انہوں نے یہ انتہائی بیش قیمت کتاب کسی اشاعتی ادارے کی مدد کے بغیر اپنے طور پر شائع کی ہے، اشاعت کا پتہ... چٹائی گراونڈ ملیر اور چھ ہندسوں کا پرانا فون نمبر درج ہے. حمید ناضر صاحب کے اسی پس منظر کے تحت اوپر میں نے دیوانے کا لفظ استعمال کیا ہے.

(نوٹ.....یہ کتاب... کئی دہائیوں سے اردو اور انگریزی کی پرانی کتابوں کے کاروبار سے منسلک ہمارے کرم فرما یوسف بھائی نے مہیا کی ہے جو اتوار کے روز ریگل اور فریئر ہال گارڈن میں کتابوں کا اسٹال لگاتے ہیں. شہر کی کئی کتاب دوست شخصیات کو یوسف بھائی کے اسٹال پر مستقل آتے ہوئے دیکھا ہے جن میں سرِ فہرست پروفیسر سحر انصاری صاحب ہیں. یوسف بھائی نے مندرجہ بالا کتابی سلسلے کی بقیہ دونوں کتابیں بھی مہیا کرنے کا یقین دلایا ہے)

ورکشاپ برائے والدین

جعفر طیار لائبریری نے ICAN کے تعاون سے محمد علی جناح ہال جعفر طیار لائبریری میں ایک ورکشاپ برائے والدین کا انعقاد ہوا۔ اس ورک شاپ میں ماہر نفسیات محترمہ ڈاکٹر ساجدہ صاحبہ، محترمہ افشین صاحبہ اور جناب غیور صاحب نے خطاب کیا اس کے علاوہ نظامت کے فرائض جناب احسن صاحب نے انجام دیے۔ بارش ہونے کے باوجود اس ورکشاپ میں کافی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔
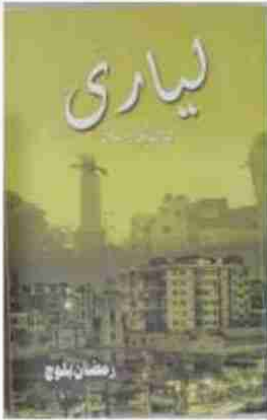
کتاب: لیاری کی ان کہی کہانی

مصنف: رمضان بلوچ

تبصرہ نگار: شبیر احمد ارمان

یہ کہانی ایک تھکے ہارے اور ضعیف ذہن رکھنے والے ایک ایسے انسان کی تحریر ہے جس نے اپنی پوری زندگی جدوجہد میں گزاری۔ اس وقت رمضان بلوچ کی دلچسپ اور تاریخی یادداشتوں پر مبنی کتاب ''لیاری کی ان کہی کہانی'' کی اولین کاپی زیر مطالعہ ہے۔ جس میں 1960ء کی دہائی سے لے کر رواں سال تک کے ان خاص خاص واقعات کا ذکر ہے جس میں وہ خود شامل تھے یا پھر ان کے ارد گرد رونما ہوئے تھے۔ یہ کتاب 40 ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کا ایک الگ عنوان ہے جو قارئین کو ہر باب پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مثلاً دو ہاتھیوں کی جنگ، بمباسا اسٹریٹ۔ قارئین سوچتے ہوں گے کہ یہ دو ہاتھی کون ہیں ؟اور بمباسا اسٹریٹ یقیناً براعظم افریقا میں واقع ہوگا۔ یہ تو کتاب پڑھنے کے بعد معلوم ہوگا کہ یہ دو ہاتھی کون ہیں اور بمباسا اسٹریٹ کہاں واقع ہے۔

اس طرح ہر باب اپنے اندر ایک ادبی چاشنی رکھتا ہے اور قاری کو ماضی کی سنہری یادوں میں لے جاتا ہے، جنھوں نے وہ دور دیکھا ہوگا، وہ بلاشبہ یہ کتاب پڑھ کر ماضی میں کھو جاتے ہوں گے۔ جہاں اگرچہ غربت اپنے پنجے گاڑے ہوئی تھی مگر ہر سو سکھ چین تھا، کیونکہ بھائی چارگی کی فضا غربت پر غالب تھی۔ رمضان بلوچ اپنی عرضداشت میں لکھتے ہیں کہ لیاری کی ان کہی کہانی ایک تھکے ہارے اور ضعیف ذہن رکھنے والے ایک ایسے انسان کی تحریر ہے جس نے بہتری کی جانب قدم بڑھانے کے لیے اپنی پوری زندگی مصائب جھیلتے اور جدوجہد میں گزاری اور ذاتی طور پر وہ کچھ حاصل کیا جس کی تمنا کی تھی۔

مگر ایک خواہش ابھی تک دل میں پنپ رہی ہے کہ یہ معاشرہ جس میں ہم رہ رہے ہیں، وہ غربت، نفرت، استحصال اور محرومیوں سے پاک ہو۔ جہاں کمزور اور بے بس مظلوم افراد کو انصاف نصیب ہو۔ جہاں علم و دانش کو ہی مقدم سمجھا جاتا ہو، جہاں پیار و محبت، امن و سلامتی کا راج ہو۔ یہ ہم جیسے آشفتہ سروں کے ساتھ ساتھ ہر باشعور فرد کی خواہش ہے جو کئی نسلوں بعد بھی بس خواہش ہی ہو کر رہ گئی ہے۔

یہی لیاری اور ملک کے دوسرے علاقوں کی اصل کہانی ہے، چاہے اسے کوئی بھی عنوان سے پکارا جائے۔ اس کتاب میں شایع شدہ لیاری کی پرانی تصاویر واجہ یوسف نسکندی (مرحوم) عبدالرحیم موسوی اور راقم کی فراہم کردہ ہیں۔ واضح رہے کہ اس کتاب کی تقریب رونمائی 28 دسمبر 2017ء کو آرٹس کونسل کراچی میں ہوگی۔

کچھ باتیں رمضان بلوچ کے متعلق ملاحظہ کریں۔ رمضان بلوچ لیاری کی ادھوری کہانی کے مصنف ہیں۔ ان کے مضامین مختلف اخبارات اور رسالوں میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ لیاری کے سنجیدہ اور معتبر روشن خیال دانشوروں میں شمار ہوتے ہیں۔ لیاری کے نوجوانوں کی علمی اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو بڑھانے کی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی سرگرمیوں پیش پیش رہتے ہیں۔ کراچی کے صحافتی اور ادبی حلقوں میں

بھی وہ اجنبی نہیں ہیں۔ 1944ء میں کراچی کی پرانی بستی لیاری شاہ بیگ لین کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ایس ایم لیاری سیکنڈری اسکول سے میٹرک اور کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کی تعلیم مکمل کی۔

طالبعلمی دور سے ہی لیاری میں تعلیمی اور سماجی سرگرمیوں میں مصروف رہے ہیں خاص طور پر لڑکیوں کو تعلیم کی جانب راغب کرنے کی مہم میں اہم کردار ادا کیا۔ تیس سال سے زیادہ عرصے تک حکومت سندھ کے بلدیاتی شعبہ میں نمایاں خدمات انجام دینے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ کراچی میٹروپولیٹن کارپوریشن (کے ایم سی) کے زیرک اور اہم افسران میں ان کا شمار رہا ہے۔ ادبی، علمی اور سماجی میدان میں اب بھی سرگرم نظر آتے ہیں۔

زندگی کی کٹھن راہوں میں ان کی جدوجہد و ثابت قدمی نوجوانوں کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ رمضان بلوچ اپنی کتاب لیاری کی ان کہی کہانی کے باب نمبر 14 عنوان: بیچارہ ادب دوست دلہا، میں رقم طراز ہیں کہ: ہمارے دوسرے ساتھی کی شادی و نکاح کی تقریب یوں تو بہت سادہ طریقے اور خوش اسلوبی سے انجام پائی لیکن اس دلہا میاں نے دلہن سے جس انداز کے ڈائیلاگ سے خود کو متعارف کرایا، وہ بہ زبان اکبر جلال بعد میں کافی عرصے تک دلچسپ موضوع کا باعث بنا رہا۔

بلوچ گھرانوں میں روایت کے مطابق دلہن کا انتخاب والدین ہی کرتے ہیں اس لیے شادی کی آخری رسومات تک دلہا اور دلہن ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہی رہتے ہیں، ہمارے یہ بلوچ دلہا دوست ادبی ذوق و شوق رکھتے تھے۔ خود بھی شاعری کرتے تھے۔ اردو کے نامور رومانوی شاعروں سے بہت متاثر تھے۔

اسی پس منظر کے ساتھ انھوں نے دلہن کو اپنا تعارف کرانے کے لیے اردو ادب کا سہارا لینا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہ دلہن سے یوں گویا ہوئے: آج آسمان سے چاند اتر آیا ہے، میں چاند ستاروں سے تمہارا دامن بھر دوں گا وغیرہ وغیرہ۔ یہاں تک بات صحیح ہوتی اگر یہ جملے اردو زبان ہی میں ادا کیے جاتے لیکن غضب یہ ہوا کہ انھوں نے اردو کے ان جملوں کو لفظ بہ لفظ ترجمہ کر کے بلوچی زبان میں کہا (مروچی آسمانا چے نوک ایر کپتا، من نوک و استاراں چے تہی پندولا پر کناء) بس صاحب یہ سننا تھا کہ دلہن نے چیخ ماری اور ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

دوسرے روز دلہا کے والدین کی طلبی ہوئی۔ دلہن کے والدین نے شکایت کی کہ لڑکے کی ذہنی صحت کے بارے میں باتیں کیوں پوشیدہ رکھی گئی تھیں، ہماری لڑکی کی زندگی تو تباہ ہو گئی۔ خیر بڑی مشکل سے سمجھدار لوگوں نے معاملہ رفع دفع کیا اور دلہن کے والدین کو باور کرایا کہ لڑکے کی ذہنی صحت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ بس کچھ اردو ادب سے شغف رکھتا ہے اور شاعر بھی ہے۔

دراصل قصہ کچھ یوں تھا کہ دلہا نے چاند ستاروں کو دامن میں بھرنے کی بات کرتے ہوئے لفظ دامن کو بلوچی زبان میں (پندول) (بلوچی خواتین کی ڈھیلی ڈھالی قمیض کے سامنے لمبی سی جیب) ترجمہ کر کے سنایا۔ اب دلہن نہ اردو ادب کی باریکیوں سے واقف تھی اور نہ کبھی شعر و شاعری سے واسطہ پڑا تھا۔ چاند ستاروں سے بھرے ہوئے (پندول) جیب کا تصور آتے ہی وہ بیچاری نہیں چیختی تو اور کیا کرتی۔ اسی طرح اس کتاب کے دیگر ابواب اپنے اندر دلچسپ واقعات رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ماضی کے متعلق معلومات بھی فراہم کرتے ہیں کہ اس وقت کراچی

اور لیاری کیسے تھے اور اب کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔

کتاب کی تحریری زبان آسان اردو میں ہے، جسے عام قاری باآسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ کتاب کا ٹائٹل ایک امید کی کرن کو ظاہر کرتا ہے، طلوع ہوتا ہوا سورج اور جھومتے ہوئے لیاری کے نوجوانوں کا عکس اس امر کا پتہ دیتے ہیں کہ آنیوالا کل ان کا اپنا ہے، جہاں خوشحالی ان کا مقدر ہو گی۔ لیاری دی ارتھ آف کراچی کا پیغام لیاری کے نوجوانوں کو ایک عزم دیتا ہے کہ قدم بڑھاتے رہو، منزل تمہاری منتظر ہے۔

کتاب کا آخری باب اختتام ان الفاظ میں کیا گیا ہے: ایک ایسی ہی محفل سے اٹھ کر ایک دن ہم ٹہلتے ہوئے میوہ شاہ روڈ کے آخری سرے پر پہنچے تو کسی ہوٹل سے پرانی فلم میلہ میں محمد رفیع کی سریلی آواز میں یہ نغمہ گونج رہا تھا: ہوں گی یہی بہاریں، الفت کی یادگاریں، بگڑے گی اور بنے گی، دنیا یہی رہے گی، ہونگے یہی جھمیلے، یہ زندگی کے میلے، دنیا میں کم نہ ہونگے، افسوس! ہم نہ ہونگے۔

ہماری دعا ہے رمضان بلوچ مزید صحت مندانہ عمر پائے اور اسی طرح اپنی آپ بیتی نئی نسل تک منتقل کرتے رہے (آمین)

سبیل کتب 📚 پاکستان میں کتابوں کی مفت تقسیم کی 9 روزہ سب سے بڑی سبیل
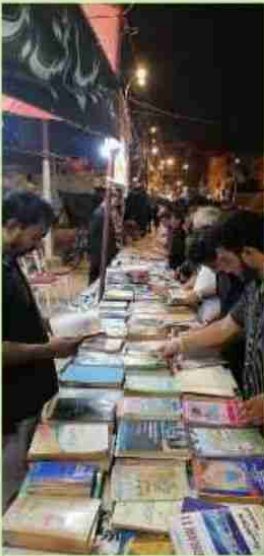
یوں تو محرم کا چاند دیکھتے ہی پورے پاکستان میں اور خصوصاً کراچی میں سبیلیں لگائی جاتی ہیں اور ان سبیلوں سے شربت سے لے کر بریانی تک بے پناہ تبرک تقسیم کیا جاتا ہے، لیکن گذشتہ 5 سالوں سے جعفر طیار لائبریری نے ایک منفرد سبیل لگانے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔ لائبریری کی جانب سے یکم محرم سے لے کر 9 محرم تک باقاعدہ ایک بڑی سبیل لگائی جاتی ہے لیکن اس سبیل میں علم کے پیاسوں کو سیراب کیا جاتا ہے، یعنی شربت کے بجائے لوگوں میں مفت کتابیں تقسیم کی جاتی ہیں۔ رواں سال سبیل کتب سے جعفر طیار لائبریری نے یکم محرم سے 9 محرم تک تقریباً 3000 سے زیادہ کتابیں لوگوں میں مفت تقسیم کیں، جن میں اسلامی کتابوں کے ساتھ ساتھ میڈیکل، انجینئرنگ، بزنس، اردو ادب اور درسی کتابیں بھی شامل تھیں۔ اس سبیل کتب میں نامور محقق ڈاکٹر عقیل عباس جعفری، پروفیسر اقبال حماد، پروفیسر ڈاکٹر نوازش، ڈاکٹر علی عمار، پروفیسر ڈاکٹر طلعت زہرا، پروفیسر بابر عسکری، پروفیسر جمیل زیدی، پروفیسر ریاض مہدی، پروفیسر ناصر حسین، پروفیسر احمد علی حیدری اور معروف کوئز اسپیشلسٹ جناب جاوید رضا صاحب نے بوتراب اسکاؤٹ کے عہدے داران کے ساتھ خصوصی شرکت کی اور سبیل کتب سے استفادہ کیا۔ اس کے علاوہ مولانا رضا حیدر صاحب اور بڑی تعداد میں اساتذہ و دانشور حضرات نے بھی سبیل کا دورہ کیا۔

کتاب: سادات کالونی ڈگ روڈ اور یہاں کی عزاداری

مصنف: سید ظہیر حسن زیدی

تبصرہ نگار: مریم فاطمہ
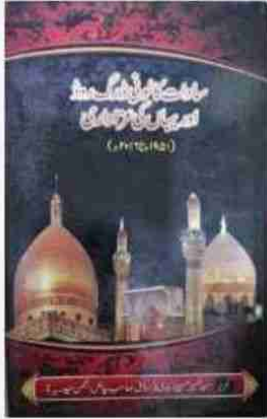
سید ظہیر حسن زیدی صاحب تدریس کے پیشے سے منسلک رہے اور ایک طویل عرصے تک انجمن حیدریہ میں نوحہ خوانی کے فرائض بھی انجام دیتے رہے ہیں۔ آپ 1953 سے اب تک شاہ فیصل کالونی کے علاقے سادات کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ اپنے اس علاقے سے شدید محبت رکھتے ہیں جس کی بنا پر آپ نے یہ کتاب تحریر کی۔ اس کتاب میں ڈرگ روڈ سادات کالونی میں مہاجرین کی آمد سے لے کر موجودہ دور تک کے زمانے کو بیان کیا گیا ہے اور خاص طور پر اس پرانے دور کو بہت تفصیل سے بیان کیا ہے جس میں مہاجرین نے اپنی زندگیوں کو صفر سے شروع کیا۔ اس طرح اس کتاب میں سادات کالونی ڈرگ روڈ کی پوری تاریخ محفوظ ہو گئی ہے۔

جناب ظہیر صاحب چونکہ خود ایک طویل عرصے تک اس علاقے کی سب سے مشہور ماتمی انجمن حیدریہ کے صاحب بیاض رہ چکے ہیں اور خود اس پورے علاقے میں ہر جگہ عزاداری کا حصہ رہے ہیں اس لیے انہوں نے اپنے علاقے سادات کالونی کی عزاداری کو بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں ہونے والی مجالس، جلوس، محفل میلاد اور دیگر مذہبی سرگرمیوں کو خاص ترتیب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جب کہ اس علاقے میں موجود دیگر مسجد اور امام بارگاہوں کے بارے میں بھی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

ظہیر صاحب نے کتاب میں ایک الگ باب بنا کر سادات کالونی سے تعلق رکھنے والے تمام شعراء اور دیگر مشاہیر کا بھی الگ الگ تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ پرانے وقتوں میں یہاں پر ہونے والی تمام اسپورٹس کی سرگرمیوں کو بھی تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب 184 صفحات پر مشتمل ہے جس میں جگہ جگہ نایاب تصاویر بھی لگائی گئی ہیں۔

کتاب: نارتھ کراچی نصف صدی کا قصہ

مصنف: شاہ ولی اللہ جنیدی
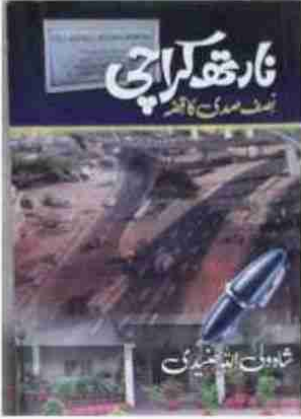
شاہ ولی اللہ جنیدی معروف مصنف، محقق و صحافی ہیں، پیر طریقت حضرت سید شاہ محمد خلیل اللہ جنیدی علیہ الرحمتہ کے صاحبزادے کراچی پر تحقیق کی راہ پر گامزن ہیں، لڑکپن میں خاندان کے ساتھ ناظم آباد سے نارتھ کراچی منتقل ہوئے اور یہیں کے ہو رہے، اسے اپنا گلشن قرار دیتے ہیں اور اسکی الفت میں مداح سرا ہیں، نارتھ کراچی کی ابتداا ور ارتقاء کو موضوع بنا کر تقریباً ساٹھ صفحات کی کتاب ترتیب دی گویا تاریخ کے طلباء کو بہترین یادداشتوں کا خوبصورت تحفہ دیا۔ حالیہ ملاقات میں انتہائی خلوص سے یہ کتاب نذر کی، جزاکم اللہ خیر، آیئے اسکے مندرجات کا جائزہ لیتے ہیں۔

نارتھ کراچی کی تشکیل کا مقصد ایک ایسے علاقہ کا قیام تھا جسکا مقصد دارالخلافہ کراچی میں سرکاری افسران کی رہائش کے لئے بین الاقوامی معیار کا جدید ترین خوبصورت انفرااسٹرکچر قائم کرنا تھا، مگر اے بساء آرزو کہ خاک شدہ، کراچی کا دارالحکومت کا اسٹیٹس برقرار نہ رہ سکا اور یہ اسکیم سہاگن بننے کی بجائے بیوگی کا روپ دھار گئی۔

کراچی کے دیگر علاقوں کی طرح نارتھ کراچی بھی کبھی کھیتوں سے آباد سرسبز سرزمین ہوگی، جب بسی تو مکانوں اور مکینوں سے آباد ہوئی، سرکار نے یہاں مکانات بنوائے تو ایک مکان کی چابی صدر ایوب خان نے مکین کے حوالے کرکے بستی بسانے کا آغاز کیا۔ شاہ صاحب اپنی یادیں جگاتیں ہیں کہ سنہ ۱۹۸۰ تک جہاں گلشن کنیز فاطمہ ہے یہیں ناصر بروہی کے کھیت ہوتے تھے جہاں سے روز کے روز تازہ سبزیاں لانا نارتھ کراچی کے باشندوں کے لئے نعمت سے کم نہ تھا۔

انڈہ موڑ، کریلا چوک اور ناگن چورنگی کہلائے جانے کی دلچسپ وجہ تسمیہ کے ساتھ سڑکوں اور ٹرانسپورٹ کا تذکرہ ہے، مکمل علاقے کی ہر اعتبار سے باریک بینی سے کی گئی منظر کشی تاریخ کے اوراق میں حسن خوبی سے محفوظ کی گئی ہے۔

نارتھ کراچی کا محل وقوع، شہری سہولیات، سیاست، درسگاہیں، علم ادب، کھیل اور کھلاڑی، اور مسائل، شاہ صاحب نے گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے، شہر خموشاں اور اس کی خاک میں آسودہ کل کے جیتے جاگتے کردار جو اس بستی کے مکین تھے ان کا تذکرہ جیسے پاکستان کے پہلے پرچم ساز ماسٹر افضال اور ماسٹر الطاف جو اسی بستی کے رہائشی تھے، مہدی حسن بھی یہیں آسودہ خاک ہیں۔

بلاشبہ یہ ایک بہترین کتاب ہے جسکی تحریر پر شاہ صاحب ستائش کے مستحق ہیں۔

کتاب: شکستہ تہذیب (ناظم آباد کی تاریخ)

مصنف: شاہ ولی اللہ جنیدی

تبصرہ نگار: اقبال اے رحمٰن
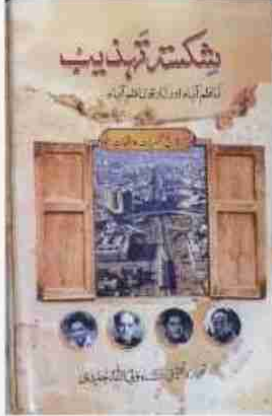
تمھارے شہر کی ہر چھاؤں مہرباں تھی مگر
جہاں پہ دھوپ کھڑی تھی وہاں شجر ہی نہ تھا
سمیٹ لیتی شکستہ گلاب کی خوشبو
ہوا کے ہاتھ میں ایسا کوئی ہنر ہی نہ تھا
(پروین شاکر)

ناظم آباد کبھی خوشبوؤں سے بسا چمن تھا جسکی خوشبو صبا سنبھال نہ سکی۔ معروف صحافی و محقق شاہ ولی اللہ جنیدی نے اس سرزمین کا نوحہ لکھا ہے، جو نوحہ تو ہے ہی مگر اس اجڑے چمن کا قصیدہ بھی ہے جس چمن کو خزاں نے نگل لیا۔

وہ ہجرت جو بتدریج اور منظم طور پر ہونا قرار پائی تھی جبراًفی الفور مسلط کر دی گئی، قافلوں کی صورت مہاجروں کی آمد نے کراچی کو جھگیوں کا شہر بنا دیا تھا، مگر حکومت پاکستان نے انتہائی بہادری اور زمہ داری سے اس للکار کو قبول کرتے ہوئے حسن انتظام سے بستیاں بسانے کا آغاز کر دیا،

وقت، محنت سرمایہ سب کچھ لگا مگر اتنا ہوا کہ جھگیاں ختم ہو گئیں، اور اہل وطن قابل عزت طور پر رہنے بسنے کے قابل ہو گئے، مکان، زمین یا احاطہ جو کچھ ممکن ہوا حکومت نے فراہم کیا، آج وہی زمیں کروڑوں کی ملکیت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ ایسی بہت ساری بستیوں میں سے سب سے نمایاں ناظم آباد ہے۔ حکومت پاکستان نے لیاری ندی کے پرلی طرف دیہہ بیرانو میں قبائلی بروہی سردار مستی خان سے ایک ہزار ایکڑ پر مشتمل بنجر زمین خرید کر 11 فروری 1950 کو ایک رہائشی منصوبے کی بنیاد رکھی، اس منصوبے کی تعمیر و آبادکاری میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے خصوصی دلچسپی کے سبب یہ منصوبہ ناظم آباد کہلایا۔

یہ بستی کیا بسی امروہہ، آگرہ، دلی، دکن، رامپور، لکھنؤ و مراد آباد گویا پورے ہندوستان کی مسلم تہذیب یہاں سمٹ آئی، نابغہ روزگار ہستیوں کی آمد کے سبب ناظم آباد نے جو رنگ وروپ اختیار کیا، شاہ صاحب Shah Waliullah نے ناظم آباد کی اسی آب وتاب کا تذکرہ کیا ہے، تاریخ، تہذیب، شخصیات، سماجیات، روایات، واقعات، تعلیمی ادارے، علاقے بستیاں اور مسلم لیگ کوارٹرز، سب کچھ اس کتاب میں سمو دیا گیا ہے۔

رسمی تعارف اور تفصیلات کے بعد ناظم آباد ایک تا 5 اور شمالی ناظم آباد کی سیر کتاب کا انتہائی دلچسپ اور معلوماتی حصہ بلکہ کتاب کی جان ہے، سادہ دور کی قد آور شخصیات کا تذکرہ خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ معروف صحافی نصر اللہ خان کا پیپی ڈیل اور علامہ رضی حیدر کا حسینی اسکول اور انکی شاندار خدمات، گول مارکیٹ اور گھر کی چوتھی منزل پر قربانی کے جانوروں کی پرورش کی کہانی، ڈاکو بھوپت کا تذکرہ یہ سب کچھ بہت خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ شخصیات کے ضمن میں کمال کی معلومات ہیں، جیسے 1970 میں ہادی مارکیٹ میں صدر مملکت ڈاکٹر عارف علوی کے والد ڈاکٹر حبیب الرحمن علوی کا ڈینٹل کلینک تھا، ڈاکٹر صاحب بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کے ڈینٹسٹ رہ چکے ہیں۔ اسی طرح سے ممتاز ناول نگار اور ماہر شکاریات نیز مترجم ابوالفضل صدیقی کی رہائش ناظم آباد نمبر 3 میں تھی جن کے مکان کے زیریں حصے میں کرکٹر انتخاب عالم رہائش پزیر تھے۔ نارتھ ناظم آباد اولاً تیموریہ سے معروف ہوا، اس نام کے محرک کون تھے اور اسطرح کی بہت سی معلومات کتاب کا حصہ ہیں۔ ناظم آباد میں برپا ہونے والے ہنگامے، حادثات و جرائم کے تذکرہ نے مذکورہ واقعات کو تاریخ میں محفوظ کر دیا ہے۔ شاہ صاحب اپنی اس کاوش کے بارے میں کیا کہتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

''اس کوشش کو ناظم آباد اور نارتھ کراچی کی تاریخ نہ سمجھا جائے، یہ یہاں مقیم شخصیات اور اس علاقے میں پیش آنے والے واقعات کا تشنہ سا جائزہ ہے جسکے پس پشت جذبہ علاقے سے اپنی محبت کا اظہار ہے''۔

کتاب کا خوبصورت سرورق یوسف تنویر صاحب کی کاوش ہے، دیباچہ خواجہ رضی حیدر اور ڈاکٹر پیرزادہ قاسم نے تحریر کیا ہے۔
اس شاندار کتاب کے اجراء پر بہت بہت مبارکباد۔

امتحانات کے زمانے میں لائبریری کے اوقات میں اضافہ

میٹرک اور انٹر کے امتحانات کے قریب آنے کی وجہ سے جعفر طیار لائبریری کے اوقات بڑھا کر دوپہر 2 سے رات 10 بجے تک کر دیئے گئے۔ لوڈشیڈنگ کی اس بری صورتحال اور گرمی کی شدّت کے دوران لائبریری انتظامیہ کے اس اقدام کو طلباء نے بہت سراہا اور بھرپور استفادہ کیا۔ امتحانات کے زمانے میں لوڈشیڈنگ کے اوقات میں جعفر طیار لائبریری میں طلباء امتحانات کی تیاری کرتے

کتاب: جعفر طیار سوسائٹی: یہ نصف صدی کا قصہ ہے

مصنف: پروفیسر سید عمران ظفر

تبصرہ نگار: پروفیسر اقبال شاہ حماد
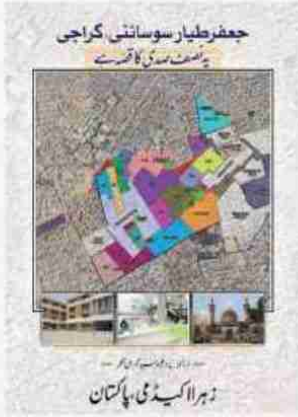
اس سے پہلے پروفیسر عمران ظفر کی تین کتابیں کراچی کی عزاداری جلد اول، کراچی کی عزاداری جلد دوم اور خود شناسی منظر عام پر آچکی ہیں اور پڑھے لکھے حلقوں میں اس کو بڑی پذیرائی بھی ملی ہے۔ زیر نظر کتاب مصنف کی چوتھی کتاب ہے جو پاکستان میں جعفر طیار سوسائٹی کے بارے میں ہے۔

اس کتاب کی ابتدا بڑے منظم طریقے سے کی گئی ہے۔ جعفر طیار سوسائٹی ضلع ملیر میں ہے اور ضلع ملیر کراچی میں ہے اس لیے سب سے پہلے کراچی کی مختصر تاریخ پھر ملیر کی مختصر تاریخ اور پھر جعفر طیار سوسائٹی کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جعفر طیار سوسائٹی کی تمام سرگرمیوں کو انتہائی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد جعفر طیار سوسائٹی کے بارے میں معلومات کی کوئی تشنگی محسوس نہیں ہوتی۔ اسے جعفر طیار سوسائٹی کا انسائیکلوپیڈیا بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب دراصل ایک ایسی تہذیب کی داستان ہے جس نے اپنی علمی شناخت کو حاصل کرنے کے لیے باقاعدہ جدوجہد کی ہے. اس کتاب کا مطالعہ کر کے باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ملیر جیسے مضافاتی علاقے میں ہوتے ہوئے جعفر طیار سوسائٹی نے کتنے بہترین انداز میں اپنے معیار زندگی کو بلند کیا ہے اور اپنی علمی و ادبی شناخت کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے. پروفیسر عمران ظفر نے اس کتاب میں جو معلومات فراہم کی ہیں یہ ان کا آنکھوں دیکھا حال نہیں ہے کیونکہ جعفر طیار سوسائٹی کی عمران کی عمر سے 7 سال زیادہ ہے لہذا اس کتاب کا مواد جمع کرنے میں ان کی لگن اور بہت زیادہ محنت شامل ہے جو قابل ستائش ہے۔

یہ کتاب خاص طور پر اس وقت جعفر طیار میں موجود جوان نسل اور آئندہ آنے والی نسلوں کی بھی رہنمائی کرتی رہے گی۔ تحریر اس قدر پر اثر ہے کہ مشکل سے یقین آتا ہے کہ کامرس کا ایک پروفیسر ایسی کتاب بھی لکھ سکتا ہے۔ دراصل اس کتاب میں ان کی گزشتہ کتابوں کا تجربہ بھی شامل ہے۔

جعفر طیار سوسائٹی پر ایسی مکمل اور مفصل کتاب تحریر کرنے پر میں پروفیسر عمران ظفر کو دلی تہنیت پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ علم دوست حلقوں میں کتاب کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور دعا گو ہوں کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔
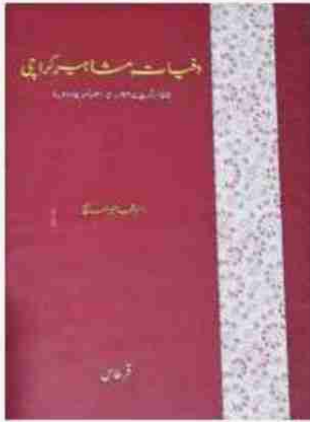
وفوفیاتِ مشاہیر کراچی
(15 اگست 1947 تا 31 دسمبر 2015)
مصنف: ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ
تبصرہ نگار: ڈاکٹر روف پاریکھ

ڈاکٹر منیر احمد سلیچ پیشے کے لحاظ سے طبیب ہیں اور ذہنی مریضوں کے علاج و معالجے میں مصروف رہتے ہیں۔ میڈیکل کالج میں درس دیتے ہیں۔ لیکن ان کے ادبی شوق اور تحقیقی ذوق نے ان سے بعض عجیب و غریب ادبی و تحقیقی کام کرائے ہیں۔ ان کاموں کو دیکھ کر جب راقم نے برادرم عقیل عباس جعفری سے ان کا ذکر کیا تو کہنے لگے بہت جلد ان کا وفوفیات پر ایک اور کام آرہا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور واقعی جب منیر احمد سلیچ کی مرتبہ "وفوفیات ناموارن پاکستان "2006 میں اردو سائنس بورڈ سے چھپ کر آئی تو راقم دنگ رہ گیا۔ اس کتاب میں انہوں نے 10 ہزار کے قریب پاکستانی مشاہر کی وفوفیات اور متعلقہ معلومات بڑے منظم انداز میں مختصراً درج کی ہیں۔

اردو ادب اور زبان پر تحقیق کرنے والے طلبہ وطالبات کو اکثر یہ شکوہ رہتا ہے کہ کراچی کی فلاں فلاں شخصیات کے بارے میں نہایت مختصر معلومات ملتی ہیں اور بعض ادیبوں یا شاعروں کی کتابوں کے نام تک کہیں دستیاب نہیں ہوتے۔ احمد حسین صدیقی صاحب نے 5 جلدوں میں "دبستان کا دبستان کراچی" لکھ کر اس کمی کو کسی حد تک پورا کیا ہے لیکن انہوں نے اپنے کام کو بیشتر اہل قلم تک محدود رکھا ہے۔ دیگر شعبوں سے متعلق کراچی کی دیگر شخصیات کی وفوفیات بالعموم آسانی سے نہیں ملتیں۔ پھر ان 5 جلدوں میں 900 کے قریب اہل قلم کا احوال ملتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر منیر احمد سلیچ کی زیر نظر کتاب میں کراچی سے تعلق رکھنے والے ڈھائی ہزار سے زیادہ مشاہیر جن میں اہل قلم کے علاوہ دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی معروف وکم معروف شخصیات بھی شامل ہیں، کی سوانحی تفصیلات بشمول تاریخ پیدائش ووفات، ان کی ادبی یا دیگر شعبوں میں مصروفیات، کارہائے نمایاں نیز بعض دیگر اہم معلومات موجود ہیں۔ اس کتاب میں 1947 سے 2015 کے درمیان وفات پانے والے مشاہیر کراچی کا ذکر ہے۔ درحقیقت منیر سلیچ کی یہ کتاب یعنی "وفوفیات مشاہیر کراچی "ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ معلومات نہایت معروضی، غیر جذباتی اور محققانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ یہ امر باعث اطمینان اور مسرت ہے کہ سلیچ صاحب نے ہر شخصیت کے بارے میں پوری تحقیق کے بعد قلم اٹھایا ہے اور وفوفیات کے ضمن میں ایسی احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے جس میں ہمارے بزرگ تاریخ نویسوں اور محققوں نے قابل فخر مثالیں قائم کی تھیں۔ انہوں نے نہ صرف احتیاط سے کام لیا ہے بلکہ مکمل معلومات پیش کی ہیں اور ضروری ماخذات کا ذکر بھی ماخذ میں مختصراً کر دیا ہے۔ اسی لیے اس کتاب کے بارے میں ادھورے حوالوں یا ناقص معلومات ہونے کی شکایات سننے میں نہیں آئے گی، جیسا کہ مشاہیر کراچی کے سلسلے میں لکھی گئی بعض دیگر تحریروں کے بارے میں سنی جاتی ہے۔
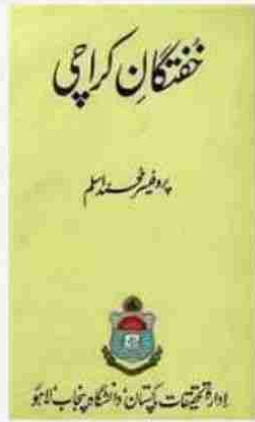
خفتگان کراچی
تحریر: پروفیسر محمد اسلم

معروف محقق جناب پروفیسر محمد اسلم صاحب کو پاکستان میں وفیات نگاری کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔
آپ 28 نومبر 1932 کو پھلور ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی ساری تعلیم لاہور میں ہی مکمل ہوئی۔ ایم اے کرنے کے بعد آپ انگلستان چلے گئے جہاں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ واپس آکر پنجاب یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے اور اسی شعبے کے صدر شعبہ بن کر ریٹائر ہوئے۔ آپ نے بے شمار کتابیں تحریر کیں لیکن ان میں وفیات مشاہیر پاکستان، وفیات اعیان پاکستان، خفتگان کراچی اور خفتگان خاک لاہور سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ پاکستان میں پہلے محقق ہیں جس نے وفیات نگاری پر باقاعدہ کام کیا۔

خفتگان کراچی نومبر 1991 میں ادارہ تحقیقات پاکستان پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے شائع ہوئی۔ 372 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کراچی کے 17 بڑے قبرستانوں میں مدفون تقریبا 450 مشاہر کی الواع قبور نقل کی گئی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ مختصر تعارف بھی دیا گیا ہے۔ آخر میں 15 ایسے مشاہیر کی بھی فہرست دی گئی ہے جن کی قبور کی نشاندہی نہیں ہو سکی مگر ان کا تعلق کراچی سے ہی تھا۔ کتاب کا تحقیقی معیار نہایت بلند ہے۔ مگر اس کتاب میں 17 قبرستانوں کے علاوہ دیگر اور بہت سے قبرستانوں میں مدفن مشاہیروں کا ذکر نہیں آسکا۔

اس کتاب میں شامل شخصیات کی اکثریت معروف لوگوں پر مشتمل ہے اور ان کی لوح قبر کے ساتھ ساتھ تفصیل بھی موجود ہے مگر وہ لوگ جو کم معروف ہیں ان کی لوح قبر کے ساتھ تعارف ذرا کم ہے جس کی شدید ضرورت تھی تاہم اس کتاب میں موجود ہر معلومات سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

کتاب: کراچی میں مدفون مشاہر

مصنف: ایم ار شاہد

تبصرہ نگار: ناصر زیدی

آج کے دورِ نفسا نفسی میں جبکہ زندوں کو کوئی نہیں پوچھتا، اے آر شاہد صاحب مردوں کی خبر لے رہے ہیں اور تمام اردو داں حلقوں کو خبر دے رہے ہیں کہ کون سی بڑی شخصیت کہاں مدفون ہے؟ حال ہی میں ''کراچی میں مدفون مشاہیر'' کے نام سے ان کی کتاب نے خاصا غلغلہ بلند کیا ہے۔ یوں تو ان سے پہلے بھی یہ کام پروفیسر محمد اسلم ''خفتگانِ کراچی'' کے عنوان سے کر چکے ہیں مگر اے آر شاہد نے اس کام کو خاصی وسعت دے دی ہے لگ بھگ چھ سو صفحات کی کتاب میں بزرگانِ دین، شاعر، ادیب نقاد، صحافی، کارکنانِ تحریک پاکستان، شہداء وطن، فلم ٹی وی اور ریڈیو کی دنیا کے باسی، ماہر طب، ماہر تعلیم، ماہر قانون، کھلاڑی، خطاط مصور، مجسمہ ساز، اہم سیاسی اور سماجی شخصیات لگ بھگ پانچ سو کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ قبروں کے کتبوں پر کندہ اشعار کا باب الگ ہے۔ عجیب اور تاریخی قبرستان کا دلچسپ احوال بھی ہے اور آخر میں چھپتے چھپتے کچھ اہم شخصیات کے حوالے سے موصولہ معلومات کو بھی کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یوں کتاب ہر لحاظ سے اہمیت وافادیت کی حامل ہو گئی ہے مگر اغلاط کی بھرمار کی وجہ سے پڑھتے ہوئے ذہنی کوفت کا شکار ہونا پڑتا ہے.....!

اس کتاب سے قبل ایم آر شاہد صاحب کی چار کتابیں اسی موضوع پر چھپ کر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں جن میں ''لاہور میں مدفون مشاہیر''، ''شہر خموشاں کے مکین''، ''شہیدانِ وطن'' اور ''شہدائے پنجاب پولیس'' شامل ہیں۔ ''لاہور میں مدفون مشاہیر'' میں لاہور کے ایک سو پانچ قبرستانوں کے مکینوں کا حال احوال درج ہے۔ دوسری کتاب ''شہر خموشاں کے مکین'' میں اسلام آباد، راولپنڈی میں آسودۂ خاک نامور ہستیوں کا ذکر، مذکور ہے۔ تیسری کتاب ''شہدائے وطن'' میں ان عظیم جاں باز شہدائے وطن کا ذکر ہے جنہوں نے اپنا آج ہمارے خوشگوار کل کے لئے قربان کر دیا اور ''شہدائے پنجاب پولیس'' میں اے آر شاہد نے اپنے محکمے کے سپوتوں کا تذکرہ قلمبند کر کے محکمے میں ملازمت کا بھی حق ادا کیا ہے کہ وہ 27 اپریل 1981ء سے پولیس کے محکمے سے وابستہ ہیں اور خشک ملازمت کے ساتھ ساتھ قرطاس و قلم سے بھی رشتہ استوار رکھے ہوئے ہیں۔

وہ پنجابی اور اُردو دونوں زبانوں میں یکساں رواں ہیں۔ اخبارات و رسائل میں بھی مضامین لکھتے رہتے ہیں مگر اب ان کا اختصاص قبریں اور قبرستان بن چکا ہے اور اس حوالے سے انہیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے اس سال ''تمغۂ امتیاز'' سے نوازا گیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''کراچی میں مدفون مشاہیر'' کی ابتدا میں اے آر شاہد کی کاوش کو سراہنے والوں میں عالمی سیاح مقصود احمد چغتائی، علامہ عبدالستار عاصم، شفیع عقیل، کمال احمد رضوی، احمد حسین صدیقی، محترمہ سعدیہ راشد اور خود مولف و مرتب کتاب اے آر شاہد بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں ''قبرستانوں کی سیاحت کے دوران گورستانِ سخنجسن سے تسلیم فاضلی کی آواز سنائی دیتی ہے:

کیسے مرا وہ کیوں مرا، ہے سب کو جستجو
یہ بھی تو کوئی پوچھے کہ وہ کس طرح جیا؟

کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجموعی تاثر یہ ملتا ہے کہ کراچی میں موجود قبرستان اب تنگیِ داماں کے شکار ہیں اور بقول امداد آکاش وہ وقت دور نہیں جب کیفیت یہ ہوگی کہ :

بشر مقیم تھے قبروں میں اور نئے مردے
سمندروں میں بہائے گئے زمیں کم تھی

کتاب کے آخر میں "وضاحت" کے عنوان سے دو صفحات میں مرقوم کچھ شاعر، ادیب نقاد، صحافی، ماہر تعلیم، خطاط، مصور، فلم ٹی وی، ریڈیو آرٹسٹ، کارکنانِ تحریک پاکستان، ماہر طب، ماہر قانون، کھلاڑی اور اہم سماجی و سیاسی شخصیات ایسی بھی ہیں جو کراچی ہی میں کہیں نہ کہیں دفن ہیں لیکن مولف و محقق و مرتب کتاب کو باوجود تلاش کے علم نہیں ہو سکا کہ یہ لوگ کہاں دفن ہیں؟ اور یہ کوئی گمنام لوگ نہیں ہیں۔ ان میں آرزو لکھنوی، صبا اکبر آبادی، صہبا لکھنوی، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، راغب مراد آبادی، ساقی امروہوی، رضی اختر شوق، امید فاضلی، نثار بزمی، ضیا سرحدی، اسد جعفری، سر آغاخان، فتح یاب علی خان، عبیداللہ علیم اور شاہد احمد دہلوی کے نام بھی شامل ہیں۔

جبکہ ہماری معلومات کے مطابق عبیداللہ علیم باغِ احمد (قادیانی قبرستان) رزاق آباد نزد اسٹیل ملز پپری کراچی میں 18 مئی 1998ء سے مدفون ہیں، وہ 12 جون 1939ء کو بھوپال (انڈیا) میں رحمت اللہ بٹ کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ سیالکوٹ میں بھی رہے پھر مستقل کراچی کو مسکن بنایا اور یہی شہر آخری مسکن ٹھہرا.... وہ ٹی وی کے پروڈیوسر رہے۔ عبیداللہ علیم بہت اچھے شاعر تھے، آخر آخر میں اپنے مسلک کے "تبلیغی" ہو گئے تھے۔ عبیداللہ علیم نے افسانہ نگار ذکاء الرحمن کے بارے میں کبھی لکھا تھا کہ : "منٹو اُردو، افسانے کا بچپن ہے اور ذکاء الرحمن اُردو افسانے کا شباب".... چنانچہ جوابِ ذکاء الرحمن نے اپنے ایک مضمون میں عبیداللہ علیم کو میر تقی میر سے جا بھڑایا۔ "ویسے خود علیم کا بھی دعویٰ یہی تھا کہ :

مجھ سے پہلے میر ہُوا اور اُس کے بعد ہوں میں

کتاب میں ایک پورا باب "قبروں کے کتبوں پر اشعار" کے عنوان سے ہے مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اکثر اشعار غلط سلط نوٹ کر کے درج کئے گئے ہیں اور بہت سے معیاری شعراء کی جانب سے لکھے گئے لوحِ مزار کے اشعار بھی اغلاط کے سبب غیر معیاری ہو گئے ہیں۔

"موت" کے حوالے سے پنڈت برج نرائن چکبست کا یہ شعر ضرب المثل بنا ہوا ہے کہ :

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

اور ہادی مچھلی شہری کے لوحِ مزار کے لئے خود ان کے اپنے لکھے ہوئے یہ دو شعر چکبست کے شعر کی تائید کرتے ہیں کہ :

اک کھلونا ٹوٹتے جس کو نہیں لگتی ہے دیر
زندگی کیا ہے فقط ترکیبِ آب و گل کی بات
عہدِ پیری تک تھیں جتنی منزلیں سب آگئیں
رہ گئی ہے اب تو ہادی آخری منزل کی بات

اور حفیظ ہوشیار پوری کی قبر کا کتبہ ہے:

سوئیں گے حشر تک کہ سبکدوش ہو گئے
بارِ امانتِ غمِ ہستی اُتار کے

اور قیس سہار نپوری نے کیا حقیقت بیان کی ہے:

اے قیس میری قبر کسی کی عطا نہیں
دے کر متاعِ زیست ملا ہے یہ گھر مجھے

جعفر طیار لائبریری میں سال 2023 کا بہترین ورکر

جعفر طیار لائبریری کی سب سے اہم بات اس کا پر سکون ماحول اور انتہائی صفائی ہے جو آنکھوں کو اور انسانی دماغ کو اتنی بھلی لگتی ہے کہ خود سے اس ماحول میں پڑھنے کا دل چاہتا ہے اور یہی جعفر طیار لائبریری کا امتیاز ہے کہ لوگ گھنٹوں بیٹھ کر یہاں پڑھتے ہیں اور فریش رہتے ہیں۔ اس تمام صفائی و ستھرائی کا کریڈٹ صرف ایک شخص کو جاتا ہے یعنی لائبریری کے سب سے پرانے ورکر جناب شفیق صاحب جو بغیر کسی دباؤ اور سختی کے اپنی ذمہ داریوں کو خود سے محسوس کرتے ہوئے جعفر طیار لائبریری کو انتہائی صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ کسی بھی ادارے میں کام کرنے والے افراد تو بہت ہوتے ہیں مگر ان میں سے اکثریت بس ایک مخصوص ٹائم گزارنے کے لیے آتی ہے ادارے سے اس کا کوئی خاص لگاؤ نہیں ہوتا۔

الحمدللہ جعفر طیار لائبریری کو شفیق بھائی کی صورت میں ایسا ورکر میسر آیا ہے جس نے ادارے میں اپنی دی گئی ذمہ داریوں کو باحسن وخوبی ادا کیا ہے، صرف ٹائم نہیں گزارا بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو انتہائی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ جناب شفیق صاحب کی خدمات کے اعتراف میں جعفر طیار لائبریری کی جانب سے ایک تحفہ یوم اقبال کے موقع پر شفیق صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔

بزرگان کراچی

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر ناصر الدین صدیقی قادری

اس کتاب کا بنیادی موضوع کراچی کے مختلف قبرستانوں میں مدفون بزرگان دین اور مشائخ عظام ہیں۔ یہ کتاب 240 صفحات پر مشتمل ہے جبکہ اس کے مؤلف پروفیسر ڈاکٹر ناصر الدین صدیقی قادری ہیں اور اسے مرکز فیض قادریہ احمد رشیدیہ جے بلاک نارتھ ناظم اباد کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اول 1993 میں جبکہ اشاعت دوم 2004 میں منظر عام پر آئی۔ دوسری اشاعت میں تقریبا 58 صفحات کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں 237 بزرگان کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے جو سلاسل اربع سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کی جائے مدفن کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

اس کتاب میں بزرگان کا تذکرہ کسی خاص ترتیب سے نہیں کیا گیا یعنی نہ تو اسے حرف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے نہ سلسلہ طریقت کے اعتبار سے اور نہ ہی قبرستانوں کے لحاظ سے ترتیب دیا گیا ہے بس جیسے جیسے بزرگان کے نام آتے گئے ان کا تذکرہ کتاب میں آتا جاتا ہے۔ اس وجہ سے کسی خاص بزرگ کا نام تلاش کرنا تھوڑا سا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کتاب میں بزرگان سے متعلق جتنی معلومات مصنف کو حاصل ہوئیں انہوں نے فراہم کر دی ہیں مگر کہیں کہیں تشنگی کا احساس ہوتا ہے تاہم اس سلسلے میں یہ ایک بہت بڑا کام ہے کہ پورے کراچی شہر میں مدفون بزرگان کا ڈیٹا اس کتاب کے اندر جمع کر دیا گیا ہے جو تحقیق کرنے والوں کے لیے ہمیشہ ماخذ کے طور پر کام آتا رہے گا۔

کراچی میں مدفون شعرا

مرتب کردہ: اظہر عباس ہاشمی

معاونین: سید معراج جامی، احمد حسین صدیقی، سعید الکبیر اور جاوید منظر

یہ کتاب اظہر عباس ہاشمی نے مرتب کی ہے جبکہ سید معراج جامی احمد حسین صدیقی سعید الکبیر اور جاوید منظر ان کے معاونین ہیں۔ اس کتاب کو ساکنان شہر قائد ٹرسٹ کراچی نے اپریل 2014 میں شائع کیا۔ اس کتاب میں 292 صفحات ہیں۔ اس میں سے ایک 67 صفحات پر مرحوم شعرا کا تذکرہ اور ایک 144 صفحات پر کراچی کے مرحوم شعراء کا منتخب کلام دیا گیا ہے جسے سید معراج جامی نے ترتیب دیا ہے۔ عنوان کی رو سے یہ کتاب بنیادی طور پر وفیات نگاری کے زمرے میں آتی ہے مگر اس میں شعری انتخاب بھی دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شمولیت کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ مرحوم شاعر ہو اور کراچی میں دفن ہو لیکن اس میں پھر بھی پروین شاکر، جوش ملیح آبادی اور ماہر القادری وغیرہ کا ذکر موجود ہے جن کی قبر کراچی میں نہیں تاہم ان کی پہچان کراچی ہی ہے۔

اس کتاب میں ایک بات اور غور طلب ہے کہ کراچی میں صرف 220 شعراء نہیں ہیں۔ اس سے زیادہ مرحوم شعراء تو صرف ضلع کورنگی میں ہی نکل جائیں گے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب مزید جلدوں کی متقاضی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں کراچی میں مدفون شعراء میں سے کچھ شعراء کے بارے میں نہیں بتایا گیا کہ وہ کس قبرستان میں دفن ہیں۔ کتاب میں شعرا کے ذکر کے لیے ترتیب ان کے نام کے شروع کے حرف تہجی سے بنائی گئی ہے۔
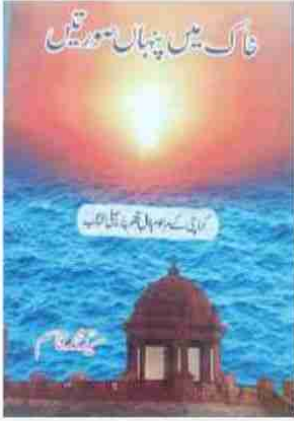
خاک میں پنہاں صورتیں

مصنف: سید محمد قاسم

سید محمد قاسم بنیادی طور پر نثر نگار ہیں اور تذکرہ نگاری، تحقیق، تاریخ، سوانح نگاری اور تنقید کے شعبوں سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ انہوں نے ادبی صحافت بھی کی ہے اور ایک سہائی مجلہ تذکرے کے نام سے جاری کیا تھا۔ خاک میں پنہا صورتیں لکھنے سے قبل آپ کی ایک اہم تصنیف پاکستان کے نعت گو شعراء جو 4 جلدوں پر مشتمل ہے منظر عام پر آچکی ہیں۔

سید محمد قاسم نے اپنے آپ کو نعت گو شعراء ہی کے تذکرے تک محدود رکھا تھا مگر اب کراچی کی محبت میں کراچی کے مرحوم اہل قلم پر قلم اٹھایا ہے اور 500 سے کچھ زیادہ اہل قلم کے بارے میں تذکرہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہر بے مثال کراچی میں مدفون شعرا و ادبا کی تعداد ہزاروں میں ہے لیکن جناب سید محمد قاسم صاحب نے آغاز کیا ہے یہ اس سلسلے میں ان کی پہلی جلد بھی تصور کی جاسکتی ہے۔ کتاب میں اہل قلم کے تذکرے کو ان کے نام کے حروف تہجی کے اعتبار سے رکھا گیا ہے۔

شعرا کے تذکرے میں کوشش کی گئی ہے کہ ان کے بہترین کلام کو بھی پیش کیا جائے۔ جبکہ ادبا کے تذکرے میں کوشش کی گئی ہے کہ ان کی شائع ہونے والی تمام کتابوں کا ذکر کیا جائے اور ساتھ ساتھ حالات زندگی بھی مختصر انداز میں بیان کر دی جائیں۔ اس کے علاوہ ہر اہل قلم کے ذکر کے بعد لازمی ماخذ کتابوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

سہ ماہی برقی مجلہ

تفکر (کراچی نمبر - حصہ سوم)

اپریل - جون 2024

جعفر طیار لائبریری

 www.jtlibrary.org

 JaffareTayyarLibraryOfficial

 +92 317 24 86 365

حرف آغاز

جعفر طیار لائبریری کی جانب سے سہ ماہی برقی مجلے تفکر کا اس بار کراچی نمبر نکالا جا رہا ہے جو 3 حصوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ تینوں حصے ایک ساتھ جاری کیے جا رہے ہیں۔

پہلا حصہ

پہلے حصے میں صرف ان مضامین کو شامل کیا گیا ہے جو کسی نہ کسی طریقے سے کراچی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کو بھی ایک خاص ترتیب سے رکھا گیا ہے پہلے کراچی کی تاریخ سے متعلق اور براہ راست کراچی سے متعلق مضامین رکھے گئے ہیں۔ اس کے بعد کراچی شہر کی مختلف آبادیوں کی تاریخ اور ان کے بارے میں مضامین ترتیب وار رکھے گئے ہیں۔ اور آخر میں وہ مضامین رکھے گئے ہیں جو کراچی کی کسی مخصوص تاریخ یا شناخت سے متعلق ہیں۔

دوسرا حصہ

دوسرے حصے میں کراچی شہر پر لکھی جانے والی کتابوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ کراچی شہر اور اس کے باسیوں پر لکھی جانے والی تمام کتابوں کا تعارف پیش کیا جائے. اس لیے شہر کے کسی مخصوص علاقے پر لکھی جانے والی کتابیں اور مخصوص عنوانات پر بھی لکھی گئی کتابوں کے تعارف کو بھی شامل کیا گیا ہے. دوسری جانب کراچی شہر پر وفیات کے موضوع پر لکھی گئیں کتابوں کا تعارف بھی اس حصے میں موجود ہے۔

تیسرا حصہ

تیسرے حصے میں کراچی شہر کے وفات پا جانے والے مشاہیر کا مختصر تعارف پیش کیا گیا ہے وہ بھی ان کی وفات کی تاریخ کے اعتبار سے۔

کوئی بھی شخص ان تینوں حصوں کا مطالعہ کر کے کراچی شہر سے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتا ہے۔ یہ مجلہ انشاءاللہ کراچی شہر کو جاننے کا شوق رکھنے والوں اور کراچی پر لکھنے اور تحقیق کرنے والوں کے لیے کافی مددگار ثابت ہو گا۔
کراچی شہر پر لکھے جانے والے کچھ مضامین جو سوشل میڈیا پر موجود تھے ان کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ مگر کچھ پر مضمون لکھنے والے کے نام کا تحریر نہ ہونے کی وجہ سے نام نہیں دیا گیا۔ کیونکہ یہ ایک برقی مجلہ ہے اس لیے مضمون کے لکھنے والے کے نام کا پتہ چلتے ہی ان کا نام تحریر کر دیا جائے گا۔ کسی بھی مضمون میں پیش کی گئی رائے مصنف کی زاتی رائے ہوتی ہے، جس سے برقی مجلہ تفکر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

اخبار رفتگان

جعفر طیار لائبریری کی جانب سے مسلسل 3 سال تک نکلنے والے سہ روزہ اخبار رفتگان میں سے میگزین تفکر کے کراچی نمبر کی مناسبت سے کراچی کے وفات پاجانے والے مشاہیر کا ان کی تاریخ وفات کے اعتبار سے ترتیب وار مختصر تعارف مستند کتابوں سے خاص طور پر پاکستان کرونیکل، انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا اور دیگر کتابوں سے پیش کیا جارہا ہے. یہ مختصر تعارف 30 اپریل 2022ء تک وفات پاجانے والے مشاہیر پر مشتمل ہے.

حبیب ابراہیم رحمت اللہ

2 جنوری 1991 کو ممتاز تاجر اور تحریک پاکستان کے رہنما حبیب ابراہیم رحمت اللہ کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 10 مارچ 1912 کو بمبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد سر ابراہیم رحمت اللہ 1892 سے 1918 تک ممبئی میونسپل کارپوریشن کے رکن رہے اور 1931 سے لے کر 1934 تک مرکزی قانون ساز اسمبلی کے صدر بھی رہے تھے۔ آپ نے ممبئی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آپ نے قیام پاکستان سے قبل قائد اعظم کی رفاقت اور ان کی ہدایت کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے ایوان تجارت وصنعت قائم کیا اس کے علاوہ آپ نے بینکنگ، شپنگ اور فضائی کمپنیوں کے شعبوں میں مسلم کمرشل بینک، محمدی اورینٹ ایئرویز اور محمدی اسٹیم شپ کمپنی کی داغ بیل ڈالی۔ 1953 میں آپ فرانس کے سفیر رہے اور پھر بعد میں سندھ کے گورنر اور پنجاب کے گورنر بھی مقرر ہوئے. 1958 میں ایوب خان نے کراچی کے مسائل کے حل کے سلسلے میں آپ کو کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کا چیئرمین منتخب کیا۔ 1969 میں آپ کو ریڈ کراس کا سربراہ بنایا گیا اور 1972 میں اس وقت مستعفی ہوئے جب آخری جنگی قیدی بھی پاکستان واپس آگیا۔

سیٹھ احمد داؤد

2 جنوری 2002 کو پاکستان کے نامور صنعتکار اور سماجی کارکن سیٹھ احمد داؤد کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1905 میں کاٹھیاواڑ کے شہر بانٹوا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے تعلیم بہت معمولی حاصل کی تھی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں سوت اور ریان کے ڈیلر کی حیثیت سے کاروبار شروع کیا اور جلد ہی درآمد اور برآمد بھی کرنے لگے۔ دریں اثناء کاٹن اور بناسپتی گھی کا کارخانہ بھی قائم کیا اور بہت تیزی سے داؤد گروپ کے دفاتر کلکتہ، مدراس، کانپور اور دہلی میں بھی قائم ہوگئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے اپنا تمام سرمایہ پاکستان منتقل کیا اور ایک صف اول کے صنعت کار کی حیثیت سے پاکستان کی معیشت کو مستحکم کرنے اور صنعتی میدان میں آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور پورے پاکستان میں کارخانے قائم کیے۔ سقوط ڈھاکہ کے وقت متعدد کارخانے وہیں رہ گئے اسی طرح 1974 میں صنعتی یونٹوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا تو داؤد گروپ کے بھی اکثر کارخانے قومی ملکیت میں چلے گئے۔

1961 میں آپ نے 5 کروڑ کے سرمائے سے الگ فلاحی قومی ادارہ داؤد فاؤنڈیشن قائم کیا جس کے تحت داؤد کالج آف انجینیئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی میں قائم کیا گیا دیگر کالجوں، ہسپتالوں، میٹرنیٹی ہوم اور رفائی اداروں کی مالی اعانت کی گئی۔ رائٹرز گلڈ کے تعاون سے داؤد ادبی انعام کا اجرا کیا گیا اور داؤد کالونی تعمیر کروائی۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ہلال خدمت کا اعزاز عطا کیا۔

بیگم زبیدہ طارق

4 جنوری 2018 کو پاکستان کی نامور ماہر امور خانہ داری زبیدہ طارق کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ 4 اپریل 1945 کو پیدا ہوئی تھیں۔ آپ کا تعلق ایک علمی خانوادے سے تھا آپ کے گھر میں مایہ ناز مصنفہ فاطمہ ثریا بجیا اور منفرد لہجے کی شاعرہ زہرہ نگاہ اور بھائیوں میں نامور مزاح نگار انور مقصود اور معروف سول سرونٹ احمد مقصود شامل ہیں۔ چار کامیاب بھائی بہنوں کے درمیان گمنام زندگی گزارنے والی زبیدہ آپا کا کیریئر 1996 کے لگ بھگ شروع ہوا اور انہوں نے کوکنگ ایڈوائزر کی حیثیت سے شوبز میں قدم رکھا اور اپنے کوکنگ شوز اور ٹوٹکوں کے ذریعے اس قدر ہر دلعزیز ہو گئیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے ہر خاندان کی رکن بن گئیں۔ آپ نے نجی ٹی وی چینلز سے جو کوکنگ شوز، ٹاک شوز اور مارننگ شوز کئے ان کی تعداد تقریباً 4000 بنتی ہے۔

سید محمد جعفری

7 جنوری 1978 کو اردو کے نامور مزاح گو شاعر سید محمد جعفری کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 27 دسمبر 1905 کو بھرت پور کی ایک بستی پہر سر میں پیدا ہوئے تھے۔ اسی پہر سر میں آپ کے جد اعلی سید جلال الدین کا مزار بھی ہے۔ 1906 میں جب آپ کے والد سید محمد علی جعفری اسلامیہ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل بنے تو پھر آپ بھی ان کے ساتھ لاہور آ گئے اور آپ کی تعلیم لاہور میں ہی مکمل ہوئی۔ آپ کچھ عرصہ لکھنؤ میں بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کا خاندان جو کہ پہر سر میں آباد تھا آگ اور خون کا دریا عبور کر کے 100 سے زیادہ شہداء کی قربانی دے کر پاکستان آ گیا اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ آپ ایک صاحب اسلوب شاعر تھے آپ نے سیاسی اور سماجی موضوعات پر 900 کے لگ بھگ نظمیں لکھیں۔ آپ نے غالب اور اقبال کے جن مصرعوں کی تضمین کی ہے اس کی کوئی اور مثال اردو شاعری میں نظر نہیں آتی۔ آپ کی جس پیروڈی کو سب سے زیادہ شہرت ملی وہ نظیر اکبر آبادی کی نظم "جب لاد چلے گا بنجارہ" ہے۔

نگار صہبائی

8 جنوری 2004 کو اردو کے ممتاز گیت نگار شاعر نگار صہبائی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 7 اگست 1926 کو ناگپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام محمد سعید تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے مدراس اور ناگپور سے حاصل کی اور قیام پاکستان کے بعد آپ نے مستقل سکونت کراچی میں اختیار کی اور مزید تعلیم جامعہ کراچی سے حاصل کی۔ آپ نے شاعری کی تربیت اپنے ماموں عبدالوہاب سے لی۔

ابتداء میں آپ نے شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھے اور ساتھ مصوری کا بھی شوق رہا۔ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے بعد آپ گیت نگاری کی طرف مائل ہوئے اور اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے شہرت حاصل کی۔ آپ کے تین مجموعے جیون درپن، من گاگرہ اور انت سے آگے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

9 جنوری 2013 کو اردو کے ممتاز نقاد ماہر تعلیم اور انگریزی کالم نگار ڈاکٹر محمد علی صدیقی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 7 مارچ 1938 کو ہندوستان کے شہر امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے خاندان کے ساتھ کراچی آگئے۔ ڈی جے کالج سے انٹر کرنے کے بعد آپ نے انگریزی ادب میں ماسٹرز اور مطالعہ پاکستان میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں کراچی یونیورسٹی سے حاصل کیں۔ پی ایچ ڈی کے بعد آپ نے دوبارہ اسی موضوع پر ڈی لٹ کیا۔ آپ کو انگریزی فرانسیسی، فارسی، پنجابی، سندھی، سرائیکی اور اردو سمیت کئی زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔ آپ پاکستان اور بیرون پاکستان کئی ادبی تنظیموں کے رکن تھے اس کے علاوہ برطانیہ کینیڈا اور ناروے کی جامعات میں لیکچر کے لیے آپ کو مدعو کیا جاتا تھا۔ آپ نے 100 سے زیادہ ریسرچ آرٹیکل تحریر کیے اس کے علاوہ آپ روزنامہ ڈان میں ایریل کے نام سے کئی دہائیوں تک ادبی سماجی کالم لکھتے رہے۔ آپ نے بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح پر کئی تصانیف اور تالیفات یادگار چھوڑیں۔ اس کے علاوہ آپ کی کتابوں توازن اور کروچے کی سرگزشت کو سال کی بہترین کتابوں کے ایوارڈ حاصل ہوئے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ اس کے علاوہ کینیڈین ایسوسی ایشن آف ساؤتھ ایشین اسٹڈیز نے آپ کو بہترین اسکالر کے اعزاز سے نوازا۔

حکیم محمود احمد برکاتی

9 جنوری 2013 کو معروف معالج اور ادیب حکیم محمود احمد برکاتی کراچی میں قتل کر دیے گئے۔ آپ اکتوبر 1924 کو ٹونک میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ ہمدرد نونہال کے مدیر مسعود احمد برکاتی کے بڑے بھائی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد دونوں بھائی کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ کراچی میں آپ نے کچھ عرصہ بہت برے حالات میں انتہائی غربت کے عالم میں گزارا۔ رفتہ رفتہ حکمت میں آپ کا نام مشہور ہو گیا۔ آپ بلند پایہ ادیب بھی تھے آپ کی تصانیف میں فضل حق خیر آبادی اور سن ستاون، شاہ ولی اللہ اور ان کا خاندان، سفر و تلاش، منتخب مقالات، مشاہدات فرہنگ اور جادہ نسیاں کے نام سر فہرست ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی دیں عطا کیا تھا.

نواب صدیق علی خان

9 جنوری 1974 کو جدوجہد آزادی کے معروف رہنما نواب صدیق علی خان کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی عالمگیر روڈ پر واقع جامع مسجد سی پی اینڈ برار ہاؤسنگ سوسائٹی کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1900 کو ناگپور میں نواب غلام محی الدین کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی تعلیم ناگپور میں ہی حاصل کی اور 1935 میں ناگپور سے مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے پولیٹیکل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ لیاقت علی خان نے شہادت کے وقت آپ ہی کے ہاتھوں میں دم توڑا تھا۔ آپ خواجہ ناظم الدین محمد علی بوگرہ اور حسین شہید سہروردی کے پولیٹیکل سیکریٹری بھی رہے۔ 1958 سے 1961 تک آپ ایتھوپیا میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے. آپ نے لیاقت علی خان کی سوانح حیات بے تیغ سپاہی کے نام سے تحریر کی۔

جسٹس ریٹائرڈ سعید الزماں صدیقی

11 جنوری 2017 کو پاکستان کے سابق چیف جسٹس اور موجودہ گورنر سندھ جسٹس ریٹائرڈ سعید الزماں صدیقی وفات پا گئے. آپ یکم دسمبر 1937 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کے والدین ہجرت کر کے ڈھاکہ میں مقیم ہوگئے تھے آپ نے میٹرک اور انٹر کے امتحانات ڈھاکہ ہی سے پاس کیے۔ بعد ازاں آپ کراچی منتقل ہوگئے اور کراچی یونیورسٹی سے فلسفے میں گریجویشن کرنے کے بعد ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی اور 1961 میں ایڈوکیٹ کی حیثیت سے بار سے وابستہ ہوگئے۔ 1963 میں آپ مغربی پاکستان ہائی کورٹ اور 1969 میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے ایڈوکیٹ مقرر ہوئے۔ 5 مئی 1980 کو آپ سندھ ہائی کورٹ کے جج بنے اور 5 نومبر 1990 کو سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بن گئے۔ یکم جولائی 1999 کو آپ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بن گئے اور یکم جولائی 1999 سے لے کر دسمبر 2005 تک پاکستان لاء کمیشن کے چیئرمین بھی رہے۔ 11 نومبر 2016 کو آپ سندھ کے گورنر بنے لیکن دو ماہ کے اندر ہی مختصر علالت کے بعد وفات پاگئے۔

ابن انشاء

11 جنوری 1978 کو نامور شاعر، مزاح نگار، سفر نامہ نگار، صحافی اور مترجم جناب ابن انشاء وفات پا گئے۔ آپ 15 جون 1927 کو ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ جامعہ پنجاب سے بی اے اور جامعہ کراچی سے اردو میں ایم اے کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے آپ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک تھے اور قیام پاکستان کے بعد آپ ریڈیو پاکستان لاہور اور پھر کراچی اسٹیشن سے وابستہ ہو گئے۔ آپ کا شمار اردو کے ان مایاناز قلمکاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے نظم اور نثر دونوں میدانوں میں اپنے فن کے جھنڈے گاڑھے۔ ایک جانب آپ اردو کے ایک بہت اچھے شاعر تھے اور دوسری جانب آپ مزاح نگاری میں بھی اپنا ثانی نہ رکھتے تھے اور خاص کر سفر نامہ نگاری میں آپ ایک نئے اسلوب کے بانی تھے۔ اس کے علاوہ آپ مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھا کرتے تھے۔ آپ کا پہلا مجموعہ کلام چاند نگر تھا اس کے علاوہ آپ کے شعری مجموعوں میں اس بستی کے اک کوچے میں اور دل وحشی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے اردو ادب کو کئی خوبصورت سفر نامے بھی عطا کئے جن میں آوارہ گرد کی ڈائری، دنیا گول ہے، ابن بطوطہ کے تعاقب میں، چلتے ہو تو چین کو چلیے اور نگری نگری پھرا مسافر شامل ہیں۔

پروفیسر احمد علی

14 جنوری 1994 کو انگریزی اور اردو ادب کے ممتاز ادیب نقاد اور دانشور پروفیسر احمد علی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ یکم جولائی 1910 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ 1932 میں آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ 1942 میں بی بی سی لندن کی نئی دہلی شاخ کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ 1945 میں پریزیڈنسی کالج کلکتہ میں شعبہ انگریزی ادبیات کے صدر بنے۔ 1947 کے اوائل میں برٹش کونسل کی جانب سے چین میں نیشنل سنٹرل یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ 1948 میں آپ پاکستان آ گئے اور فارن پبلسٹی کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ 1950 میں آپ پاکستان فارن سروس میں شامل ہو گئے اور مختلف ملکوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ کچھ عرصے کے لیے آپ جامعہ کراچی میں اعزازی پروفیسر بھی رہے۔ آپ کی اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تصانیف شائع ہوئیں۔ آپ کے انگریزی میں مشہور ترین ناول "ٹوائی لائٹ ان دہلی" ہے جس کا اردو فرانسیسی جرمن اور ہسپانوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ آپ نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جو اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ قائد اعظم کا اعزاز بھی عطا کیا۔

منہاج برنا

14 جنوری 2011 کو پاکستان کے نامور صحافی اور صحافتی اقدار کے سربلندی کے لیے جدوجہد کرنے والے مشہور صحافی منہاج برنا راولپنڈی میں وفات پاگئے۔

آپ یکم جولائی 1929 کو یوپی میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور اپنے کیریئر کا آغاز عملی صحافت سے کیا اور کئی اخبارات میں کام کیا۔ آپ صحافتی تنظیموں کے فعال رکن رہے جبکہ آل پاکستان نیوز پیپر امپلائز کنفیڈریشن کے بانی صدر بھی تھے۔ 1978 میں آپ نے جنرل ضیاالحق کے خلاف صحافیوں کی مشہور تحریک کی قیادت بھی کی۔ آپ مشہور سیاستدان معراج محمد خان کے بڑے بھائی تھے۔

سید حسین امام

16 جنوری 1985 کو تحریک پاکستان کے رہنما سید حسین امام کراچی میں وفات پاگئے۔

آپ 1897 میں بہار کے ایک قصبے باڑہ میں پیدا ہوئے۔ والد کے جلد انتقال ہونے کی وجہ سے چچا کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی۔ 1913 میں لندن چلے گئے جہاں آپ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے امپیریل کالج آف سائنس میں داخلہ لیا۔ آپ لندن میں اسی جگہ پر مقیم تھے جہاں قائداعظم قیام پذیر تھے اس لیے آپ نوجوانی سے ہی قائداعظم سے متاثر تھے اور ہمیشہ ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہے۔ وطن واپس آکر 1930 میں آپ آزاد امیدوار کی حیثیت سے کونسل آف اسٹیٹس کے رکن بنے. 1937 میں دوبارہ اس عہدے پر منتخب ہوئے اور ساتھ ساتھ مسلم لیگ کی دستور ساز کمیٹی کے رکن بھی بن گئے۔ 1938 میں مسلم لیگ کی پہلی مجلس عاملہ کے رکن نامزد ہوئے۔ 1946 کے عام انتخابات میں مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان تشریف لائے تو ابتدا میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لیا مگر پھر سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور گمنامی کی زندگی گزاری۔

محسن بھوپالی

17 جنوری 2007 کو اردو کے معروف شاعر محسن بھوپالی کراچی میں وفات پاگئے۔

آپ کا اصل نام عبدالرحمن تھا اور 29 ستمبر 1932 کو بھوپال میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے والدین کے ہمراہ

پاکستان آگئے اور پہلے لاڑکانہ اور پھر کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ این ای ڈی یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ کیااور حکومت سندھ سے وابستہ ہوگئے جو 1993 تک جاری رہی۔ اسی دوران آپ نے کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری بھی حاصل کی۔ شعر گوئی کا آغاز آپ نے 1948 سے شروع کردیا تھااور سیماب اکبر آبادی کی شاگردی اختیار کرلی تھی. 1961 میں آپ کے اولین شعری مجموعے کی تقریب رونمائی حیدر آباد سندھ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت زیڈ اے بخاری نے انجام دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی کتاب کی پہلی باقاعدہ تقریب رونمائی تھی۔ رفتہ رفتہ آپ نے اپنی جداگانہ راہ اختیار کی اور قطع نگاری اور نظمانے کی صنف میں اپنے دور کے سیاسی معاشرتی اور تہذیبی مسائل کو موضوع بنایااور طنز کی کاٹ سے اس کا حل بتایا۔ نظمانے تو خاص آپ ہی کی ایجاد ہے۔ ہر نظمانے میں ایک الگ کہانی نظر آتی ہے گویا مختصر افسانے کو شعر کا روپ دے دیا ہو۔ آپ کے 10 کے قریب شعری مجموعے شائع ہوئے۔

سید امجد علی

19 جنوری 1999 کو فنون لطیفہ کے مشہور نقاد سید امجد علی وفات پاگئے۔ آپ 1920 میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے آپ نے اینگلو عربک کالج دہلی اور سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے تعلیم حاصل کی۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز تدریس کے شعبے سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان آگئے اور پاکستان کوارٹرلی سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ رسالہ پاکستان میں فنون لطیفہ کا سب سے خوبصورت اور دقیع جریدہ سمجھا جاتا تھا۔ 1972 سے 1980 کے دوران آپ محکمہ اطلاعات میں مختلف اہم عہدوں پر فائز رہے۔ آپ نے منصور راہی، گل جی، بشیر مرزااور دیگر لوگوں کے فن پر خوبصورت کتابیں تحریر کیں۔ 1985 میں آپ کی کتاب مسلم ورلڈ ٹوڈے شائع ہوئی جس نے پورے عالم اسلام سے خراج تحسین حاصل کی۔ 1995 میں آپ کی کتاب پینٹرز آف پاکستان شائع ہوئی جو اپنے موضوع پر لکھی جانے والی سب سے جامع کتاب سمجھی جاتی ہے۔ آپ ایک طویل عرصے تک اخبارات میں فنون لطیفہ کے موضوع پر کالم بھی لکھتے رہے۔ آپ ایبٹ آباد میں آسودہ خاک ہیں۔

راغب مرادآبادی

19 جنوری 2011 کو اردو کے معروف شاعر راغب مراد آبادی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ کا اصل نام سید اصغر حسین تھااور آپ 27 مارچ 1931 کو مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے بی اے ادیب فاضل اردو منشی فاضل فارسی کی اسناد حاصل کر کے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور محکمہ محنت میں ملازم ہوگئے جہاں 1980 میں افسر تعلقات عامہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آپ بڑے قادر الکلام شاعر تھے غزل نظم رباعی مرثیہ غرض ہر صنف میں آپ نے اپنے کلام کے جوہر دکھائے۔ آپ کی تصانیف کی تعداد 22 سے زیادہ ہے جن میں 600 آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا اردو میں شعری ترجمہ شامل ہے.

دلاور فگار

21 جنوری 1998 کو اردو کے ممتاز مزاح گو شاعر دلاور فگار کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 8 جولائی 1929 کو بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے شاعری کی ابتدا انتہائی سنجیدہ غزلوں سے کی جس کا مجموعہ حادثے کے عنوان سے اشاعت پذیر بھی ہوا۔ مزاحیہ شاعری آپ سے حادثاتی طور پر شروع ہوئی جب آپ کے دوست نے آپ سے مزاحیہ نظمیں لکھ کر خود پڑھنا شروع کیں جو مشاعروں میں بے انتہا مقبول ہوئی بعد میں جب یہ پتہ چلا کہ یہ نظمیں آپ نے لکھی ہیں تو آپ سے اصرار کیا گیا کہ یہ نظمیں آپ خود پڑھیں اور یوں آپ مزاحیہ شاعری کی طرف آگئے۔ آپ نے دس سے زیادہ مزاحیہ شعری مجموعے چھوڑے ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کو آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کی وفات کے بعد صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی

22 جنوری 1981 کو نامور ماہر تعلیم ممتاز محقق اور بلند پایا مصنف ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلام آباد میں وفات پاگئے اور کراچی میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 20 نومبر 1903 کو پٹیالی ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے کیمبرج یونیورسٹی سے شعبہ تاریخ میں پی ایچ ڈی کیا تھا۔ وطن واپس آکر آپ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ سے وابستہ رہے اور 1945 میں کلیہ فنون کے ڈین بن گئے۔ کیمبرج میں قیام کے دوران آپ چودھری رحمت علی مرحوم کی تحریک پاکستان نیشنل موومنٹ کے ساتھ وابستہ رہے۔ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی اور پھر پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1949 سے 1951 تک حکومت پاکستان کے نائب وزیر داخلہ اور پھر 1951 سے 1954 تک وزیر تعلیم رہے۔ 1961 میں آپ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے اور اس عہدے پر آپ 1971 تک فائز رہے۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن، انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز، انڈین ہسٹری کانفرنس اور پاکستان ہسٹری سوسائٹی کے نائب صدر اور پاکستان پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے صدر رہے۔ سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ کے بانی ڈائریکٹر بھی تھے اور 1979 میں مقتدرہ قومی زبان کے پہلے صدر مقرر ہوئے تھے۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جس میں سلطنت دہلی کا نظم حکومت، برصغیر پاک وہند کی ملت اسلامیہ، سلطنت مغلیہ کا نظم ونسق (انگریزی)، علماء اور سیاست، تحریک آزادی کی تاریخ (چار جلدیں) پاکستان کی مختصر تاریخ (انگریزی) بہت مشہور ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں ستارہ پاکستان اور ہلال امتیاز کا اعزاز عطا کیا۔

رضی اختر شوق

22 جنوری 1999 کو اردو کے معروف شاعر رضی اختر شوق کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 23 اپریل 1933 کو سہارن پور میں پیدا ہوئے تھے آپ کا اصل نام خواجہ رضی الحسن انصاری تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم حیدر آباد دکن سے حاصل کی اور جامعہ عثمانیہ سے گریجویشن کیا اور پھر ریڈیو پاکستان سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ جہاں آپ نے اسٹوڈیو نو کے نام سے بے شمار خوبصورت ڈرامے

پیش کیے۔ آپ جدید لب و لہجے کے شاعر تھے اور آپ کے شعری مجموعوں میں میرے موسم میرے خواب بہت مشہور ہے۔ جس پر آپ کو اکادمی ادبیات پاکستان نے ایوارڈ بھی عطا کیا۔

ایم ایچ عسکری

23 جنوری 2005 کو پاکستان کے ممتاز انگریزی ادیب اور صحافی ایم ایچ عسکری وفات پاگئے اور کراچی میں ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

آپ دسمبر 1924 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا پورا نام مرزا حسن عسکری تھا اور آپ انگریزی کے نامور استاد اور ناول نگار پروفیسر مرزا محمد سعید کے فرزند تھے اور اسی نسبت سے بعض اوقات ابن سعید کے قلمی نام سے بھی لکھا کرتے تھے۔ آپ تقریبا نصف صدی صحافت کے شعبے سے وابستہ رہے اور اس دوران آپ نے متعدد اردو افسانے بھی لکھے آپ کا شمار پاکستان رائٹرز گلڈ کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

رضوان واسطی

24 فروری 2011 کو ٹیلی ویژن کے معروف فنکار رضوان واسطی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1938 کے لگ بھگ لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ 18 سال کی عمر میں آپ ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے اور اپنی بھرپور مردانہ آواز بہترین تلفظ اور رموز صوتیات پر مہارت کے باعث اپنے عہد کے بہترین انگریزی نیوز کاسٹر شمار ہوئے۔ پاکستان میں ٹیلی ویژن کی آمد کے بعد آپ نے متعدد ڈراموں میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ آپ کی مشہور ڈرامہ سیریل میں شمع عروسہ اور آبگینے کے نام سر فہرست ہیں۔ آپ نے شیر شاہ سوری کی شخصیت پر انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی تحریر کی۔ آپ کی شادی مشہور اداکارہ طاہرہ واسطی سے ہوئی تھی۔

میر خلیل الرحمن

25 جنوری 1992 کو پاکستان کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے جنگ گروپ آف نیوز پیپرز کے بانی اور ایڈیٹر میر خلیل الرحمان وفات پاگئے۔ آپ 19 جولائی 1931 کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے تھے جہاں آپ کے آزاد کشمیر سے ہجرت کر کے آباد ہو گئے تھے۔ آپ کے والد میر عبدالعزیز نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے گریجویشن کرنے کے بعد دہلی میں سکونت اختیار کی یوں آپ کا خاندان گجرانوالہ سے دہلی منتقل ہو گیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم صدیقہ ہائی اسکول دہلی اور مسلم ہائی سکول فتح پوری دہلی سے حاصل کی۔ بی کام کرنے کے بعد آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک پرائیویٹ فرم میں ٹائپسٹ کی حیثیت سے کیا۔ کچھ عرصے بعد ایک فلمی رسالے نگار خانے سے وابستہ ہو گئے جو اس زمانے کے مشہور صحافی دادا عشرت علی نکالا کرتے تھے۔ اس ملازمت کے دوران میر صاحب کو خود ایک روزنامہ جاری کرنے کی تحریک ملی۔ کیونکہ اس زمانے میں جنگ عظیم عروج پر تھی اس لیے آپ نے اپنے اخبار کا نام جنگ رکھا اور اسے شام کے اخبار کی حیثیت سے جاری کیا۔ جنگ نے بہت جلد تحریک پاکستان کے ایک نمایاں ترجمان کی حیثیت

اختیار کرلی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان آگئے اور کراچی سے 15 اکتوبر 1947 کو روزنامہ جنگ کا دوبارہ اجرا کردیا اور رفتہ رفتہ جنگ مقبولیت کے لحاظ سے پاکستان کے تمام اخبارات پر سبقت لے گیا۔ 13 نومبر 1959 کو روزنامہ جنگ کا راولپنڈی کا ایڈیشن شروع ہوا اور پھر 17 اکتوبر 1962 کو ڈیلی نیوز، یکم جنوری 1967 کو ہفت روزہ اخبار جہاں، 15 مارچ 1975 کو جنگ لندن، 13 مارچ 1972 کو جنگ کوئٹہ، 8 مئی 1980 کو میگ ویکلی، یکم اکتوبر 1981 کو جنگ لاہور اور 11 فروری 1991 کو دی نیوز کراچی لاہور اور اسلام آباد کا اجراء ہوا۔ یوں جنگ گروپ آف نیوز پیپرز پاکستان کا سب سے بڑا اشاعتی ادارہ بن گیا۔ اس توسیع اور ترقی کی اصل وجہ آپ کی وسعت نظری اور تدبر تھا۔ آپ نے اخبار نویس اور مدیر کی حیثیت سے دنیا کے تقریباً تمام ممالک کے دورے کیے اور آپ نے تمام عالمی مشاہیر سے ملاقاتیں کیں۔ آپ ایک صحافی کی حیثیت سے مسلسل محنت اور انتھک جدوجہد کی علامت بن گئے تھے۔

سر آدم جی حاجی داؤد

26 جنوری 1948 کو پاکستان کے نامور تاجر صنعت کار اور مخیر شخصیت سر آدم جی حاجی داؤد کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 30 جون 1880 کو جیت پور گجرات میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا تعلق میمن برادری کے باوانی خاندان سے تھا۔ آپ کی تعلیم محدود تھی ایک پرائیویٹ اسکول میں گجراتی کی صرف دو جماعتیں پڑھنے کا موقع ملا آپ کو اس کمی کا شدت سے احساس رہا اور آپ نے اس کی تلافی اپنی تعلیمی خدمات سے پوری کیں۔ آپ 15 سال کی عمر میں برما چلے گئے جہاں آپ کے والد چاول کا کاروبار کرتے تھے وہاں ایک فرم میں پچیس روپے ماہوار پر ملازم ہوگئے۔ 18 سال کی عمر میں شادی کے بعد اپنے والد کے کاروبار میں مدد کرنے لگے۔ انگریزی نہیں جانتے تھے مگر انگریزی میں تار لکھنا سیکھ گئے تھے۔ چنانچہ کاروباری لوگوں کو ایک آنا فی تار کے حساب سے تار لکھ دیتے۔ نیز بوریا سائیکل پر رکھ کر چاول بازار میں بیچا کرتے تھے۔ 1899 میں حاجی داؤد بیگ محمد کے نام سے اپنی ذاتی فرم الگ قائم کی اس کے تحت باردانہ (پٹ سن) کا کام شروع کیا جو رفتہ رفتہ ترقی کرتا گیا۔ 1904 میں آپ کی فرم کا دفتر کلکتہ میں بھی کھل گیا۔ 1912 میں اپنے بھائی عبدالستار کے تعاون سے کاروبار میں توسیع کی اور اے ایس آدم جی اینڈ کمپنی کے نام سے ایک نئی کمپنی کھولی۔ بعدازاں آپ نے سمنٹ ماچس سوت وغیرہ کا کاروبار بھی شروع کردیا۔ 1930 میں میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی قائم کی جو قیام پاکستان کے بعد دو حصوں میں تقسیم ہوئی ایک دفتر کراچی میں اور دوسرا بمبئی منتقل ہوا۔ آپ قائداعظم کے قریبی ساتھی تھے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تحریک پاکستان کو عام کرنے میں آپ نے رات دن ایک کردیئے اور اپنا پیسہ پانی کی طرح بہایا اور قائداعظم کی ہر پکار پر لبیک کہتے رہے۔ قائداعظم نے آپ کو پاکستان کی آزادی کی تقریب میں شرکت کی خصوصی دعوت دی تو آپ کراچی آئے اور قائداعظم ہی کے ارشاد پر پاکستان میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔ کراچی آتے ہی آپ نے رحمی بائی گرلز اسکول کی عمارت تین لاکھ روپے میں خرید کر میمن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کو بورڈنگ ہاؤس کے لیے دی مسلم کمرشل بینک قائم کیا آدم جی سائنس کالج بھی

آپ ہی کے نام سے منسوب ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے قیام کے سلسلے میں ایک مشاورتی میٹنگ میں شریک تھے کہ دل کا دورہ پڑا اور وفات پا گئے۔ قائداعظم نے اپنے تعزیتی پیغام میں فرمایا" میں آدم جی حاجی داؤد کے انتقال پر بے حد مغموم اور رنجیدہ ہوں وہ ایک سچے اور مخلص مسلمان تھے انہوں نے تحریک آزادی میں پورا پورا تعاون کیا ہم اس عظیم نقصان کو بہت شدت سے محسوس کرتے ہیں ان کا انتقال پاکستان کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے"

حاتم علوی

26 جنوری 1976 کو کراچی کے سابق میئر حاتم علوی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 20 اکتوبر 1898 کو کراچی کی ایک داؤدی بوہرہ فیملی میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیم و تربیت کے منازل کراچی میں طے کرنے کے بعد اپنے والد کے کاروبار میں مشغول رہے۔ بچپن ہی سے آپ سیاسی سماجی اور فلاحی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ آپ بے شمار انجمنوں کمیٹیوں اور رفاعی اداروں کے سرپرست اور رکن تھے۔ 1924 سے 1948 تک آپ کراچی میونسپلٹی جسے 1934 میں میونسپل کارپوریشن کا درجہ دیا گیا تھا ممبر منتخب ہوتے رہے۔ 1938 سے 1939 تک آپ متفقہ طور پر کراچی میونسپل کارپوریشن کے میئر منتخب ہوئے۔ سندھ کو بمبئی پریذیڈنسی سے الگ کرنے والے تین ممبروں میں آپ کا نام بھی شامل تھا۔ آپ 30 سال تک کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ٹرسٹی اور تین مرتبہ اس کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ آپ تحریک پاکستان کے دوسرے مسلم رہنماؤں کے ساتھ پیش پیش رہے۔ آپ مسلم لیگ کے مخلص کارکن تھے اور قائداعظم کے معتمد کارکنوں میں سے تھے۔ 1948 میں قائداعظم نے آپ کو پاکستان پلاننگ کمیشن کا ممبر نامزد کیا تھا۔ آپ کا شمار معاشیات کے ماہرین میں ہوتا تھا اس لیے پاکستان بننے کے بعد شروع سے ہی اسٹیٹ بینک کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے اور مرتے دم تک اس اعزازی منصب پر فائز رہے۔

ریحان اعظمی

26 جنوری 2021 کو نامور شاعر، استاد، صحافی اور قلم کار جناب ریحان اعظمی کراچی میں وفات پا گئے اور وادی حسین قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 7 جولائی 1958 کو کراچی کے علاقے لیاقت آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سید ریحان عباس رضوی تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گورنمنٹ اسکول لیاقت آباد سے حاصل کی جب کہ سراج الدولہ کالج سے انٹر تک کی تعلیم حاصل کی پھر آپ نے جامعہ کراچی سے اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ بطور صحافی روزنامہ حریت سے کافی عرصے تک وابستہ رہے اس کے علاوہ کچھ عرصہ آپ نے ایک نجی اسکول میں تدریس کے فرائض بھی انجام دیے۔ پاکستان ٹیلی ویژن سے آپ بحیثیت نغمہ نگار وابستہ رہے اس دوران آپ نے 4000 سے زائد نغمات لکھے جن میں مشہور نغمہ خوشبو بن کر مہک رہا ہے سارا پاکستان بھی شامل تھا۔ جب آپ رومانوی شاعری میں عروج پر جا رہے تھے تو آپ نے سب کچھ ترک کر کے اپنے آپ کو حمد، نعت، سلام، منقبت، نوحہ اور مرثیہ کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کی رسائی ادب پر 25 سے زیادہ کتب شائع ہو چکی ہیں۔ 1997 میں آپ کو گینز

بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ساتویں تیز ترین شاعری کرنے والے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ آپ کو عالمی اور قومی سطح پر کئی تمغے اور ایوارڈ بھی حاصل ہوئے۔

ماجد خلیل

27 جنوری 2016 کو معروف نعت گو شاعر ماجد خلیل کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی سخی حسن کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1940 میں ہندوستان کے شہر سیتاپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کو پاکستان اور پاکستان سے باہر نعت گو شاعر کی حیثیت سے بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ آپ کے نعتیہ مجموعہ کلام روشنی ہی روشنی کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ حکومت پاکستان کی جانب سے قومی سیرت ایوارڈ بھی آپ کو دیا گیا۔

سیماب اکبر آبادی

31 جنوری 1951 کو کراچی میں اردو کے نامور شاعر علامہ سیماب اکبر آبادی انتقال کر گئے۔ آپ 1880 کو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام عاشق حسین تھا۔ آپ نے پہلے عربی ادبیات اصول منطق اور فارسی زبان وادب کی تحصیل کی اور پھر انگریزی زبان پر بھی دسترس حاصل کی۔ بچپن سے ہی آپ نے شاعری کا آغاز کر دیا تھا اور داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ آپ نے اگرہ میں قصر الادب کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا جس کے ذریعے آپ نے برسوں اردو ادب کی خدمات انجام دیں۔ آپ نے علمی ادبی اور تہذیبی رسالہ ماہنامہ شاعر بھی جاری کیا تھا ڈاکٹر علامہ اقبال آپ کے ہم عصر اور مدح تھے آپ کا شمار اردو شاعری کے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ آپ نے قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ یادگار چھوڑا ہے۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ دفاتر میں گزرا جس کے بارے میں اپنی خود نوشت میں آپ خود لکھتے ہیں۔ "جب معلوم ہوا کہ فطرت نے مجھے اس لیے پیدا نہیں کیا کہ میں اپنی تمام عمر ذہنی غلامی میں بسر کر دوں بلکہ میری تخلیق خدمت ادب کے لیے ہوئی ہے اس انکشاف کے بعد میں نے ملازمت کو استعفی دے دیا اور ادب کی خدمت پر مامور ہو گیا"۔

عشرت ہاشمی

31 جنوری 2005 کو پاکستان ٹیلی ویژن کی معروف اداکارہ عشرت ہاشمی دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ آپ 1935 میں پیدا ہوئیں تھیں۔ آپ نے 1960 میں ریڈیو پاکستان سے فنی سفر کا آغاز کیا اور پھر پاکستان ٹیلی ویژن کے کراچی مرکز سے وابستہ ہو گئیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں آپ نے لاتعداد ڈراموں میں کام کیا۔ آپ کی مقبول ترین ڈرامے سیریلز میں شمع، افشاں، شہزوری، آگہی، بر گر فیملی، آرزو، ایمر جنسی وارڈ، رات ریت اور ہوا، منڈی، ہوائیں، عروسہ اور ٹیپو سلطان کے نام سرفہرست ہیں۔

ظہور احمد

یکم فروری 2009 کو اسٹیج ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے معروف فنکار ظہور احمد اسلام آباد میں وفات پاگئے اور وہیں آسودہ خاک ہوئے۔

آپ 18 ستمبر 1934 کو ناگپور بھارت میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے نظام سقہ مرزا، غالب بندر روڈ پر اور تعلیم بالغاں جیسے ڈراموں میں کام کیا۔ آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن میں بھی ڈراموں میں یادگار کردار ادا کیے۔ آپ کے مشہور ڈراموں میں خدا کی بستی، دیواریں، نورالدین زنگی، اور آخری چٹان کے نام شامل ہیں۔

ایس ایم توفیق

3 فروری 1959 کو کراچی کے سابق میئر جناب ایس ایم توفیق کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 14 نومبر 1911 کو کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد کانپور کے رئیس اعظم تھے جن کا بمبئی کلکتہ اور کانپور میں وسیع کاروبار تھا۔ آپ نوجوانی میں ہی کاروبار کی دیکھ بھال کے لئے کلکتہ چلے گئے اور کاروباری مصروفیات کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی اور کلکتہ مسلم لیگ کے جوائنٹ سیکریٹری مقرر ہوئے۔ کلکتہ کی میونسپل کارپوریشن کے پہلے رکن اور پھر میئر منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آگئے اور اپنی زندگی مہاجرین کی آبادکاری کے لیے وقف کردی۔ 1952 میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے کونسلر منتخب ہوئے اور اس حیثیت سے ہی لالوکھیت کی جگہ لیاقت آباد کی بستی تعمیر کروائی۔ 1958 میں آپ کراچی کے میئر منتخب ہوئے جس کے بعد آپ نے کراچی کے لیے بے شمار کام کروائے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں لیاقت آباد کی ایک بڑی سڑک کا نام آپ کے نام پر ایس ایم توفیق روڈ رکھا گیا۔

علامہ نصیر الاجتہادی

3 فروری 1990 کو پاکستان کے نامور عالم دین خطیب اور مصنف علامہ نصیر الاجتہادی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 15 فروری 1931 کو لکھنؤ کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی پرورش بھی بہت علمی ماحول میں ہوئی آپ مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے اور آپ نے مفتی اعظم ہند مفتی احمد، مولانا ایوب، مولانا ناظم حسین اور علامہ مرتضی حسنین سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ آپ اتحاد بین المسلمین کے زبردست داعی تھے۔ آپ نے عربی کی کئی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ آپ ایک بلند پایا مقرر تھے آپ کا انداز خطابت انتہائی دل نشین تھا۔ آپ کے الفاظ کی ادائیگی اسطرح ہوتی تھی کہ لوگوں کے دماغ میں آپ کی منظر نگاری فلم کی صورت میں چلنے لگتی تھی۔ تقریر میں ہم معنی الفاظ اور مترادف کے استعمال میں آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن سے کئی برس تک مجالس شام غریباں سے بھی خطاب کیا۔

ڈاکٹر محمد علی شاہ

4 فروری 2013 کو پاکستان کے نامور آرتھوپیڈک سرجن اور وزیر اعلی سندھ کے مشیر برائے کھیل ڈاکٹر محمد علی شاہ وفات پاگئے۔ آپ 24 اکتوبر 1940 کو بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد سید اصغر علی شاہ جج تھے۔ آپ نے ڈاؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کرنے کے بعد برطانیہ کے رائل کالج آف سرجن سے فیلوشپ حاصل کی۔ 1980 میں وطن واپس آکر آپ نے ناظم آباد میں

ایک کلینک قائم کیا جو ہڈیوں کے امراض کے علاج کا ایک مستند اسپتال ہے۔ آپ اس ہسپتال میں ہڈیوں کے جوڑوں اور ٹوٹی ہڈیوں کے ایسے آپریشن پاکستان میں کرنے لگے جن کے لئے لازمی طور پر بیرون ملک جانا پڑتا تھا۔ آپ 2008 کے عام انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ اور سندھ کے وزیر برائے کھیل اور امور نوجوان مقرر ہوئے۔ آپ کو کرکٹ سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ آپ نے اپنے والد کے نام پر ایک کرکٹ اسٹیڈیم بھی تعمیر کروایا۔ آپریشن کی تعداد کے لحاظ سے آپ کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں بھی شامل ہے۔ آپ کی طب کے شعبے میں خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی اور کھیلوں کے سلسلے میں آپ کی خدمات کے اعتراف میں ستارہ امتیاز عطا کیا۔

ارم لکھنوی

5 فروری 1967 کو کراچی میں اردو کے ممتاز شاعر جناب ارم لکھنوی وفات پاگئے. آپ کا اصل نام سید شہنشاہ حسین تھا اور آپ 1910 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور تاعمر ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے۔ آپ آرزو لکھنوی کے شاگرد تھے اور پاکستان میں دبستان لکھنو کے آخری نمائندہ شاعر سمجھے جاتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام خیاباں خیاباں کے نام سے زیر ترتیب تھا مگر اچانک دل کا دورہ پڑنے سے آپ کا انتقال ہو گیا اور یوں آپ کا مجموعہ کلام بھی شائع نہ ہو سکا۔

آغا ہلالی

6 فروری 2001 کو پاکستان کے نامور سفارتکار آغا ہلالی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 20 مئی 1911 کو بنگلور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے مدراس یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور کیمبرج یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد 1936 میں انڈین سول سروس میں شمولیت اختیار کی اور مختلف وزارتوں کے اندر سیکرٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کو وزارت داخلہ میں ڈپٹی سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ 1956 میں آپ کا تبادلہ وزارت خارجہ میں ہو گیا آپ نے دنیا کے متعدد ملکوں میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اپنی اعلیٰ خدمات کے اعتراف کے طور پر متعدد ملکی اور غیر ملکی اعزازات بھی آپ کو عطا کئے گئے جن میں ستارے قائد اعظم اور ستارے پاکستان کے اعزاز بھی شامل ہیں۔ آپ پاکستان کے سابق وزیر خارجہ آغا شاہی کے چھوٹے بھائی تھے۔

خالد اسحاق ایڈوکیٹ

7 فروری 2004 کو پاکستان کے نامور ماہر قانون اور دانشور خالد اسحاق ایڈوکیٹ کراچی میں وفات پاگئے۔
آپ 1926 میں شکارپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ڈی جے کالج کراچی سے گریجویشن کیا اور شاہانی لاء کالج (موجودہ ایس ایم لاء کالج) سے قانون کی ڈگری حاصل کی اس وقت اس کالج میں 351 نشستوں میں صرف 22 مسلمان طالب علم تھے۔ 1948 میں آپ نے وکالت کا آغاز کر دیا اور ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سندھ اور ایڈوکیٹ جنرل مغربی پاکستان کے مناصب پر فائز رہے۔ آپ کو بیک

وقت اردو سندھی پنجابی سرائیکی عربی فارسی اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ آپ کی ایک اور بڑی وجہ شہرت آپ کی ذاتی لائبریری تھی اس میں مختلف زبانوں کی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ کتب اور رسائل موجود تھے۔ آپ کی لائبریری کا شمار جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی نجی لائبریری میں ہوتا تھا۔ آپ نے بے شمار مقالات اور چند کتابیں بھی تصنیف کیں۔

ذاکر علی خان

8 فروری 2012 کو اردو کے نامور ادیب اور کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے سابق مینجنگ ڈائریکٹر ذاکر علی خان کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 18 جولائی 1924 کو رام پور میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے لاہور اور پھر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ کراچی آکر آپ نے کراچی میونسپل کارپوریشن کے محکمہ انجینئرنگ سے منسلک ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے چیف انجینئر اور پھر کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کے مینیجنگ ڈائریکٹر کے اہم منصب تک پہنچے۔ کراچی میونسپل کارپوریشن کی سروس کے دوران آپ نے کئی منصوبے پائے تکمیل تک پہنچائے جن میں خاص طور سے کے ایم سی اسپورٹس کمپلیکس عباسی شہید اسپتال اور کے ایم سی فٹ بال اسٹیڈیم بہت اہم ہیں۔ آپ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سرگرم رکن رہے اور ایک طویل عرصے تک اس کے اعزازی جنرل سیکریٹری بھی رہے۔ آپ کی تحریر کا ایک خاص اسلوب ہے جو کہ پروفیسر رشید احمد صدیقی کے اسلوب سے ملتا جلتا ہے۔ آپ کی تصانیف میں حدیث حرم، مرحبا الحاج، قلم رو، رختہ سفر، دیوان عام اور روایات علیگڑھ وغیرہ کے نام بھی شامل ہیں۔

صادقین

10 فروری 1987 کو پاکستان کے نامور مصور صادقین کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 20 جون 1930 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے جد اعلیٰ کا نام سید حسین شرف الدین تھا جنھیں شاہ ولایت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ میٹرک آپ نے امروہہ کہ ایک اسکول سے کیا اور آگرہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں سکونت پذیر ہوئے جہاں آپ نے بہت جلد اپنی منفرد مصوری اور خطاطی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ آپ نے عالمی شہرت میورلز (دیواری تصاویر) سے پائی۔ 1961 میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کراچی کی لائبریری میں بھی ایک عظیم الشان میورل بنایا جسے آپ نے وقت کے خزانے کا نام دیا اس میورل میں آپ نے سقراط سے آئنسٹائن تک ہر عہد کے علمی اور سائنسی ارتقاء کو بڑی خوبصورتی اور مشاقی سے محفوظ کیا۔
آپ کے والد آپ کے بارے میں کہتے ہیں "صادقین کا پڑھنے لکھنے میں بالکل جی نہیں لگتا تھا وہ ہر وقت دیواروں پر کوئلے سے الٹی سیدھی لکیریں بناتا رہتا تھا گھر کی تمام دیواریں اس کی سیاہ لکیروں سے بھر گئی تو محلّے کی دیواریں تختہ مشق بن گئیں۔ ایک روز اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے مجھے بلا لیا جب میں وہاں پہنچا تو اس نے مجھے اسکول کی تمام دیواریں اور دروازے دکھائے اور کہاں صادقین اب حد سے بڑھ چکا ہے۔ ایک دفعہ میں صادقین سے ملنے پیرس گیا تو صادقین کا پتہ لکھ کر اپنے بٹوے میں رکھ لیا کہیں راستے میں کھو نہ جائے لیکن

پیرس میں صادقین کی اتنی شہرت تھی کہ ایئرپورٹ کے افسران نے مجھے صادقین کے گھر تک پہنچادیا"۔1970 میں آپ نے سورہ رحمن کی آیات کو انتہائی دلکش انداز میں پینٹ کیااور مصورانہ خطاطی کے ایک نئے اسلوب اور دبستان کی بنیاد ڈالی۔ غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر آپ نے کلام غالب کو بڑی خوبصورتی سے مصور کیااور تقریباً50 بڑی تصاویر تخلیق کیں۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا۔

جمال احسانی

10فروری1998کواردو کے ممتاز غزل گو شاعر جمال احسانی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 21اپریل 1951کو سرگودھامیں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے خاندان کا تعلق پانی پت مشرقی پنجاب سے تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ذریعہ معاش کی تلاش میں آپ کراچی چلے آئے اور محکمہ اطلاعات و نشریات سے منسلک ہو گئے۔اس کے علاوہ آپ روزنامہ حریت، سویرااوراظہار کراچی سے بھی وابستہ رہے۔1970 کی دہائی میں آپ نے شاعری کا آغاز کیااور بہت جلد اردو کے اہم غزل گو شعرا میں شمار ہونے لگے۔ کراچی کے ادبی ماحول کے ساتھ قمر جمیل اور سلیم احمد کے قرب میں رہ کر آپ کا ذوق سخن مزید بڑھ گیا۔ آپ کے شعری مجموعوں میں ستارہ سفر، رات کے جاگے ہوئے اور تارے کو مہتاب کیا شامل ہیں۔

فاطمہ ثریا بجیا

10فروری2016کو معروف ناول نگار اور ڈرامہ نگار فاطمہ ثریا بجیا کراچی میں وفات پاگئیں۔ آپ یکم ستمبر 1930کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ کا تعلق ایک تعلیم یافتہ اور ادبی گھرانے سے تھا۔ آپ کا آبائی وطن بدایوں تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کا خاندان کراچی میں قیام پذیر ہوا۔ آپ کے خانوادے میں مشہور شاعرہ زہرہ نگاہ, معروف بیوروکریٹ احمد مقصود حمیدی, نامور مزاح نگار انور مقصود اور معروف ماہر امور خانہ داری زبیدہ طارق شامل ہیں۔ آپ نے کسی اسکول یا کالج میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی بلکہ تعلیم دلانے کے لیے گھر پر ہی بندوبست کیا گیا تھا۔ اسکول اور کالج میں تعلیم حاصل نہ کرنے کے باوجود آپ نے گھر پر اردو، فارسی، انگریزی اور ہندی سب ہی زبانوں کو پڑھااور لکھنا سیکھا۔1966 میں آپ پاکستان ٹیلی ویژن سے منسلک ہوئیں۔ آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے لاتعداد ڈرامہ سیریل تحریر کیں جن میں اوراق، شمع،افشاں، عروسہ،اساوری اور گھر ایک نگر وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کے ڈرامے خاندانوں کے مسائل کی بہترین عکاسی کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ کے ڈرامے ہر دور میں بے حد مقبول رہے. آپ نے حکومت سندھ کی مشیر برائے تعلیم کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی اور ہلال امتیاز کے اعزازات عطا کیے۔ جبکہ حکومت جاپان نے آپ کو اپنا اعلیٰ ترین شہری اعزاز عطا کیا۔ آپ کی سوانح عمری بجیہ برصغیر کی عظیم ڈرامہ نویس کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔

قاضی واجد

11 فروری 2018 کو ریڈیو ٹیلی ویژن فلم اور تھیٹر کی معروف فنکار قاضی واجد کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی گلشن اقبال کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

آپ 2 فروری 1944 کو گوالیار میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے فنی کیریئر کا آغاز ریڈیو پاکستان سے پروگرام قاضی جی کا قاعدہ سے شروع کیا اور بہت مقبولیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ ریڈیو پاکستان کے مشہور ڈرامہ سیریز حامد میاں کے ہاں میں بھی آپ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور طویل عرصے تک ریڈیو پاکستان سے بطور اسٹاف آرٹسٹ وابستہ رہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور بے شمار لافانی کردار ادا کیے۔ آپ کے مشہور ڈرامہ سیریل میں خدا کی بستی, تنہائیاں, آنگن ٹیڑھا, دھوپ کنارے، حوا کی بیٹی اور اساوری وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ خواجہ معین الدین کے اسٹیج ڈرامے تعلیم بالغاں اور مرزا غالب بندر روڈ پر آپ کی اداکاری اپنے کمال پر تھی۔ حکومت پاکستان نے آپ کے فن کے اعتراف کے طور پر صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر احسان رشید

13 فروری 2002 کو پاکستان کے ممتاز ماہر اقتصادیات ماہر تعلیم اور سفارت کار پروفیسر ڈاکٹر احسان رشید کراچی میں وفات پاگئے۔

آپ اردو ادب کے صف اول کے مزاح نگار رشید احمد صدیقی کے فرزند تھے جو علی گڑھ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ آپکی پیدائش بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں اساتذہ کے لئے تعمیر کیے ہوئے کیمپس میں ہی 23 اکتوبر 1927 کو ہوئی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سے لیکر ایم اے اقتصادیات تک علی گڑھ مسلم ہائی سکول اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ہی تعلیم حاصل کی۔ جرمنی سے آپ نے اقتصادیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ کچھ عرصہ آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی میں باحیثیت لیکچرر خدمات انجام دیں اور پھر قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مکمل سکونت اختیار کی۔ جامعہ کراچی میں آپ شعبہ اقتصادیات میں لیکچرر اور پھر شعبے کے صدر مقرر ہوئے۔ 1970 میں آپ نے جامعہ کراچی میں اپلائیڈ اکنامکس ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی بنیاد رکھی جس کے آپ پہلے ڈائریکٹر تعینات ہوئے۔ 1976 میں آپ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر کیے گئے. 1980 میں آپ ایک سال کے لئے ہارورڈ یونیورسٹی کے وزٹنگ پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں سے 1982 میں واپس آئے تو آپ کو سفیر بناکر اردن بھیج دیا گیا جہاں 1986 تک تعینات رہے۔ آخر میں آپ کو اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں ریکٹر تعینات کر دیا گیا۔ آپ اسلامائزیشن کمیشن کے چیئرمین، یونیورسٹی گرانڈ کمیشن کے رکن، مین پاور کمیشن کے رکن، ہمدرد فاؤنڈیشن، یونیورسٹیز کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے رکن، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کے وائس چیئرمین، وائس چانسلرز کمیٹی کے چیئرمین، اسلامی نظریاتی کونسل کی معاشیات وبینکاری کمیٹی کے چیئرمین، پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اکنامکس کے صدر، پاکستان اکنامکس ایسوسی ایشن کے صدر اور اس کے علاوہ بھی کئی دوسرے سرکاری و نیم سرکاری کمیٹیوں کے رکن رہے۔ اور وقتاً فوقتاً بین الاقوامی سطح پر سرکاری و غیر سرکاری وفود میں پاکستان کی نمائندگی کی

یوسف ہارون

14 فروری 2011 کو پاکستان کے ممتاز سیاستدان یوسف ہارون نیویارک میں وفات پاگئے اور کراچی میں آسودہ خاک ہوئے.

آپ 1917 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے آپ نے اپنے والد سر عبداللہ ہارون کی زندگی میں ہی عملی سیاست میں قدم رکھ دیا تھا اور 1942 میں فقط 25 سال کی عمر میں ہندوستان کے مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ 1940 میں کراچی کی میونسپل کارپوریشن کے رکن اور 1944 میں کراچی کے میئر بھی بننے میں بھی کامیاب ہوئے۔ 1946 کے عام انتخابات میں آپ نے صوبہ سندھ سے مرکزی مجلس قانون ساز کی واحد نشست پر آل انڈیا مسلم لیگ کے امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا اور پیر علی محمد راشدی کو شکست دی۔ قیام پاکستان کے بعد 1949 میں آپ مختصر مدت کے لیے سندھ کے وزیر اعلیٰ بھی منتخب ہوئے اور استعفیٰ دے کر ہائی کمشنر کے طور پر آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں پاکستان کی نمائندگی کرنے لگے۔ 1969 میں آپ چند دنوں کے لیے مغربی پاکستان کے گورنر بھی بنائے گئے۔ 1971 میں آپ دلبرداشتہ ہو کر امریکہ چلے گئے اور اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے۔

نثار بیانوی

16 فروری 1971 کو معروف شاعر نثار بیانوی وفات پاگئے۔

آپ 5 مئی 1905 کو قصبہ بیانہ ریاست بھرتپور بھارت میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سید نثار احمد تھا جبکہ نثار تخلص اور قلمی نام بیانوی تھا۔ اعلیٰ تعلیم آپ نے آگرہ اور الہ آباد سے حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان سے الحاق شدہ ریاست حیدر آباد دکن ہجرت کر گئے مگر 1949 میں جب ہندوستان نے حیدر آباد دکن پر قبضہ کر لیا تو آپ ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی. شاعری کا ذوق آپ کو بچپن ہی سے تھا۔ 13 سال کی عمر سے آپ نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کردیے تھے۔ آپ نے غزل، نظم، رباعی، مسدس، حمد، نعت، منقبت، مرثیہ، قصیدہ اور سلام ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ تنقیدی مضامین بھی لکھے اور خطوط نگاری میں نئی نئی راہ نکالیں۔ جبکہ علم عروض پر ایک کتاب بھی تالیف کی۔

نازش حیدری

17 فروری 1984 کو معروف شاعر نازش حیدری کراچی میں وفات پاگئے۔

آپ یکم جنوری 1914 کو دہلی کے ایک صوفی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ شعر و سخن کا ذوق وراثت میں ملا تھا آپ کے والد اور 4 بھائی شعر کہتے تھے. 1941 میں الہ آباد میں آپ نے سی پی برار کے لیے اردو پرائمری نصاب لکھا جو تقریبا 24 سال کے بعد تک پڑھایا جاتا رہا۔ متعدد انگریزی ناولوں کے تراجم اور یونیورسٹی کالجز کے لیے کتابیں بھی لکھیں۔ آپ کا مجموعہ کلام "صدیوں کا سفر کر کے "نام سے شائع ہوا اس کے علاوہ بچوں کی 13 کہانیاں پر مشتمل کتابیں بھی شائع ہوئیں۔ آپ کی ایک بڑی ضخیم بیاض ہجرت کے وقت دہلی میں رہ گئی جس کا آپ کو بہت افسوس تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آگئے اور روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوگئے اور سب ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

شبنم رومانوی

17 فروری 2009 کو اردو کے ممتاز شاعر، ادیب اور کالم نگار شبنم رومانی کراچی میں وفات پاگئے۔
آپ شاہجہاں پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے بریلی کالج سے بی کام کا امتحان پاس کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے۔ ابتدا میں اسٹیٹ بینک میں ملازمت کی لیکن تھوڑے دن کے بعد محکمہ دفاع میں ملازم ہوگئے اور یہیں سے ریٹائر ہوئے۔
آپ خاندانی طور پر شاعر نہیں تھے لیکن آپ نے اس میدان میں بہت نام پیدا کیا۔ شعر کہنے کا شوق بچپن ہی سے تھا آپ کی تصانیف میں مثنوی سیر کراچی، جزیرہ اور تہمت وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر احمد مرزا جمیل

17 فروری 2014 کو نامور خطاط اور نوری نستعلیق فاؤنٹ کے موجد ڈاکٹر احمد مرزا جمیل کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ کا تعلق ایک مغل گھرانے سے تھا اور آپ 21 فروری 1921 کو دہلی کے محلے حویلی اعظم خان میں پیدا ہوئے تھے۔ خطاطی سے دلچسپی آپ کو ورثے میں ملی تھی آپ کے والد اور دادا دونوں خوش نویسی کے ماہر تھے۔ آپ بمبئی کے جے اسکول آف آرٹ کے فارغ التحصیل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ چھپائی کے لیے عام طور پر خط نستعلیق کو زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔
آپ اردو زبان کو کمپیوٹر میں کمپوز کرنے کا تجربہ کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں آپ نے مطلوب الحسن سید کے ساتھ مل کر کئی تجربات کیے بالآخر آپ کا سنگاپور کی ایک پرنٹنگ انڈسٹری کے ساتھ معاہدہ ہوگیا۔ لیکن اس نے یہ شرط عائد کی کہ اگر تجربہ ناکام ہوا تو اس کے تمام اخراجات آپ ادا کریں گے۔ آپ نے اس کی حامی بھر لی۔ پہلے نمونے کی تیاری میں 6 ماہ لگے پھر اسے لندن میں ایک نمائش میں پیش کردیا گیا۔ 1980 میں وطن واپس پہنچ کر مقتدرہ قومی زبان کے صدر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی مدد سے ایک پریس کانفرنس میں خط نستعلیق کی برقی کتابت میں منتقلی کا اعلان کیا۔ اس اعلان کے بعد سے اردو ہاتھ کی کتابت سے نکل کر الیکٹرونک دور میں داخل ہوئی۔ آپ نے اپنے والد کے نام پر اس خط کا نام نوری نستعلیق رکھا۔ یہ ایک تاریخ ساز کارنامہ تھا حکومت پاکستان نے اس کارنامے پر آپ کو تمغہ امتیاز سے نوازا۔

رسول احمد کلیمی

18 فروری 2013 کو معروف بینکار اور شاعر رسول احمد کلیمی وفات پاگئے۔ آپ 11 دسمبر 1944 کو گورکھپور یوپی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ڈی جے کالج سے بی ایس سی میں پورے کراچی میں تھرڈ پوزیشن حاصل کی اور اس کے بعد این ای ڈی کالج سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ آپ نے ہومیوپیتھک کا امتحان پاس کیا اور پورے پاکستان میں ٹاپ کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر کچھ عرصہ آپ نے این آئی ڈی کالج میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے پھر آپ حکومت سندھ میں ملازم ہوگئے۔
1972 میں آپ نے سوڈان کے لیے ٹیکسٹائل پلان بھی بنایا۔ 1974 میں نیشنل ڈویلپمنٹ فائنس کارپوریشن اور پھر نیشنل بینک

آف پاکستان میں تعینات ہوئے اور 1983 تک خدمات انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد بنک الجزیرہ سعودی عرب جوائن کیا جہاں بہت کم وقت میں ترقی کرتے ہوئے وائس پریزیڈنٹ سے جنرل منیجر کے عہدے تک پہنچے۔ بعدازاں پھر آپ ایگزیکیوٹیو وائس پریزیڈنٹ کی حیثیت سے نیشنل بینک آف پاکستان میں واپس آ گئے۔ شاعری سے آپ کو خصوصی شغف تھا۔ غزل اور نظم دونوں میں آپ نے طبع آزمائی کی اور خاص طور پر غالب کی زمین میں تضمین بھی لکھی۔

صہبا اختر

19 فروری 1995 کو اردو کے ممتاز شاعر صہبا اختر کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 30 ستمبر 1929 کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد منشی رحمت علی آغا حشر کاشمیری کے ہم عصر تھے اور اپنے زمانے کے ممتاز ڈرامہ نگاروں میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے بریلی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لیا مگر پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا اور آپ اپنے اہل خانہ کے ہمراہ پاکستان آ گئے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا لیکن نامسائد حالات نے آپ کو ملازمت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ حفیظ ہوشیار پوری اور شیخ اعجاز کی کوششوں سے محکمہ فوڈ میں انسپیکٹر ملازم ہو گئے اور ریٹائرمنٹ تک اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ شعر و سخن کا ذوق آپ کو زمانہ طالب علمی سے تھا۔ 15 سال کی عمر میں پہلی بار منقبت لکھی اور پڑھ کر داد لی۔ آپ ایک زود گو شاعر تھے آپ نے نظم، قطعہ، گیت، ملی نغمے، دوہے اور غزل غرض ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی۔ پاکستان کے جتنے قومی نغمے اور گیت آپ نے لکھے کسی اور شاعر نے نہیں لکھے۔ آپ کے 4 شعری مجموعے آپ کی زندگی میں شائع ہوئے۔ جن میں سرکشیدہ، اقرا، سمندر اور مشعل شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ادبی جرائد میں آپ کی بے شمار منظومات شائع ہوئے ہیں جن کو مدون کرنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو آپ کی وفات کے بعد صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

تمنا بیگم

20 فروری 2012 کو ریڈیو تھیٹر ٹیلی ویژن اور فلم کی معروف اداکارہ تمنا بیگم کراچی میں وفات پا گئیں۔
آپ 1944 میں علی گڑھ میں پیدا ہوئی تھیں۔ انیس سو ساٹھ کی دہائی میں ریڈیو پاکستان لاہور سے آپ نے اپنی فنی کیریئر کا آغاز کیا۔ تھوڑی ہی مدت میں آپ نے تھیٹر اور پھر ڈراموں میں کام شروع کیا اور آخر میں فلموں کی طرف آ گئیں۔ آپ نے مجموعی طور پر 209 فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔

مشفق خواجہ

21 فروری 2005 کو اردو کے نامور محقق ادیب اور شاعر مشفق خواجہ کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 19 دسمبر 1935 کو لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد خود کئی علمی کتب کے مصنف تھے جبکہ آپ کے چچا خواجہ عبدالحمید اردو کی معروف لغت جامع

الغات کہ مؤلف تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی منتقل ہو گئے جہاں آپ نے کراچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ 1957 سے لے کر 1977 تک آپ انجمن ترقی اردو سے وابستہ رہے جہاں آپ کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ علمی و ادبی کام کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس ادارے سے وابستگی نے آپ کی شخصیت کو جلا بخشی اور یوں آپ نے تن تنہا کئی اہم تحقیقی کارنامے انجام دیے۔ آپ کا شماران محققوں اور ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں ان کے ادبی کارناموں کی وجہ سے برصغیر پاک و ہند میں بہت قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ کی تصانیف اور تالیفات میں قاموس الکتب، خوش معرکہ زیبا، پرانے شاعر نیا کلام، اقبال از احمد دین، غالب اور صفیر بلگرامی، جائزہ مکتوبات اردو، تحقیق نامہ اور کلیات یگانہ کے نام سر فہرست ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے خامہ بگوش کے قلمی نام سے ادبی کالم نگاری کا آغاز کیا جس نے پورے برصغیر میں دھوم مچادی جس کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

جوش ملیح آبادی

22 فروری 1982 کو اردو کے نامور شاعر جوش ملیح آبادی اسلام آباد میں وفات پاگئے۔

آپ 5 دسمبر 1898 کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے خاندان کے بیشتر افراد سلطنت اودھ میں معزز عہدوں پر فائز تھے۔ آپ کے والد دادا اور پردادا سب صاحب دیوان شاعر تھے۔ آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی شعر گوئی کی طرف مائل ہونا فطری تھا۔ آپ نے 9 سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ کچھ عرصے کے لیے آپ حیدر آباد دکن میں ادبی کام کیا مگر نظام حیدر آباد کے خلاف ایک نظم لکھنے پر معتوب ہوئے اور دہلی چلے آئے جہاں سے رسالہ کلیم جاری کیا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور ترقی اردو بورڈ میں اردو لغت کے مدیر مقرر ہوئے۔ آپ اردو کے ان قادر الکلام شاعروں میں سے تھے جن کا شمار اردو زبان کے محسنوں میں کیا جانا چاہیے۔ جنگل کی شہزادی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب، مناظر سحر، تلاش اور فتنہ خانقاہ آپ کی مشہور نظمیں ہیں جبکہ حسین اور انقلاب آپ کا وہ مرثیہ ہے جس نے مرثیہ گوئی کے ایک نئے دبستان کی بنیاد رکھی اور شاعر انقلاب کے نام سے مشہور ہوئے۔ کئی دفعہ آپ اپنی انقلابی شاعری کی وجہ سے پابند سلاسل بھی رہے۔ 1970 میں آپ کی خود نوشت یادوں کی برات کے نام سے شائع ہوئی جو آج بھی اردو ادب میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔

ڈاکٹر سجاد دہلوی

24 فروری 1955 کو اردو کے ایک اہم محقق مترجم اور استاد ڈاکٹر سجاد دہلوی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1895 کو راجپوتانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا تعلق دہلی کے ایک علمی گھرانے سے تھا۔ آپ کی تصانیف اور تراجم میں تغیرات زبان، ہندوستانی اصطلاحات، تاریخ نثر، اردو ہندی آریائی فلسفہ اور تاریخ ادبیات ایران کے نام سر فہرست ہیں

نصر اللہ خان

25 فروری 2002 کو پاکستان کے مشہور صحافی کالم نگار اور ڈرامہ نگار نصر اللہ خان کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 11 نومبر 1920 کو جاورا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد مسلم ہائی سکول امر تسر کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے امر تسر سے حاصل کی جب کہ بی اے کا امتحان آگرہ یونیورسٹی اور ایم اے اردو ناگپور یونیورسٹی سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کو صحافت سے شغف تھا۔ آپ نے صحافت کی تربیت مولانا ظفر علی خان سے حاصل کی اور ان کے اخبار زمیندار میں کام کیا۔ آپ ذاتی طور پر تو ایک بے باک انسان تھے مگر مولانا ظفر علی خان کی تربیت نے آپ کے قلم کو بھی بے باک کر دیا۔ شروع میں آپ نے 1949 سے 1953 تک ریڈیو پاکستان کراچی میں پروڈیوسر کے طور پر خدمات انجام دیں بعد ازاں روزنامہ حریت اور پھر جنگ کراچی سے وابستہ رہے۔ اردو صحافت میں آپ کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ آپ بڑی مدت تک صرف ایک عنوان کے تحت یعنی "آداب عرض" کے زیر عنوان لکھتے رہے۔ آپ کی تصانیف میں آپ کے کالموں کا مجموعہ "بات سے بات" ڈرامہ "لائٹ ہاؤس کے محافظ" خاکوں کا مجموعہ "کیا قافلہ جاتا ہے" اور آپ کی خود نوشت سوانح عمری "ایک شخص مجھی سا تھا" شامل ہیں۔

ڈاکٹر احسن فاروقی

26 فروری 1978 کو افسانہ نگار ناول نگار اور اردو کے صفحہ اول کے نقاد ڈاکٹر احسن فاروقی کوئٹہ میں وفات پاگئے اور کراچی میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 22 نومبر 1913 کو قیصر باغ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے لکھنؤ میں حاصل کی جب کہ بی اے اور ایم اے کی ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی سے حاصل کی اور اسی یونیورسٹی سے رومانوی شاعری پر ملٹن کے اثرات کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی آپ پہلے کراچی یونیورسٹی پھر سندھ یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔ آپ بلوچستان یونیورسٹی میں پروفیسر صدر شعبہ انگریزی اور کلیہ فنون کے ڈین بھی رہے۔ آپ کا شمار اردو کے صف اول کے ناقدین میں ہوتا ہے۔ آپ انگریزی اور اردو کے ساتھ ساتھ جرمن اور فرانسیسی زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے۔ آپ کی تنقیدی کتابوں میں اردو ناول کی تنقیدی تاریخ، ناول کیا ہے، ادبی تخلیق اور ناول، میر انیس اور مرثیہ نگاری اور تاریخ انگریزی ادب کے نام سر فہرست ہیں۔

احمد ہمدانی

26 فروری 2015 کو نامور نقاد، شاعر اور براڈ کاسٹر احمد ہمدانی کراچی میں وفات پاگئے۔
آپ 10 اکتوبر 1924 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے آگرہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ 23 سال تک ریڈیو پاکستان سے منسلک رہے اور پھر حکیم محمد سعید کی ذاتی درخواست پر ہمدرد یونیورسٹی سے

منسلک ہو گئے جہاں تقریباً دس برس خدمات انجام دیں۔ آپ ایک اچھے شاعر اور ناقد تھے۔ آپ کے شعری مجموعوں میں پیاسی زمین اور ہجر کی چھاؤں کے نام شامل ہیں۔

میجر آفتاب حسن

26 فروری 1993 کو سائنسی موضوعات کے معروف مصنف، محقق اور ماہر تعلیم میجر آفتاب حسن کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 16 ستمبر 1919 کو بازید پور بہار میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے شہر میں ہی حاصل کی جبکہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے آپ نے طبیعات میں ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن چلے گئے۔ لندن میں آپ کی ملاقات چوہدری رحمت علی سے ہوئی۔ ان دونوں تحریک پاکستان زوروں پر تھی چنانچہ آپ بھی برطانیہ میں تحریک پاکستان میں شامل ہو گئے۔ سقوط حیدرآباد کے بعد آپ پاکستان آ گئے اور ملٹری اکیڈمی کاکول میں سائنس شعبے کے سربراہ بنے۔ ملٹری اکیڈمی میں ملازمت کی وجہ سے آپ کے نام کے ساتھ میجر کا اضافہ ہو گیا جو آپ کے نام کا جز بن گیا۔ 1953 میں آپ اردو کالج میں باحثیت پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس وقت اردو کالج رنچھوڑ لائن میں ایک پرانی عمارت میں واقع تھا۔ تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ آپ علمی ادبی اور دوسری سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے تھے آپ کے دور میں کراچی یونیورسٹی کی بیشتر پوزیشنز اسی کالج میں آتی تھیں اور کھیلوں کے مقابلے میں بھی آپ کا کالج ہمیشہ فاتح رہتا تھا۔ اسی زمانے میں خواجہ معین الدین کا لکھا ہوا ڈرامہ تعلیم بالغاں سب سے پہلے اردو کالج میں ہی اسٹیج پر ہوا۔ 1960 سے 1978 تک آپ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی کے سربراہ رہے اسی دوران آپ نے اردو میں سائنسی اصطلاحات سازی اور سائنسی موضوعات پر کتب کی اشاعت کے سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ کچھ عرصہ آپ مقتدرہ قومی زبان کے صدر بھی رہے۔ پاکستان میں اردو میں سائنس کی تعلیم آپ کا پہلا اور آخری عشق تھا اس سلسلے میں آپ نے کئی سائنسی رسالے نکالے اس کے علاوہ سائنس کی تقریباً ایک لاکھ اصطلاحت کے اردو مترادفات تیار کرائے۔

عارف سنبھلی

26 فروری 1978 کو معروف شاعر عارف سنبھلی کو نامعلوم دہشت گردوں نے فائرنگ کر کے قتل کر دیا۔ آپ 1939 کو قصبہ بچھراوں تحصیل سنبھل ضلع مرادآباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا آبائی تعلق سادات امروہہ سے تھا اور آپ کا اصل نام سید عابد علی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ کراچی سے میٹرک انٹر کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور بی ایڈ کی اسناد حاصل کیں۔ آپ نے پانچویں کلاس سے ہی شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ آپ کا کلام روزنامہ جنگ جسارت اور انجام اور دیگر رسائل اور کتب کی زینت بنتا رہا۔ آپ نے بہت کم عمری میں ہی شہرت کی اعلیٰ منازل طے کیں۔ 2008 میں آپ کے بھتیجے سید حسن خالد نے آپ کا کلام مرتب کر کے "جلوہ جام" کے عنوان سے شائع کیا۔

حاجی محمد صدیق چوہدری

27فروری2004کو پاک بحریہ کے پہلے کمانڈرانچیف حاجی محمد صدیق چودھری کراچی میں وفات پاگئے۔آپ1911میں بٹالہ ضلع گرداس پور میں پیدا ہوئے تھے۔1933میں رائل انڈین نیوی میں کمیشن حاصل کیا۔قیام پاکستان کے بعد آپ نے پاک بحریہ میں اپنی خدمات انجام دینا شروع کی اور31جنوری1953کو پاک بحریہ کے پہلے مسلمان اور پہلے پاکستانی کمانڈرانچیف کے عہدے کا حلف اٹھایا۔آپ اس عہدے پر28فروری1959تک فائزرہے۔آپ کی گراں قدر خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو بابائے پاک بحریہ کہا جاتا تھا جبکہ حکومت پاکستان نے آپ کو ہلال پاکستان کا اعزاز عطا کیا۔

نسیم امروہوی

28فروری1987کو اردو کے نامور مرثیہ نگار شاعر اور ماہر لسانیات جناب نسیم امروہوی کراچی میں وفات پاگئے۔آپ24اگست 1908کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے آپ کا اصل نام سید قائم رضا تھا۔آپ کا خاندان علمی اور ادبی لحاظ سے امروہہ میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔آپ نے عربی اور فارسی کے علاوہ منطق، فلسفہ، فقہ، علم الکلام، تفسیر، حدیث اور ادبیات کی تحصیل کی۔کم عمری میں جب آپ نے پہلی مرتبہ اپنا مرثیہ پڑھا تو اس میں نواب سید باقر علی خان نسیم بھی تشریف رکھتے تھے۔وہ آپ کے کلام سے اتنے متاثر ہوئے کہ اپنے ہاتھ سے سر پر دستار بندی کی اور نسیم جوان کا تخلص تھا آپ کو سونپ دیا۔اس واقعے کے بعد سے آپ نے اپنا تخلص نسیم اختیار کر لیا جبکہ اس سے پہلے آپ اپنے نام کی مناسبت سے قائم کا تخلص استعمال کرتے تھے۔تکمیل تعلیم کے بعد آپ نے کچھ عرصہ فیض کالج میں مدرس رہے پھر لکھنؤ چلے گئے جہاں مختلف اداروں سے بطور معلم وابستہ رہے ہجرت سے پہلے آپ رامپور میں اورینٹل کالج میں فارسی کے پروفیسر تھے۔قیام پاکستان کے بعد آپ خیر پور آئے اور پھر کراچی میں سکونت اختیار کی۔آپ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، گیت اور نغمہ سبھی اصناف پر عبور رکھتے تھے لیکن آپ کی اصل شناخت مرثیہ نگاری ہے۔آپ نے200سے زائد مرثیے کہے۔آپ لسانیات پر بھی مکمل عبور رکھتے تھے اور ایک طویل عرصے تک ترقی اردو بورڈ میں اردو لغت کے مدیر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔اس کے علاوہ آپ نے نسیم اللغات اور فرہنگ اقبال بھی مرتب کیں۔

نیاز بدایونی

29فروری2008کو ممتاز شاعر نیاز بدایونی کراچی میں وفات پاگئے۔آپ1935کو بدایوں یوپی کے ایک علمی وادبی خانوادے میں پیدا ہوئے۔آپ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہاں برسوں سے شعر و سخن کا چرچا تھا۔آپ کے والد اور دادا دونوں صاحب دیوان شاعر تھے۔دلاور فگار اور محشر بدایونی آپ کے قریبی عزیز تھے۔قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔آپ پہلے وزارت مالیات اور پھر موسمیات سے وابستہ رہے اور پھر تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ادبی جریدے انجم کے مدیر بھی رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد نصابی و تعلیمی کتب کا محض چند برس میں ڈھیر لگادیا۔اس کے علاوہ آپ نے نہج البلاغہ کا منظوم ترجمہ اور قواعد انشاء پر5کتابیں الگ تحریر کیں۔

مولانا حسن مثنیٰ ندوی

یکم مارچ 1998 کو تحریک پاکستان کے کارکن، صحافی اور عالم دین مولانا حسن مثنیٰ ندوی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 18 جنوری 1913 کو صوبہ بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا مولانا شاہ سلیمان پھلواری ندوۃ العلماء کے بانی تھے۔ آپ بھی 1929 میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے۔ آپ کے دادا نے نہ صرف لوگوں کو دینی علوم بلکہ جدید تعلیم کی طرف بھی مائل کیا اور پشاور سے رنگون تک جتنے اسکول کالج اور مدارس قائم ہوئے ان سب کے قیام میں کسی نہ کسی طرح آپ کے دادا کا ہاتھ تھا۔ سرسید احمد خان کی تحریک تعلیم جدید کی حمایت میں قدیم خانوادوں کی طرف سے پہلی طاقتور آواز آپ کے دادا ہی کی تھی۔ 1936 میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی اور 1937 میں آپ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں بحیثیت صحافی شریک ہوئے پھر توآپ مسلم لیگ کے انتہائی سرگرم کارکن بن گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور پھر سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے ایک ادبی رسالہ "مہر نیم روز بھی جاری کیا۔ 1959 میں آپ نیشنل کالج کراچی میں لیکچرار مقرر ہوئے اور پھر جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اسلامک انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ اسکالر مقرر کردیا۔ 1966 میں آپ نے روزنامہ حریت کراچی سے وابستگی اختیار کرلی۔ آپ کی درجن کے قریب کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔

سید آل رضا

یکم مارچ 1978 کو نامور شاعر سید آل رضا کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 10 جون 1896 کو ضلع اناؤ (اودھ) کے ایک قصبے نیوتنی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد اودھ کے اضلاع میں انصاف اور قانون کے مختلف عہدوں پر فائز رہے اور آخر میں چیف کورٹ لکھنؤ ہوئے۔ آپ نے میٹرک سیتاپور اور بی اے کی ڈگری لکھنؤ سے حاصل کی جبکہ ایل ایل بی اے ڈگری الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہو کر لکھنو ہی سے وکالت کی پریکٹس شروع کی اور یہی وہ زمانہ تھا جب آپ نے شاعری بھی شروع کی۔ آپ نے آرزو لکھنوی کی شاگردی اختیار کی اور بہت جلد ان کے قریبی شاگردوں میں شمار ہونے لگے۔ کچھ ہی عرصے میں آپ کی شاعری کی دھوم پورے لکھنو میں ہوگئی اور زبان کی شستگی اور شگفتگی کی وجہ سے آپ کا شمار اساتذہ میں ہونے لگا۔ آپ دراصل غزل کے استاد تھے لیکن آپ نے مرثیہ نگاری میں بھی بڑی شہرت حاصل کی۔ آپ کے مرثیے "شہادت سے پہلے شہادت کے بعد" نے بہت زیادہ شہرت حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آکر آباد ہوگئے آپ کے چھوٹے بھائی جناب ہاشم رضا کراچی کے پہلے ایڈمنسٹریٹر بنے۔ کراچی میں بھی شاعری کے علاوہ آپ نے ایک نامور وکیل کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا۔

ظریف جبل پوری

یکم مارچ 1964 کو معروف مزاح نگار شاعر ظریف جبل پوری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 30 نومبر 1913 کو ضلع جبلپور (سی

پی) میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی ظریفانہ اشعار کہنے کی وجہ سے ظریف کے نام سے مشہور ہوگئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ بنیادی طور پر مزاحیہ شاعر تھے تاہم اس کے علاوہ آپ نے غزل نظم قصیدہ اور منقبت غرض ہر صنف میں آپ نے بہت اچھا اور بہت جامع لکھا۔ آپ کی مزاحیہ نظموں میں ٹیڈی بوائے، ٹیڈی گرل، ملکہ معظمہ کی آمد وغیرہ بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ مشاعروں میں آپ کی آمد پر بڑی چہل پہل اور رونق ہو جاتی تھی خاص طور پر نوجوان آپ کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ آپ کے 3 مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن میں فرمان ظرافت، تلافی مافات اور نشان تماشا شامل ہیں۔

عزم بہزاد

4مارچ 2001 کو اردو کے مقبول شاعر عزم بہزاد کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہیں میوا شاہ قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 31 دسمبر 1958 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ مشہور شاعر بہزاد لکھنوی کے پوتے تھے۔ آپ کے والد افسر بھزاد بھی کراچی کے ممتاز شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کی شاعری کا مجموعہ "تعبیر سے پہلے" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔

فخر ماتری

5مارچ 1966 کو نامور صحافی فخر ماتری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 3 ستمبر 1917 کو گجرات میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم بھی آپ نے گجرات میں ہی حاصل کی۔ آپ شروع ہی سے تحریک پاکستان سے وابستہ رہے اور 1938 میں جب قائداعظم ایک قومی اخبار کے اجرا کے سلسلے میں گجرات کے دورے پر آئے تو آپ ہی نے ریلوے اسٹیشن پر قائداعظم کا استقبال کیا اور پھولوں کا ہار بھی پہنایا اور ساتھ ساتھ اخبار کے فنڈ کے لیے روپوں کی تھیلی بھی پیش کی۔ قائداعظم کی تحریک پر 1940 میں گجراتی زبان میں ہفت روزہ ملت جاری کیا جس نے تحریک پاکستان اور دو قومی نظریے کو کاٹھیاواڑ میں مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد کانگریس نے آپ پر پاکستان کی حمایت کرنے کا الزام لگا کر بمبئی سے نکال دیا۔ کراچی آکر آپ نے یہاں روزنامہ ملت جاری کیا اور اپنی وفات تک اس کے مدیر رہے۔ 1948 میں آپ نے اردو اخبار "حریت" اور انگریزی اخبار "لیڈر" جاری کیا اور ان دونوں اخبارات کے مدیر رہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں حریت اخبار پاکستان میں صف اول کا اخبار شمار ہونے لگا۔ آپ صحافیوں کی قومی تنظیم اور آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی کے بھی صدر رہے۔

پروفیسر محمد فائق بدایونی

6مارچ 2016 کو ممتاز ادیب اور ماہر تعلیم اور اردو یونیورسٹی میں شعبہ نفسیات کے استاد براڈ کاسٹر پروفیسر محمد فائق بدایونی کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی میواہ شاہ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 2 دسمبر 1947 کو بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ 1970 میں غزالہ رفیق کے ساتھ ریڈیو پاکستان سے آپ کا ایک پروگرام بہت مشہور ہوا۔ آپ ادب اور نفسیات کے موضوعات پر متعدد کتابوں کے مصنف تھے جن میں صدیوں کا سفر اور آپ کی خودنوشت صبح کرنا شام کا بہت مشہور ہوئے۔

جسٹس سجاد علی شاہ

7 مارچ 2017 کو پاکستان کے سابق چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 17 فروری 1933 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ گریجویشن کرنے کے بعد آپ قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن گئے جہاں آپ نے لنکن ان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ 1960 میں آپ نے ہائی کورٹ کے وکیل کی حیثیت سے رجسٹریشن کروائی جس کے بعد آپ نے کراچی میں قانون کی پریکٹس شروع کر دی۔ 1968 میں آپ کی براہ راست ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے پر تقرری ہوئی۔ یہ سیٹ مقامی بار کے ممبران کے لیے مخصوص تھی اور آپ نے یہ میرٹ پر حاصل کی۔ ون یونٹ کے دوران پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے اور جب ون یونٹ ختم ہو گیا تو پھر سندھ میں تعینات ہو گئے۔ 1974 میں وفاقی وزرات قانون و پارلیمانی امور میں جوائنٹ سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے اور 1977 میں آپ کو سپریم کورٹ آف پاکستان کا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں سندھ ہائی کورٹ کے جج تعینات کیے گئے اور پھر 1989 میں کچھ عرصے کے لیے سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس رہے اور پھر آپ 1992 میں سپریم کورٹ کے جج مقرر ہو گئے اور 5 جون 1994 کو آپ نے چیف جسٹس آف پاکستان کا عہدہ سنبھالا۔ دسمبر 1997 میں آپ نے مختلف وجوہات کی بنا اپنے عہدے سے استعفی دے دیا۔

حسیب احسن

8 مارچ 2013 کو پاکستان کے سابق کرکٹر اور سابق چیف سلیکٹر حسیب احسن کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی میں ہی سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 15 جولائی 1939 کو پشاور میں پیدا ہوئے تھے آپ نے اسلامیہ کالج پشاور سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ پاکستان کی طرف سے 1958 سے 1962 کے دوران 12 ٹیسٹ میچ کھیل کر 27 وکٹیں حاصل کیں۔ آپ سیدھے ہاتھ سے گیند کرنے والے آف اسپنر تھے۔ محض 23 برس کی عمر میں آپ کا ٹیسٹ کیریئر میں مشکوک بالنگ ایکشن کے باعث ختم ہو گیا۔ تاہم فرسٹ کلاس میچز میں آپ کی کارکردگی بہت شاندار رہی۔ اسی کی دہائی میں آپ چیف سلیکٹر اور پاکستان کرکٹ ٹیم کے منیجر بھی رہے۔

جی الانہ

8 مارچ 1985 کو تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن دانشور شاعر ماہر معیشت اور سندھ مسلم لیگ کے سابق جنرل سیکرٹری غلام علی الانہ جو کہ جی الانہ کے نام سے بھی مشہور تھے کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 22 اگست 1906 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ سینٹ پیٹرک ہائی اسکول کراچی سے میٹرک اور ڈی جے کالج سے انٹر کیا اور فرگوسن کالج سے بی اے کی تعلیم حاصل کی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی آپ تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ 20 سال تک کراچی میونسپل کارپوریشن کے رکن منتخب ہوتے رہے 1948 میں کارپوریشن کے میئر بھی منتخب ہوئے۔ کئی سال تک اسلامک چیمبر آف کامرس کے صدر بھی رہے۔ آپ شاعر اور مصنف کی حیثیت سے بھی مشہور تھے جبکہ آپ انگریزی زبان میں شاعری کرتے تھے آپ کی شاعری کا اردو بنگالی سندھی گجراتی

زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے۔ آپ کی مشہور کتاب "قائداعظم اسٹوری آف اے نیشن" ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے تحریک پاکستان سے متعلق تاریخی دستاویزات کا مجموعہ بھی مرتب کیا۔

سید علی اکبر رضوی

9 مارچ 2009 کو معروف ادیب سید علی اکبر رضوی کراچی میں وفات پا گئے۔

آپ 1922 میں اعظم گڑھ یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک ہمہ جہت شخصیت تھے آپ نہ صرف اپنے وقت کے بڑے صنعتکار تھے بلکہ مختلف سماجی و فلاحی اور تعلیمی اداروں کے سرپرست بھی تھے اور ایک کثیر المطالعہ شخص تھے۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ صنعت و تجارت میں گزرا مگر 1992 میں جب آپ 70 سال کے تھے تو آپ نے سفر نامہ نگاری کا آغاز کیا۔ آپ نے 18 سے زیادہ کتابیں لکھیں اور آپ کی سب سے معرکتہ الآراء کتاب تاریخ اسلام کا سفر ہے جس کا عنوان ہے حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت خاتم علیہ السلام آپ کی بہت سی کتابیں انگریزی ہندی اور بنگلہ زبان میں ترجمہ ہو کہ شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر نسیمہ ترمذی

11 مارچ 2005 کو ممتاز ماہر تعلیم کالم نویس اور سائنس دان ڈاکٹر نسیمہ ترمذی کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ 12 جولائی 1933 کو دہلی میں پیدا ہوئی تھیں۔ نامور ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کی آپ پڑپوتی جب کہ نامور مزاح نگار رشید احمد صدیقی کی بھتیجی تھیں۔ جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر سید معصوم علی ترمزی کی آپ اہلیہ تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے اپنے والدین کے ہمراہ کراچی آگئیں تھیں۔ جامعہ کراچی سے آپ نے ایم ایس سی کیا اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے ڈی فل اور جامعہ کراچی سے ہی ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیمی مراحل پورے کرنے کے بعد آپ جامعہ کراچی میں ہیں تدریس سے وابستہ ہو گئی۔ متعدد طلبا نے آپ کی نگرانی میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کیا۔ آپ کی مہارت کا خاص موضوع بحری حیاتیات تھا اس موضوع پر آپ کے 120 سے زائد تحقیقی مقالات قومی و بین الاقوامی جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ نے متعدد تحقیقی منصوبے مکمل کیے جن میں آکسفورڈ یونیورسٹی اور برٹش میوزیم آف نیچرل ہسٹری لندن کے منصوبے بھی شامل ہیں۔ آپ جامعہ کراچی کے شعبہ حیوانات کی چیئرمین بھی رہیں اس کے علاوہ ادارہ علوم بحری کی ڈائریکٹر بھی رہیں۔ آپ کئی دفعہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ آپ نے روزنامہ جنگ میں ایک طویل عرصے تک "اللہ معاف کرے" کے عنوان سے کالم بھی لکھا۔ آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں پاکستان اکیڈمی آف سائنسز نے گولڈ میڈل اور جامعہ کراچی کی المنائی ایسوسی ایشن نے سلور میڈل دیے۔

طاہرہ واسطی

11 مارچ 2012 کو معروف اداکارہ طاہرہ واسطی انتقال کر گئیں۔

آپ 1944 کو سرگودھا میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ نے اپنے فنی سفر کا آغاز 1968 میں پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈرامے جیب کترا سے

کیا جو معروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی ایک کہانی سے ماخوذ تھا۔1970 اور 80 کی دہائی میں آپ نے ٹیلی ویژن کے لاتعداد ڈراموں میں کام کیا جن میں افشاں، آخری چٹان، غرناطہ، شاہین اور ٹیپو سلطان کے نام سر فہرست ہیں۔ آپ نے پی ٹی وی کے لیے متعدد ڈرامے بھی تحریر کیے۔ آپ کی شادی معروف اداکار اور انگریزی نیوز کاسٹر رضوان واسطی سے ہوئی۔ جبکہ آپ کی بیٹی لیلی واسطی نے بھی ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں کام کیا۔

ادا جعفری

12 مارچ 2015 کو اردو نامور شاعرہ ادا جعفری کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ 22 اگست 1924 کو بدایوں میں پیدا ہوئی تھیں جبکہ آپ کا اصل نام عزیز جہاں تھا۔ شروع میں آپ ادا بدایونی کے نام سے شعر کہتی تھیں لیکن شادی کے بعد ادا جعفری کے نام سے مشہور ہوئی۔ خاندانی روایات کے مطابق گھر ہی پر تعلیم حاصل کی اور شاعری کا ذوق کیونکہ فطری تھا اس لیے ابتدا نظم گوئی سے کی اور ابتدائی اصلاح آپ نے اختر شیرانی اور اثر لکھنوی سے لی۔ 1945 میں آپ کی پہلی غزل اختر شیرانی کے رسالے "رومان" میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد تو برصغیر پاک وہند کا کوئی ایسا ادبی جریدہ نہ تھا جس میں آپ کی نظم یا غزل شامل اشاعت نہ ہو۔ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو تمغہ امتیاز اور صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا جب کہ پاکستان رائٹرز گلڈ نے آپ کو آدم جی ادبی ایوارڈ اور اکادمی ادبیات پاکستان نے کمال فن ایوارڈ سے نوازا۔ آپ کے مجموعہ کلام میں ساز ڈھونڈتی رہی، شہر درد، غزالاں تم تو واقف ہو اور ہائیکو نظموں کا مجموعہ ساز سخن اور آپ کی خودنوشت "جو رہی سو بے خبر رہی" کے نام سے بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

ظہیر الحسن لاری

13 مارچ 1972 کو معروف قانون دان اور آل انڈیا مسلم لیگ کے رہنما ظہیر الحسن لاری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ لارڈ سٹرک گورکھپور یوپی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات میں علی گڑھ یونیورسٹی سے ٹاپ کیا جبکہ 1930 میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی اور وکیل کی حیثیت سے اپنی پروفیشنل زندگی کا آغاز کیا۔ 1936 میں آپ یوپی اسمبلی میں مسلم لیگ کے ڈپٹی لیڈر رہے. اس کے بعد آپ قیام پاکستان تک یوپی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوتے رہے اور پاکستان ہجرت سے پہلے ڈپٹی لیڈر اپوزیشن کے عہدے پر تھے۔ پاکستان آکر آپ 1950 میں ایڈیشنل جج مقرر ہوئے مگر 1952 میں استعفی دے دیا اور کراچی بار کے ممبر بن گئے۔ یوپی کی اسمبلی میں جو آپ نے تقاریر کیں ان کے اردو تقاریر اور انگریزی تقاریر کے الگ الگ مجموعے کتاب کی صورت میں آپ کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔

حبیب جالب

13 مارچ 1993 کو پاکستان کے نامور عوامی اور انقلابی شاعر حبیب جالب لاہور میں وفات پاگئے۔

آپ 24 مارچ 1928 کو میانی افغاناں ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا بچپن ضلع ہوشیار پور میں ہی گزرا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران آپ دہلی چلے گئے جہاں اینگلو عربک اسکول دہلی میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے اور جیکب لائنز اسکول میں داخل ہوئے۔ مگر آپ کی توجہ پڑھائی سے زیادہ شاعری کی طرف تھی۔ آپ نے زندگی بھر عوام کے مسائل اور خیالات کی ترجمانی کی اور عوام کے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے رہے زمانہ طالب علمی میں حیدر بخش جتوئی کی سندھ ہاری تحریک سے وابستہ ہوئے اور پہلی بار 1954 میں گرفتار ہوئے۔ صدر ایوب خان کے خلاف 1962 میں اپنی مشہور نظم دستور تحریر کی جسے ایک مشاعرے میں جب آپ نے پڑھا تو پورا مشاعرہ لوٹ لیا لیکن اسی کے ساتھ قید وبند کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ نے ہر عہد میں سیاسی اور سماجی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کی جس کی وجہ سے ہر دور میں حکومت کے معتوب اور عوام کے محبوب رہے۔ آپ کے بارے میں نواب آف کالاباغ کہتے ہیں "میں اپنے دور میں صرف ایک بندے سے عاجز آیا ہوں اور وہ تھا حبیب جالب میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا اگر اس کے پاس کچھ ہوتا تو میں اسے تگنی کا ناچ نچا دیتا لیکن اس کے پاس صرف شاعری تھی اور اس شاعر کا ضمیر تھا جس کا میں کچھ نہیں بگاڑ سکا"۔ آپ کے شعری مجموعوں میں برگ آوارہ، سر مقتل، عہد ستم، حرف حق، ذکر بہتے خون کا، عہد سزا، اس شہر خرابی میں اور چاروں جانب سناٹا وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کو انسانی حقوق کی متعدد تنظیموں نے ایوارڈ پیش کیے کراچی پریس کلب نے بھی آپ کو اعزازی رکنیت دی۔ آپ کی وفات کے بعد حکومت پاکستان نے آپ کو نشان امتیاز کا اعزاز عطا کیا۔

تسلیم عارف

13 مارچ 2008 کو پاکستان کے سابق ٹیسٹ کرکٹر اور مایہ ناز کمینٹیٹر تسلیم عارف کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ یکم مئی 1954 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ 29 جنوری 1980 کو آپ نے بھارت کے خلاف کلکتہ میں پہلا ٹیسٹ کھیلا اور پہلی اننگز میں 90 اور دوسری اننگ میں 40 رنز اسکور کئے۔ تاہم آپ کو اصل شہرت آسٹریلیا کے خلاف فیصل آباد میں کھیلے جانے والے ٹیسٹ سے ملی۔ اس ٹیسٹ میں آپ نے 210 رنز ناٹ آؤٹ اسکور کئے جو کہ کسی بھی وکٹ کیپر کا سب سے بڑا اسکور تھا اور یہ ایک عالمی ریکارڈ بنا جسے بعد میں زمبابوے کے اینڈی فلاور نے توڑ دیا۔ آپ کا کیریئر بہت مختصر تھا آپ نے صرف 6 ٹیسٹ میچ کھیلے۔ کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے اردو میں کرکٹ کمنٹری شروع کی اور اپنے مخصوص انداز لہجے اور آواز کی بناپر بہت مقبولیت حاصل کی۔

پروین رحمٰن

13 مارچ 2013 کو پاکستان کی معروف سماجی شخصیت پروین رحمٰن کراچی میں قتل کر دی گئیں۔
آپ 22 جنوری 1957 کو ڈھاکہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ 1982 میں آپ نے داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کراچی سے بیچلرز آف آرکیٹیکچر کی ڈگری حاصل کی اور بعد میں اربن پلاننگ کے موضوع پر پوسٹ گریجویشن کیا۔ کافی عرصے تک آپ تدریس کے شعبے سے وابستہ رہیں۔ آپ نے اختر حمید خان کے اربن پائلٹ پروجیکٹ میں بھی خدمات انجام دیں۔ 1989 میں آپ نے

کراچی میں اربن ٹرانسپورٹ سینٹر کے نام سے ایک این جی او قائم کی۔ آپ اپنے دفتر سے گھر لوٹ رہی تھیں کہ نامعلوم دہشتگردوں کی فائرنگ سے زندگی کی بازی ہار گئیں۔

عمر قریشی

14 مارچ 2005 کو کرکٹ پر رواں تبصرہ کرنے والے پاکستان کے پہلے کمنٹیٹر جناب عمر قریشی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 2 جون 1927 کو مری میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد ایم اے قریشی فوج میں کرنل کے عہدے پر فائز تھے۔ قیام پاکستان کے وقت آپ امریکہ میں مقیم تھے جہاں آپ نے بین الاقوامی امور میں گریجویشن کیا۔ 1953 میں آپ پاکستان آئے اور آپ نے براڈکاسٹنگ شروع کی جنوری 1955 میں جب ڈھاکہ میں بھارت اور پاکستان کے درمیان پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا گیا تو ریڈیو سے پہلی مرتبہ کمنٹری نشر ہوئی اور پاکستان میں پہلی کمنٹری کرنے والی آواز آپ ہی کی تھی جب کہ آپ کے ساتھ جمشید مارکر اور حامد جلال بھی تھے۔ اس دن سے لیکر آپ کی وفات تک آپ کا بندھن کبھی کرکٹ کمنٹری سے نہیں ٹوٹا۔ آپ نے کئی کتابیں بھی تحریر کیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو ستارے امتیاز عطا کیا۔

جسٹس (ر) دراب پٹیل

15 مارچ 1997 کو پاکستان کے نامور ماہر قانون جسٹس (ر) دراب پٹیل کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 13 ستمبر 1944 کو کوئٹہ کے ایک کاروباری پارسی خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن میں ہی والدہ کے انتقال ہوگیا۔ اس وجہ سے آپ کی دادی جو بمبئی میں مقیم تھیں تعلیم و تربیت کے لئے اپنے ساتھ لے گئی۔ بمبئی میں آپ نے ایم اے اور ایل ایل بی کی تعلیم حاصل کی اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے 1954 میں وطن واپس آگئے اور کراچی سے وکالت شروع کی۔ 1966 میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج مامور ہوئے اور 1976 میں سپریم کورٹ کے جج بنے۔ درمیان میں آپ نے بلوچستان یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر کے طور پر خدمات بھی انجام دیں۔ آپ نے ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمہ قتل کے کیس میں اختلافی نوٹ لکھا تھا۔ 1981 میں جب صدر ضیاء الحق نے پی سی او نافذ کیا تو آپ نے استعفی دے دیا۔ آپ 1987 میں انسانی حقوق کمیشن پاکستان کے بانی اور تاحیات چیئرمین رہے۔

اکرم بریلوی

17 مارچ 2018 کو اردو کے معروف ادیب اکرم بریلوی کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں وفات پاگئے۔ آپ 30 جون 1918 کو ضلع مراد آباد کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے۔ کیونکہ آبائی وطن بریلی تھا اس لیے مراد آباد کی جگہ بریلی لکھتے تھے. آپ کی والدہ اپنے زمانے کی مشہور قصہ گو تھیں۔ قیام پاکستان کے وقت جس طرح مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلی گئی اس کا آپ کی طبیعت پر بہت گہرا اثر ہوا۔ اور آپ نے کراچی منتقل ہونے کے باوجود پانچ سال تک کچھ نہ لکھا۔ انتظار حسین کی کوششوں سے آپ دوبارہ ادبی دنیا میں واپس آئے اور بڑی تعداد میں ناول اور ڈرامے تحریر کیے جن میں گردش، لاوہ، پل صراط، سوداگر اور آشوب سرا وغیرہ شامل ہیں۔

ایم ایم عالم

18مارچ 2013 کو 1965 کی پاک بھارت جنگ کے ہیر وجناب ایم ایم عالم کراچی میں وفات پاگئے۔آپ 6جولائی 1935 کو کلکتہ کے ایک خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے آپ کا پورا نام محمد محمود عالم تھا۔ابتدائی تعلیم آپ نے کلکتہ میں ہی حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کے خاندان نے مشرقی پاکستان میں سکونت اختیار کی۔ پائلٹ بننے کا شوق اعصاب پر ایسا تاری ہوا کہ آپ نے تعلیم ترک کرکے پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کرلی۔1953 میں کمیشن حاصل کیا اور سال بہ سال آگے بڑھتے رہے اور ترقی کرتے رہے۔1965 کی جنگ میں آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے سرگودھا کے محاذ پر 5 بھارتی ہنٹر طیاروں کو ایک منٹ کے اندر اندر مار گرایا جن میں سے 4 تیس سیکنڈ کے اندر مار گرائے تھے۔یہ ایک عالمی ریکارڈ ہے۔اس مہم میں آپ سیبر طیارہ اڑا رہے تھے جو اس زمانے کے اعتبار سے ہنٹر طیارے سے ٹیکنیکی اعتبار سے بہت کمتر تھا۔اس جنگ کے دوران آپ نے مجموعی طور پر دشمن کے نو طیارے مار گرائے اور دو کو نقصان پہنچایا۔اس کارنامے پر آپ کو دو مرتبہ ستارہ جرات کا اعزاز عطا کیا گیا۔آپ کی وفات کے بعد کراچی اور لاہور کی ایک سڑک کو آپ کے نام سے منسوب کیا گیا جب کہ میانوالی ایئر بیس کو بھی آپ کے نام سے منسوب کر دیا گیا اور پاکستان کے محکمہ ڈاک نے آپ کی تصویر سے مزین ایک یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیا۔

پروفیسر سبط جعفر

18مارچ 2013 کو پاکستان کے نامور شاعر، معلم، ماہر تعلیم، سوز خواں اور سماجی کارکن پروفیسر سبط جعفر کراچی میں نامعلوم افراد کی فائرنگ سے شہید ہوگئے۔آپ 7مارچ 1957 کو لیاقت آباد کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔آپ نے گورنمنٹ بوائز ہائی اسکول لیاقت آباد سے میٹرک اور اسلامیہ کالج سے گریجویشن کیا۔اس کے ساتھ ساتھ بی ایڈ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے اسلامیات اور ایم اے اردو ادب کی ڈگریاں بھی حاصل کی۔اس کے علاوہ آپ نے ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔آپ ایک عالم کے فرزند تھے اس لئے مذہبی تعلیم میں بھی اسناد مدرسہ الواعظین جامعہ امامیہ ناظم آباد سے حاصل کیں۔آپ نے تھوڑا عرصہ وکالت کی مگر اس پیشے کو ترک کر دیا اور 1981 میں سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا مگر اپنی درویشانہ طبیعت کی وجہ سے بیوروکریسی میں جانے سے زیادہ تدریس کو فوقیت دی اور گورنمنٹ ڈگری کالج لطیف آباد میں لیکچرر مقرر ہوئے۔ تھوڑے عرصے میں آپ کا تبادلہ گورنمنٹ ڈگری کالج لیاقت آباد میں ہو گیا جہاں آپ اپنی شہادت تک تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے شہادت کے وقت آپ اس کالج کے پرنسپل تھے۔آپ نے سوز خوانی کی باقاعدہ تربیت استاد عاشق علی خان سے حاصل کی اور بہت جلد پاکستان کے معروف ثناء خوانوں میں شمار ہونے لگے۔ سوز خوانی کے فن کے فروغ کے لیے ادارہ ترویج سوز خوانی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور بستہ کے نام سے سوز خوانی میں پڑھا جانے والا کلام مرتب کیا جو سوز خوانی کے فروغ میں بہت معاون اور مددگار ثابت ہوا۔آپ کے شاگرد پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور سوز خوانی کے فن کو فروغ دے رہے ہیں۔اسی لیے آپ تمام حلقوں میں "استاد" کے

لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ آپ ایک عمدہ شاعر تھے اور آپ کی شاعری کے کئی مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں اس کے علاوہ آپ نے کئی کتابیں بھی تحریر کیں جن میں کچھ نصابی موضوعات بھی ہیں۔ حجاج کی رہنمائی کے لئے آپ نے معروف کتاب "زادِ راہ" تحریر کی۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری

19 مارچ 1978 کو اردو کے نامور ماہر لسانیات نقاد محقق اور مترجم اور ماہر تعلیم ڈاکٹر شوکت سبزواری کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 13 اکتوبر 1948 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ امداد العلوم اسلام میرٹھ سے حاصل کی پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور مولوی فاضل کے امتحانات پاس کرنے کے بعد۔ اردو عربی اور فارسی میں ایم اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1946 میں میرٹھ کالج میں اردو کے لیکچرر مقرر ہوئے کچھ عرصے دہلی میں بھی تدریسی فرائض انجام دیے۔ قیام پاکستان کے بعد 1950 میں ڈھاکہ چلے گئے اور وہاں کی یونیورسٹی سے لسانیات میں پی ایچ ڈی کیا۔ آپ کے مقالے کا عنوان تھا اردو زبان کی ارتقاء۔ 1958 تک ڈھاکہ یونیورسٹی سے منسلک رہے پھر آپ کراچی آ گئے جہاں آپ جوش ملیح آبادی اور ڈاکٹر ابو للیث صدیقی کی تحریک پر آپ نے آکسفورڈ کی طرز پر اردو کا مکمل تاریخی لغت تیار کرنے کا منصوبہ بنایا اس کے لیے حکومت نے کراچی میں اردو ترقی بورڈ کی تشکیل دیا اور لغت کی ترتیب وتدوین کا کام آپ کے سپرد کیا۔ مولوی عبدالحق کے انتقال کے بعد لغت بورڈ کی ساری ذمہ داری آپ کے کندھوں پر آپڑی اور مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے اور وفات تک اسی عہدے پر فائز رہے۔ آپ کی وفات تک اردو لغت کی ایک جلد بھی منظر عام پر نہیں آئی تھی بہر حال 8 جلدیں مکمل ہو چکی تھیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہیں۔

نثار بزمی

23 مارچ 2007 کو پاکستان کے نامور موسیقار نثار بزمی وفات پا گئے اور نارتھ کراچی میں محمد شاہ قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ یکم دسمبر 1925 کو صوبہ مہاراشٹر کے ضلع خان دیش میں جل گاؤں میں پیدا ہوئے تھے آپ کا اصل نام سید نثار احمد تھا۔ آپ نے 31 سال کی عمر میں سارے راگوں پر عبور حاصل کر لیا تھا۔ 1944 میں آپ نے یہ ڈرامے نادر شاہ کی موسیقی ترتیب دی۔ جس کے تمام گیتوں نے بہت شہرت حاصل کی۔ مشہور ملی نغمہ "یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے "کی موسیقی بھی آپ نے ترتیب دی تھی اس کے علاوہ 69 فلموں کی موسیقی ترتیب دیں تھی۔ آپ ایک خوش گو شاعر بھی تھے اور آپ کا شعری مجموعہ "پھر ساز صدا خاموش ہوا" بھی شائع ہو چکا ہے حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا تھا۔

جسٹس (ر) قدیر الدین احمد

23 مارچ 1995 کو سندھ ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس اور سابق گورنر سندھ جسٹس (ر) قدیر الدین احمد کراچی میں وفات

پاگئے۔ آپ 20 اکتوبر 1909 کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے جب کہ آپ کا آبائی وطن دہلی تھا۔ آپ نے اینگلو عربک اسکول دہلی سے میٹرک کیا اور پھر اسٹیفن کالج سے امتیازی نمبروں کے ساتھ بی اے کا امتحان پاس کیا۔ دہلی یونیورسٹی سے آپ نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے دہلی یونیورسٹی میں طلبہ کی یونین قائم کی اور قائداعظم سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا۔ جب آپ نے وکالت شروع کی تو کافی مشکلات کا سامنا ہوا مگر آپ نے دو سال میں ہی اپنی اتنی نیک نامی بنالی تھی کہ جج صاحبان اور عدالت کے ملازمین بھی عزت و مروت سے پیش آنے لگے۔ 1946 میں آپ دہلی صوبائی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور کچھ ہی عرصے میں اپنی ذاتی صلاحیتوں اور سخت محنت سے وکالت کے پیشے میں ایسا نام پیدا کیا کہ سارے پاکستان میں آپ کا نام مشہور ہو گیا۔ آپ کی اعلی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے جلد ہی آپ کو مغربی پاکستان ہائی کورٹ کا جج مقرر کر دیا گیا جہاں آپ نے ون یونٹ کے خاتمے تک خدمات انجام دیں۔ بعد میں آپ چیف جسٹس آف سندھ ہائیکورٹ مقرر ہوئے اور اپنی ریٹائرمنٹ تک اس عہدے پر فائز رہے۔ آپ کی کتابوں میں نظام مصطفی کیا ہے اور کس طرح قائم کیا جاسکتا ہے اور اسلام کی قوت متحرکہ اور مسلمانوں کا ذہنی جمود قابل ذکر ہیں۔

شیخ احمد

24 مارچ 1986 کو پاکستان کے نامور مصور شیخ احمد کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1901 میں امرتسر میں پیدا ہوئے تھے کلکتہ اور ممبئی سے مصوری اور انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد 1926 میں امریکہ چلے گئے جہاں وہ 10 سال مقیم رہے اور آٹو موبائل انجینئرنگ اور سینما فوٹو گرافی کی تعلیم حاصل کی۔ پھر آپ لندن چلے گئے جہاں تین سال تک سینٹرل اسکول آف آرٹس سے مصوری کی تربیت حاصل کی۔ 1939 میں وطن واپس لوٹے اور میو اسکول آف آرٹ لاہور سے وابستہ ہو گئے 1951 میں کراچی میں منتقل ہوئے جہاں آپ نے اپنے شاگرد آفتاب ظفر کے ساتھ ثانوی تعلیمی بورڈ کی ان نصابی کتابوں کی تزئین و آرائش اور ڈیزائننگ کی جو نیویارک کے اشاعتی ادارے سلور برڈٹ کمپنی کے اشتراک سے شائع کی گئی تھیں۔

سعیدہ عروج مظہر

25 مارچ 1978 کو ممتاز شاعرہ سعیدہ عروج مظہر وفات پاگئیں۔ آپ یکم جنوری 1922 کو حیدر آباد دکن کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئی۔ آپ نے جامعہ عثمانیہ سے فارسی میں ایم اے اور بی ایڈ کے امتحانات پاس کیے اور اس کے بعد حیدر آباد دکن کے ہی کالج میں لیکچرار مقرر ہو گئیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی منتقل ہو گئیں لیکن کچھ ہی عرصے میں گجرات کے ایک کالج میں بطور لیکچرار تدریس کے فرائض انجام دینے لگیں۔ آپ نے بہت کم عمری میں ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ سعیدہ آپ کا نام تھا اور عروج آپ کے شوہر کا نام جب کہ مظہر آپ کا تخلص تھا۔ آپ نے ادب کی تقریباً ہر صنف کو کچھ نہ کچھ دیا آپ کی نظمیں غزلیں افسانے ناول تحقیقی مقالے ملک کے معیاری رسائل میں زمانہ طالب علمی میں ہی شائع ہونے لگے تھے۔ آپ کی تصانیف میں اندھیرے

اجالے، ضیغم، ضمیر لالا، پل صراط، نئی صبح اور وحشت دل وغیرہ شامل ہیں۔

ساحر عباسی

25مارچ 1978 کو ممتاز شاعر ساحر عباسی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 30نومبر 1927 کو شعر و سخن کی بستی امروہہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام معشوق علی تھا جبکہ تخلص ساحر اور قلمی نام ساحر عباسی تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے امروہہ سے ہی حاصل کی جبکہ باقی تعلیم اینگلو عربک کالج دہلی میں حاصل کی۔ قیام پاکستان سے پہلے آپ مقبول عوامی شاعر تھے آپ نے قیام پاکستان کے سلسلے میں تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ کی قومی نظموں پر مشتمل ایک کتابچہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے اپنی قومی نظمیں ان جلسوں میں بھی پڑھیں جن کی صدارت قائداعظم محمد علی جناح نے کی آپکی ایک نظم کو قائداعظم نے بہت پسند کیا اور Very Good اور Well Recited کہہ کر آپ کو داد دی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ شاعری ترک کر کے صحافت کہ ہو گئے اور روزنامہ "انجام" کراچی سے وابستہ ہوئے اور ماہنامہ "بربط" کے مدیر بھی رہے۔ بعد میں آپ نے اپنا ذاتی ماہنامہ "ساون" اور ہفتہ وار انگریزی اخبار بھی نکالا۔ آپ ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں بہت سی غزلیں کہیں جنہیں آپ کی وفات کے بعد رئیس امروہی کی نگرانی میں "ابر صحرا کے نام سے مکمل کیا گیا۔

لیڈی نصرت عبداللہ ہارون

27مارچ 1966 کو تحریک پاکستان کی خاتون رہنما لیڈی نصرت عبداللہ ہارون کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ 9فروری 1896 کو کرمان ایران میں پیدا ہوئی تھیں اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ پھر آپ کو سندھ آنا پڑا جہاں آپ نے عربی فارسی اردو اور انگریزی میں تعلیم حاصل کی 1914 میں آپ کی شادی سر عبداللہ ہارون سے ہوئی۔ فلاحی اور سماجی بہبود کے کام کرنے کا جذبہ بچپن ہی سے تھا مسلمان لڑکیوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے گھر ہی پر جماعتیں جاری کر دیں اور چند تعلیم یافتہ خواتین کو پڑھانے پر آمادہ کر لیا۔ تحریک خلافت شروع ہوئی تو اس میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بی اماں جب بھی کراچی تشریف لاتیں وہ آپ ہی کے گھر مہمان ہوتیں اور قیام کرتیں۔ 1938 میں مسلم لیگ خواتین کی سب کمیٹی کی رکن مقرر ہوئیں اور 1943 میں آپ اس کمیٹی کی صدر منتخب ہوئیں۔ صدر کی حیثیت سے آپ نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا اور متعدد بار وائسرائے ہند سے ملاقات کر کے دو قومی نظریے کی وضاحت کی۔ قیام پاکستان کے بعد جب کشمیر میں جنگ چھڑی تو کشمیر کمیٹی قائم کی اور ہزاروں کمبل سویٹر اور موزوں وغیرہ کے بنڈل بھجوائے۔ خواتین مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی اور 1948 میں صدر منتخب ہوئیں اور اسی سال اپوا کی نائب صدر بھی منتخب ہوئیں۔ 1949 میں گل رعنا نصرت کلب قائم کیا اس کے علاوہ بے شمار فلاحی اداروں کی سرپرستی اور نگرانی کی۔

لطیف کپاڑیا

29مارچ 2002 کو پاکستان ٹیلی ویژن کے نامور اداکار لطیف کپاڑیا وفات پاگئے اور کراچی کے میوہ شاہ قبرستان میں آسودہ خاک

ہوئے۔ آپ 27 مارچ 1934 کو ناسک مہاراشٹر میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ 1957 میں آپ نے اداکاری کا آغاز کیا اور کی اسٹیج ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد آپ نے ٹیلی ویژن کے ڈراموں میں اداکاری شروع کی اور بے شمار ڈراموں میں کام کیا جن میں بارش، برزخ، ففٹی ففٹی، گریز، نادان نادیہ، شکست آرزو اور روزی بہت مقبول ہیں۔ حکومت پاکستان میں آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

صہبا لکھنوی

30 مارچ 2002 کو اردو کے ممتاز شاعر ادیب اور ماہنامہ افکار کے مدیر صہبا لکھنوی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 25 دسمبر 1919 کو ریاست بھوپال میں پیدا ہوئے تھے تاہم آپ کا آبائی وطن لکھنؤ تھا۔ آپ کا اصل نام سید شرافت علی تھا آپ کے والد نامور وکیل تھے۔ ابتدائی تعلیم بھوپال سے حاصل کی اور بقیہ تعلیم لکھنؤ اور بمبئی میں حاصل کی۔ 1931 میں ہفت روزہ "آفتاب" امرتسر میں آپ کی پہلی تخلیق شائع ہوئی۔ آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز ریاست بھوپال کے محکمہ مالیات سے کیا لیکن چند ماہ میں ہی اپنا تبادلہ محکمہ تعلیم میں کرالیا جہاں وہ مدرس مقرر ہوئے۔ 1945 میں آپ نے بھوپال سے ماہنامہ "افکار" کا اجراء کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں سکونت پذیر ہوئے اور یہاں 1951 میں افکار کا دوبارہ اجراء کیا۔ افکار کے ساتھ آپ کی یہ وابستگی آپ کی وفات تک جاری رہی اور یہ رسالہ مسلسل 57 برس تک بغیر کسی تعطل کے شائع ہوتا رہا۔ آپ کے شعری مجموعے ماہ پارے اور زیر آسمان کے نام سے شائع ہوئے جبکہ آپ کی نثری کتب میں میرے خوابوں کی سرزمین، اقبال اور بھوپال، مجاز ایک آہنگ، ارمغان مجنوں اور رئیس امروہوی فن اور شخصیت وغیرہ شامل ہیں۔

لیاقت سولجر

30 مارچ 2011 کو معروف اسٹیج فنکار لیاقت سولجر کراچی میں وفات پاگئے اور اپنے آبائی قبرستان دھوبی گھاٹ میوا شاہ لیاری میں آسودہ خاک ہوئے۔

آپ 1951 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام لیاقت علی تھا۔ آپ نے اپنے فنی کیریئر میں بے شمار اسٹیج ڈراموں میں کام کیا۔ آپ کی وجہ شہرت بھی دراصل اسٹیج ڈراموں سے ہی ہے۔ آپ اور شہزاد رضا کی جوڑی جب ایک ساتھ کوئی اسٹیج ڈرامہ کرتی تو مزاح کا طوفان برپا ہو جاتا تھا۔

سرور بارہ بنکوی

3اپریل1980کواردو کے ممتاز شاعراور ہدایتکار سرور بارہ بنکوی وفات پاگئے۔آپ30جنوری1919کو بارہ بنکی یوپی میں پیدا ہوئے تھے۔آپ کااصل نام سعیدالرحمان تھا۔لکھنواور علی گڑھ میں آپ نے تعلیم حاصل کی۔17سال کے ہوئے توشعروشاعری کاشوق ہواجہاں جگر مرادآبادی نے آپ کے ذوق سخن کی حوصلہ افزائی کی۔آپ کلام ترنم سے سنایاکرتے تھےاسی وجہ سے آپ اور زیادہ مقبول ہوگئے۔قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی مگر جلد ہی انجمن ترقی اردو کی عمارت بنوانےاور اس کے آفس کو چلانے کے لیے ڈھاکہ منتقل ہوگئے۔مشرقی پاکستان کے بگڑتے ہوئے حالات کے باعث1970میں کراچی آکر مستقل طورپرآباد ہوگئے۔آپ بنیادی طورپر غزل کے شاعر تھےاس لئے آپ کی شاعری کی معراج غزلوں میں ہی دیکھی جاسکتی ہے۔ 1980میں آپ ایک دستاویزی فلم کے سلسلے میں ڈھاکا گئے ہوئے تھے کہ دل کادورہ پڑنے سے وفات پاگئے۔آپ کاجسد خاکی کراچی لایاگیااور سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

محمد عظیم داؤدپوتہ

3اپریل2017کوپاکستان فضائیہ کے سابق افسراور سندھ کے سابق گورنرایئرمارشل(ر)محمد عظیم داؤدپوتہ کراچی میں وفات پاگئے۔آپ14ستمبر1933کو بمبئی میں پیداہوئے تھے۔ابتدائی تعلیم سینٹ پیٹرکس اسکول کراچی سے حاصل کی اور پھرڈی جے سائنس کالج سے ایف ایس سی کیا۔1951میں آپ جرنل ڈیوٹی پائلٹ کی حیثیت سے پاک فضائیہ سے وابستہ ہوئےاور مختلف عہدوں پرکام کرتے رہے۔1965کی جنگ میں آپ کو بہادری اور دلیری کے مظاہرے پرستارہ جرات سے نوازاگیا۔1983سے 1986تک آپ زمبابوے کے ایئرپورٹس کے کمانڈر بھی رہے۔آپ کی خدمات پرزمبابوے کے صدررابرٹ موگابے نے آپ کو زمبابوے آرڈرآف میرٹ بھی عطاکیا۔1986میں آپ پی آئی اے کے مینیجنگ ڈائریکٹراور بعدازاں چیئرمین بھی مقرر ہوئے۔ 1999کوآپ سندھ کے گورنر مقرر ہوئےاوراس عہدے پر24مئی2000تک فائز رہے

اسلم لاٹر

3اپریل2005کومعروف اداکاراسلم لاٹروفات پاگئے۔آپ1944میں بھارتی ریاست اترپردیش میں پیداہوئے تھے۔قیام پاکستان کے بعد آپ اپنےاہل خانہ کے ہمراہ پاکستان آگئے۔آپ نےاپنے کیریئرکاآغاز قاسم جلالی کے ڈرامے"خالق"سے کیا۔جبکہ آپ کی پہلی ڈرامہ سیریل"شمع"تھی۔آپ نےاپنے منفی کرداروں کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کی۔آپ نے200سے زیادہ ڈراموں میں کام کیا۔

حاجی غلام فرید صابری

5اپریل1994کوپاکستان کے نامور قوال حاجی غلام فرید صابری کراچی میں وفات پاگئے۔آپ1930میں کلیان شریف ہندوستان میں پیداہوئے تھے۔قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے خاندان سمیت کراچی کے علاقے لالوکھیت میں سکونت پذیرہوئے

آپ کا شمار پاکستان کے مقبول ترین قوالوں میں ہوتا تھا۔ آپ اپنے چھوٹے بھائی حاجی مقبول احمد صابری کے ساتھ صابری برادران کے نام سے قوالی گاتے تھے۔ 70 اور 80 کی دہائی میں آپ اور آپ کے بھائی کی جوڑی نے قوالی کہ میدان میں راج کیا۔ دراصل آپ ہی وہ پہلے قوال ہیں جنہوں نے قوالی کو مغرب میں متعارف و مقبول بنایا آپ کی قوالیوں میں میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا، تاجدار حرم، بھر دو جھولی، اور تیری نظر کرم وغیرہ نے عالمی شہرت پائی۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

منور بدایونی

6 اپریل 1984 کو اردو کے ممتاز شاعر منور بدایونی کراچی میں وفات پاگئے اور عزیز آباد کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ کا اصلی نام ثقلین احمد تھا آپ 2 دسمبر 1908 کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے شعری مجموعوں میں منور نعتیں_ منور غزلیں، منور نغمات اور منور قطعات کے نام شامل ہیں اس کے علاوہ آپ کے نعتیہ کلام کی کلیات بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔ آپ کے چھوٹے بھائی محشر بدایونی بھی اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتے ہیں

زیڈ اے نظامی

7 اپریل 2013 کو جدید کراچی کے بانی زیڈ اے نظامی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 25 مئی 1931 کو امروہہ ضلع مراد آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے میرٹھ سے حاصل کی اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں گریجویشن مکمل کیا۔ دوران تعلیم ہی تحریک پاکستان سے وابستہ ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور 1953 میں آپ کراچی امپرومنٹ ٹرسٹ سے منسلک ہو گئے۔ 1957 میں جب کراچی امپرومنٹ ٹرسٹ اور کراچی جوائنٹ واٹر بورڈ کو ملا کر کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی بنائی گئی تو آپ اس کا حصہ بن گئے۔ آپ ایک بہت بڑے ٹاؤن پلانر تھے آپ ہی نے کراچی میں سستے فلیٹ بنانے کا شعور پیدا کیا۔ 1950 کی دہائی کے بعد سے کراچی میں بننے والی زیادہ تر آبادیوں کی تعمیر میں اہم کردار آپ ہی کا تھا۔ پی ای سی ایچ ایس، نارتھ ناظم آباد، نارتھ کراچی، فیڈرل بی ایریا، اسکیم 33، اورنگی ٹاون، لانڈھی، کورنگی، ملیر، شاہ فیصل، ماڈل کالونی، گلشن اقبال اور گلستان جوہر وغیرہ آپ ہی کی پلاننگ کا نتیجہ ہیں۔ 1974 میں آپ نے حکومت پاکستان کے زیر نگرانی کراچی کا ایک ماسٹر پلان ترتیب دیا جس میں تمام اداروں کے افراد شامل تھے اور آپ اس کے سربراہ تھے۔ یہ 411 صفات پر مشتمل ماسٹر پلان تھا۔ 1979 میں آپ نے کراچی کی پھیلتی ہوئی آبادی کو دیکھتے ہوئے دو ادارے قائم کیے ایک کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی اور دوسرا کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ۔ آپ ورلڈ بینک اور سعودی حکومت کے بھی مشیر رہے۔ خانہ کعبہ کی توسیع کی کمیٹی میں بھی شامل تھے۔ آپ نے 1994 میں سرسید انجینئرنگ یونیورسٹی قائم کی اور اپنی وفات تک اس کے چانسلر رہے۔

سید مصطفی علی بریلوی

7اپریل 2015 کو ممتاز ماہر تعلیم اور مصنف سید مصطفی علی بریلوی کراچی میں وفات پاگئے۔
آپ 17 ستمبر 1923 کو بریلی یوپی میں پیدا ہوئے۔ تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن اور انڈیا مسلم ایجوکیشن کانفرنس کے بانی الطاف علی بریلوی آپ کے چچا تھے۔ابتدائی تعلیم آپ نے علیگڑھ سے حاصل کی۔ بعدازاں آپ نے بی کام اور پھر ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ آپ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔بھارت میں سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ گاؤں در گاوں تحریک پاکستان کے لیے کام کرتے رہے جس کی وجہ سے سرکاری نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پہلے ٹنڈو آدم میں مقیم ہوئے اور پھر کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی جہاں آپ پہلے محکمہ مال اور پھر محکمہ تعلیمات کراچی میں ہیڈ کلرک سے ترقی کرتے ہوئے ڈائریکٹر پرائمری ایجوکیشن ہو کر ریٹائر ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں نواب خان بہادر خان رومیلا، مسلمانان سندھ کی تعلیم، مسلمانان پنجاب کی تعلیم، مسلمانان سرحد کی تعلیم، انگریزی کی لسانی پالیسی، لیاقت علی خان: تعلیم سے سیاست تک اور سندھ کی تعلیمی حالت اور ہمارے مسائل۔اس کے علاوہ آپ ریڈیو پاکستان کہ مختلف پروگراموں میں بھی حصہ لیتے اور ان کے تاریخی و تعلیمی مضامین جنگ اور دیگر اخبارات میں بھی چھپتے۔

شاہدہ احمد

7اپریل 2015 کو اردو کے ممتاز ادیب اور براڈکاسٹر شاہدہ احمد کراچی میں وفات پاگئیں اور کراچی میں ہی آسودہ خاک ہوئیں۔
آپ 20 ستمبر 1949ء کو الہ آباد میں پیدا ہوئی تھیں۔آپ نے عمر کا بڑا حصہ برطانیہ میں گزارا جہاں آپ کچھ عرصہ بی بی سی سے بھی وابستہ رہیں۔آپ خصوصی افراد کے رسالے آدرش کی مدیرا بھی رہیں۔آپ کا ناول سپنے تیری یادوں کے اور افسانوں کے مجموعے ہجرتوں کے گھر اور بھنور میں چراغ کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔

مریم فاروقی

9اپریل 2012 کو مشہور ماہر تعلیم مریم فاروقی کراچی میں وفات پاگئیں۔آپ 1924 میں پونا میں پیدا ہوئی تھیں۔آپ کے والد ایک معروف تاجر تھے جنھوں میں اردو لغت ہفت روزہ مسلم جاری کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور کراچی کے ایک معتبر علمی ادارہ پیپی ہوم اسکول قائم کیا۔اس تعلیمی ادارے سے اب تک ہزاروں طلباء وطالبات فیضیاب ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر محمود حسین

10اپریل 1975 کو پاکستان کے نامور ماہر تعلیم سابق وفاقی وزیر اور جامعہ کراچی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین کراچی میں وفات پاگئے۔آپ 15 جولائی 1907 کو قائم گنج ضلع فروخ آباد یوپی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے آپ نے میٹرک کیا اور جامع ملیہ دہلی سے ایم اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ 1932 میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی سے تاریخ کے مضمون

میں پی ایچ ڈی کیا اور وطن واپس آکر ڈھاکہ یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ 1946 میں آپ مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے اور 1949 سے 1953 تک پاکستان کی مرکزی کابینہ کے رکن رہے۔ آپ لیاقت علی خان کی کابینہ میں دفاعی امور خارجہ اور دولت مشترکہ کے وزیر مملکت بھی رہے۔ 1953 میں آپ جامعہ کراچی سے وابستہ ہو گئے اور شعبہ تاریخ اور شعبہ بین الاقوامی تعلقات کے سربراہ کے علاوہ رئیس کلیہ فنون بھی رہے۔ 1960 سے 1963 تک ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ 1964 میں ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں وزٹنگ پروفیسر رہے. 1971 میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کو جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز کیا گیا اور آپ اپنی وفات تک اس منصب پر فائز رہے۔ آپ کیونکہ جامعہ ملیہ دہلی کے فارغ التحصیل تھے اس لیے کراچی میں ملیر کے مقام پر جامعہ ملیہ دہلی کی طرز پر جامعہ ملیہ ہی کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ قائم قائم کیا اور آپ کو اسی تعلیمی ادارے کے احاطے میں سپرد خاک کیا گیا۔ کراچی یونیورسٹی کی مرکزی لائبریری آپ ہی کے نام سے منسوب ہے۔

مولانا احتشام الحق تھانوی

11 اپریل 1980 کو پاکستان کے نامور عالم دین مولانا احتشام الحق تھانوی وفات پاگئے۔ آپ 1915 میں ضلع مظفر نگر کے قصبے تھانہ بھون میں پیدا ہوئے تھے اور نامور عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی کے بھانجے تھے۔ آپ بچپن سے ہی ماموں کی زیر تربیت رہے اور بارہ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ 1930 میں دار العلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور 1937 میں حدیث، تفسیر، فقہ، ادب، فلسفہ، کلام اور جملہ دینی علوم امتیازی حیثیت کے ساتھ اول درجے کی سند فراغ حاصل کی۔ آپ بہت پر اثر خطیب اور مبلغ تھے۔ خواجہ ناظم الدین، مولانا ظفر علی خان، مولانا تمیز الدین خان، سردار عبد الرب نشتر اور آئی آئی چندریگر وغیرہ آپ سے بہت زیادہ متاثر تھے اور آپ کے خطبے بڑے ذوق اور شوق کے ساتھ سنتے تھے۔ آپ تحریک پاکستان کے حوالے سے بہت زیادہ متحرک تھے اور خاص کر مسلم لیگ کی مقبولیت میں اور صوبہ سرحد کے ریفرنڈم میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین اور بعض دیگر اہم دینی اور قومی مجالس کے عہدے دار رہے۔

آرزو لکھنوی

16 اپریل 1951 کو معروف شاعر جناب آرزو لکھنوی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 17 فروری 1873 کو لکھنؤ میں ایک ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سید انور حسین تھا۔ آپ بہت کم عمری میں ہی شعر کہنے لگے تھے آپ کے والد نے آپ کا رجحان دیکھ کر آپ کو جلال لکھنوی کی شاگردی میں دے دیا۔ پھر ایک وقت یہ بھی آیا کہ آپ استاد جلال لکھنوی کے جانشین ہو گئے اور وہ اپنے شاگردوں کو اصلاح کے لئے آپ کے پاس بھیجنے لگے۔ معاشی پریشانیوں کے باعث آپ لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے اور پھر وہاں سے بمبئی آگئے جہاں آپ نے بہت گیت لکھے اور شہرت پائی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان آگئے مگر جس سال پاکستان

ہجرت کر کے آئے اسی سال وفات پا گئے۔

افضل صدیقی

16 اپریل 1992 کو پاکستان کے ممتاز صحافی شاعر ادیب مترجم اور ریڈیو پاکستان کے صداکار افضل صدیقی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 3 مئی 1930 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ہائی اسکول دہلی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مضمون نگاری کا شوق اسکول سے شروع ہوا آپ کے مضامین اتنے اچھے ہوتے تھے کہ اسکول میں انہیں انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ بحث اور مو باحثے سے میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ آپ کی انہی صلاحیتوں کی وجہ سے آپ کو جی ایچ کیو کے پبلکیشنز ڈائریکٹ میں کلرک کی جگہ مل گئی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور میں مقیم ہوئے۔ لیکن آپ کو راولپنڈی جانا پڑا لیکن جلد ہی فوج کی نوکری سے اکتا گئے اور استعفی دے دیا۔ کچھ دنوں لاہور میں روزنامہ امروز سے وابستہ رہے۔ 1950 میں ریڈیو پاکستان کراچی سے بطور اسکرپٹ رائٹر عملی زندگی کا آغاز کیا۔ 1972 میں آپ نے اپنے ساتھیوں اجمل دہلوی اور حبیب الرحمن کے ہمراہ کراچی سے روزنامہ امن جاری کیا جو مختصر مدت میں اپنی اشاعت کے اعتبار سے کراچی میں جنگ کے بعد سب سے بڑا اخبار بن گیا۔ آپ ایک اچھے صداکار بھی تھے اور ریڈیو پاکستان کے مشہور پروگرام حامد میاں کے ہاں میں آپ نے ایک طویل عرصہ تک انجم میاں کا کردار ادا کیا جو آپ کی پہچان بن گیا۔

ریاض فرشوری

17 اپریل 1983 کو معروف صحافی افسانہ نگار اور ریڈیو اور ٹی وی کے ڈرامہ نگار جناب ریاض فرشوری کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1927 میں بدایوں اتر پردیش میں پیدا ہوئے تھے۔ ریڈیو پاکستان اور پی ٹی وی میں بطور اسکرپٹ رائٹر اور ڈرامہ نگار وابستہ رہے اس کے علاوہ آپ ماہانہ "رنگارنگ" ڈائجسٹ کے بانی مدیر بھی تھے۔ آپ ایک بڑے ادیب دانشور کہانی نگار اور ڈرامہ لکھنے کا ایسا فن جانتے تھے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا۔ اردو زبان پر آپ کو بلا کا عبور تھا اس کے علاوہ بھی آپ کو شاعری، تنقید، تاریخ، مذہب، سیاست، نفسیات، فلسفہ، غرض ہر شعبے میں عبور حاصل تھا۔ 1965 کی جنگ کے دوران آپ کے لکھے ہوئے ریڈیو پروگرامز بہت زیادہ مقبول ہوئے۔

سید علی محمد رضوی (سچے بھائی)

18 اپریل 2000 کو پاکستان کے نامور شاعر اور نوحہ خواں سید علی محمد رضوی (سچے بھائی) امریکا میں وفات پا گئے۔ آپ 1941 میں اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد صاحب جناب یاور اعظمی بھی خود ایک بہت مشہور شاعر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی کہ علاقے لیاقت آباد میں مکمل سکونت اختیار کی۔ 1950 کی دہائی میں آپ نے نوحہ خوانی کا آغاز کیا اور اسی دوران آپ نے گریجویشن کو بھی مکمل کیا۔ اپنے مخصوص انداز کی وجہ سے کچھ ہی عرصے میں آپ آپ کا شمار پاکستان کے معروف نوحہ خوانوں میں ہونے لگا۔ 1950 کی دہائی کے آخر سے لے کر 1990 کی دہائی کے آخر تک آپ نے انتہائی مقبولیت

دیکھی مگر پھر آپ امریکہ منتقل ہو گئے جہاں پر آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کو کراچی میں جعفر طیار ملیر کے قبرستان سپرد خاک کیا گیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

18 اپریل 2019 کو نامور ادیب، محقق، نقاد، مورخ اور ماہر تعلیم ڈاکٹر جمیل جالبی کراچی میں انتقال کر گئے. آپ یکم جولائی 1929ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے آپ کا اصل نام محمد جمیل خان تاتاہم سید احمد دہلوی سے متاثر ہونے کی وجہ سے جالب کی رعایت سے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ جالبی لگانا شروع کر دیا اور یہی آپ کی شناخت بن گیا ابتدائی تعلیم علی گڑھ میں ہی حاصل کی 1943 میں میٹرک کا امتحان سہارن پور کے گورنمنٹ ہائی اسکول سے پاس کیا اور میرٹھ کالج سے 1945 میں ایف اے اور 1947 میں بی اے کی ڈگری حاصل کی قیام پاکستان کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان آ گئے اور سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم اے انگریزی ڈگری حاصل کی. اسکے علاوہ ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں بھی حاصل کیں پی اے ایس کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انکم ٹیکس آفیسر مقرر ہوئے اور اسی محکمے میں تیس سالہ بے داغ خدمات کے بعد انکم ٹیکس کمشنر کے اعلیٰ عہدے سے سبکدوش ہوئے اور اس کے بعد ادبی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گئے آپ پاکستان کے تقریبا تمام ہی علمی اور ادبی تحقیقی اداروں کی تشکیل و تنظیم میں کسی نہ کسی حیثیت میں عملاً شریک رہے آپ کی تصانیف و تالیفات اور تراجم کی فہرست بہت طویل ہے اس کے علاوہ آپ کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے آپ کو داؤد ادبی انعام، یونیورسٹی گولڈ میڈل، محمد طفیل ادبی ایوارڈ اور حکومت پاکستان کی جانب سے ستارہ امتیاز عطا کیا گیا.

ابو بکر احمد حلیم

20 اپریل 1975 کو تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن، پاکستان کے معروف ماہر تعلیم، علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے سابق سربراہ اور پرو وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور کراچی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر ابو بکر احمد حلیم جو اے بی حلیم کے نام سے مشہور تھے وفات پا گئے۔ آپ 1897 کو صوبہ بہار کے ضلع گیا میں ایک جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے میں حاصل کی اور پھر اس کے بعد پٹنہ یونیورسٹی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے مزید تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں آپ اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان چلے گئے جہاں قانون کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آ کر آپ علی گڑھ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے یوپی کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر بھی رہے۔ نومبر 1942 میں جب قائداعظم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے دورے پر آئے تو بطور پرو وائس چانسلر آپ نے جلسے کی صدارت کی۔ اپنے خطبہ صدارت میں آپ نے ایک ایسا جملہ کہا جو آپ کی ذات سے مخصوص ہو کر تحریک پاکستان کا حصہ بن گیا آپ نے فرمایا "میں آج کل مسلمانوں کی سب سے بڑی درسگاہ میں تاریخ پڑھا رہا ہوں اور قائداعظم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اور آپ مسلمانوں کی تاریخ بنا رہے ہیں"۔ 1946 کے عام انتخابات میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء کو مسلم لیگ کے امیدواروں کے حق میں کام کرنے کے لئے

اجازت مل گئی تو آپ نے پورے ملک کے گوشے گوشے میں یونیورسٹی کے طلباء کے وفود روانہ کئے اور ان کی تنظیم کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور پہلے سندھ یونیورسٹی اور پھر کراچی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے اور اپنی ریٹائرمنٹ تک کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔

اشرف صبوحی

22اپریل1999 کو معروف صاحب طرز ادیب جناب اشرف صبوحی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 11مئی1905 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سید ولی اشرف تھا جب کہ آپ کا تعلق ڈپٹی نذیر احمد کے خاندان سے تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گھر میں ہی حاصل کی بعد ازاں آپ اینگلو عربک اسکول میں داخل ہو گئے۔ میٹرک کے بعد آپ نے پرائیویٹ طور پر ادیب فاضل منشی فاضل ایف اے اور بی اے کے امتحانات پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیے۔ آپ کا شمار ان نثر نگاروں میں ہوتا تھا جنہوں نے 1947 سے قبل ہی ادب میں اپنے لئے ممتاز مقام بنالیا تھا۔ ماہنامہ ساقی میں آپ کے بہت سے مضامین، افسانے اور خاکے شائع ہوتے تھے۔ 1929 سے آپ نے بچوں کے رسالوں میں چھوٹی چھوٹی سی سیکڑوں خوبصورت کہانیاں اور ادبی رسالوں میں مضامین لکھنا شروع کر دیے تھے۔ آپ نے ارمغان کے نام سے ایک ماہنامہ بھی دہلی سے جاری کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور میں مقیم ہوئے اور یہی محکمہ ڈاک میں ملازمت اختیار کی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آخر میں آپ لاہور سے کراچی منتقل ہو گئے۔ آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ کیوں کہ لاہور میں گزرا اس لیے آپ کو لاہور چھوڑنے کا بڑا دکھ تھا۔ پنجاب کے محکمہ تعلیم نے نویں اور دسویں جماعت کے نصاب میں آپ کا ایک خاکہ مرزا اسکندر بخت شامل کیا ہے اسی طرح کراچی کے محکمہ تعلیم نے بھی ایف اے کے کورس میں آپ کا ایک خاکہ شامل کیا تھا۔ آپ کی ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے پیچھے علم وادب کا ایسا خزانہ چھوڑا ہے جس سے آنے والی نسلیں ہمیشہ استفادہ کرتی رہیں گی۔

اختیار عالم حنفی

22اپریل2015 کو ممتاز بینکار اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے سابق گورنر امتیاز عالم حنفی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ سے جنوری1929 کو الہ آباد کے ایک دیہی علاقے پرگانہ چیل میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی کراچی میں آپ نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا اور پھر 1952 میں جامعہ کراچی سے امتیازی پوزیشن کے ساتھ معاشیات میں ایم اے کیا۔ اس کے بعد آپ مقابلے کے امتحان (CSS) میں شریک ہوئے اور کامیابی حاصل کرنے کے بعد آفیسر کلاس ون کی حیثیت سے اسٹیٹ بینک سے وابستہ ہو گئے۔ تقرری کے بعد آپ کو ورلڈ بینک میں بھی چھ مہینے کی ٹریننگ پر بھیجا گیا جہاں آپ نے ٹریننگ میں بھی پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 1970 میں اپ اسٹیٹ بینک کے ڈائریکٹر اور پھر 1976 میں ایگزیکٹو ڈائریکٹر بن گئے۔ 1981 سے 1984 تک آپ تین برس کے لیے اسٹیٹ بینک سے الگ رہے۔ اس

لیے کہ آپ کو پاکستان انڈسٹریل کریڈٹ اینڈ انویسٹمنٹ کارپوریشن کا ڈپٹی ڈائریکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ 1988 میں آپ کو اسٹیٹ بینک کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

آپ اسٹیٹ بینک کے گورنر کے عہدے پر 1989 تک فائز رہے اور حکومت وقت سے پالیسیوں پر اختلاف کی وجہ سے استیفیٰ دے دیا۔ آپ گورنر کے عہدے پر فائز ہونے والی پہلی شخصیت تھے جن کا تعلق اسٹیٹ بینک ہی سے ہی تھا۔ یکم ستمبر 1990 کو آپ کو دوبارہ گورنر اسٹیٹ بینک مقرر کیا گیا اور 30 جون 1993 تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس طرح دو مرتبہ گورنر اسٹیٹ بینک بننے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

معین اختر

22 اپریل 2011 کو پاکستان کے مشہور اداکار اور میزبان معین اختر کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی کے ماڈل کالونی ملیر کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 24 دسمبر 1950 کو ممبئی میں پیدا ہوئے تھے آپ نے اپنی زندگی کا آغاز 6 ستمبر 1966 کو پاکستان کے پہلے یوم دفاع کی ایک تقریب میں کیا تھا جس کے بعد آپ نے پھر پلٹ کر نہیں دیکھا 1966 میں آپ نے نگار فلم ایوارڈ کی تقریبات میں اور 1970 میں آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن پر انڈیا انڈیا ضیاء محیُ الدین شو میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا جس کے بعد آپ پاکستانی اسٹیج اور ٹیلی ویژن کے مصروف ترین اداکار بن گئے آپ نے بے شمار پروگراموں کی میزبانی بھی کی آپ نے جس ڈرامے میں بھی اداکاری کی اس ڈرامے کو کمال پر پہنچادیا جس ڈرامے میں بھی آپ اپنی اداکاری کے جوہر دکھاتے وہ ڈرامہ صرف آپ کے نام سے ہی مشہور ہو جاتا آپ نے مشہور اسٹیج ڈراموں بکرا قسطوں پر اور بڈھا گھر پر ہے جیسے معرکتہ الآرا ڈراموں میں بھی اپنے فن کا مظاہرہ کیا آپ نے لوز ٹاک میں 200 سے زیادہ بہروپ اختیار کئے حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی اور ستارہ امتیاز کے اعزازات عطا کیے.

عزیز حامد مدنی

23 اپریل 1991 کو اردو کے معروف شاعر ادیب نقاد اور براڈکاسٹر عزیز حامد مدنی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 21 جون 1922 کو رائے پور میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے آپ نے بی اے کیا اور پھر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے لندن چلے گئے اور لندن یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور پھر واپس آکر جامعہ عثمانیہ ہی میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی مستقل سکونت اختیار کی۔ ابتداء میں آپ ایس ایم کالج میں انگریزی کے لیکچرر رہے۔ پبلک سروس کمیشن کا امتحان دے کر آپ 1950 میں ریڈیو پاکستان سے بحثیت پروگرام ایگزیکٹو وابستہ ہو گئے۔ ریڈیو کی ملازمت کے دوران آپ پاکستان کے مختلف شہروں میں رہے اور مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ آپ کی علمی وادبی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب آپ جامعہ عثمانیہ میں پڑھ رہے تھے۔ آپ کا شمار جدید ترین اور اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ ایک جداگانہ

اسلوب کے مالک تھے اور آپ کے موضوعات کی انفرادیت پر کوئی شبہ نہیں۔ آپ کے شعری مجموعوں میں چشم نگراں، دشت امکاں اور آدم کے نام سر فہرست ہیں اس کے علاوہ تنقیدی کتب جدید اردو شاعری اور آج بازار میں پابجولاں چلو کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے۔

علامہ عقیل ترابی

23اپریل2009کو معروف خطیب اور عالم دین علامہ عقیل ترابی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ1934میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے آپ کے والد علامہ رشید ترابی اپنے عہد کے نامور خطیب تھے۔ کراچی میں انٹر میڈیٹ کے بعد آپ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایران اور عراق چلے گئے۔ مذہبی تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے لندن یونیورسٹی سے تقابل ادیان میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ آپ مختلف ادوار میں اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی رہے۔

مولانا محمد شفیع اوکاڑوی

24اپریل1984کو پاکستان کے نامور عالم دین خطیب اور متعدد کتابوں کے مصنف مولانا محمد شفیع اوکاڑوی کراچی میں وفات پاگئے اور سولجر بازار کراچی میں جامعہ گلزار حبیب میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ1929میں کھیم کرن میں پیدا ہوئے قیام پاکستان کے بعد آپ نے اوکاڑہ میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے مولانا غلام علی اوکاڑوی اور علامہ سید احمد سعید کاظمی کی شاگردگی اختیار کی اور پھر خطابت میں کمال حاصل کیا۔ کچھ عرصہ ساہیوال میں مقیم رہے اور1952میں کراچی آگئے۔1970میں کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔ آپ نے صدر بازار میں گلزار حبیب ٹرسٹ قائم کیا اس کے تحت آپ نے گرانقدر خدمات انجام دیں۔ آپ کی اہم تصانیف میں ذکر جمیل، نغمہ حبیب، سفینہ نو، رائے حق، شام کربلا اور رائے عقیدت شامل ہیں۔ آپ کے خطاب کی آڈیو ریکارڈنگ اب تک سنی جاتی ہیں۔

سبین محمود

24اپریل2015کو معروف سماجی کارکن انسانی حقوق کی علمبردار سبین محمود کو قتل کر دیا گیا.
آپ20جون1974کو کراچی میں پیدا ہوئیں ابتدائی تعلیم آپ نے کراچی گرامر اسکول سے اور اعلیٰ تعلیم بیرون ملک سے حاصل کی. آپ نے دی سیکنڈ فلور کے نام سے ایک کیفے بنایا جس میں مباحثے فلم شو مشاعرے مزاحیہ پروگرام اور تھیٹر کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا آپ ہی کی سرپرستی میں بہت سی سماجی سرگرمیاں منعقد ہوئی آپ نے ملک میں جاری مذہبی عدم برداشت اور مسلکی اختلافات کو ختم کرنے کی مہم میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ایک دن جب آپ اپنے والدہ کے ہمراہ گھر جارہی تھیں تو ڈیفنس لائبریری کے قریب ایک ٹریفک سگنل پر نامعلوم موٹر سائیکل سوار نے آپ کی کار پر فائرنگ کر دی دی آپ کو فوری طور پر اسپتال پہنچانے کی کوشش کی مگر رستے میں ہی آپ نے دم توڑ دیا..

مطلوب الحسن سید

25 اپریل 1984 کو قائداعظم محمد علی جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری اور ان کے سوانح نگار جناب مطلوب الحسن سید کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 8 مارچ 1915 کو پیدا ہوئے لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویشن مکمل کیا۔ 1940 سے 1944 تک آپ قائداعظم کے ساتھ بطور پرائیویٹ سیکریٹری منسلک رہے اور بعدازاں آپ نے قائداعظم کی مشہور سوانح عمری محمد علی جناح اے پولیٹیکل اسٹیڈی تحریر کی جسے بڑی پذیرائی ملی۔ 1946 میں بمبئی سے نکلنے والے ہفت روزہ اخبار دی سٹار کی ادارت کی لیکن اسے بھی چھوڑ دیا اور اگلے سال طباعت اور گرافک آرٹس کی تعلیم اور عملی تربیت کے لئے لندن چلے گئے۔ 1948 میں آپ سیدھے کراچی آگئے اور ایک ہفت روزہ میگزین نکالا۔ مگر اگلے سال پھر دوبارہ لندن چلے گئے اور 1952 کے اوائل میں واپس لوٹے۔ آپ نے اپنا پورا وقت پاکستان میں طباعت کا معیار بلند کرنے میں صرف کیا۔ آپ 12 سال تک پاکستانی ایسوسی ایشن آف پرنٹنگ اینڈ گرافک انڈسٹری کے چیئرمین رہے۔ 1980 میں آپ نے احمد مرزا جمیل کے ساتھ نوری نستعلیق واضع کیا جس نے اردو طباعت کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔

عشرت رومانی

25 اپریل 2021 کو معروف محقق اور مصنف عشرت رومانی وفات پاگئے.

آپ 1939 میں بہار کے ایک شہر سپرا میں پیدا ہوئے تھے آپ کے دادا معروف وکیل تھے جب کے والد محکمہ صحت سے منسلک تھے. آپ کی ابتدائی تعلیم سپرا پٹنہ اور کلکتہ میں ہوئی. قیام پاکستان کے بعد آپ مشرقی پاکستان کے شہر ڈھاکہ چلے گئے جہاں آپ نے اپنی تعلیم کو جاری رکھا اور ڈھاکہ یونیورسٹی سے بی کام کی ڈگری حاصل کی. تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے مختلف سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کلیدی عہدوں پر خدمات انجام دیں اور مختلف شہروں میں قیام پذیر رہے. ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی آپ ایک بہترین نثر نگار اور ادبی تجزیہ نگار تھے جبکہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں آپ شاعری بھی کرتے تھے آپ کی تصانیف میں ایک شعری مجموعہ صبح آنے کو ہے کے علاوہ پچاس شعرا پر مضامین، شعور عصر اور چند اہم افسانہ نگار، شعر اور مقصد کی شاعری ایک جائزہ بھی شائع ہوا.

ایس ایم نقی

26 اپریل 2014 کو ہاکی کے مشہور کمنٹیٹر کھیلوں کے صحافی اور مبصر ایس ایم نقی وفات پاگئے۔

آپ کراچی میں پیدا ہوئے تھے ابتدائی تعلیم سندھ مدرستہ الاسلام میں حاصل کی میٹرک کا امتحان 1960 میں ماڈل سکول سے پاس کیا۔ 1964 میں اسلامیہ کالج سے بی اے کیا۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں ہاکی اور فٹبال کھیلی۔ کالجوں کی کمبائنڈ ہاکی ٹیم کے کپتان رہے اور نیشنل ہاکی چیمپئن شپ کے مقابلوں میں کراچی کی جانب سے کھیلتے رہے اور رفتہ رفتہ صرف ہاکی کے ہوگئے۔ آپ ابھی اسکول

میں ہی تھے کہ روزنامہ انجام میں بچوں کی صفحے اور کھیلوں کے صفحے کے لئے چھوٹے چھوٹے معلوماتی مضامین لکھتے۔ جب روزنامہ مشرق جنگ میں ضم ہوگیا تو آپ کو اس نئے اور بڑے اخبار کا اسپورٹس ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ ہفت روزہ اخبار خواتین میں بھی کھیلوں پر آپ کے دلچسپ تبصرے شائع ہونے لگے۔ 1994 تک منعقد ہونے والے تمام مقابلوں میں جس میں ہاکی کی ٹیم شرکت کرتی تھی جیسے اولمپکس، ایشین گیمز، سارک گیمز وغیرہ میں لازمی موجود ہوتے تھے۔ بعد ازاں آپ کی خدمات کے پیش نظر آپ کو بین الاقوامی ہاکی کا امپائر بھی بنایا گیا۔ اردو تبصرے کے لئے آپ کی خدمات وائس آف جرمنی وائس آف امریکہ اور بی بی سی کو بھی حاصل رہیں۔

ایم ای زیڈ غزالی

26 اپریل 2003 کو پاکستان کے سابق مڈل آرڈر بیٹسمین اور بولر ایم ای زیڈ غزالی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 15 جون 1924 کو ممبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام محمد ابراہیم زین الدین غزالی تھا۔ 1954 میں انگلستان کا دورہ کرنے والی پاکستانی ٹیم کے رکن تھے۔ آپ کو یہ منفرد اعزاز بھی حاصل ہے کہ انگلینڈ کے خلاف کھیلتے ہوئے آپ دونوں اننگز میں صفر کے اسکور پر آؤٹ ہوئے اور یوں آپ نے پاکستان کی جانب سے پہلا پیر بنانے کا ریکارڈ قائم کیا۔

سر عبداللہ ہارون

27 اپریل 1942 کو برصغیر پاک وہند کے نامور مسلمان تاجر اور سیاستدان سر عبداللہ ہارون کراچی میں وفات پاگئے۔ 1972 میں آپ کراچی کے ایک میمن خاندان کے اندر پیدا ہوئے۔ آپ زمانہ طالب علمی سے برصغیر اور خصوصن سندھ کے مسلمانوں کو جو کہ معاشی طور پر جو ہندوؤں کے دست نگر تھے نجات دلانا چاہتے تھے۔ 1917 سے 1925 تک آپ نے ملکی سیاست کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ آپ ہی نے سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے کی تحریک چلائی۔ یہ آپ ہی کی محنتوں کا صلہ تھا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک جداگانہ صوبہ بنادیا گیا۔ آپ تحریک پاکستان کے بھی سرگرم رہنما تھے اور آپ ہی نے سندھ میں مسلم لیگ کو مضبوط کرنے کے لیے مسلسل کام کیا۔

غلام فاروق

29اپریل 1992کو معروف ماہر معاشیات ومالیات اور سابق سول سرونٹ جناب غلام فاروق وفات پاگئے۔ آپ 1899 میں مدنا پور میں پیدا ہوئے۔ آپ سابق صدر مملکت غلام اسحاق خان کے بڑے بھائی تھے۔ ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کرنے کے بعد 1921 میں بنگال ریلوے میں ملازمت اختیار کرلی۔ 1940 سے 1946 تک کوئلہ کی تقسیم وسپلائی کے کنڑولر رہے۔ 1946 میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ایسٹ انڈیا ریلوے کے پہلے مسلمان جنرل مینجر بنادیے گئے۔ 1948 میں قیام پاکستان کے بعد وزارت صحت کی سیکرٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ پاکستان جوٹ اور کاٹن بورڈ کے چیئرمین رہے پھر پاکستان کی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے چیئرمین بنادیے گئے۔ کچھ عرصے کے لیے واپڈا کے چیئرمین مقرر ہوئے اور آپ کے عہد صدارت میں واپڈا نے بے انتہا ترقی کی۔ 1962 میں ایوب خان نے آپ کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کیا۔ آپ پاکستان آرڈیننس فیکٹریز اور واپڈا کے بانی چیئرمین رہے۔ 1965 میں آپ مرکزی وزیر تجارت بنے۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اپنی وفات تک آپ سرکار میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔

بی اے نجمی

29اپریل 2001 کو پاکستان کے نامور کارٹونسٹ بی اے نجمی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ کا اصل نام بشیر احمد تھا آپ کا شمار پاکستان کے صف اول کے کارٹون نگاروں میں ہوتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قیام پاکستان کے بعد اردو صحافت میں کارٹون سازی کا باقاعدہ آغاز آپ نے کیا تھا تو یہ کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ آپ نے کارٹون نگاری کا آغاز انگریزی اخبار ہیرالڈ سے کیا تھا مگر آپ کی باقاعدہ کارٹون نگاری کا آغاز کراچی کے ایک اخبار قندیل سے ہوا۔ آپ نے مجید لاہوری کے رسالہ نمک دان میں کارٹون بنانا شروع کئے۔ لیکن بطور کارٹونسٹ آپ کو عوامی شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب آپ نے روزنامہ جنگ میں باقاعدگی سے کارٹون بنانا شروع کئے۔ اس کے علاوہ آپ نے وقتاً فوقتاً امروز، انجام، حریت اور لیڈر وغیرہ کے لیے بھی کارٹون بنائے۔

ڈاکٹر حنیف فوق

یکم مئی 2009 کو اردو کے مشہور شاعر، ادیب اور نقاد ڈاکٹر حنیف فوق انتقال کر گئے. ڈاکٹر محمد حنیف فوق 26 دسمبر 1926 کو بھوپال میں پیدا ہوئے انہوں نے کانپور اور لکھنؤ سے تعلیمی مراحل طے کیے۔ 1950 میں وہ ڈھاکہ منتقل ہوئے جہاں انہوں نے ڈھاکہ یونیورسٹی سے وابستگی اختیار کی اور اسی یونیورسٹی سے اپنی پی ایچ ڈی کی سند بھی حاصل کی۔ بعد ازاں آپ کراچی آگئے اور کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ 1981 میں انقرہ یونیورسٹی ترکی سے وابستہ ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں متوازی نقوش اور ترکی زبان کے بعض ادیبوں اور شعرا کی تحریروں کے تراجم شامل ہیں۔

اسماعیل احمد تسنیم مینائی

2 مئی 1991 کو معروف شاعر نثر نگار اسماعیل احمد تسنیم مینائی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 13 جنوری 1910 کو رام پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مراد آباد اور فیض آباد میں حاصل کی۔ کرسچین کالج الہ آباد سے ایف ایس سی اور پھر الہ آباد یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا۔ الہ آباد میں دوران طالب علمی میں آپ کو شاعری کا شوق ہو گیا اور مشاعروں اور علمی جلسوں میں شریک ہونے لگے اور ساتھ ساتھ سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں بھی دلچسپی رکھنے لگے۔ گریجویشن کے بعد آپ کے چچا نے آپ کو حیدر آباد دکن بلا لیا جہاں آپ نے ایل ایل بی کا امتحان صوبے بھر میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا اور یوں آپ منصفی کے اعلی عہدوں پر حیدر آباد دکن کے مختلف اضلاع میں تعینات رہے۔ سقوط حیدر آباد کے بعد آپ نے پاکستان ہجرت کر لی اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ کراچی آکر کچھ عرصے آپ سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ کے سیکریٹری رہے پھر کراچی میونسپل کارپوریشن کے چیف آفیسر مقرر ہوئے اور اس عہدے پر کئی سال کام کرتے رہے۔ علامہ ماہر القادری کے انتقال کے بعد ماہنامہ فاران کے ایڈیٹر بھی رہے اس کے علاوہ آپ نے اسلام کا آرڈر نامی ایک رسالہ بھی جاری کیا۔ آپ کے مضامین رسالہ الناظر میں بھی چھپتے رہے اس کے علاوہ آپ کے افسانوں کا مجموعہ لال شریک اور تنقیدی جائزہ میخانہ ریاض کے نام سے چھپا۔ کراچی میں معیاری مشاعروں کے انعقاد میں آپ کا بڑا اہم کردار ہے۔

پروفیسر حسن عادل

2 مئی 2005 کو نامور ماہر تعلیم اور نیشنل کالج کے بانی پروفیسر حسن عادل انتقال کر گئے. آپ بریلی میں پیدا ہوئے اور اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئے قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان آگئے اور کراچی کے اسلامیہ کالج سے اپنا تدریسی سفر شروع کیا۔ 1954 میں جناح کالج میں پرنسپل کے طور پر تعینات ہوئے جہاں آپ نے بہترین اساتذہ کی ٹیم کو جمع کیا اور دو سال بعد ہی آپ نے نیشنل کالج کی بنیاد رکھی۔ نیشنلائزیشن کی پالیسی کے بعد جب حکومت نے نیشنل کالج کو قومی ملکیت میں لے لیا تو آپ نے نیشنل کالج کو خیر باد کہہ کر گلشن اقبال میں نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی۔

ضیاءالدین احمد برنی

4 مئی 1978 کو اردو کے مشہور ادیب انشاء پرداز صحافی اور جدوجہد آزادی کے رہنما جناب ضیاءالدین احمد برنی کراچی میں انتقال کر گئے اور پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔ آپ 3 فروری 1890 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد منشی محمد الدین۔ اپنے عہد کے مشہور خطاط تھے جبکہ آپ کے بھائی یوسف دہلوی پاکستان میں خط نستعلیق کے دہلوی طرز کے سب سے بڑے خطاط تسلیم کیے جاتے ہیں۔ برنی صاحب نے جدوجہد آزادی میں بڑا فعال حصہ لیا اور علی برادران اور خواجہ حسن نظامی جیسی ہستیوں کے ساتھ کام کیا۔ اور ان شخصیات کے بارے میں عظمت رفتہ کے نام سے ایک کتاب بھی مرتب کی۔ آپ کی دیگر تصانیف میں جمال الدین افغانی اور لائف آف محمد بہت مشہور ہیں۔

خرم زکی

7 مئی 2016 کو نڈر صحافی اور سماجی کارکن خرم زکی کو شہید کر دیا گیا۔

آپ 26 مارچ 1976 کو کراچی میں پیدا ہوئے. آپ نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹر زکی ڈگری لی تھی۔ آپ کا شمار سول سوسائٹی کے اہم رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ آپ صحافت کے پیشے سے بھی منسلک رہے اس کے علاوہ آپ ٹی وی چینل نیوز ون سے بھی منسلک رہے۔ آپ انتہائی نڈر اور بے باک انسان تھے اور حق بات کہنے میں کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ایک عرصے سے قتل کی دھمکیاں مل رہی تھیں۔

سید ظفر حسن نقوی

8 مئی 1989 کو نامور عالم دین مفسر قرآن اور متعدد کتابوں کے مترجم مصنف اور مؤلف مولانا سید ظفر حسن نقوی امروہوی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ دسمبر 1890 میں امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ آپ نے مدرستہ الواعظین جامعہ امامیہ ناظم آباد کی بنیاد رکھی۔ آپ نے قرآن مجید کے ترجمہ اور تفسیر کے علاوہ متعدد کتابوں کے ترجمے بھی کیے اور لاتعداد کتابیں تصنیف اور تالیف بھی کیں۔ آپ کی ترجمہ شدہ کتابوں میں اصول کافی، فروع کافی، تحفتہ الاغیار اور مناقب شہر آشوب کے نام سرفہرست ہیں۔

خواجہ آشکار حسین

9 مئی 1984 کو پاکستان کے نامور ماہر تعلیم، صحافی، شاعر اور تحریک پاکستان کے سرگرم کارکن خواجہ آشکار حسین کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 4 اگست 1920 کو ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے اور علی گڑھ یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے. تحریک پاکستان کے دنوں میں آپ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پورے ملک کا دورہ کر کے قائد اعظم کا پیغام پھیلایا اور مسلم لیگ کے لیے بھرپور کام کیا. قیام پاکستان کے بعد آپ

نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے صحافت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا مگر درس اور تدریس کے شعبے کو اپنایا اور تمام عمر اسی شعبے میں بسر کردی. ابتدا میں اردو کالج اور پھر نبی بخش کالج کراچی کے پرنسپل کے عہدے پر رہے آپ نبی بخش کالج کے فاؤنڈر ممبر بھی تھے. آپ کے بصیرت افروز افکار اور خیالات طلبہ کے کئی ذہنی مسائل اور گتھیوں کو حل کردیتے تھے۔

انجینئر ابوالکلام

9 مئی 2013 کو نامور ماہر تعلیم اور پاکستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں سب سے زیادہ عرصہ وائس چانسلر کی حیثیت سے رہنے والے سابق وائس چانسلر این ای ڈی یونیورسٹی انجینئر ابوالکلام 90 سال کی عمر میں انتقال کرگئے. انجینئر ابوالکلام 25 نومبر 1923 کو جنوبی انڈیا کے ایک شہر وجے واڑا میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے پوسٹ گریجویٹ تک کی تعلیم مدراس یونیورسٹی سے حاصل کی۔ 10 دسمبر 1996 کو گورنر سندھ کمال اظفر نے آپ کو NED یونیورسٹی کا وائس چانسلر منتخب کیا اور 2013 تک آپ اسی حیثیت میں رہے۔ جب آپ نے چارج لیا تو یونیورسٹی میں صرف 4 شعبوں میں انجینئرنگ کرائی جاتی تھی اور آپ کی رخصت کے وقت یونیورسٹی میں 22 شعبے کام کررہے تھے۔ آپ وقت کی پابندی کی وجہ سے بہت مشہور تھے آپ پورے 16 سال یونیورسٹی کے ٹائم سے 5 منٹ پہلے یعنی 08:25 پر یونیورسٹی میں ہوتے تھے۔ کسی بڑے سے بڑے پروگرام میں اگر چیف گیسٹ بھی تاخیر کردے تو آپ اس کی بھی پرواہ کیے بغیر پروگرام شروع کروادیتے تھے۔ آپ کی قوت فیصلہ لاجواب تھی اور چند سیکنڈوں میں بڑے سے بڑے معاملے کا فیصلہ کرلیتے تھے۔

ماہر القادری

12 مئی 1978 کو اردو کے نامور شاعر، صحافی اور نقاد مولانا ماہر القادری جدہ کے ایک مشاعرے کے دوران وفات پاگئے اور مکہ مکرمہ میں جنت المعلی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ کا اصل نام منظور حسین تھا اور آپ 30 جولائی 1907 کو ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز حیدرآباد دکن سے کیا اور آپ کو حکومت کے مختلف محکموں میں کام کرنے کے مواقع میسر آئے مگر ملازمت کے دوران بھی آپ نے پوری دلچسپی کے ساتھ اپنا شعری ذوق جاری رکھا۔ تحریک پاکستان میں بھی آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قائداعظم محمد علی جناح سے نواب بہادر جنگ نے آپ کا تعارف کراتے ہوئے کہا میری تقریروں اور ان کی نظموں نے مسلمانان دکن میں بیداری پیدا کی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور اپ نے ایک علمی جریدے فاران کی بنیاد رکھی اس کے علاوہ آپ نے 20 سے زیادہ کتابیں تحریر کیں۔ آپ کا اشعار پڑھنے کا انداز ترنم بہت دل نشین تھا۔

بیگم قمر اصفہانی

13 مئی 2007 کو نامور سماجی کارکن بیگم قمر اصفہانی کراچی میں وفات پاگئیں اور کراچی میں ہیں آسودہ خاک ہوئیں۔
آپ 1922 میں ایران میں پیدا ہوئی تھیں۔ انہوں نے تہران، فرانس اور لندن سے اعلی تعلیم حاصل کی۔ 1952 میں آپ کی شادی امریکہ میں پاکستان کے پہلے سفیر اور تحریک پاکستان کے عظیم رہنما مرزا ابوالحسن اصفہانی سے ہوئی۔ آپ چھ زبانوں فارسی اردو

ترکی فرانسیسی اطالوی اور انگریزی پر دسترس رکھتی تھی۔ آپ نے کراچی میں لاوارث بچوں کی دیکھ بھال کے لئے کاشانہ اطفال کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا اس کے علاوہ پاکستان چائلڈ ویلفیئر کونسل کی صدر بھی رہیں حکومت اٹلی نے آپ کو کیوری ایوارڈ اور ایوانے نشان خدیجۃ الکبریٰ عطا کیا۔ جبکہ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ستارے امتیاز کا اعزاز عطا کیا۔

ڈاکٹر مشرف احمد

13 مئی 2003 کو اردو کے ممتاز ادیب افسانہ نگار نقاد اور محقق ڈاکٹر مشرف احمد کراچی میں انتقال کر گئے اور کراچی میں سخی حسن کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ جون 1942 میں کھرڑ ضلع انبالہ میں پیدا ہوئے تھے تاہم آپ کا آبائی وطن پانی پت تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کا خاندان ابتداء میں لاہور آیا اور پھر بہاولپور ریاست میں آباد ہوا جہاں پر آپ کے والد درس وتدریس سے وابستہ ہو گئے. آپ نے ابتدائی تعلیم بہاولپور سے حاصل کی اور پھر بی اے اور ایم اے کی ڈگری کراچی یونیورسٹی سے حاصل کی۔ آپ نے "اردو انشائیے کی روایت اور میر ناصر علی" کے نام سے تحقیقی مقالہ لکھ کر کراچی یونیورسٹی سے ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کا افسانوی مجموعہ جب شہر نہیں بولتے کہ نام سے شائع ہوا تھا۔ جبکہ آپ کی دیگر کتب میں پریم چند کا تنقیدی مطالعہ ،اقبال شناسی اور کرشن چندر کا تنقیدی مطالعہ وغیرہ شامل ہیں۔ آپ ماہنامہ دائرے اور سہائی ارمغان کراچی کے مدیر بھی رہے۔ آپ 15 برس تک اخبار خواتین میں ادبی موضوعات پر کالم لکھتے رہے اور کئی برسوں تک روزنامہ ایکسپریس کراچی کے ادارتی صفحے پر "باادب" کے عنوان سے ادبی اور سماجی موضوعات پر ہر ہفتے کالم لکھتے رہے.

شکریہ خانم

14 مئی 2017 کو پاکستان کی پہلی خاتون پائلٹ شکریہ خانم لاہور میں وفات پا گئیں۔

آپ 1935 میں کراچی میں پیدا ہوئی تھیں گریجویشن کرنے کے بعد آپ نے لاہور فلائنگ اکیڈمی سے جہاز اڑانے کی تربیت حاصل کی اور 12 جولائی 1959 کو کمرشل پائلٹ کا لائسنس حاصل کیا اس طرح آپ پاکستان کی پہلی لائسنس یافتہ کمرشل پائلٹ بن گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ پہلی فلائنگ انسٹرکٹر اور پہلی گلائیڈر انسٹرکٹر بھی تھیں۔ 1965 میں آپ نے پاکستان کی قومی ایئر لائن کو بطور فلائٹ کریو انسٹرکٹر شمولیت اختیار کی اور جہاز اڑانے والے پائلٹ سے گراؤنڈ انجینئر تک سبھی کو ٹریننگ دی آپ کی تربیت یافتہ شاگرد نا صرف پاکستان بلکہ 10 سے زیادہ ممالک میں پائلٹ کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

رفیق خاور

14 مئی 1990 کو اردو کے ممتاز شاعر ،ادیب، محقق، نقاد، مترجم اور ماہر لسانیات رفیق خاور کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی میں پی ای سی ایچ ایس کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ کا اصل نام محمد رفیق حسین تھا اور آپ 15 فروری 1908 کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ دیال سنگھ کالج لاہور کے پرنسپل ڈاکٹر محمد صادق اور اردو شاعری میں جدید نظم کے بانی تصدق حسین خالد آپ کے

بڑے بھائی تھے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے انگریزی ایم اے فارسی اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ وزارت محنت اور اطلاعات میں کام کرتے رہے ٹائر منٹ کے بعد آپ اردو لغت بورڈ سے منسلک ہو گئے۔ آپ کی تصانیف میں خاقانی ہند، ابر گہر بار، پدما سے چناب تک، اقبال اور اس کا پیغام اور حرف نشاط آور کے نام شامل ہیں۔ آپ کے تراجم کی فہرست بہت طویل ہے۔ آپ کئی زبانوں کے ماہر تھے اور منظوم و منثور تراجم پر یکساں عبور رکھتے تھے۔

ڈاکٹر سید عبدالخیر کشفی

15 مئی 2008 کو اردو کے نامور ادیب محقق نقاد اور ماہر تعلیم سید ابوالخیر کشفی کراچی میں وفات پاگئے اور جامعہ کراچی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 12 مارچ 1932 کو کانپور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا سید شاہ محمد اکبر عربی و فارسی زبان کے مشہور عالم تھے۔ آپ کے والد سید ابو محمد ثاقب کانپوری اپنے زمانے کے نامور شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ 1947 میں آپ نے انٹر میڈیٹ کا امتحان پاس کر کے کراچی آ گئے جہاں 1952 میں آپ نے جامعہ کراچی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا ایم اے کرنے کے بعد آپ نے تدریس کو اپنا ذریعہ معاش بنایا پہلے آپ اسلامیہ کالج میں اور پھر جامعہ کراچی میں شعبہ اردو سے منسلک ہوئے۔ 3 برس تک آپ ایک جاپانی یونیورسٹی میں بھی اردو کی تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔

آپ نے اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا تھا جو کتابی شکل میں اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ ان کی دیگر کتب میں ہمارے عہد کے ادب اور ادیب، جدید اردو ادب کا تنقیدی جائزہ، ہمارے ادبی اور لسانی مسائل اور خاکوں کا مجموعہ یہ لوگ بھی غضب تھے شامل ہیں۔

رفیق احمد نقش

15 مئی 2013 کو معروف ماہر لسانیات شاعر مترجم اور نقاد جناب رفیق احمد نقش کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں محمد شاہ قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 15 مارچ 1959 کو میر پور خاص میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے جامعہ سندھ سے ایم اے اردو ادب اور جامعہ کراچی سے ایم اے اردو لسانیات کیا بعد ازاں آپ نے سندھی اور ہندی میں پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ بھی کیا۔
آپ ایک ادبی پرچے "تحریر" کے مدیر بھی تھے۔ آپ کا نیجی کتب خانہ کراچی کے چند اہم کتب خانوں میں شمار ہوتا ہے

عبدالرؤف عروج

17 مئی 1990 کو اردو کے ممتاز شاعر ادیب اور محقق عبدالرؤف عروج کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں گلشن اقبال کے قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔ آپ 5 جنوری 1932 کو اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پہلے لاہور اور پھر کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ جہاں آپ متعدد اخبارات اور جرائد سے وابستہ رہے ان اخبارات اور جرائد میں روزنامہ امروز، مشرق، انجام اور ماہنامہ نیا راہی کے نام شامل تھے۔ آپ کی تصانیف میں اردو مرثیے کے پانچ سو سال، بزم غالب، رجال اقبال، خسرو

اور اہل خسر و،اقبال اور بزم اقبال، حیدر آباد دکن، میر اور اہل میر اور فارسی گو شعرائے اردو اس کے علاوہ آپ کا شعری مجموعہ چراغ آفریدم کے نام سے اشاعت پذیر ہوا تھا جبکہ آپ کے مرثیوں کا مجموعہ لہو لہو اجالا تشنائے طباعت ہے۔

چوہدری خلیق الزماں

18 مئی 1973 کو تحریک پاکستان کے نامور رہنما چوہدری خلیق الزماں انتقال کر گئے۔ آپ 25 دسمبر 1889 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایل ایل بی کر کے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ شروع میں کانگریس میں شمولیت اختیار کی پھر بعد میں مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ دسمبر 1947 میں آپ پاکستان مسلم لیگ کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور مشرقی پاکستان کے گورنر بھی رہے۔ جدوجہد آزادی پر آپ کی لکھی ہوئی کتاب بہت مشہور ہے جس کا نام Pathway to Pakistan ہے۔

مولانا محمد یوسف لدھیانوی

18 مئی 2000 کو نامور عالم دین مولانا یوسف لدھیانوی کو فائرنگ کر کے شہید کر دیا گیا۔ آپ 1932 میں مشرقی پنجاب کے جزیرہ نما بستی عیسی پور میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کے گھرانے نے ملتان میں سکونت اختیار کی۔ ابتدائی تعلیم آپ نے ملتان میں ہی حاصل کی اور پھر اس کے بعد ایک طویل عرصہ تک جامعہ رشیدیہ سے منسلک رہے۔ آپ جامعہ بنوری ٹاؤن میں حدیث کے استاد کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیتے رہے۔ تحریک تحفظ ختم نبوت کے سلسلے میں آپ نے گرانقدر خدمات انجام دیں اور اس معاملے میں متعدد کتب بھی تحریر کیں۔ آپ کی دیگر کتب میں عہد حاضر حدیث نبوی کے آئینے میں، اختلاف امت اور صراط مستقیم، شیعہ سنی اختلافات اور صراط مستقیم اور معاشرتی بگاڑ کا سدباب شامل ہیں۔

عبیداللہ علیم

18 مئی 1998 کو اردو کے ممتاز شاعر عبیداللہ علیم کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی میں رزاق آباد کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 12 جون 1939 کو بھوپال میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ آپ کراچی آ گئے اور لالو کھیت میں آباد ہوئے۔ ابتدا میں رنچھوڑ لائن کے ایک نائٹ اسکول میں داخلہ لیا لیکن پھر نویں کلاس میں لالو کھیت نمبر 2 میں گورنمنٹ اسکول میں داخلہ لیا اور وہیں سے میٹرک پاس کیا۔ آپ نے اردو کالج سے انٹر اور اسلامیہ کالج سے بی اے کی ڈگری لی جبکہ 1969 میں کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن میں بطور پروڈیوسر ملازمت اختیار کی مگر حکام بالا سے اختلافات کی وجہ سے 1978 میں آپ نے ملازمت سے استعفی دے دیا۔ آپ نے میٹرک میں ہی غزلیں اور نظمیں لکھنا شروع کر دیں تھیں۔ لیکن حالات سے بہت زیادہ پریشان ہو کر آپ نے اپنی زمانہ طالب علمی کی پوری بیاض کو باقاعدہ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی۔ مگر 1969 کے بعد سے آپ نے باقاعدہ دوبارہ شاعری شروع کی۔ آپ کے

شعری مجموعوں میں چاند چہرہ ستارہ آنکھیں، ویران سرائے کا دیا اور نگار صبح کی امید میں شامل ہیں اس کے علاوہ آپ کی دو نثری تصانیف بھی اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

عبدالرزاق ٹبا

19 مئی 2005 کو پاکستان کے صف اول کے صنعتکار عبدالرزاق ٹبا 77 سال کی عمر میں کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ 1928 میں ہندوستان کے شہر جٹ پور میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی تشریف لے آئے اور صنعت و تجارت سے وابستہ رہے۔ 1962 میں یونس برادرز گروپ آف کمپنیز قائم کی جو آج پاکستان کے بڑے گروپ آف کمپنیز میں سے ایک ہے۔ آپ انتہائی انسان دوست شخصیت تھے۔ آپ کا مشن تھا کہ پاکستان میں سے غربت کا خاتمہ کیا جائے اس سلسلے میں آپ نے بے شمار اداروں کی مالی معاونت کی اس کے علاوہ ٹبا ہارٹ اور ٹبا کڈنی کے نام سے بڑے بڑے ہسپتال بھی بنائے۔ آپ کی انہی خدمات کی وجہ سے پاکستان کے سب سے بہترین تعلیمی ادارے انسٹیٹیوٹ آف بزنس ایڈمنسٹریشن (IBA) نے آپ کے نام سے پورا ایک بلاک بنایا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کو حکومت پاکستان کی طرف سے ستارہ امتیاز بھی ملا۔

اقبال مہدی

19 مئی 2008 کو پاکستان کے نامور مصور اقبال مہدی اسلام آباد میں وفات پا گئے۔
آپ یکم اپریل 1946 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ کہنے کو تو امروہہ ایک مختصر بستی ہے لیکن علم و ادب، شاعری اور فنون کی دنیا میں جو اس بستی کو آفاقی شہرت ملی ہے وہ برصغیر کے کسی شہر کو نہ مل سکی۔ آپ ابتداء میں اپنے عزیز اور مشہور مصور صادقین سے بہت متاثر تھے مگر بعد میں آپ نے اپنا الگ اسلوب مصوری تشکیل دیا۔ آپ انسانی چہروں کو پینٹ کرنے میں بہت مہارت رکھتے تھے۔
آپ نے قائداعظم اور علامہ اقبال کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت ساری تصویریں بنائی جس کی نمائش پورے پاکستان میں ہوئیں۔

راز زیدی

20 مئی 1991 کو معروف شاعر راز زیدی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1924 میں ریاست پٹودی کے ایک گاؤں شاہ پور کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام محمد حنیف زیدی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے پہلے میانوالی اور پھر کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ کراچی میں آپ نے کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ملازمت اختیار کی جہاں پر آپ کو رئیس فروخ کی ہم نشینی حاصل ہوئی۔ شاعری کا شوق تو آپ کو بچپن ہی سے تھا مگر رئیس فروخ کی صحبت میں آپ نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی اور جلد ہی شاعری میں اپنا الگ مقام بنالیا۔ زبان و بیاں پر آپ کو بڑی قدرت حاصل تھی مگر آپ کی شاعری میں ہمیشہ سوز و گداز موجود رہا۔

اقبال صفی پوری

22 مئی 1999 کو معروف شاعر اقبال صفی پوری کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی کے پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودہ خاک

ہوئے۔ آپ 9 جولائی 1921 کو صفی پور ضلع اناؤ یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے داداشاہ خلیل احمد چشتی صابری ایک جید عالم اور صوفی بزرگ تھے۔ تعلیمی مراحل لکھنؤ میں پورے کیے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی لیکن ملازمت کے سلسلے میں کچھ عرصے لاہور اور فیصل آباد بھی رہے۔ آخر میں کراچی بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی میں ملازمت اختیار کی اور باحیثیت اسسٹنٹ آرکٹکٹ ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ شاعری کا جنون آپ کو بچپن ہی سے تھا اور بہت کم عمری ہی سے آپ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ آپ کے شعری کتب ہوائیں رنگ ونور اور شاخ گل کے نام سے شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ آپ کا ایک نعتیہ مجموعہ رحمت لقب کے نام سے شائع ہوا۔

سید محسن علی

23 مئی 2003 کو پاکستان ٹیلی ویژن کے معروف ڈائریکٹر سید محسن علی کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی ہی میں گلشن اقبال کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1941 میں پیدا ہوئے تھے۔ 1967 میں پاکستان ٹیلی ویژن سے وابستگی اختیار کی۔ آپ کے مشہور ٹیلی ویژن ڈراموں میں شہزوری, کرن کہانی, انکل عرفی, تعبیر, شاہین اور جناح سے قائد کے نام سر فہرست ہیں. حکومت پاکستان کی جانب سے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی اور پاکستان ٹیلی ویژن نے لائیو اچیو منٹ ایوارڈ آپ کو عطا کیا۔

ایئر کمانڈو مسرور حسین

24 مئی 1967 کو کراچی میں ایک حادثے کے نتیجے میں ایئر کمانڈو مسرور حسین شہید ہوگئے۔ آپ ماری پور ایئر بیس کے اسٹیشن کمانڈر تھے اور 1965 کی جنگ میں فضائی دفاع کے سلسلے میں قابل قدر خدمات انجام دینے پر آپ کو ستارہ پاکستان عطا کیا گیا تھا۔ نیشنل اسٹیڈیم کے قریب آپ کے طیارے سے ایک پرندہ ٹکرا گیا جس سے طیارے میں آگ لگ گئی آپ چاہتے تو طیارے سے کود کر پیراشوٹ کے ذریعے اپنی جان بچا سکتے تھے مگر طیارے کو آبادی سے دور ہٹانے کی کوشش میں آپ کی بھی شہادت ہوگئی۔ آپ کی خدمات کی یاد میں 24 مئی 1968 کو پاک فضائیہ کے اس ایر بیس کا نام آپ کے نام پر بدل کر پی اے ایف بیس مسرور رکھ دیا گیا۔

علامہ نیاز فتح پوری

24 مئی 1966 کو اردو کے نامور ادیب, نقاد, محقق اور ماہر لسانیات علامہ نیاز فتح پوری کراچی میں وفات پاگئے. آپ 28 دسمبر 1884 کو فتح پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے فروری 1922 کو ایک اپنا ذاتی رسالہ نگار شائع کیا۔ اس کا اجراء تو آگرہ سے ہوا لیکن یہ سفر کرتا ہوا چار شہروں اور دو ملکوں سے ہوتا ہوا آپ کی حیات تک اور پھر اس کے بعد آپ کے لائق شاگرد ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اس کو آگے بڑھایا اس رسالے میں آپ کی تحریریں نہایت تفصیلی ہیں جو اردو ادب کا بیش بہا سرمایا ہیں۔ اوران تحریروں نے اردو ادب میں نت نئے مباحث کو جنم دیا اس کے علاوہ آپ نے 35 مختلف موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں۔

حمید داؤد حبیب

25 مئی 2000 کو پاکستان کے نامور بینکار اور سماجی شخصیت حمید داؤد حبیب انتقال کر گئے. آپ 1925 میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا اسماعیل حبیب حبیب گروپ کے بانی ہیں آپ کے والد اور چچا نے ملکر 1941 کو بمبئی میں بر صغیر میں پہلے مسلمان بینک حبیب بینک لمیٹڈ کی بنیاد رکھی۔ اور قیام پاکستان کے وقت قائد اعظم کی درخواست پر پورے بینک کا نظام بمبئی سے کراچی شفٹ کر دیا۔ آپ ایکسپورٹ پروموشن بیورو کے چیئر مین بھی رہے۔ اس کے علاوہ آپ نے حبیب ایجوکیشنل ٹرسٹ بھی بنایا جس نے بے شمار فلاحی کام کیے جیسے حبیب پبلک اسکول حبیب گرلز اسکول غلامان عباس اسکول اور ڈسپنسری وغیرہ

الطاف حسین

25 مئی 1968 کو پاکستان کے نامور صحافی الطاف حسین کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 26 جنوری 1900 کو سلہٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ آزادی کے زمانے میں قائد اعظم نے انہیں مسلم لیگ کے اخبار ڈان کا مدیر مقرر کیا تھا۔ آزادی کے بعد جب روزنامہ ڈان کراچی سے جاری ہوا تو آپ اس کے بھی مدیر رہے۔ 1965 میں آپ کو ایوب خان نے اپنی کابینہ میں بطور وزیر صنعت کو قدرتی وسائل شامل کر لیا لیکن اپنی صحت کی وجہ سے آپ انتقال سے دس روز پہلے اس عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔

ڈاکٹر محمد سرور

26 مئی 2009 کو پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے بانی رکن اور معروف سابق طالب علم رہنما ڈاکٹر محمد سرور کراچی میں وفات پا گئے. آپ 1929 میں الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کا امتحان پاس کیا۔ 1953 میں طلبہ کے ہونے والے مشہور مظاہرے میں انتہائی فعال کردار ادا کیا جس کی بنا پر انہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔ آپ کا شمار پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے بانیوں میں ہوتا ہے جس کے آپ 2 مرتبہ جنرل سیکرٹری بھی منتخب ہوئے.

مفتی نظام الدین شامزئی

30 مئی 2004 کو ممتاز عالم دین مفتی نظام الدین شامزئی کراچی میں فائرنگ سے شہید ہو گئے۔ آپ 12 جولائی 1952 کو گاؤں فاضل بیگ علاقہ شامل ضلع سوات میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سوات میں اور پھر بقیہ تعلیم کراچی سے مکمل کی۔ شیوخ بخاری کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر آپ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاون سے بطور استاد وابستہ ہو گئے۔--1998 میں آپ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں شرح مقدمہ مسلم، والدین کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، شیوخ بخاری (مقالہ پی ایچ ڈی) اور عقیدہ ظہور مہدی احادیث کی روشنی میں شامل ہیں۔

قمر علی عباسی

31 مئی 2013 کو معروف براڈکاسٹر اور نامور ادیب قمر علی عباسی نیویارک میں وفات پا گئے۔ آپ 13 جون 1938 کو امروہہ

ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور ایم اے معاشیات کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ابتدا میں کچھ عرصے نیشنل کالج میں معاشیات کی تدریس بھی کی۔ 1976 میں مقابلے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد ریڈیو پاکستان میں ملازمت کا انتخاب کیا اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔

آپ کی اصل شہرت سفر نامہ نگار کی حیثیت سے ہے۔ آپ کے سفر ناموں میں لندن لندن، دلی دور ہے، چلا مسافر سنگاپور اور امریکہ مت جائیو وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کی سوانح عمری "اک عمر کا قصہ ہے" بہت لاجواب ہے۔ آپ نے اسے اس انداز سے لکھا ہے کہ جو بھی شخص اسے پڑھنا شروع کرے گا وہ ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ کو حکومت پاکستان نے تمغہ امتیاز کا اعزاز بھی عطا کیا۔

اظفر رضوی

31 مئی 2013 کو نامور ماہر تعلیم آظفر رضوی ایک قاتلانہ حملے میں شہید ہو گئے۔ آپ 27 دسمبر 1957 کو ڈھاکہ میں پیدا ہوئے تھے جہاں آپ کے والد نوکری کے سلسلے میں تعینات تھے۔ آپ کا تعلق اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا آپ کے والد سید احمد رضوی پاکستان سول سروسز کے ممتاز فرض شناس آفیسر کے طور پر مشہور تھے۔ جبکہ آپ کے دادا پٹنہ شہر کے مشہور طبیب تھے۔ آپ کے نانا علامہ تمنا عمادی ہندوپاک کے مشہور عالم دین تھے۔ آپ نے میٹرک ڈھاکا سے کیا اور پھر کراچی آ گئے۔ کراچی میں آپ نے نیشنل کالج میں ایڈمیشن لیا اور پھر کراچی یونیورسٹی سے ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ لندن یونیورسٹی سے آپ نے ایجوکیشن میں ڈپلومہ کیا اور پھر وطن واپس آ کر ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کو فروغ تعلیم کے لئے وقف کر دیا۔ آپ نے کریم آباد میں دو کمروں کے فلیٹ سے اپنے اس مشن کا ڈھاکہ گروپ آف انسٹی ٹیوشن کے نام سے آغاز کیا جس سے اب تک 25 سال گزرنے کے بعد پچاس ہزار طلبہ وطالبات فارغ التحصیل ہو چکے ہیں۔ اس ادارے کے زیر انتظام چار سیکنڈری اسکول دو اولیول 3 کوچنگ سینٹرز اور ایک انٹرمیڈیٹ کالج ہے۔ تعلیم کے میدان میں آپ کی بے پناہ خدمات کے صلے میں آپ کو قائداعظم ایوارڈ، مالوین جون ایوارڈ، اعتراف کمال ایوارڈ، نقش محنت ایوارڈ اور اس کے علاوہ فروغ نعت کے لیے کئی ایوارڈ دیے گئے۔

ڈاکٹر آصف اسلم فرخی

یکم جون 2020 کو نامور ادیب، افسانہ نگار، مترجم، مدیر اور معالج ڈاکٹر آصف اسلم فرخی کراچی میں وفات پا گئے اور جامعہ کراچی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 16 ستمبر 1959 کو کراچی میں انتہائی علمی وادبی گھرانے میں آنکھ کھولی. آپ کے والد ڈاکٹر اسلم فرخی علمی وادبی دنیا کی نامور شخصیت تھے اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے بہت عرصے تک وابستہ رہے۔ آپ کی والدہ بھی عظیم ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کی پڑپوتی اور نامور ادیب شاہد احمد دہلوی کی بھتیجی تھیں اور خود بھی ایک گورنمنٹ گرلز کالج میں پرنسپل خدمات انجام دیتی رہیں۔ انٹر میں کراچی بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے کے بعد آپ نے کراچی میں ڈاؤ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور مزید پڑھنے کے لیے امریکہ کی ہارورڈ یونیورسٹی چلے گئے. واپس آ کر دس سال تک آغاخان میڈیکل

یونیورسٹی میں بحیثیت استاد وابستہ رہے اور پھر اقوام متحدہ کے ادارے یونیسف سے وابستہ ہو گئے۔ لکھنے لکھانے کا شوق آپ کو بچپن ہی سے تھا آپ کا پہلا مضمون ماہنامہ افکار کراچی میں شائع ہوا۔ آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ آتش فشاں پر کھلے گلاب آپ کی زمانہ طالب علمی میں ہی شائع ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ آپ کے کئی افسانوی مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ مگر آپ نے دراصل تنقید نگار کی حیثیت سے ملک گیر شہرت حاصل کی آپ کے تنقیدی مجموعے عالم ایجاد کو اس دور کا ایک اہم تنقیدی مجموعہ قرار دیا جاتا ہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو تمغہ امتیاز عطا کیا۔

نظیر شاہجہاں پوری

یکم جون 1998 کو معروف شاعر نظیر شاہجہاں پوری کراچی میں وفات پا گئے اور وہیں آسودہ خاک ہوئے. آپ 28 اکتوبر 1906 کو روہیل کھنڈ کے شہر شاہ جان پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے خاندان کے ساتھ نصیر آباد ضلع لاڑکانہ تشریف لے آئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ 1988 میں حالات خراب ہونے کی وجہ سے آپ نے ایک بار پھر ہجرت کی اور کراچی میں سکونت اختیار کی۔ آپ کے کیوں کے گھر میں ہی مشاعروں کی محفل ہستی تھی اس لئے شاعرانہ مزاج تو بچپن سے ہی بن گیا تھا بیدل شاہ جان پوری کے شاگرد ہوئے۔ آپ نے تھوڑے ہی عرصے میں بہت زیادہ مشہور ہو گئے۔

نصر اللہ شجیع

2 جون 2014 کو جماعت اسلامی کے رہنما نصر اللہ شجیع بالاکوٹ کے مقام پر دریائے کنہار میں اپنے ایک شاگرد کی جان بچانے کی کوشش میں اپنی جان کی بازی ہار گئے۔ آپ 1970 میں کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ ایک دفعہ سندھ اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے تھے۔ اپنے شاگرد کی جان بچانے کے لیے جس طرح سے آپ نے اپنے آپ کو قربان کیا اس کی مثال نہی ملتی۔ حکومت پاکستان نے 14 اگست 2014 کو آپ کو بعد از مرگ تمغہ شجاعت کا اعزاز عطا کیا۔

سید شریف الدین پیرزادہ

2 جون 2017 کو تحریک پاکستان کے کارکن اور معروف قانون دان سید شریف الدین پیرزادہ کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 12 جون 1923 کو ریاست مدھیہ پردیش کے شہر برہان پور میں پیدا ہوئے۔ بمبئی یونیورسٹی سے حصول تعلیم کے بعد آپ نے لندن سے قانون کی ڈگری حاصل کی اور بمبئی ہائی کورٹ سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ آپ مسلم لیگ میں کارکن کی حیثیت سے وابستہ رہے اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئے۔ ایوب خان کے دور میں آپ پاکستان کے اٹارنی جنرل مقرر ہوئے بعد ازاں آپ وزیر خارجہ بھی رہے۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں ایک دفعہ پھر اٹارنی جنرل کی حیثیت سے کام کیا اور او آئی سی کے سیکرٹری جنرل بھی رہے۔ آپ پاکستان کے آئین کے ماہر اور آئینی جادوگر کہلاتے تھے۔ آپ نے مختلف موضوعات پر 10 کتابیں بھی لکھیں۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے 1988 میں پاکستان کا سب سے بڑا شہری اعزاز نشان پاکستان عطا کیا گیا۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

2 جون 1992 کو اردو کے ممتاز نقاد اور افسانہ نگار ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کراچی میں وفات پا گئے
آپ 12 جون 1912ء کو رائے پور ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ علیگڑھ سے ایم اے کرنے کے بعد پیرس یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تاہم اس سے پہلے ہی آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ قیام پاکستان تک آپ وزارت تعلیم میں انڈر سیکریٹری کے عہدے پر کام کر رہے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی آپ پاکستان کے وزارت تعلیم سے منسلک رہے پھر ایک طویل عرصے تک یونسکو سے وابستہ رہے۔ آپ کا شمار اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ آپ کے دو افسانوں کے مجموعے محبت اور نفرت اور زندگی کا میلا بہت مشہور ہیں.

مجنوں گورکھپوری

4 جون 1988 کو اردو کے ممتاز نقاد محقق ماہر تعلیم مترجم اور افسانہ نگار جناب مجنوں گورکھپوری کراچی میں وفات پا گئے۔
اب 10 مئی 1904 کو گورکھپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آگرہ یونیورسٹی سے آپ نے انگریزی زبان میں ایم اے کی ڈگری لی اور کلکتہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اور آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بطور استاد منسلک ہو گئے۔ پاکستان آنے کے بعد آپ کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ آپ کا شمار اردو ادب کے چند بڑے نقادوں میں ہوتا ہے۔ آپ کی کتاب "شعر اور غزل" کا مطالعہ ادب کے ہر طالب علم کے لئے مفید ہے اس کے علاوہ آپ کی کتاب "ادب اور زندگی" ایک معرکتہ الآراء کتاب ہے جس میں آپ نے تنقید کو ایک نئی جہت سے روشناس کرایا۔ کیونکہ آپ اردو اور انگریزی دونوں ادب کے ماہر تھے۔ اس لیے آپ کے ترجمے بھی اپنے کمال پر ہوتے تھے خاص کر "تاریخ جمالیات" ترجمہ ہی ہے مگر اس میں روانی اور شگفتگی ایسی ہے کہ طبع زاد تصنیف معلوم ہوتی ہے.

حمید وائیں

4 جون 1997 کو پاکستانی ٹیلی وژن اور اسٹیج کے معروف فنکار حمید وائیں کراچی میں وفات پا گئے۔
آپ 1927 کو امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور کراچی میں اسٹیج ڈراموں کو فروغ دینے کے لیے کراچی آرٹس تھیٹر کے نام سے ایک تھیٹر گروپ تشکیل دیا۔ بعد ازاں آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگراموں کی ہدایات بھی دیں۔ اس کے علاوہ بے شمار ڈراموں میں اپنے اداکاری کے جوہر بھی دکھائے۔ آپ کی مشہور ٹیلی ویژن ڈراموں میں احساس، دھوپ کنارے، کاوش اور سنہرے دن کے نام سر فہرست ہیں۔

مسلم ضیائی

5 جون 1977 کو اردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات جناب مسلم ضیائی کراچی میں وفات پا گئے۔
آپ 1911 میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن سے آپ نے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ شروع میں صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور پھر اردو محل کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا جس کے ذریعے اپنے بے شمار ادیب اور شعراء کو ترقی کے منازل طے کروائے۔ آپ اردو ادب کی بڑی بڑی شخصیات کے گرومانے جاتے ہیں۔ محقق کی حیثیت سے جو آپ نے کتابیں لکھیں وہ آپ کی دقیق تحقیق کا اعلی ترین ثبوت ہے جن میں ٹیپو سلطان اور اس کا خواب اور میر تقی میر کی آپ بیتی نمایاں ہیں۔ آپ غالب کے بہت بڑے عاشق اور ان کی شاعری پر آپ کو بڑی دسترس حاصل تھی۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ غالب کا منسوخ دیوان ہے۔

تراب علی

5 جون 2009 کو پاکستان کے مشہور فٹ بال کھلاڑی تراب علی کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی میں وہ شاہ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ کے فٹبال کیریئر کا آغاز 1961 میں ہوا تھا آپ نے اپنا پہلا بین الاقوامی میچ برما کے خلاف کھیلا اور آخری میچ 1967 میں ایشیا کپ فٹ بال ٹورنامنٹ میں بھارت کے خلاف کھیلا۔ آپ سینٹرل ڈیفنڈر پوزیشن پر کھیلتے تھے اور آپ کی کارکردگی کی وجہ سے آپ کو دیوار چین اور پلر آف ہرکولیس کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

محمد علی رنگون والا

5 جون 1998 کو پاکستان کے نامور صنعت کار جناب محمد علی رنگون والا وفات پا گئے۔
آپ 1924 کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد کا کاروبار پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ تھوڑے عرصے میں بمبئی کے کاروباری سرکل میں آپ نے اپنا مقام بنالیا تھا۔ 1940 میں آپ تحریک پاکستان میں شامل ہو گئے جہاں جناب عبداللہ ہارون کے اصرار پر آپ نے اپنا کاروبار کراچی شفٹ کر لیا اور پاکستان کی پہلی خردنی تیل کی ریفائنری بنائی جس کا افتتاح خود قائد اعظم نے اپنے ہاتھوں سے کیا۔ نیشنلائزیشن کی پالیسی آنے سے پہلے آپ کا گروپ پورے ایشیا میں خردنی تیل کا سب سے بڑا گروپ تصور کیا جاتا تھا۔ نیشنلائزیشن کی پالیسی کے بعد آپ نے اپنے کاروبار کو پوری دنیا میں پھیلا دیا۔

مگر پاکستان میں کاروباری سرگرمیاں مسلسل جاری رکھیں آپ کراچی چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے بانی صدر بھی رہے اسی طرح سے ورلڈ میمن فاؤنڈیشن کے بھی بانی صدر رہے۔ آپ کراچی سٹاک ایکسچینج کے بانی ممبر بھی تھے۔ پورے پاکستان اور خاص کر کراچی میں آپ نے بے شمار تعلیمی اور سماجی کام کیے۔ رنگون والا کمیونٹی ہال بنا کر پہلی مرتبہ آپ نے کمیونٹی ہال کا خیال دیا۔

پروفیسر حامد حسن قادری

6 جون 1964 کو اردو کے نامور ادیب نقاد, محقق اور تاریخ گو شاعر پروفیسر حامد حسن قادری کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی ہی میں پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔

آپ 25 مارچ 1887 کو ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے_ تعلیم مکمل کرنے کے بعد تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوئے اور سینٹ جانز کالج آگرہ میں 25 سال تک اردو اور فارسی پڑھاتے رہے۔ مولانا حامد حسن قادری کی تصانیف کی تعداد 40 کے لگ بھگ ہیں۔ تاہم ان میں سب سے زیادہ شہرت داستان تاریخ اردو نے پائی۔ اس کے علاوہ تاریخ مرثیہ گوئی بھی آپ کی بہت نادر کتاب ہے۔

حسین ابراہیم جمال

7 جون 1972 کو کراچی کی مشہور کاروباری اور سماجی شخصیت حسین ابراہیم جمال انتقال کر گئے۔

آپ کو 14 سال کی عمر میں آپ کے چچا کے پاس کاروبار کے لیے جنوبی افریقہ بھیج دیا گیا۔ جہاں آپ نے کاجو کی تجارت کا کام شروع کیا اور بہت جلد ہی اپنا نام بنا لیا۔ کچھ سالوں بعد آپ بمبئ واپس آگئے اور تھوڑے ہی عرصے میں آپ کا شمار بمبئ کے نامور تاجروں میں ہونے لگا۔ آپ بمبئ میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کہ ممبر بھی تھے۔ آپ کو ہمیشہ اپنی تعلیم مکمل نہ کرنے کا افسوس رہتا تھا اسی لئے آپ نے اپنی پوری زندگی تعلیمی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے اور مہاجرین کی آبادکاری میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ آپ کی انہی خدمات کی وجہ سے فیڈرل بی ایریا کے ایک علاقے کا نام آپ کے نام پر حسین آباد رکھا گیا۔ آپ کی تعلیم کے لئے مختص کی ہوئی رقم سے آپ کی وفات کے بعد کراچی یونیورسٹی میں آپ کے نام پر ایچ ای جے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری بنایا گیا۔ آپ کے گھر والوں نے آپ کے نام پر ایک رفاعی ادارہ حسین فاؤنڈیشن بھی بنایا ہوا ہے۔

مولانا سید آغا جعفر نقوی

7 جون 2003 کو نامور عالم دین اور عارف اللہ مولانا سید آغا جعفر نقوی وفات پا گئے۔ آپ 1936 میں کھجوا ضلع سارن، بہار کے ایک انتہائی علمی اور مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا سید علی حیدر ایک تحقیقی رسالے "اصلاح" کے ایڈیٹر اور صاحب تصانیف عالم تھے۔ آپ نے دینی تعلیم کی ابتدا اپنے گھر سے اور پھر لکھنؤ کے دینی مدرسے میں داخل ہو گئے۔ فاضل عربی کا امتحان پاس کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے ایم-اے بھی کیا۔ کافی عرصے حبیب پبلک اسکول میں معلم کے فرائض بھی انجام دیے۔ جمعہ اور ہفتے کو اپنے گھر پر نماز باجماعت کی امامت فرماتے تھے جس کے بعد فقہ اور تفسیر کا درس ہوتا تھا جس میں شامل ہونے والے لوگ آج بھی عرفان اور معنویت کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ آپ نے کئی کتابیں لکھیں اور ترجمے بھی کیے جن میں اللہ اور کائنات آدم و نوح اور نور کے دریا (ترجمہ بحار الانوار) بہت مشہور ہیں۔ آپ عربی اردو فارسی انگریزی کے علاوہ ہندی زبان پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ 1960 میں ایک رسالہ بنام پندرہ روزہ "شمس" جاری کیا۔ اس رسالے کا معیار بہت علمی تھا۔ 1962 میں اس رسالے کا ایک نمبر شائع کیا جس میں قطب شمالی اور قطب جنوبی جہاں چھ مہینے رات اور چھ مہینے دن ہوتا ہے او قات نماز اور روزوں کے متعلق بہت سارے سوالات کے جوابات دیے.

حافظ حبیب اللہ پراچہ

8 جون 1988 کو حبیب اللہ گروپ آف کمپنی کے مالک اور بلدیہ کراچی کے سابق وائس چیئر مین جناب حافظ حبیب اللہ پراچہ وفات پا گئے۔

آپ 1896 میں پنجاب کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے تھے۔ 1931 میں حبیب اللہ گروپ کی بنیاد رکھی اور 1938 میں کراچی منتقل ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے امور ریاست چلانے کے لئے لیاقت علی خان کو ایک بلینک چیک پیش کیا اور حکومت پاکستان نے اس میں سے دس لاکھ روپے نکلوائے جو اس وقت کا سب سے بڑا چندا تھا۔ آپ 1953 سے 1958 تک کراچی کے قائم مقائم مئیر رہے۔ 1960 سے 1968 تک آپ بلدیہ کراچی کے نائب چیئر مین بھی رہے۔ یہی وہ دور ہے جس میں کراچی میں سب سے زیادہ ترقیاتی کام ہوئے۔ آپ ایسوسی ایٹ پریس آف پاکستان (APP) کے بانی ممبر بھی تھے. 1974 سے 1976 تک ملائشیا میں سفارتکار بھی رہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ستارہ خدمت اور تمغہ قائد اعظم سے بھی نوازا.

علامہ عباس کمیلی

8 جون 2019 کو سابق سینیٹر اور فلسطین فاؤنڈیشن کے بانی صدر علامہ عباس کمیلی طویل علالت کے باعث 74 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔ آپ 15 دسمبر 1942 کو کراچی کے علاقے کھارادر میں واقع قائد اعظم کے گھر وزیر مینشن کے سامنے والے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ

قائداعظم کے رشتے داروں میں سے ایک تھے۔ بعدازاں آپ نے علامہ رشید ترابی سے دست فیض حاصل کیا اور ایک طویل عرصے تک ممبر پر علم بانٹتے رہے۔ آپ ہمیشہ کہتے تھے کہ پاکستان کو قائداعظم کے اصولوں پر قائم رہنا چاہیے۔

پروفیسر مرزا محمد سعید

10 جون 1962 معروف ماہر تعلیم اردو ادیب اور ناول نویس جناب پروفیسر مرزا محمد سعید کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 2 جون 1986 میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ سر سید احمد خان اور منشی ذکاءاللہ سے آپ کی رشتہ داری بھی تھی۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگلش میں ایم اے کیا اور پھر پہلے علی گڑھ میں اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ پطرس بخاری اور امتیاز علی تاج آپ کے شاگردوں میں سے تھے۔ پطرس بخاری آل انڈیا ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل بننے کے باوجود وائسرائے کا بھی اتنا احترام نہیں کرتے تھے جتنا وہ آپ کا احترام کرتے تھے۔ آپ نے زندگی بھر جو کام کیا وہ اپنی دلی تسکین کے لیے کیا کبھی مالی مفاد نہیں دیکھا پبلشر زان سے ناول لکھوانے کے بدلے بھاری رقم دینے کو تیار رہتے تھے مگر آپ نے اپنے دونوں ناول "یاسمین" اور "خواب ہستی" بغیر کسی قیمت کے چھپوائے۔ اور آپ کی معرکتہ الآرا کتاب "مذہب اور باطنی تعلیم" بھی بغیر کسی معاوضے کے چھپی۔ جو کہ بلامبالغہ اردو کی سو بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ آپ کو مطالعے بہت شوق تھا اور اپنی پنشن کا زیادہ تر حصہ کتابوں کے خریدنے میں ہی خرچ کر دیتے تھے۔ ایک علمی محفل میں فیض احمد فیض نے آپ کو کسی بات پر ٹوک دیا اس کے بعد جو آپ نے علمی دلائل دینا تو پوری محفل کو اپنے علمی دلائل سے حیران کر دیا اور فیض تو آپ کے علم کے ابلتے ہوئے دریا کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے قیام پاکستان سے پہلے مسلم لیگ کی طرف سے صوبائی ممبر بھی منتخب ہوئے تھے۔

ضمیر نیازی

11 جون 2004 کو پاکستان کے نامور صحافی مصنف اور آزادی صحافت کے علمبردار ضمیر نیازی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 8 مارچ 1927 کو بمبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ 1942 میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک سے اپنی جدوجہد کا آغاز کیا اور صحافت کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے اور روزنامہ ڈان سے منسلک ہو گئے پھر بعد میں بزنس ریکارڈر سے منسلک ہوئے اور اپنی ریٹائرمنٹ تک اسی اخبار سے وابستہ رہے۔ آپ اپنی چار تصانیف کے باعث پاکستانی صحافت کی دنیا میں لافانی مقام حاصل کر چکے ہیں۔ 1987 میں آپ کی کتاب Press in chins شائع ہوئی جس کا اردو ترجمہ "صحافت پابند سلاسل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ 1992 میں Press Under Siege لکھی۔ ان دونوں کتابوں کو پاکستانی پریس کی واحد مستند و معتبر دستاویز خیال کیا جاتا ہے۔ یہ صرف پاکستانی اخبارات کی تاریخ نہیں بلکہ ملک کے پچاس سالہ سیاسی و معاشرتی تاریخ بھی بیان کرتی ہیں۔ پاکستان کی سیاست و معاشرت کا مطالعہ کرنے والے طالب علم کے لئے یہ دونوں کتابیں ابجد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کی دو اور کتابیں باغبان صحرا اور حکایت خونچکاں بہت مشہور ہیں۔ 1994 میں حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی

عطا کیا جسے اگلے برس کراچی کے 6 اخبارات پر پابندی عائد ہونے کے بعد آپ نے احتجاجاً واپس کر دیا۔ کراچی یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری ادا کرنے کا اعلان کیا مگر انہوں نے اسے قبول کرنے کے لئے گورنر ہاؤس جانے سے انکار کر دیا۔

بیگم رعنا لیاقت علی خان

13 جون 1990 کو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم قائد ملت لیاقت علی خان کی شریک حیات اور تحریک پاکستان کی سر گرم خاتون رہنما بیگم رعنا لیاقت علی خان کراچی میں وفات پا گئی اور کراچی میں ہی مزار قائد اعظم کے احاطے میں دفن ہوئی. آپ 13 فروری 1905 کو پیدا ہوئی تھیں۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے معاشیات اور عمرانیات میں ایم اے کے امتحانات پاس کیے اور 1933 میں آپ نے اسلام قبول کیا اور نوابزادہ لیاقت علی خان کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔ قیام پاکستان کے لیے خاتون ہونے کے باوجود اپنے شوہر کے ساتھ انتھک محنت کی۔ قیام پاکستان کے بعد بھی آپ نے ہر طرح سے لوگوں اور خاص کر خواتین کی فلاح و بہبود کے لئے کام شروع کیے۔ لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد بھی آپ کی فعالیت میں کمی نہیں آئی۔ آپ نے آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن (اپوا) کی بنیاد رکھی اور ہر شعبہ ہائے زندگی کی خواتین کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا کیا اور آپ اس تنظیم کی تاحیات صدر رہیں۔ آپ کئی ممالک کی سفیر بھی رہیں اس کے علاوہ آپ صوبہ سندھ کی گورنر بھی رہیں اس طرح آپ کو پاکستان کہ کسی بھی صوبے کی پہلی خاتون گورنر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ آپ کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی جانب سے انسانی حقوق کا ایوارڈ دیا گیا جبکہ حکومت پاکستان کی جانب سے نشان امتیاز کا اعزاز بھی ملا۔

عطاءاللہ حسینی قادری

14 جون 2020 کو ممتاز عالم دین اور کالم نگار جناب پروفیسر ڈاکٹر سید عطاءاللہ حسینی قادری کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی کے علاقے ملیر میں آسودہ خاک ہوئے۔ 10 فروری 1931 کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ جامعہ ملیہ ملیر، اسلامیہ آرٹس اینڈ کامرس کالج اور لیاقت گورنمنٹ کالج کراچی سے وابستہ رہے 0 جب کے جامعہ ملیہ ملیر کی جامع مسجد ابوالفضل کے خطیب بھی تھے۔ آپ کی کتب میں اسلامی نظام اسلام کی بنیادی تعلیمات، شاہد الوجود، مکاتب حسینی، نور الحقیقت اور موج خیال وغیرہ شامل ہیں.

ڈاکٹر اسلم فرخی

15 جون 2016 کو پاکستان کے نامور اردو نقاد، محقق اور شاعر ڈاکٹر اسلم فرخی کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی میں ہیں کراچی یونیورسٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 23 اکتوبر 1924 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں سکونت پذیر ہو گئے مگر آپ کو اپنے ہندوستان میں موجود کتب خانے کی بربادی کا بہت افسوس تھا جس میں 15 سے 16 ہزار کتابیں موجود تھیں اور اسے حکومت ہندوستان نے گھر کے سارے سامان کے ساتھ ضبط کر لیا تھا۔ آپ نے محمد حسین آزاد: حیات و تصانیف کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی یہ مقالہ جب کتابی شکل میں سامنے آیا تو اسے داؤد ادبی انعام سے نوازا گیا۔

آپ پوری زندگی کراچی یونیورسٹی میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ آپ نے تحقیق اور خاکہ نگاری کو اپنی شناخت بنایا آپ کے خاکوں کے مجموعے میں گلدستہ احباب، انگن میں ستارے، لال سبز کبوتروں کی چھتری، سات آسمان اور رونق بزم جہاں کے نام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے بے پناہ تحقیقی کام کیا جس کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

قمر ہاشمی

16 جون 1993 کو معروف شاعر اور ادیب قمر ہاشمی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 2 فروری 1924 کو ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد خود ایک جید عالم دین تھے اس لیے ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد سے حاصل کی پھر مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ چلے گئے جبکہ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ امتحان سے فارغ ہو کر آپ نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور دوران ملازمت آپ کا تبادلہ کانپور ہو گیا۔ اس وقت کانپور شعر وادب کا ایک بہت بڑا مرکز تھا۔ خوش قسمتی سے آپ کو مولانا حسرت موہانی کی صحبت میسر آگئی لیکن آپ باقاعدہ شاگرد اختر شیرانی کے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور یہاں آکر صحافت کے پیشے سے وابستہ ہو گئے۔ پہلے روزنامہ ڈان اردو کے سب ایڈیٹر ہوئے اور پھر امروز لاہور کے نامہ نگار رہے۔ 1952 میں آپ ہمدرد پاکستان کے شعبہ تصنیف وتالیف سے منسلک ہو گئے۔ آپ بڑے پکے مسلمان اور دین کے علم بردار تھے یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری رنگ ونسل اور جغرافیائی قانون سے بالاتر ہے۔ 1982 میں آپ کی اعلیٰ ادبی خدمات کے اعتراف میں گلڈ سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی

17 جون 1992 کو پاکستان کے نامور سائنسدان ڈاکٹر عشرت حسین عثمانی وفات پاگئے۔ ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی 15 اپریل 1917 کو پیدا ہوئے تھے بمبئی یونیورسٹی سے بی ایس سی کیا اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری لی۔ اور لندن یونیورسٹی سے مشہور نوبل انعام یافتہ سائنسدان جی پی تھامسن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1942 میں وطن واپس آکر انڈین سول سروس میں شامل ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے پاکستان کی سول سروس میں مختلف اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیں۔ آپ 1960 سے 1970 تک پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین رہے آپ ہی کے زمانے میں پاکستان انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کی بنیاد رکھی گئی اور کراچی میں کینپ کا نیوکلیئر پاور پلانٹ نصب کیا گیا۔ 1972 میں وزارت سائنس اور ٹیکنالوجی کے سیکریٹری مقرر ہوئے یہ وزارت آپ ہی کی تجویز پر قائم کی گئی تھی۔ آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو ستارہ پاکستان اور نشان امتیاز کے اعزازات عطا کیے گئے۔

نور احمد میرٹھی

18 جون 2011 کو اردو کے ممتاز محقق اور شاعر جناب نور احمد میرٹھی کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 17 جنوری 1948 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کے خاندان والے کراچی میں منتقل ہو گئے اور مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ بنیادی طور پر تحقیق کے آدمی تھے۔ آپ کی تصانیف میں اذکار وافکار (شعرائے لانڈی کورنگی)، نور سخن (غیر مسلم شعرا کی نعتوں کا انتخاب)، صابر براری کی تخلیقات تقرہ شعراء میرٹھ کے شاعر، میرٹھ کی شخصیات وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر منظر ایوبی

20 جون 2020 کو اردو کے ممتاز شاعر اور ماہر تعلیم پروفیسر منظر ایوبی کراچی میں وفات پاگئے اور سخی حسن کراچی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 4 اگست 1932 کو روہیل کھنڈ ضلع بدایوں یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے اسلامیہ اسکول وکالج سے میٹرک اور انٹر کے امتحان پاس کیے اور پھر اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے ادیب فاضل اور کراچی سے گریجویشن کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا اور پھر کچھ عرصہ مختلف نوکریاں کی اور پھر تدریس سے وابستہ ہو گئے اور مختلف گورنمنٹ کالجز میں پڑھاتے رہے یہاں تک کہ ریٹائر ہو گئے۔ آپ نے ایک ایسے شہر میں آنکھ کھولی تھی جو صدیوں سے علم وادب اور شعر وسخن کا گہوارہ رہا ہے۔ اسی لئے اس ماحول سے متاثر ہونا ایک فطری عمل تھا۔ آپ نے 1948 سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور جلد ہی بلند مقام حاصل کر لیا۔ آپ کے شعری مجموعے تکلم، مزاج، چڑھتا چاند ابھرتا سورج اور نئی پرانی آوازیں کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے تحقیقی مقالے ریڈیائی فیچر اور ڈرامے بھی لکھے جو بڑے مقبول ہوئے۔

پروفیسر شمیم احمد

20 جون 1993 کو اردو کے ممتاز نقاد دانشور اور ماہر تعلیم پروفیسر شمیم احمد کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 15 مارچ 1933 کو بارہ بنکی ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ اردو کے معروف شاعر اور مصنف سلیم احمد کے چھوٹے بھائی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں سکونت پذیر ہوئے اور جامعہ کراچی سے اردو ادب میں ایم اے کی سند حاصل کی۔ 10 سال بلوچستان یونیورسٹی میں شعبہ اردو سے وابستہ رہے اور بقیہ زندگی ریٹائرمنٹ جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے منسلک رہے۔ آپ کے فن اور شخصیت پر اب تک 7 طلباء نے ایم فل کے مقالے تحریر کر چکے ہیں۔ آپ نے بہت سی کتابیں تحریر کیں ان میں برش قلم، میری نظر میں اور تحریک پاکستان کا فکری تہذیبی اور ثقافتی پس منظر بہت مشہور ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی

20 جون 2018 کو اردو ادب کے عظیم مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی وفات پاگئے۔ آپ 4 اگست 1923 میں ضلع ٹونک، راجستان

کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کا مزاح نگاری اور بینکاری کے علاوہ ایک بڑا کارنامہ آپ کا اکیڈمک تعلیمی ریکارڈ ہے۔ مہاراجہ کالج جے پور سے آپ نے انٹرمیڈیٹ میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا اور اسی کالج سے انگریزی ادب، فلسفے اور تاریخ میں بی اے کے مضامین لے کر پھر پہلی پوزیشن حاصل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اسی طرح 1945 میں علی گڑھ یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن میں کر کے پھر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ آپ کا شاندار تعلیمی ریکارڈ قابل تعریف ہونے کے ساتھ ساتھ قابل رشک بھی ہے۔ 1946 میں پروینشل سول سروس میں آگئے۔ 1948 تک ڈپٹی کمشنر رہے اور پھر ہجرت کر کے حیدرآباد سندھ آگئے۔ جہاں مسلم کمرشل بینک جوائن کیا اور جنرل منیجر تک پہنچے پھر مختلف بینکوں میں ہوتے ہوئے آخر کار یوبی ایل کے صدر بن گئے۔ 1979 میں لندن چلے گئے اور بی سی سی آئی جوائن کر لیا اور 1990 میں ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی واپس آگئے اور اپنے آپ کو اردو ادب کے لیے وقف کر دیا۔ مزانگار ادیبوں میں آپ کا شمار اردو ادب کے صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے بقول ایک نقاد کے "ہم اردو مزاح کے عہد یوسفی میں جی رہے ہیں"۔ آپ نے بہت کم لکھا لیکن انتہائی معیاری لکھا آپ الفاظ کا انتخاب کرنے میں وقت نظر سے کام لیتے تھے۔ جملوں کی ساخت اور پرداخت اور ترکیب سازی پر جتنی محنت کرتے تھے دیگر مزاح نگار اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ کی پہلی کتاب چراغ تلے 1961 میں منظر عام پر آئی اس کے بعد خاکم بدہن، زرگزشت، آب گم اور شام شعر یاراں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی۔ آپ کی کتابوں پر آپ کو دو مرتبہ آدم جی ایوارڈ، ہجرہ ایوارڈ، بولان ایوارڈ، کمال فن ایوارڈ اور اس کے علاوہ حکومت پاکستان کی جانب سے آپ کی ادبی خدمات پر ہلال امتیاز بھی عطا کیا گیا۔

علامہ طالب جوہری

21 جون 2020 کو نامور عالم دین علامہ طالب جوہری کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی نیورضویہ میں اپنے مدرسے کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 27 اگست 1939 کو گورکھپور میں پیدا ہوئے جہاں آپ کے نانا بسلسلہ معاش مقیم تھے۔ آپ کا آبائی وطن حسین گنج سارن (بہار) ہندوستان تھا۔ آپ ایک ایسے علمی خانوادے کی معروف آٹھویں پشت میں تھے جو صدیوں سے تصنیف وتالیف اور تحقیق وتدریس میں پورے بہار میں معروف رہا ہے۔ آپ کے والد محمد مصطفی جوہر کا شمار برصغیر کے نامور علماء میں ہوتا تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد مولانا محمد مصطفی جوہر اور چچا مولانا محمد مرتضی اختر سے حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے دس سال تک اسلامی علوم کی بین الاقوامی درسگاہ نجف اشرف میں علوم اسلامی کی تعلیم حاصل کی۔ نجف اشرف سے واپس آکر آپ نے درسگاہ جامعہ امامیہ ناظم آباد میں 5 سال تک باحیثیت پرنسپل کام کیا۔ اس کے علاوہ آپ گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں ایک طویل عرصے تک تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور اسی کالج سے ریٹائر ہوئے۔ اسی دوران کراچی یونیورسٹی کے شعبہ معارف اسلامیہ میں کچھ عرصے کے لیے غیر ملکی طلباء کی تدریس بھی کی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے 2 بار رکن منتخب ہوئے اور ایک بار مجلس شوریٰ

حکومت پاکستان کے بھی رکن رہے۔ آپ بین الاقوامی شہرت کے حامل خطیب تھے اور برسوں پاکستان ٹیلی ویژن کی مجلس شام غریباں سے خطاب کرتے رہے۔ اس کے علاوہ پاکستان ٹیلی ویژن سے فہیم القرآن کے عنوان سے آپ کی تقریر کا سلسلہ نشر ہوا اور جب تک یہ سلسلہ چلتا رہا لوگوں کی توجہات کا مرکز رہا اور آج بھی لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔ 30 سال تک آپ محرم کے ایام میں نشتر پارک کراچی میں مجالس سے خطاب کرتے رہے جن میں ہر مکتبہ فکر کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ آپ کی بہت ساری تقریریں کتابیں صورت میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ آپ کی دیگر کتابوں میں علامات ظہور مہدی، نظام حیات انسانی، ذکر معصوم، حدیث کربلا اور اس کے علاوہ آپ نے تفسیر قرآن احسن الحدیث کے نام سے لکھی۔ آپ شعر و سخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور آپ کے شعری مجموعے حرف نمو میں غزلیں نظمیں مرثیہ اور قصیدہ سبھی کچھ شامل ہیں۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ امتیاز سے نوازا

اے ایم قریشی

22 جون 1989 تحریک پاکستان کے کارکن اور اسلامیہ کالج کراچی کے بانی جناب عبدالرحمٰن محمد قریشی کراچی میں وفات پاگئے اور اسلامیہ کالج کراچی کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 16 نومبر 1914 کو راجپوت کاٹھیاواڑ کے ایک انتہائی غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر سے ہی محنت مزدوری کرنا شروع کر دی تھی۔ آپ نے کراچی کے اندر گدھا گاڑی سے ٹرانسپورٹ کا کام شروع کیا اور رفتہ رفتہ کاروبار میں ترقی ہونے لگی اور تھوڑے ہی عرصے میں کراچی کے سب سے بڑے ٹرانسپورٹر بن گئے۔ 1946 کے الیکشن میں آپ نے اپنی پوری ٹرانسپورٹ سروس مسلم لیگ کے حوالے کر دی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد جب کراچی نئے ملک کا دارالحکومت بن گیا اور مہاجرین کا قافلہ در قافلہ اس شہر میں آنے لگے تو قریشی صاحب ہر طرح سے ان کی خدمت پر مامور ہو گئے۔ جب قائداعظم نے ملیر میں قیام کیا تو ان کی دیکھ بھال آپ ہی کے ذمے رکھی گئی۔ آپ کی اصل وجہ شہرت آپ کی تعلیمی خدمات ہیں آپ نے اسلامیہ کالج جو کہ پاکستان کے چند بڑے کالجوں میں سے ایک ہے بنایا اس کے علاوہ آپ نے کراچی میں اسی طرح 17 اور مختلف تعلیمی ادارے قائم کیے۔ آپ کی انہی خدمات کی بنا پر صدر ایوب خان آپ کو "سرسید ثانی" کہا کرتے تھے۔ آپ 1948 میں مسلم لیگ کراچی کے صدر منتخب ہوئے اور 1949 میں پاکستان مسلم لیگ کے خزانچی اور 1954 میں سندھ صوبائی مسلم لیگ بورڈ کے رکن بن گئے۔ 1956 میں کراچی کے حلقے سے مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن اور 1962 میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

عبیداللہ بیگ

22 جون 2012 کو پاکستان کے نامور کمپیئر، دانشور اور ادیب عبیداللہ بیگ کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ یکم اکتوبر 1936 کو رام پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی زندگی کی سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ آپ نے کسی کالج یا یونیورسٹی سے تعلیم حاصل نہیں کی

تھی۔ لیکن دینی مدارس، علمی اور تہذیبی اداروں سے وابستگی نے انہیں اعلی تعلیم یافتہ لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا تھا۔ آپ کو بے پناہ علم ہی کی وجہ سے ذرائع ابلاغ میں ایسا احترام حاصل تھا جو پاکستان میں بہت کم لوگوں کو ملتا ہے لوگ جو آپ سے محبت کرتے تھے وہ دراصل علم سے محبت کا اظہار ہے۔ آپ جب ٹیلی ویژن سے منسلک ہوئے تو پروگرام کسوٹی آپ کی پہچان بنا۔ جس میں آپ کے ساتھ قریش پور اور افتخار عارف شامل ہوتے تھے۔ مطالعہ کی وسعت حافظے کے کمال اور ذہانت کی لپک نے آپ کو راتوں رات شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ کسوٹی کے بعد آپ نے سیلانی کے نام سے ایک دستاویزی پروگرام پیش کیا جس نے ماحولیات اور جنگلی حیات کی نسبت سے مقبولیت کی ایک تاریخ رقم کی۔ 1973 میں باقاعدہ طور پر پاکستان ٹیلی ویژن سے بطور پروڈیوسر وابستہ ہوئے اور 1992 تک پاکستان ٹیلی ویژن کے صدر دفتر اسلام آباد میں شعبہ تعلقات عامہ میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی واپس لوٹ آئے اور ماحولیات کے مشہور ادارے آئی یو سی آئی میں خدمات انجام دینے لگے۔ آپ نے دو ناول بھی تحریر کیے "انسان زندہ ہو" اور "راجپوت"۔ حکومت پاکستان میں آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی بھی عطا کیا۔

امجد صابری

22 جون 2016 کو عالمی شہرت یافتہ قوال نعت خواں اور منقبت خواں امجد صابری کو کراچی کے علاقے لیاقت آباد میں نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے شہید کر دیا۔ آپ 23 دسمبر 1976 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا شمار جنوبی ایشیا کے نامور قوالوں میں ہوتا تھا۔ آپ کا تعلق برصغیر کے مشہور قوال گھرانے سے تھا آپ کے والد اور چچا غلام فرید صابری اور مقبول فرید صابری نے صابری برادران کے نام سے قوالی کی دنیا پر ہمیشہ راج کیا۔ آپ نے اپنے والد کے ساتھ 12 سال کی عمر میں قوالی گانا شروع کی۔ اور جب آپ نے اپنے مخصوص انداز میں اپنے والد کی قوالیوں کو پڑھنا شروع کیا تو یہ کلام جیسے امر ہو گئے جس میں تاجدار حرم بھر دو جھولی اور میرا کوئی نہیں تیرے سوا جیسی قوالیاں شامل ہیں۔ اپنی شہادت سے تھوڑی دیر پہلے جو آپ نے آخری نعت "کرم مانگتا ہوں" ٹی وی پر پڑھی وہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئی۔

اعظم کریوی

22 جون 1955 کو کراچی میں برصغیر کے ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر اعظم کریوی کو سفاکانہ طریقے سے قتل کر دیا گیا۔ آپ 1899 میں ضلع الہ آباد ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار اردو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے ہندوستانی معاشرت کی حامل کہانیاں لکھنے میں آپ بہت معروف تھے۔ آپ قدیم ہندی شاعری کے اردو ترجمہ کرنے کے لیے بھی جانے جاتے تھے۔ آپ کے خاندان اور آباء واجداد نے جنگ آزادی سے لے کر تحریک پاکستان تک بڑی قربانیاں دیں۔ آپ شاہ فیصل کالونی میں رہائش پذیر تھے اور سائیکل پر اپنے گھر واپس جا رہے تھے کہ راستے میں ڈرگ روڈ کے مقام پر پرتگال کے سفارت خانے کے سامنے نامعلوم افراد نے

بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ آپ کے افسانوی مجموعوں میں شیخ و برہمن، انقلاب، پریم کی چوڑیاں، دکھ سکھ اور دکھیا کی آپ بیتی کے نام سر فہرست ہیں۔ آپ کی یہ تمام کتابیں نایاب ہیں اور ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں دوبارہ شائع کیا جائے۔

سید محمد تقی

25جون1999 کو پاکستان کے نامور فلسفی، دانشور اور روزنامہ جنگ کراچی کے سابق مدیر سید محمد تقی وفات پاگئے۔ آپ 1917 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے دہلی یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم اے کیا تھا۔ آپ عظیم شاعر رئیس امروہی کے چھوٹے اور نامور شاعر جون ایلیا کے بڑے بھائی تھے۔ آپ کی تصانیف میں تاریخ اور کائنات میرا نظریہ، پراسرار کائنات اور فلسفہ اور تاریخ وغیرہ شامل ہیں اس کے علاوہ آپ نے کارل مارکس کی مشہور تصنیف داس کیپیٹل کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ آپ اردو لکھنے والوں میں پہلے صاحب نظام فلسفی ہیں اسی لیے آپ کا شمار پاکستان کے صف اول کے فلسفیوں اور دانشوروں میں ہوتا تھا۔ آپ نے اپنی زندگی بھر کے تدبر اور تحقیق کا خلاصہ اپنی مشہور کتاب "تاریخ اور کائنات میرا نظریہ" میں پیش کیا ہے۔

آپ کی تمام کتابیں اردو ادب کی سب سے بڑی آن لائن لائبریری ریختہ پر پڑھنے کے لئے دستیاب ہیں۔

کلیم عمر

25جون2009 کو انگریزی زبان کے معروف شاعر اور صحافی کلیم عمر کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1937 میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے روزنامہ اسٹار میں بطور صحافی اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ اور پھر دی نیوز میں بھی ایک عرصے تک رہے۔ آپ انگریزی کے بہت اچھے شاعر تھے آپ کا شمار انگریزی زبان کے بڑے شاعروں میں کیا جاتا تھا۔ آپ کا شعری مجموعہ 1975 میں worldfall کے نام سے شائع ہوا تھا

وسیم عون جعفری

28جون2011 کو پاکستان کے سابق سول سرونٹ، سابق گورنر اسٹیٹ بینک اور ماہر مالیات وسیم عون جعفری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 29مارچ1925 کو الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد جو پہلا سول سروسز کا امتحان ہوا اس میں شریک ہوئے اور کامیابی حاصل کی۔ مختلف انتظامی اور صوبائی حکومتوں کے سیکرٹری محکمہ خزانہ رہے بعد ازاں پلاننگ کمیشن آف پاکستان کے ڈپٹی چیئرمین مقرر ہوئے۔ 10جولائی1986 سے 16اگست1988 تک آپ اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں گورنر کے عہدے پر فائز رہے۔ آپ مشہور ماہر مالیات نور الحسن جعفری کے کزن اور مشہور شاعرہ ادا جعفری کے برادر نسبتی تھے۔

خالد شمس الحسن

30جون1995 کو تحریک پاکستان کے کارکن، ممتاز بینک کار اور مصنف خالد شمس الحسن کراچی میں وفات پاگئے۔

آپ 1926 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ سید شمس الحسن جو قائد اعظم کے رفیق کار اور آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکریٹری

تھے ان کے بڑے صاحبزادے تھے۔ آپ نے اپنے والد کی دستاویزات کو جمع کر کے 98 جلدوں میں شمس الحسن کلکشن کے نام سے مرتب کیا اور اس کلیکشن کی مدد سے آپ نے خود بھی مزید چار کتابیں تالیف کیں۔ 2010 میں حکومت پاکستان میں آپ کی خدمات کے اعتراف میں بعد از مرگ ستارہ امتیاز عطا کیا۔

رفعت القاسمی

30 جون 2010 کو ممتاز شاعر اور بینکار رفعت القاسمی کراچی میں وفات پا گئے۔

آپ 1934 میں شیخ پور صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اردو فارسی اور عربی کی تعلیم گھر میں ہی حاصل کی اور علامہ عبدالعزیز میمنی کے آپ براہ راست شاگرد بھی رہے جس پر آپ کو ہمیشہ فخر تھا۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے آپ کلکتہ چلے گئے جہاں تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے تاریخ اسلام میں ایم اے کیا اور عربی ادب میں بھی سند امتیاز کے ساتھ حاصل کی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد آپ نے الہ آباد بینک کلکتہ سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور یہیں پر بینکاری کا وسیع تجربہ اور پوری تربیت حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ بینک آف بہاولپور میں مینیجر اور پھر چیف اکاؤنٹس آفیسر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ پھر آپ کراچی آگئے اور اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر نیشنل کمرشل بینک لمیٹڈ قائم کرنے میں نمایاں حصہ لیا اور اس کے بھی چیف اکاؤنٹس آفیسر مقرر ہوئے۔ کچھ عرصے سٹی بینک میں اسپیکٹر آف برانچز کے عہدے پر بھی فائز ہوئے۔ 1963 میں پریمیئر بینک لمیٹڈ قائم کرنے کی اجازت اپنے ذاتی نام پر حاصل کی اور اس میں ڈائریکٹر اور مشیر اعلی مقرر ہوئے۔ پاکستان کی بینکاری کی ڈائریکٹری میں ایک ممتاز بینکار کی حیثیت سے آپ کے سوانح حیات درج کیے گئے ہیں۔ آپ ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر بھی تھے مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے پھر مگر شعر و سخن کا ذوق بچپن سے کی تھا۔ آپ پاکستان اردو اکادمی کے نائب صدر، ادارہ ادبیات اردو کے جنرل سیکریٹری اور پاکستان عربی اکادمی کے رکن بھی رہے۔ اس کے علاوہ آپ اکثر علمی و ادبی مضامین بھی لکھتے۔ آپ کی غزلوں کے دو دیوان "دکھ پیغمبری کے" اور "عشق نہ تمام" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔

زیبا ردولوی

یکم جولائی 1968 کو معروف شاعر زیبا ردولوی وفات پا گئے۔ آپ 14 اکتوبر 1908 کو محلہ مخدوم زادہ ضلع بارہ بنکی یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سید علی حسنین تھا جبکہ زیبا آپ کا تخلص تھا۔ آپ کے والد اور دادا دونوں 1857 کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے تھے۔ آپ نے اردو میں ایم-اے عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے کیا۔ جب کہ شاعری اور

ادبی تحقیق میں نظم طباطبائی مرحوم اور جناب نجم آفندی سے مشورہ سخن کیا۔ آپ کی تصانیف میں مطالعہ انیس 600 صفحات پر مشتمل تحقیقی مقالہ ہے جو انجمن ترقی اردو دہلی کے لئے لکھا جو اب تک غیر مطبوعہ ہے اس کے علاوہ گلہائے زیبا اور نم جان نظمیں اور غزلیں کراچی سے شائع ہوئیں۔

مختار زمن

2 جولائی 2003 کو معروف صحافی مختار زمن کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 21 فروری 1923 کو بجنور ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی سے آپ نے انگریزی میں ایم اے اور پھر ایل ایل بی کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ آپ ہی نے پاکستان بننے کے عظیم واقعے کی تفصیلات کی رپورٹ تحریر کیں۔ آپ ملکی اور غیر ملکی بہت سے اخبارات سے وابستہ رہے۔ 1979 سے 1973 تک بی بی سی اردو سروس سے بھی منسلک رہے۔ وطن واپس آکر اے پی پی کراچی کے بیورو چیف مقرر ہوئے اور ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ آپ بے شمار تنظیموں کے عہدے دار رہے۔ آپ نے بہت ساری بین الاقوامی شخصیات کا انٹرویو کیا۔ آپ نے سیاسی وادبی موضوعات پر انگریزی اور اردو میں 200 سے زیادہ مقالات لکھے۔ آپ کے مضامین کا پہلا مجموعہ باتوں کے خربوزے شائع ہوا۔ آپ نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی جس کا بعد میں اردو ترجمہ تحریک پاکستان میں طلبہ کا حصہ کے نام سے ہوا۔ اس کے علاوہ بھی آپ کے مضامین کی کئی کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔

حمید کاشمیری

6 جولائی 2003 کو معروف افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار حمید کاشمیری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ کا اصل نام عبدالحمید تھا اور آپ یکم جون 1929 کو بانسرہ گلی تحصیل مری ضلع راولپنڈی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ انتہائی فعال ادیب تھے آپ نے لاتعداد افسانے اور ٹیلی ویژن کے لئے بے شمار انفرادی ڈرامے اور ڈرامہ سیریز تحریر کیے۔ آپ کے ڈرامہ سیریز میں اعتراف، روزن زنداں، شکست آرزو اور کشکول بہت مشہور ہیں۔ اس کے علاوہ آپ مختلف اخبارات میں کالم بھی لکھتے رہے۔ کراچی میں صدر کے مقام پر کتابوں کی ایک دوکان بھی کھولی جو آپ سے چل نہ سکی۔ آپ کی ادبی خدمات کے اعتراف میں نگار ایوارڈ دو مرتبہ عوامی ایوارڈ ہیومن رائٹس ایوارڈ اور متعدد ثقافتی ایوارڈ مل چکے ہیں۔

ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی

6 جولائی 2016 کو نامور فلسفی مورخ، عربی زبان کے ماہر اور علمی شخصیت ڈاکٹر سید رضوان علی ندوی عید کے دن کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1927ء کو رام پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے 9 برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کی ڈگری حاصل کی اور پھر رام پور کے ایک ہائی اسکول میں اردو پڑھانا شروع کی۔ ندوۃ العلماء سے آپ نے اسلامی علوم میں ڈپلومہ کیا اور پھر مدینہ منورہ میں بہت سے اساتذہ سے فیض حاصل کیا۔ 2 برس مصر میں تحقیق اور مطالعے میں

مشغول رہے اور پھر 1963 میں کیمرج یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ کئی عرصے تک آپ بطور معلم کیمبرج یونیورسٹی کنگ سعود یونیورسٹی ریاض اور دیگر غیر ملکی جامعات سے منسلک رہے۔ 1987 میں آپ کراچی واپس تشریف لے آئے. آپ کی اردو تصانیف میں تحریک اخوان المسلمین، تحقیقات وتاثرات، خانوادہ نبوی اور عہد بنو امیہ اور عربوں کے علوم وفنون اور عالمی تہذیب کی تمدن اور ترقی میں ان کا کردار شامل ہیں۔ عربی میں آپ نے 7 کتب تحریر کیں اس کے علاوہ انگریزی میں بھی آپ کی 2 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

جسٹس ایم بی احمد

7 جولائی 1979 کو پاکستان کے نامور ماہر قانون جسٹس ایم بی احمد کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ کا پورا نام محمد بشیر احمد تھا اور آپ 1911 میں لکھنؤ کے قریب ایک گاؤں میں پید ہوئے تھے۔ آپ آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ دستور ساز اسمبلی کے پہلے سیکرٹری بنے اور مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج رہے۔ 1961 میں آپ کی خدمات حکومت نائجیریا نے حاصل کرلیں آپ 1967 تک نائجیریا کے چیف جسٹس رہے اور اسی دوران نائجیریا کا آئین بھی بنایا۔

عبدالستار ایدھی

8 جولائی 2016 کو دکھی انسانیت کی خدمت کرنے والے صدی کے سب سے بڑے سماجی کارکن اور فخر پاکستان عبدالستار ایدھی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 28 فروری 1928 کو ریاست جوناگڑھ کے شہر بانٹوا میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آگئے۔ 1951 میں ایک ڈسپنسری کھول کر اپنے سماجی کاموں کا آغاز کیا جو اب بھی ان کی موت کے بعد جاری وساری ہیں۔ آپ نے لوگوں کے عطیات اور چندوں سے دنیا کی سب سے بڑی ایمبولینس سروس بنائی اس کے علاوہ یتیم خانے مردہ خانے شیلٹر ہومز اولڈ ایج ہومز میٹرنیٹی وارڈز اور ساتھ ساتھ لاوارث اور تعفن زدہ میں تو کو اپنے ہاتھوں سے غسل دیتے تھے۔ حکومت پاکستان نے آپ کو نشان امتیاز سے نوازا جب کہ افواج پاکستان کی طرف سے شیڈول آف آنر پیش کی گئی جبکہ حکومت سندھ نے آپ کو سوشل ورکر آف داسب کانٹینٹ کا خطاب دیا۔ اسی طرح سے فلپائن روس اور اٹلی کی حکومتوں کی طرف سے بھی آپ کو اعلیٰ ترین ایوارڈ ملے جب کہ آئی بی اے کراچی کی جانب سے آپ کو پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری بھی دی گئی۔ آپ کے انتقال کی خبر نشر ہوتے ہی پورا ملک سوگ میں ڈوب گیا حکومت پاکستان نے ایک روزہ قومی سوگ کا اعلان کیا اور قومی پرچم سرنگوں رہا۔ آپ کے جنازے کو 21 توپوں کی سلامی بھی دی گئی جبکہ آپ کے جنازے میں صدر پاکستان سے لے کر روڈ پر چلنے والے گداگر تک شامل تھے۔

پروفیسر منظور حسین شور

8 جولائی 1994 کو اردو فارسی کے ممتاز شاعر ادیب نقاد ماہر تعلیم پروفیسر منظور حسین شور کراچی میں وفات پا گئے اور سخی حسن کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ جولائی 1910 میں امراوتی برار میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے آپ نے اردو

فارسی اور انگریزی میں ماسٹرز کیا اور درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ آپ ناگپور یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی سے منسلک رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ گجرات، فیصل آباد اور کراچی کے تعلیمی اداروں سے وابستہ رہے آپ کی تصانیف میں نبض، دور و دیوار، میرے معبود اور رباعیات کا مجموعہ ذہین کو ضمیر کے نام شامل ہیں۔

محترمہ فاطمہ جناح

9 جولائی 1967 کو مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ 31 جولائی 1894 کو کراچی میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ قائداعظم محمد علی جناح کی چھوٹی بہن تھی مگر ایسی بہن جس نے اپنے بھائی کے نصب العین کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔ آپ نے کلکتہ کے ڈاکٹر احمد ڈینٹل کالج سے دندان سازی کی سند لی تھی اور بمبئی میں اپنا کلینک کھول کر پریکٹس کرتی تھیں۔ 1929 میں جب قائداعظم کی رفیق حیات کا انتقال ہو گیا تو اپنا سارا کام چھوڑ کر بھائی کے پاس آگئی اور ان کا گھر سنبھال لیا تاکہ وہ گھر کی پریشانیوں سے آزاد رہیں اور تحریک پاکستان میں بھی ان کے ساتھ رہنے کے کے علاوہ مسلم خواتین کی تنظیم کی اور انہیں فعال بنا کر میدان عمل میں لائیں۔ جب قائداعظم گورنر جنرل بنے تو آپ کو پاکستان کی پہلی خاتون اول کا اعزاز حاصل ہوا لیکن قوم نے آپ کو مادر ملت کہا اور سمجھا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد آپ نے اپنے آپ کو عملی سیاست سے الگ کر لیا مگر 1964 کے صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح نے خود بھی صدارتی امیدوار کے طور پر بھرپور حصہ لیا مگر ایوب خان کی سیاسی مشینری اور بیروکریسی کی سازشوں کے ہاتھوں شکست ہو گئی۔ آپ نے قائداعظم کے اوپر ایک کتاب My brother کے نام سے بھی لکھی جو کہ "میرا بھائی" کے نام سے ترجمہ ہوئی۔ اس میں قائداعظم کے آباؤاجداد سے لیکر ان کی وفات تک کے تمام واقعات درج ہیں.

جمال پانی پتی

10 جولائی 2005 کو اردو کے ممتاز شاعر، نقاد اور مترجم جمال پانی پتی کراچی میں وفات پا گئے۔
آپ 15 جون 1927 کو پانی پت میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام گلزار احمد قریشی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور وفاقی حکومت کے مختلف عہدوں سے وابستہ رہے۔ 1958 میں جب دارالخلافہ اسلام آباد منتقل ہوا تو آپ نے استعفی دے دیا اور نیشنل بینک آف پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ 1987 میں اپنی ریٹائرمنٹ تک نیشنل بینک آف پاکستان ہی سے منسلک رہے۔ آپ نے غزل سے اپنی شاعری کی ابتدا کی اور آگے چل کر بھی زیادہ تر غزل ہی لکھیں درمیان میں آپ کو دوہے کہنے کا شوق ہو گیا اور اچھے خاصے دوہے کہے۔ ایک زمانے میں آپ کی توجہ تنقید نگاری کی طرف بھی ہو گئی تھی۔ آپ کی تصانیف میں ادب روایت، قدیم تہذیبیں افہام و تفہیم اور نفی سے اثبات تک شامل ہیں۔

محمود علی

11 جولائی 2018 کو ریڈیو، ٹیلی ویژن، اسٹیج اور فلموں کے معروف فنکار محمود علی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1928 میں

حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ 1945 میں آپ نے آل انڈیا ریڈیو سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا۔ 1950 میں آپ بطور اسٹاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ آپ نے ریڈیو پاکستان کے مشہور ڈرامہ سیریز حامد میاں کے ہاں 50 سال تک اپنی آواز کا جادو جگایا۔ اس کے علاوہ خواجہ معین الدین کے لافانی اسٹیج ڈراموں مرزا غالب بندر روڈ پر، لال قلعہ سے لالو کھیت تک اور تعلیم بالغان وغیرہ میں بھی کردار ادا کیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے بھی متعدد ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے جن میں خدا کی بستی لیلا مجنو، تعبیر، شہزوری، کرن کہانی، آنچ، افشاں وغیرہ شامل ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو تمغائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

شور صہبائی

12 جولائی 2018 کو مشہور افسانہ نگار شور صہبائی کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ 1928 کو لکھنؤ شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام اقبال رضا خان تھا۔ آپ کے دادا نواب سلطان علی خاں فگار لکھنوی باکمال قصیدہ گو تھے اور آپ کے والد کاظم علی خاں وقار لکھنوی شاگرد رشید آرزو لکھنوی کا شمار ممتاز شعراء میں ہوتا تھا۔ اگرچہ اقبال رضا خاں کو شاعرانہ ماحول وراثت میں ملا تھا مگر آپ نے نظم کے بجائے نثر کو اپنایا اور 13 سال کی عمر سے افسانہ نگاری شروع کی۔ آپ کا پہلا افسانہ "نرالی دنیا" دہلی میں چھپا۔ 1947 میں آپ کا پہلا مجموعہ "کانٹے" کے نام سے شائع ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور ماہنامہ "عکس لطیف" میں افسانے لکھنا شروع کیے۔ 1970 میں آپ کا ناول ناول "رشکِ بہاراں" شائع ہوا۔ 2002 میں آپ کے خاکوں کا مجموعہ "حرفِ برہنہ" شائع کیا۔ آپ کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ "آرزوؤں کے چراغ" زیر طباعت ہے۔

آغا ناصر

12 جولائی 2016 کو پاکستان کے نامور براڈکاسٹر اور متعدد کتابوں کے مصنف آغا ناصر اسلام آباد میں وفات پا گئے۔ آپ 9 فروری 1937 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں جانگیر کوارٹرز میں سکونت اختیار کی اور کراچی یونیورسٹی سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ 1955 میں آپ نے ریڈیو پاکستان سے بطور براڈکاسٹر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ ریڈیو پاکستان میں آپ نے "اسٹوڈیو 9" اور "حامد میاں کہ ہاں" جیسے لازوال پروگرام کیے۔ 1964 میں آپ پاکستان ٹیلی ویژن سے وابستہ ہو گئے جہاں پر مختلف عہدوں پر کام کیا اور تھوڑے عرصے کے لیے پی ٹی وی کے مینیجنگ ڈائریکٹر بھی رہے۔ پی ٹی وی میں آپ کی یادگار تخلیقات میں الف نون، تعلیم بالغاں اور الیکشن 1970 کی براہ راست نشریات شامل ہیں۔ آپ کی کتابوں کے مصنف بھی ہیں جن میں 7 ڈرامے، گمشدہ لوگ، گلشن یاد اور ہم جیتے جی مصروف رہے کے نام سر فہرست ہیں۔ حکومت پاکستان میں آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

زیڈاے بخاری

12 جولائی 1975 کو اردو کے ممتاز شاعر، صداکار اور ماہر نشریات جناب زیڈاے بخاری کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ کا پورا نام ذوالفقار علی بخاری تھا اور آپ 1904 میں پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ اردو کے عظیم مزاح نگار پطرس بخاری کے چھوٹے بھائی تھے۔ 1936 میں جب آل انڈیا ریڈیو کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس سے منسلک ہو گئے پھر آپ کا یہ ساتھ زندگی بھر جاری رہا اور بخاری صاحب اور ریڈیو ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہو گئے۔ 1938 میں بی بی سی لندن میں براڈکاسٹنگ کی تربیت حاصل کی اور بمبئی اور کلکتہ ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر جنرل مقرر ہوئے اور جب 1967 میں کراچی میں ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم ہوا تو آپ اس کے پہلے جنرل مینیجر ہی مقرر ہوئے۔ آپ کو فارسی، انگریزی، اردو، بنگالی، پشتو اور پنجابی زبانوں پر مکمل عبور حاصل تھا۔ ہر سال ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر مرثیہ خوانی بھی کرتے تھے۔ آپ ایک بہترین ایڈمنسٹریٹر تھے۔ آپ لوگوں کی شناخت رکھنے میں بہت ماہر تھے اس لیے ہر دور میں آپ کے پاس ایک بہترین ٹیم ہوتی تھی۔ آپ نے اپنی حالات زندگی "سرگزشت" کے نام سے رقم کی جو اردو نثری ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ اس کتاب میں آپ کے واقعات اس قدر دلچسپ ہیں اور طرز بیاں ایسا شگفتہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کتاب ختم ہی نہ ہو.

یکتاامروہی

14 جولائی 2003 کو نامور شاعر یکتاامروہی

کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1911 میں امروہہ میں پیدا ہوئے تھے آپ کا اصل نام سید واحد علی تھا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم نوگانواں سے حاصل کی اور مزید تعلیم میرٹھ کے عربی کالج سے حاصل کی اور الہ آباد یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر دہلی میں نیشنل پبلک لائبریری کے مہتمم مقرر ہوئے اور اس لائبریری کے ماہانہ "قوم" میں باحثیت ایڈیٹر بھی خدمات انجام دیں۔ آپ نے سخن پرور بستی امروہہ میں آنکھ کھولی تھی لہذا بچپن ہی سے آپ کی طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ آپ نے غزلیں نظمیں گیت اور نعت لکھی جو آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوا کرتی تھی۔ آپ نے بچوں کے لیے سیکڑوں نظم اور طویل دلچسپ کہانیاں لکھیں جن کے عنوان بھی بڑے دلچسپ منتخب کرتے تھے۔ 1947 میں جو فساد برپا ہوا اس سے متاثر ہو کر آپ نے ایک کتاب "خونی ہے ہندوستان" لکھی جس کی ہر طبقہ فکر میں بڑی شہرت اور بے حد پذیرائی ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کچھ عرصہ کراچی میں قیام پذیر رہے اور پھر خیر پور میرس چلے گئے جہاں والی خیر پور میر علی تالپور کے اتالیق مقرر ہوئے۔ خیر پور میں بھی اپنے ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رکھا اور سہ روزہ "مراد" اور بچوں کا ایک رسالہ "کہانی" کے عنوان سے جاری کیا۔

حمایت علی شاعر

14 جولائی 2019 کو نامور شاعر حمایت علی شاعر ٹورانٹو کینیڈا میں وفات پا گئے اور وہیں آسودہ خاک ہوئے. آپ 14 جولائی

1926 کو اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام میر حمایت علی تھا۔ آپ نے اورنگ آباد سے ہی میٹرک کیا اور پھر ریڈیو حیدر آباد دکن سے وابستہ ہو گئے۔ سقوط حیدر آباد کے بعد آپ پاکستان آ گئے جہاں کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور ریڈیو پاکستان کراچی میں ملازمت اختیار کی۔ جب ریڈیو پاکستان حیدر آباد قائم ہوا تو آپ کا ٹرانسفر وہاں ہو گیا۔ حیدر آباد میں آپ نے نوکری کے ساتھ ساتھ انٹر بی اے اور ایم اے کے امتحان پاس کیے۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد آپ نے ریڈیو کو خیر باد کہا اور درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا اور سچل کالج حیدر آباد اور سندھ یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ شعر و سخن کا شوق آپ کو بچپن سے ہی تھا۔ آپ کے اب تک 9 شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جب کہ دو کتابیں نثر میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ نے ٹیلی ویژن پر کئی تحقیقی پروگرامز پیش کیے جن میں پانچ سو سالہ علاقائی زبانوں کے شعرا کا اردو کلام خوشبو کا سفر کے نام سے اور اردو نعتیہ شاعری کے 700 سال پر ترتیب دیا گیا پروگرام عقیدت کا سفر شامل ہیں۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔ اس کے علاوہ نگار ایوارڈ رائٹرز گلڈ ایوارڈ آدم جی ایوارڈ عثمانیہ گولڈ میڈل وغیرہ سے بھی نوازا گیا۔

امیر حسین چمن

14 جولائی 2020 کو ممتاز صحافی و ادیب افسانہ نگار اور خاکہ نگار امیر حسین چمن کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی میں ہیں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 4 جولائی 1947 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ کراچی یونیورسٹی سے آپ نے ایم اے صحافت کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز روزنامہ نئی روشنی کراچی سے کیا۔ آپ نے کافی عرصے تک ہفت روزہ چٹان کے لیے بطور نمائندہ کراچی کے طور پر کام کیا۔ اس کے علاوہ آپ نے روزنامہ جنگ، انجام، مساوات اور مشرق کراچی کے علاوہ لیل و نہار، اخبار جہاں، عالمی ڈائجسٹ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی بحیثیت فری لانس جرنلسٹ اور رائٹر کام کیا۔ آپ کی شائع کردہ کتابوں میں "ممبر کا دوسرا نام" جس کا پہلا ایڈیشن صرف پانچ دن میں فروخت ہونے کا شاندار ریکارڈ آج بھی قائم ہے۔ اس کے علاوہ میری یادگار ملاقاتیں، صحرا کی اذان اور نامور کھلاڑی دلچسپ واقعات وغیرہ شامل ہیں۔

اختر حسین

15 جولائی 1983 کو اردو کے خدمت گزار اور سابق سول سرونٹ جناب اختر حسین کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ یکم مارچ 1902 کو برہان پور (سی پی) میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے آپ نے ایم اے کیا تھا۔ 1924 میں انڈین سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں شریک ہوئے اور نمایاں حیثیت میں کامیابی حاصل کی اور گوجرانوالہ کے اسسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے اور پھر پنجاب کے متعدد اضلاع میں بحیثیت اسسٹنٹ کمشنر اور کمشنر اپنے فرائض انجام دیئے۔ جب آپ سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر تھے تو قائد اعظم سیالکوٹ کے دورے پر آئے تو آپ نے قائد اعظم کو اپنے گھر قیام کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے قبول کر لی جس پر بااثر وزیر بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ یہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے بھی قیام پاکستان کی اندرون خانہ مدد کر رہا ہے۔ قیام پاکستان کے

بعد بھی آپ متعدد اہم عہدوں پر خدمات انجام دیتے رہے جن میں سیکریٹری وزارت دفاع گورنر مغربی پاکستان وفاقی وزیر اطلاعات اور چیف سیکرٹری پنجاب کے عہدے شامل تھے۔ آپ ادب پرور اور ادیب دوست انسان تھے۔ اپنے دور میں آپ نے فیصلے اردو میں لکھے جو آج آپ کی یادگار ہیں۔ بابائے اردو کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو کے صدر بنے اور پھر انہوں نے تمام عمر اس ادارے کے لیے وقف کر دی۔ اردو سائنس کالج کے لیے زمین کا حصول اور کالج کی تعمیر آپ کا ذریعہ کارنامہ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹر آف لاء کی اعزازی ڈگری سے نوازا جبکہ حکومت پاکستان نے آپ کی علمی خدمات کے اعتراف میں ہلال پاکستان عطا کیا۔

علامہ سید ابن حسن جارچوی

16 جولائی 1977 کو ممتاز عالم دین اور تحریک پاکستان کے رہنما علامہ سید ابن حسن جارچوی وفات پا گئے۔ آپ 21 مارچ 1904 کو جارچہ ضلع بلند شہر (ہندوستان) میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے. 5 برس کی عمر میں یتیم ہو گئے تھے چنانچہ آپ کی پرورش آپ کے نانا نے کی ابتدائی تعلیم میرٹھ سے حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اور ایم اوایل کیا علیگڑھ یونیورسٹی سے بی ٹی کی اسناد حاصل کیں۔ رامپور اورینٹل کالج سے منشی فاضل اور عربی اور فارسی میں بھی سندیں حاصل کیں۔ مدرسہ ناظمیہ اور مدرسہ الواعظین لکھنؤ سے بھی تحصیل علم کیا۔ آپ عربی فارسی انگریزی اردو اور سندھی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ 1931 سے 1938 تک آپ جامعہ ملیہ کالج دہلی میں استاد رہے۔ 1938 میں محمود آباد آ گئے جہاں آپ راجہ صاحب محمود آباد کے اتالیق رہے۔ لکھنؤ میں راجہ صاحب محمود آباد کی قائم کردہ اکیڈمی کے ڈائریکٹر بھی رہے اور دار التصنیف و تالیف امیریا میں بھی قابل قدر علمی و تحقیقی کام کیا۔ صوبہ یوپی کے سینٹرل وقف بورڈ کے صدر بھی رہے۔ 1935 سے آپ نے مسلم لیگ کے جلسوں میں تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ آپ مسلم لیگ سے جنون کی حد تک وابستہ تھے اور تحریک پاکستان کے دوران اس کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے۔

1945 میں جب کرپس مشن ہندوستان آیا تو اس نے قائد اعظم سے کہا کہ آپ پاکستان دینی بنیاد پر بنانا چاہتے ہیں تو اس سلسلے میں دو قومی نظریے کا دینی پس منظر واضح کیا جائے۔ قائد اعظم نے دو قومی نظریے کی وضاحت کے لیے علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ آپ ہی کو بھیجا آپ قائد اعظم اور ان کے رفقاء کی پہلی صف میں شامل تھے۔ آپ قیام پاکستان کے بعد جامعہ کراچی کے شعبہ اسلامیات سے منسلک ہو گئے اور 1972 میں جامعہ کراچی سے ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی میں اسلامک کلچر اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا مگر اس کی تعمیر مکمل ہونے سے پہلے ہی رحلت کر گئے اور آپ اسی انسٹیٹیوٹ کے احاطے میں آسودہ خاک ہیں۔

ادیب سہارنپوری

16 جولائی 1963 کو اردو کے معروف شاعر جناب ادیب سہارنپوری کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ کا اصل نام عبدالرؤف تھا۔ آپ کی زندگی کا زیادہ تر حصہ ریاست اندور (ہندوستان) میں گزرا جہاں آپ شاعری کے علاوہ گزر بسر کرنے کے لیے چھوٹا سا کاروبار کیا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں سکونت پذیر ہو گئے اور نیوی میں نوکری کر لی۔ آپ کا مجموعہ کلام رنگ و آہنگ کے نام سے اشاعت پذیر ہوا تھا۔

فقیر سید وحید الدین

16 جولائی 1968 کو پاکستان کے ممتاز ادیب فقیر سید وحید الدین کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1903 میں لاہور کے مشہور "فقیر" خانوادے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد علامہ اقبال کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ آپ کو بھی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علامہ اقبال کی صحبت میں بسر کرنے کا موقع ملا۔ 1950 میں آپ نے علامہ اقبال کے حالات پر اپنی ذاتی یادداشتوں کی مدد سے ایک کتاب "روزگار فقیر" شائع کی جو بے حد مقبول ہوئی۔ 1964 میں اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی شائع ہو گیا۔ روزگار فقیر کے علاوہ آپ کی دیگر تصانیف میں محسن اعظم و محسنین اور شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ انجمن شامل ہے۔

محمد حسین صدیقی

17 جولائی 1969 محمد حسین صدیقی کراچی میں وفات پا گئے اور پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 17 جولائی 1929 کو پیدا ہوئے تھے آپ کا آبائی وطن امروہہ تھا۔ ابتدائی تعلیم امروہہ سے ہی حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ پاکستان آکر آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اس کے بعد ایف اے, بی اے کے امتحانات دیے۔ پھر ایل ایل بی کے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے اور بعد میں ایم اے فارسی کا امتحان بھی پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر بطور وکیل اپنی پروفیشنل زندگی کا آغاز کیا۔ آپ کو اردو فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں کی نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی۔ آپ نے تینوں زبانوں میں کلام منظوم کیا لیکن بدقسمتی سے محفوظ نہ رہ سکا۔ آپ کے افسانے پاکستان کے مختلف میگزین میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کی خواہش تھی کہ سیرت پر ایسی کتاب لکھی جائے جو کہ فرائیڈ، یونگ اور مارکس کے جدید نظریات وافکار کی نفی ہو اور اس وقت کے مغربی ذہن کو اپیل کرے۔ ابھی آپ اس کی تیاری میں ہی تھے کہ زندگی نے وفا نہ کی اور چالیس سال کی عمر میں ہی وفات پا گئے۔

مولانا محمد عبدالحامد بدایونی

20 جولائی 1970 کو برصغیر کے معروف عالم دین اور تحریک پاکستان کے رہنما مولانا محمد عبدالحامد بدایونی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 11 نومبر 1898 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ قادریہ اور پھر مدرسہ الٰہیہ کانپور میں حاصل کی۔ 23 مارچ 1940 کو جب قرارداد پاکستان پیش کی گئی تو قرارداد کی تائید میں آپ نے تقریر کی۔ 1941 میں لدھیانہ میں آپ کی صدارت میں پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی اور اس میں آپ نے پاکستان کے حق میں بڑا بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ جو بعد میں نظامی پریس بدایوں سے چھپ کر ملک بھر میں تقسیم ہوا۔ جب قائد اعظم اور والی حیدر آباد دکن میں اختلافات ہوئے تو لیاقت علی خان کے کہنے پر آپ ہی نے ان دونوں کے درمیان کشیدگی کو ختم کروایا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ نے 12 سے زیادہ کتابیں لکھیں۔ جن میں فلسفہ عبادت اسلامی، نظام عمل، اسلام کا زراعتی نظام، اسلام کا معاشی نظام، حرمت سود اور ہند و حکمرانی کا ہولناک تجربہ وغیرہ شامل ہیں.

پروفیسر حسن اکبر کمال

21 جولائی 2017 کو معروف شاعر، نغمہ نگار، ناقد اور ماہر تعلیم پروفیسر حسن اکبر کمال کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 14 فروری 1946 کو شاہ گنج آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کا خاندان سکھر میں سکونت پذیر ہوا۔ آپ نے سندھ یونیورسٹی جامشورو سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا اور تدریس کے پیشے سے وابستہ ہو گئے اور سندھ کے مختلف کالجز کے اندر اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ نے بہت کم عمری سے ہی شاعری کا آغاز کر دیا تھا آپ غزل گیت نگاری نعت سلام و منقبت نگاری میں یکساں دسترس رکھتے تھے۔ مشہور ملی نغمے "تیرا کرم مولا" اور "ہم ہیں پاکستانی ہم تو جیتیں گے" آپ ہی کے تحریر کردہ ہیں۔ آپ کے شعری مجموعے سخن، خزاں میرا موسم، خوشبو جیسی بات کرو اور التجا کے نام سے شائع ہو چکے ہیں جبکہ آپ کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "کمال کے مضامین" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ آپ نے بچوں کے لئے بھی متعدد ناول تحریر کیے۔ آپ کے شعری مجموعے خزاں میرا موسم پر آپ کو آدم جی ایوارڈ عطا کیا گیا۔

معراج محمد خان

21 جولائی 2016 کو بزرگ سیاستدان اور فلسفی معراج محمد خان وفات پا گئے۔ آپ 22 اکتوبر 1938 کو ریاست اتر پردیش کے شہر فرخ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کا خاندان ہجرت کر کے کوئٹہ آ گیا تھا۔ آپ نے میٹرک کوئٹہ سے کیا اور کراچی اگر ڈی جے سائنس کالج کراچی اور پھر جامعہ کراچی سے تعلیم حاصل کی۔ آپ نہایت پر جوش طالب علم لیڈر رہتے تھے۔ آپ ان بارہ طلبہ کے لیڈر رہتے تھے جنہوں نے احتجاج کر کر کے ایوب خان کے ناک میں دم کر دیا تھا اور آخر کار حکومت نے 1961 میں آپ سمیت بارہ طالب لیڈرز کو کراچی بدر کر دیا تھا۔ آپ کو تین سیاسی جماعتوں کی بنیاد رکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ 1967 میں بھٹو صاحب کے ساتھ مل کر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی پھر بھٹو صاحب سے اختلافات کی وجہ سے علیحدہ ہو گئے پھر اپنی سیاسی جماعت بنائی جس کا نام قومی محاذ آزادی رکھا پھر 1998 میں اپنی پارٹی کو پاکستان تحریک انصاف میں ضم کر دیا اور اس کے جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ 2003 میں عمران خان سے اختلافات کے نتیجے میں تحریک انصاف سے بھی علیحدہ ہو گئے اور تھوڑے عرصے بعد عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اسعد شاہجہانپوری

22 جولائی 1966 کو تحریک پاکستان کے نامور شاعر اسعد شاہجہانپوری کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1887 میں شاہجہاں پور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں ہی حاصل کی اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل اور ایس ایل سی کے امتحانات پاس کیے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے تھا 15 سال کی عمر میں باقاعدہ شعر کہنا شروع کیے۔ ذریعہ معاش کے لیے آپ نے محکمہ کلکٹری میں ملازمت اختیار کی اور 30 سال تک مختلف سرکاری محکموں میں خدمات انجام دیگر 1946 میں ریٹائر

ہو گئے۔ تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے اور مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے لیے آپ نے بہت سی جوشیلی نظمیں لکھیں اور ان نظموں کو وہ مسلم لیگ کے جلسوں میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ پڑھتے تھے۔ تحریک پاکستان میں آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی اور یہاں آکر مطالعہ اور شعر و شاعری کے علاوہ کوئی مشغلہ نہیں رکھا۔ آپ ایک طویل عرصہ تک بزم غالب کے صدر بھی رہے۔ آپ کے ایک شاگرد نے آپ کے نام سے ایک ادبی ادارہ "بزم اسعد پاکستان" بنایا جو شعر و سخن کی گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔

شفیق بریلوی

22 جولائی 1981 کو مشہور ادیب، شاعر، مورخ، بے باک صحافی اور تحریک پاکستان کے معروف کارکن شفیق بریلوی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 20 اپریل 1922 کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ تحریک پاکستان میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ قیام پاکستان سے پہلے قائداعظم کے اوپر ایک کتاب لکھی جس کا نام "ہمارے رہنما" تھا جو بہت مشہور ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی۔ کراچی میں صحافتی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ آپ نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ 1949 میں آپ نے "دختران حرم" کہ عنوان سے ایک کتاب لکھی جس میں تحریک پاکستان اور مسلم خواتین کی سیاسی اور معاشرتی اصلاح میں حصہ لینے والی شاعرہ خواتین کے تذکرے ہیں اس کے علاوہ آپ کی دیگر تصانیف میں تذکرہ شاعرات پاکستان، زن زر زمین، تحریک پاکستان کی تاریخ، ارمغان نعت اور نظام اسلام شامل ہیں۔ آپ کی کتاب ارمغان نعت کے بارے میں مولانا مودودی نے فرمایا "ارمغان نعت نے یہ ترغیب پیدا کی کہ جو لوگ کل تک لینن اور مارکس کے قصیدے لکھتے تھے وہ بی نعت رسول مقبول لکھنے لگے"۔

جسٹس (ر) ظہور الحق

24 جولائی 2013 کو معروف وکیل اور سابق ہائی کورٹ کے جج جسٹس (ر) ظہور الحق کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 11 نومبر 1925 میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے گریجویشن کے بعد آپ نے، 1946 میں دہلی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ تحریک پاکستان کے بہت فعال کارکن تھے اور مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے ممبر اور والنٹیر کے طور پر براہ راست قائداعظم کے ساتھ کام کیا تھا۔ آپ آپ کراچی بار ایسوسی ایشن کے تین بار لگاتار جنرل سیکریٹری رہے۔ 1958 میں پاکستان بار ایسوسی ایشن کے جنرل سیکریٹری بھی بنے۔ 1977 میں سندھ ہائی کورٹ کے جج کے طور پر آپ کا تقرر ہوا۔ آپ پاکستان بوائز اسکاؤٹس ایسوسی ایشن کے سر گرم رکن بھی تھے.

معین الدین

26 جولائی 2001 کو بم ڈسپوزل اسکواڈ کے بہادر اور نڈر سربراہ معین الدین کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 17 اگست 1932 کو پیدا ہوئے تھے 1951 میں آپ نے شہری دفاع کے محکمے میں ملازمت اختیار کی اور مختلف عہدوں پر ترقی کرتے ہوئے 1992 میں

بم ڈسپوزل یونٹ کے سربراہ کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کی غیر معمولی خدمات کو دیکھتے ہوئے حکومت نے آپ کی خدمات کانٹریکٹ حاصل کرلیں اور آپ اپنی وفات کے وقت تک یہ خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کو اپنے کام سے والہانہ عشق تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کے پورے پچاس سال کی سروس کیریر میں صرف ایک دن کی چھٹی تھی۔ بم کی اطلاع پر ذاتی طور پر خود پہنچتے تھے اور بغیر سکیورٹی گارڈ کے خطرناک سے خطرناک علاقے میں چلے جاتے تھے۔ خفیہ طور پر رکھے گئے بم دھماکہ خیز مواد تلاش کرلینا آپ کا خاصہ تھا۔ بم کو دیکھ کر اسے ناکارہ بنانے کے لیے اس طرح سے لپکتے تھے جیسے شیر اپنے شکار پر لپکتا ہے۔ ہر طرح کے دھماکہ خیز بارود سے واقفیت رکھتے تھے۔ ٹائم بموں سے اکثر سابقہ پڑا لیکن ایک بار 1985 میں 20 پاؤنڈ کا ٹائم بم اور 1996 میں 4 پاؤنڈ کا ٹائم بم ایسی حالت میں ناکارہ بنایا جب ان کے پھٹنے میں چند لمحے ہی باقی تھے۔ اورنگی تھانے کی حدود میں 5 پاؤنڈ کا دیسی ساخت کے بم نصب تھا اس کو ناکارہ بنانے کی کوشش کے دوران بم آپ کے ہاتھ میں پھٹ گیا جس سے آپ کی انگلی اور انگوٹھا ضائع ہو گیا تھا۔ انگلی اور انگوٹھے کے ضائع ہونے کے باوجود بھی آپ اپنی وفات تک کام کرتے رہے اور اپنے ساتھیوں کو ساتھ ساتھ ٹریننگ بھی دیتے رہے۔ آپ کی عظمت اس لحاظ سے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ آپ نے اپنے فن اور ہنر کو اپنے ساتھیوں میں منتقل کردیا۔ بم ڈسپوزل کے علم کے بارے میں آپ نے 11 کتابیں بھی تحریر کیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی اس بے مثال جرات اور بہادری پر آپ کو تمغہ شجاعت عطا کیا۔

ابن صفی

26 جولائی 1980 کو اردو کے نامور جاسوسی ناول نگار ابن صفی کراچی میں وفات پاگئے اور پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 26 جولائی 1928 کو قصبہ نارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام اسرار احمد تھا۔ تعلیم بی اے تک حاصل کی تھی ابتدا شعر و شاعری سے کی پھر طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی لکھے جو بے حد مقبول ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں لالوکھیت کے سی ون ایریا میں سکونت پذیر ہوئے مگر پھر بعد میں ناظم آباد شفٹ ہو گئے۔ 1952 میں جاسوسی ناولوں کا ایک سلسلہ عمران سیریز کے نام سے شروع کیا جو بے حد مقبول ہوا۔ آپ نے اس سلسلے کے تقریباً ایک سو بیس ناول تحریر کیے اور اس سلسلے کا آخری ناول 1980 میں آپ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ درمیان میں 1960 سے 1963 تک آپ اپنی بیماری کی وجہ سے نہیں لکھ پائے۔ آپ کے ہر ناول کے کم از کم چار سے پانچ ایڈیشن چھپتے تھے اور پہلا ایڈیشن 60000 تک کی تعداد میں چھپتا تھا۔ آپ کی تحریر میں ایسا جادو ہے کہ پچاس سال پہلے لکھے گئے ناول کو جب آج کے دور کا انسان پڑھتا ہے تو وہ سب بھول جاتا ہے اور اسے ختم کئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ مولوی عبدالحق، حسن نثار، امجد اسلام امجد اور محمد حسن عسکری آپ کے ناولوں سے بہت متاثر تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب خود جوانی میں آپ کے ناولوں کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔

علامہ سید محمد رضی

28 جولائی 1999 کو نامور عالم دین اور مصنف علامہ سید محمد رضی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ دسمبر 1913 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے آپ کے دادا مولانا نجم الحسن اور والد مولانا سید محمد اپنے زمانے کے نامور علماء میں شمار ہوتے تھے۔ آپ نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا اور 19 برس کی عمر میں مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ سے ممتاز الفاضل کی سند حاصل کرنے کے بعد اسی کالج میں وائس پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور وہاں ایک اسکول قائم کیا۔ آپ نے سالوں سال ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر درس قرآن حکیم اور مجلس شب عاشور سے خطاب کیا۔ آپ 85 سے زائد کتب کے مصنف تھے۔ اس کے علاوہ آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن بھی رہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو ستارہ امتیاز عطا کیا۔

شاہد سجاد

28 جولائی 2014 کو پاکستان کے معروف مجسمہ ساز شاہد سجاد کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1936 میں یوپی کے شہر مظفر نگر میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ جوانی میں آپ کے اوپر ایک عجیب جنون چڑھا جس کے تحت آپ نے موٹر سائیکل پر جنوبی ایشیا مشرقی وسطی اور یورپ کا سفر کیا جہاں آپ نے ان ممالک میں آرٹ کی مختلف گیلریاں دیکھیں۔ بعد ازاں آپ نے جاپان اور یورپ سے کانسی اور لکڑی کے مجسمہ سازی کا فن سیکھا اور پھر ان دونوں میں مہارت حاصل کی۔ 1964 میں آپ نے اپنے فن پاروں کی نمائش بھی منعقد کی۔ 1977 میں اسلام آباد میں آرٹس کی قومی نمائش میں آپ نے پہلا انعام حاصل کیا۔ آپ نے پاکستان آرمی کے لیے ایک میورل بنایا جسے بعد میں آرمڈ کور سینٹر نوشہرہ میں نصب کیا گیا۔ اسی طرح آپ نے کراچی کے میری ٹائم میوزیم کے لئے بھی ایک مجسمہ بنایا۔ 1987 میں سیول اولمپکس آرگنائزنگ کمیٹی کی دعوت پر منعقدہ نمائش میں بھی آپ شامل ہوئے اور آپ کے بنائے ہوئے فن پارے سیول اسکلپچر پارک میں موجود ہیں۔

منیر حسین

29 جولائی 2013 کو ممتاز صحافی اور کرکٹ کمینٹیٹر منیر حسین وفات پاگئے۔ آپ 29 نومبر 1923 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے اسکول کے زمانے میں اسکاوٹ تھے اس لیے مسلم لیگ کے جونیئر گارڈز میں شمولیت اختیار کرلی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور بقیہ تعلیم یہاں مکمل کی۔ مختلف اخبارات میں کام کرنے کے بعد روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوگئے اور کھیلوں کے بارے میں لکھنے لگے۔ آپ کی تحریریں خاص طور پر کھلاڑیوں سے متعلق آپ کے تجزیے بہت زیادہ مقبول ہونے لگے۔ جب ریڈیو پر کرکٹ کمنٹری کا آغاز ہوا تو آپ بھی اولین اردو کمنٹیٹرز میں شامل تھے۔ آپ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اردو کمنٹری کے بانی تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ کی اردو کمنٹری کی خاص بات یہ تھی کہ آپ کمنٹری کے دوران کرکٹ کی وہ اصطلاحات جو انگریزی میں

تھیں ان کو انتہائی سادگی کے ساتھ اس طرح ادا کرتے کہ اسے اردو زبان میں ہی سمو لیتے۔ جس کی وجہ سے آپ کی کمنٹری بہت زیادہ جاندار ہو گئی۔ آپ کھیلوں کی صحافت کے موجد بھی تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ کا جریدہ اخبار وطن کئی سال تک شائع ہوتا رہا۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

یاور اعظمی

30 جولائی 2004 کو نامور مرثیہ نگار شاعر جناب یاور اعظمی جعفر طیار کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ یکم مئی 1912 کو یوپی کے ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے فیض آباد کالج سے ایف اے اور عربی کالج سے منشی کامل کی سند حاصل کی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آگئے اور 1950 میں اکاؤنٹنٹ جنرل پاکستان میں ملازمت اختیار کی جہاں آپ 1972 میں ریٹائر ہوئے۔ آپ نے شاعری کا آغاز 1926 میں غزل گوئی سے کیا اور حکیم آغا آفتاب لکھنوی کے شاگرد ہوئے اور علم عروض حاصل کیا۔ کچھ ہی عرصے بعد آپ نے اپنے آپ کو سلام، قصیدہ، منقبت، نوحے اور مرثیے کی طرف موڑ لیا۔ آپ نے زیادہ تر موضوعاتی مرثیے کہے جس میں آپ نسیم امروہی سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ آپ کے مرثیے کی ابتدا کسی بھی عنوان کے تحت ہوں اس کی وضاحت کے بعد کربلا کے کسی بھی کردار یا واقعے سے مربوط کر دیتے ہیں۔ آپ نے بے شمار حمد، نعت، قصیدہ، منقبت، نوحے اور مرثیے کہے۔ آپ برصغیر کے عظیم نوحہ خواں جناب علی محمد رضوی (سچے بھائی) کے والد ہیں۔

اے ٹی نقوی

31 جولائی 1962 کو کراچی کے اوّلین چیف کمشنر اور معروف بیورو کریٹ اے ٹی نقوی وفات پاگئے۔ آپ کا اصل نام ابو طالب نقوی تھا۔ زمانہ طالب علمی میں آپ علی گڑھ یونیورسٹی کے صف اول کے طالب علم رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ نے مقابلے کا امتحان دیا اور کامیابی حاصل کر کے مختلف محکموں میں فرائض انجام دیے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ قدرت اللہ شہاب، اختر حسین اور ہاشم رضا وغیرہ کے ساتھ ان مسلمان بیرو کریٹس میں شامل تھے جو پاکستان آگئے آپ کو کراچی کا پہلا چیف کمشنر بننے کا بھی اعزاز حاصل ہے اس کے علاوہ آپ سیکریٹری برائے دفاع بھی رہے آپ مشہور سول سرونٹ سر رضا علی کے داماد بھی تھے۔

جمشید نسروانجی

یکم اگست 1952 کو جدید کراچی کے معمار جناب جمشید نسروانجی رستم جی مہتا وفات پاگئے۔ آپ 1886 کو کراچی کے ایک مالدار پارسی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد اور والدہ دونوں اپنی خدا ترسی اور فیاضی کی وجہ سے کراچی میں مشہور تھے۔ آپ بھی اپنے والدین سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ کراچی میونسپل کارپوریشن سے قبل آپ 6 سال تک میونسپلٹی کے صدر رہے اس کے بعد 1930 میں جب کراچی میونسپل کارپوریشن وجود میں آئی تو آپ اس کے پہلے میئر منتخب ہوئے۔ آپ نے کراچی شہر کو بنانے اور

سنوارنے میں بڑی محنت اور دلجمی سے خدمات انجام دیں۔ آپ نے کراچی کی توسیع کے لیے متعدد منصوبے بنائے۔ کراچی کو مختلف وارڈوں میں تقسیم کیا۔ اسکول، ڈسپنسری، میٹر نٹی ہوم، فائر بریگیڈ اور ایمبولینس کا اہتمام کیا۔ آپ ہی کے زمانے میں کراچی ایک چھوٹے سے قصبے سے ایک جدید شہر بن گیا۔ موجودہ کراچی کا سب سے بہترین اسکول ماما پارسی بھی آپ کی کوششوں سے وجود میں آیا تھا۔ کراچی کی ایک مشہور سڑک جمشید روڈ کا نام آپ ہی کے نام پر رکھا گیا ہے۔

فرید خان

یکم اگست 2015 کو پاکستان کے معروف مزاحیہ اداکار فرید خان طویل علالت کے بعد کراچی میں وفات پاگئے اور گلشن اقبال کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1953 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے آپ نے باحیثیت ڈرامہ آرٹسٹ اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ چالیس برس سے زیادہ عرصے تک آپ نے اپنی اداکاری کے ذریعے لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیریں۔ آپ کے مشہور پروگراموں میں نئی دنیا، بس بھئی بس اور ففٹی ففٹی کے نام سرفہرست ہیں۔ آپ کا شمار پاکستان میں اسٹینڈ اپ کامیڈی کے معماروں میں ہوتا ہے۔

سید صبیح محسن

یکم اگست 2014 کو اردو اور انگریزی کے نامور ادیب، ڈرامہ نگار، صحافی اور پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے سابق ڈائریکٹر پروگرامز سید صبیح محسن کراچی میں وفات پاگئے اور جامعہ کراچی کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1936 کو پٹنہ میں پیدا ہوئے تھے۔ بی ایس سی کرنے کے بعد آپ نے کراچی یونیورسٹی سے صحافت میں ایم اے کیا اور اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان سے کیا اور جلد ہی اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ڈائریکٹر پبلکیشن بنے اور کراچی اسٹیشن کے ڈائریکٹر کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ روزنامہ ڈان سے وابستہ ہو گئے اور دیسنوی کے نام سے کالم لکھنے لگے۔ یہ نام دراصل آپ نے پٹنہ میں واقع اپنے آبائی گاؤں ڈیسنہ سے اخذ کیا تھا۔ آپ کے کالم روزنامہ ڈان میں بہت زیادہ مقبول ہوئے۔ آپ نے پی ٹی وی کے لئے بھی کچھ یادگار ڈرامے لکھے جن میں فلائٹ 033 بہت مشہور ہوا اس کے علاوہ وقت کا آسمان جیسی ڈرامہ سیریل بھی آپ نے لکھیں۔ آپ کی طنز و مزاح کی تین کتابیں بھی شائع ہوئیں جن میں گر قبول افتد، بین السطور اور داستان کیسی کیسی شامل ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

3 اگست 2013 کو اردو کے ممتاز نقاد، محقق، ادیب اور شاعر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 26 جنوری 1924 کو اترپردیش کے شہر فتح پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آگرہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے۔ کراچی آکر آپ نے ایم اے، ایل ایل بی، بی ٹی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ 1958 میں جامعہ کراچی کے شعبہ اردو سے منسلک ہوگئے اور تقریباً 30 برس تک جامعہ کراچی سے وابستہ رہے جہاں آپ کی نگرانی میں متعدد اسکالرز نے پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔

1964 کے بعد سے ہر سال جامعہ کراچی کی سنڈیکیٹ کی جانب سے آپ کے تحقیقی و تنقیدی کاموں کی تحسین کی گئی اور تعریفی اسناد کے ساتھ ساتھ نقد انعامات سے بھی نوازا گیا۔ آپ نیاز فتح پوری سے بہت گہری وابستگی رکھتے تھے اور ان کی وفات کے بعد ان کے مشہور جریدے نگار کو جاری رکھنا آپ کا ایک بڑا کارنامہ تھا۔ آپ کی تصانیف کی تعداد 60 سے زیادہ ہے جن میں اردو کی منظوم داستان، اردو رباعی کا فنی اور تاریخی ارتقا، تحقیق و تنقید، میر انیس حیات اور شاعری، اقبال سب کے لیے، تحریک پاکستان اور قائداعظم اور فن تاریخ گوئی اور اس کی روایت سر فہرست ہیں۔ 1972 میں آپ کی کتاب اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری پر داؤد ادبی انعام بھی ملا حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں ستارہ امتیاز کا اعزاز عطا کیا۔

رئیس فروغ

5 اگست 1982 کو اردو کے معروف شاعر رئیس فروغ وفات پا گئے۔

آپ 15 فروری 1944 کو مراد آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ جہاں آئے دن شعر و ادب کی محفلوں کا انعقاد ہوتا تھا اور گلی کوچوں میں ہر طرف شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا۔ آپ نے قمر مراد آبادی اور جگر مراد آبادی کی شاگردی اختیار کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ٹھٹھہ آ گئے اور پھر وہاں سے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ کی ملازمت کے دوران آپ نے بزم ادب کے پی ٹی کی بنیاد ڈالی اور اس کے ادبی مجلے صدف کے مدیر بھی رہے۔ کچھ عرصے بعد ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور اسکرپٹ رائٹر مقرر ہوئے اور آخری وقت تک ادارے سے وابستہ رہے۔ آپ بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے لیکن آپ نے نظمیں قطعات اور گیت بھی لکھے۔ بچوں کے لئے آپ کی نظموں کا مجموعہ ہم سورج چاند ستارے شائع ہوا اور ایک شعری مجموعہ رات بہت ہوا چلی آپ کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ کراچی میں ادبی محفل کے انعقاد میں ہمیشہ آپ کا اہم کردار رہا۔

قریش پور

5 اگست 2013 کو پاکستان ٹیلی ویژن کے شہرہ آفاق پروگرام کسوٹی کے میزبان، ناول نگار اور کالم نگار جناب قریش پور طویل علالت کے بعد کراچی میں وفات پا گئے اور پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ کا اصل نام ذوالقرنین قریشی تھا اور آپ 1932 میں بھوپال میں پیدا ہوئے تھے۔ پی ٹی وی کے پروگرام کسوٹی سے لازوال شہرت حاصل کی۔ اس پروگرام میں قریش پور، عبیداللہ بیگ اور افتخار عارف اس طرح سامنے آئے کہ جنہیں ہر چیز کے بارے میں ہر بات کا علم تھا۔ اور یہی بات اس پروگرام کی مقبولیت کا راز تھا۔ آپ کافی عرصے پی ٹی وی میں پریزنٹیشن کنٹرولر کے عہدے پر فائز رہے۔ کسوٹی کے علاوہ آپ نے دیگر ذہنی آزمائش کے پروگراموں میں بھی میزبانی کی جن میں لفظ کی تلاش، شیشے کا گھر، ذوق آگہی، یو این کوئز، سارک کوئز اور ریڈیو پروگرام یو بی ایل کوئز کے نام سر فہرست ہیں۔

آغا حسن عابدی

6 اگست 1995ء کو پاکستان کے معروف بنکار آغا حسن عابدی طویل علالت کے بعد کراچی میں وفات پا گئے۔ آغا حسن عابدی 14 مئی 1922ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے انگریزی ادب میں ایم اے اور قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بینکاری کا پیشہ اپنایا اور 1946ء میں حبیب بنک سے منسلک ہوئے اور وہ اس بنک کے متعدد انتظامی عہدوں پر فائز رہے۔ 1959ء میں آپ نے سہگل گروپ کی معاونت سے یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ قائم کیا جو چند ہی برس میں پاکستان کا دوسرا سب سے بڑا کمرشل بنک بن گیا۔ آپ کی بینکنگ کے شعبے میں انقلابی تبدیلیوں اور شاندار تجربات کی بنیاد پر پاکستان کی صنعت و تجارت کو شاندار ترقی حاصل ہوئی۔

1972ء میں جب پاکستان میں بنکوں کو قومی ملکیت میں لیا گیا تو آپ نے لیگزمبرگ میں دو کمروں کے ایک آفس سے بنک آف کریڈٹ اینڈ کامرس (BCCI) کے نام سے ایک بنک قائم کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں بینک کی ترقی کا یہ عالم ہو گیا کہ اسکی شاخیں دنیا کے 72 ملکوں میں پھیل گئیں اور دنیا کا ساتواں بڑا نجی بینک بن گیا جس میں 16000 افراد برسر روزگار تھے اور ان میں اکثریت پاکستانیوں کی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ بینک کے اعلیٰ ترین عہدوں پر تعینات افسران میں سے 80 پرسنٹ پاکستانی تھے۔ آپ نے اپنی دور بینی نگاہوں سے ذہانت اور لگن سے معمور ہموطنوں کو منتخب کیا اور ان کو مثالی تربیت سے بین الاقوامی معیار کا بینکار بنایا اور دنیا کے مختلف ممالک میں تعینات کیا۔

آغا حسن عابدی نے بی سی سی آئی کو ایک کمرشل بنک کی حیثیت سے قائم کیا تھا مگر اسے تیسری دنیا کے ممالک کے محروم پسماندہ اور کم مراعات یافتہ اقوام کی ترقی کے لئے ایک فعال ادارے میں ڈھال دیا۔ آپ نے اپنے بنک کے زیر اہتمام متعدد خیراتی اور فلاحی ادارے اور فائونڈیشن قائم کئے جنہوں نے دنیا کے بہت سے ممالک خصوصاً پاکستان میں فلاحی کام سرانجام دیئے۔ کراچی اور نگی پائلٹ پروجیکٹ، بی سی سی آئی فائونڈیشن، NUST اور غلام اسحاق خان انسٹیٹیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ایسے ہی چند ادارے ہیں۔ انہوں نے تھرڈ ورلڈ فائونڈیشن کے اہتمام میں ایک شاندار تحقیقی جریدہ ساؤتھ بھی جاری کیا۔ 1989ء میں اچانک عالمی طاقتوں کی ملی بھگت، سازشوں اور اوچھے ہتھکنڈوں کے نتیجے میں بی سی سی آئی کو اپنا کاروبار سمیٹنا پڑ گیا۔

امریکا نے آغا حسن عابدی کو تفتیش کے لئے اپنے ملک میں طلب کرنا چاہا مگر حکومت پاکستان نے انہیں امریکا کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ بی سی سی آئی کے خاتمے کے بعد آغا صاحب کے تربیت یافتہ افراد کو دنیا کے تمام بینکوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ آپ کی قیادت میں ناجانے کیا جادو تھا کہ آج بھی بی سی سی آئی کے بڑے سے بڑے افسر یا معمولی ورکر سے بھی جب آغا صاحب کے بارے میں بات کریں تو بولنے سے پہلے اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ آپ نے 16000 ملازمین کی فلاح و بہبود اور ان کے خاندانوں کے لیے جو کچھ کیا اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا یہی وجہ ہے کہ کسی ایک فرد نے بھی بی سی سی آئی کو جوائن کرنے کے بعد اس کے خاتمے تک چھوڑا نہیں۔ ان لوگوں کے دلوں میں آج 25 سال گزرنے کے باوجود بھی آغا صاحب کی محبت جوں کی توں موجود ہے۔ آغا حسن عابدی ان چند عظیم انسانوں میں سے ایک تھے جو اس ملک نے اب تک پیدا کیے۔ آج ہر طرف نظر آنے والی گند اور غلاظت میں پاکستانی نوجوانوں کو ایسی متاثر کن شخصیات سے روشناس کرانا اشد ضروری ہے۔

ثاقب شیخ

7اگست 2015 کو ٹیلی ویژن ریڈیو اور تھیٹر کے معروف اداکار ثاقب شیخ کراچی میں وفات پاگئے۔ ثاقب شیخ 1970 کی دہائی سے 1990 کی دہائی تک ٹیلی ویژن کے مختلف ڈراموں میں کام کرتے رہے جن میں خدا کی بستی اور تپش میں ان کا کردار بہت پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ آپ نے اے آر وائی کی ڈرامہ سیریل میری لاڈلی اور ہم ٹی وی کے ڈرامے ذیروز میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔

الیاس رشیدی

7اگست 1997 کو پاکستان کے نامور صحافی الیاس رشیدی کراچی میں وفات پاگئےاور کراچی میں ہی شفیق پورہ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 1925 میں دہلی میں پیدا ہوئے تھے آپ کا تعلق صحافیوں کے گھرانے سے تھا۔ پاکستان کے مشہور صحافی محمد عثمان آزاد اور محمد عمر فاروقی آپ کے سگے بھائی تھے۔ آپ نے صحافتی زندگی کا آغاز اپنے بھائیوں کے اخبار روزنامہ انجام سے کیا۔ 1949 میں آپ نے مشہور جریدہ نگار جاری کیااور 1957 میں آپ نے نگار ایوارڈ کا اجراء کیا جو پاکستان کی فلمی صنعت کا سب سے اہم اور معتبر ایوارڈ بن گیا۔

پروفیسر انیتا غلام علی

8اگست 2014 کو ممتاز دانشور اور ماہر تعلیم پروفیسر انیتا غلام علی وفات پاگئیں۔ آپ دو اکتوبر 1934 کو کراچی میں پیدا ہوئی تھیں آپ کے والد جسٹس فیروز نانا تھے اور آپ کی والدہ شمس العلماء مرزا قلیچ بیگ کی نواسی تھیں۔ آپ نے ابتدائی تعلیم سینٹ جوزف اسکول مہاراشٹر سے اور سینٹ لارنس اسکول کراچی سے حاصل کی۔ انیس 1957 میں ڈی جے سائنس کالج سے بی ایس سی کیا اور 1960 میں کراچی یونیورسٹی سے مائیکرو بائیولوجی میں ایم ایس سی کیا۔ 1961 میں ایس ایم سائنس کالج میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئیں 1960 سے 1972 تک ریڈیو پاکستان سے انگریزی میں قومی خبریں بھی پڑتی رہیں۔ آپ پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی سرگرم رہنما بھی رہی ہیں اور کئی دفعہ صدر اور نائب صدر کے عہدے پر بھی رہیں۔ آپ نے تعلیم و معاشرتی مسائل پر بے شمار مقالہ تحریر کیےاور متعدد بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی اور متعدد ملکی اور غیر ملکی اعزازات آپ کو آپ کی خدمات کے اعتراف میں ملے جن میں تمغہ حسن کارکردگی ستارہ امتیاز اور بینظیر ایوارڈ شامل ہیں۔ آپ کو دو مرتبہ سندھ کی وزیر تعلیم بننے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔

کرار نوری

8اگست 1990 کو اردو کے ممتاز شاعر ادیب مترجم اور صحافی کرار نوری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 30جون 1916 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد غالب کے شاگرد اور آگاہ دہلوی کے پرپوتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ راولپنڈی اور پھر کراچی میں رہے۔ جہاں آپ ریڈیو پاکستان سے وابستہ تھے۔ آپ کی غزلوں کا مجموعہ میری غزل کے نام سے اور نعتوں کا مجموعہ میزان حق کے نام سے شائع ہوا۔

ڈاکٹر روتھ فاؤ

10 اگست 2017 کو پاکستان کی مدر ٹریسا کے نام سے مشہور جذام کے مریضوں کا علاج کرنے والی ڈاکٹر روتھ فاؤ کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ جرمنی میں 9 ستمبر 1929 کو پیدا ہوئیں۔ آپ دوسری جنگ عظیم کے خاتمے پر اپنے خاندان کے ہمراہ مغربی جرمنی منتقل ہو گئیں جہاں ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی۔ کسی زمانے میں آپ نے پاکستان میں جذام کے مریضوں سے متعلق ایک دستاویزی فلم دیکھی تھی۔ جس کے بعد آپ نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ مارچ 1960 میں کراچی پہنچ کر آپ نے کراچی میں ایک چھوٹا سا کلینک قائم کیا اور پاکستانی ڈاکٹر آئی اے گل آپ کے ساتھ اس کام میں شامل ہو گئے۔ 1963 میں ایک باقاعدہ کلینک خرید کر یہ مرکز وہاں قائم کیا گیا جہاں پاکستان کے علاوہ افغانستان سے آئے ہوئے مریضوں کا علاج بھی کیا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کراچی کے علاوہ پورے ملک میں جزام کے مریضوں کے لئے مراکز قائم ہوتے گئے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر 1988 میں آپ کو پاکستان کی باقاعدہ شہریت دے دی گئی۔ اور حکومت پاکستان کی جانب سے ہلال پاکستان اور نشان قائد اعظم عطا کیا گیا۔ آپ کی آخری رسومات کے موقع پر پاکستان اور ویٹیکن سٹی کے پرچموں کو سرنگوں کر دیا گیا۔ آپ کی میت کو پاکستانی پرچم میں لپیٹا گیا اور انیس توپوں کی سلامی دی گئی۔ ان رسومات میں صدر مملکت چیف آف آرمی سٹاف بھی شامل تھے۔

لٹل ماسٹر حنیف محمد

11 اگست 2016 کو پاکستان کے مایہ ناز کرکٹر لٹل ماسٹر حنیف محمد وفات پا گئے۔ آپ 21 ستمبر 1934 کو جونا گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی۔ آپ 5 فٹ 7 انچ کے قد کے ساتھ بطور بیٹسمین بہترین دفاعی تکنیک کے حامل تھے اسی لیے لٹل ماسٹر کے نام سے مشہور ہوئے آپ کی تربیت عبدالعزیز نے کی تھی جو جام نگر کی ٹیم میں کھیلا کرتے تھے۔ آپ کو پاکستان کی جانب سے ٹیسٹ کرکٹ میں پہلی ٹرپل سنچری بنانے اور وقت کے لحاظ سے ٹیسٹ کرکٹ میں سب سے طویل اننگز کھیلنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ فرسٹ کلاس کیریئر میں 238 میچز کے اندر 52.29 کی اوسط سے 55 سنچریوں اور 66 نصف سینچریوں کی مدد سے 17059 رنز اسکور کیے۔ فرسٹ کلاس میچز میں آپ نے 499 رنز بنا کر سر ڈان بریڈمین کا ریکارڈ توڑا۔ یہ ریکارڈ 35 برس بعد برائن لارا نے 501 رنز بنا کر اپنے نام کر لیا۔ پاکستان کی جانب سے 55 ٹیسٹ میچز کھیل کر 44 کی اوسط سے 3915 رنز بنائے جس میں 12 سینچریاں اور 15 نصف سنچریاں شامل ہیں۔ 1968 میں حنیف محمد کو Wisden Cricketer of the Year قرار دیا گیا۔ 2009 میں آپ کا نام آئی سی سی کے Hall of fame میں 55 کھلاڑیوں کی پہلی فہرست میں شامل کیا گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایک طویل عرصہ تک آپ کرکٹر نامی میگزین کے مدیر رہے۔ آپ کے چار بھائی وزیر محمد، رئیس محمد، مشتاق محمد اور صادق محمد اور بیٹا شعیب محمد بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں اور تاریخ میں محمد برادران کے نام سے مشہور ہیں.

محمد حلیم

11 اگست 2006 کو سپریم کورٹ آف پاکستان کے سابق چیف جسٹس (ر) محمد حلیم کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ یکم جنوری 1925 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی آپ کے والد بیرسٹر محمد وسیم پاکستان کے پہلے اٹارنی جنرل تھے۔ آپ 1971 میں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے جج اور 1977 میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج بنے۔ آپ ان تین ججوں میں شامل تھے جنہوں نے ذوالفقار علی بھٹو کے مشہور مقدمے میں انہیں رہا کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔ 1981 میں آپ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بنے اور 1989 میں ریٹائر ہوئے۔

ڈاکٹر ریاض الاسلام

13 اگست 2007 کو پاکستان کے ممتاز محقق اور تاریخ دان ڈاکٹر ریاض الاسلام کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ دسمبر 1919 کو رام پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا اور پہلا پی ایچ ڈی بھی علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا اور بعد میں پھر کیمبرج یونیورسٹی سے دوسرا پی ایچ ڈی کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آگئے اور کراچی یونیورسٹی سے وابستہ ہوگئے اور شعبہ تاریخ کے چیئرمین کے عہدے سے ریٹائر ہوئے آپ تاریخ کے موضوع پر متعدد کتابوں کے مصنف ہیں.

ڈاکٹر بی بی قریشی

15 اگست 2012 کو پاکستان کی پہلی پی ایچ ڈی خاتون ڈاکٹر بی بی قریشی کراچی کے آئی ڈی سنٹر میں وفات پاگئیں۔ آپ 1922 میں مراد آباد (ہندوستان) میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے اور پھر معاشیات میں ایم اے کیا اور آئرلینڈ کی ڈبل یونیورسٹی سے زرعی معاشیات میں پی ایچ ڈی کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے خاندان کے ہمراہ پاکستان آئیں اور راولپنڈی میں سکونت اختیار کی جہاں گورنمنٹ کالج میں معاشیات پڑھاتی رہیں۔ پاکستان کے علاوہ آپ گھانا کینیا اور زمبیا میں درس وتدریس سے وابستہ رہیے۔ گھانا میں قیام کے دوران اقوام متحدہ کے سابق سیکرٹری جنرل کوفی عنان کی استاد بھی رہیں۔ بیرون ممالک میں ایک عرصے تک قیام کے بعد جب آپ پاکستان واپس آئیں تو تعلیم کے میدان میں انحطاط دیکھ کر اتنی دل برداشتہ ہوئی کہ آپ نے اس شعبے کو ہی خیر باد کہہ دیا۔ آپ نے ساری عمر شادی نہیں کی اور آخری عمر میں ایدھی سینٹر میں رہنے کا فیصلہ کیا اور ایدھی سنٹر میں ہی آپ کا انتقال ہوا وصیت کے مطابق تدفین بھی ایدھی قبرستان میں کی گئی۔

سر رضا علی

15 اگست 1949 کو آل انڈیا مسلم لیگ کے رہنما ممتاز ادیب اور سابق سول سرونٹ سر رضا علی کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ 14 میں 1880 کو مراد آباد (ہندوستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے آباء واجداد کی ایران سے آگرہ آکر آباد ہوئے تھے۔ وکالت کے شعبے سے عملی زندگی کا آغاز کیا پھر سیاست کے میدان میں آئے۔ 1912 میں یوپی کی کا قانون ساز اسمبلی کے رکن کے طور پر مسلم

لیگ کی طرف سے منتخب ہوئے۔1924میں مسلم لیگ کے بمبئی کہ اجلاس کی صدارت بھی کی۔1926تک یوپی کی کونسل آف اسٹیٹ کے رکن رہے۔ بعدازاں آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مرکزی مجلس قانون ساز کے رکن بھی منتخب ہوئے۔1926سے 1931تک انڈین پبلک سروس کمیشن کے رکن رہے اور لیگ آف نیشنز پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا۔6سال تک جنوبی افریقہ میں حکومت برطانیہ کی جانب سے آئی کمیشنر کی خدمات انجام دیں۔انگریزی حکومت نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر سر کا خطاب عطا کیا مگر آپ نے1946میں مسلم لیگ کے کہنے پر یہ خطاب واپس کر دیا۔1944میں آپ نے اپنی خود نوشت سوانح عمری "اعمال نامہ" کے نام سے قلمبند کی۔آپ کی سوانح عمری اعمال نامہ کو اردو کی دس بہترین سوانح عمری میں شمار کیا جاتا ہے اس میں آپ نے قیام پاکستان سے پہلے کے حالات کو کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس وقت کے حالات کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے۔

خالد علیگ

15اگست2007کو مشہور شاعر اور صحافی خالد علیگ کراچی میں وفات پاگئے۔آپ1925کو فرخ آباد کے ایک قصبے قائم گنج میں پیدا ہوئے تھے۔آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی۔شعر و سخن کا آغاز آپ نے زمانہ طالب علمی ہی سے شروع کر دیا تھا۔برصغیر کے معروف شاعر مجاز بھی علی گڑھ میں آپ کے زمانے میں طالبعلم تھے۔آپ کو شاعری کے علاوہ صحافت سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔آپ روزنامہ تنویر اور اس کے علاوہ روزنامہ ہمدم سے بھی وابستہ رہے۔قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے اوکاڑہ اور پھر لاہور میں قیام پذیر رہے۔تھوڑے عرصے بعد آپ سکھر اور میرپور خاص میں بھی سکونت پذیر رہے۔بنیادی طور پر آپ ایک سول انجینئر تھے اس لیے پی ڈبلیوڈی میں تقریباً گیارہ سال خدمات انجام دیں۔سرکاری نوکری کو خیر باد کہہ کر آپ1960میں کراچی میں آگئے اور روزنامہ حریت سے منسلک ہو گئے۔آپ نے اپنی زندگی کے کوئی75برس شعر کہے مگر آپ کو اپنے مجموعہ کلام کو چھپانے میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔اور نہ ہی اپنے کلام کو لکھ کر محفوظ کیا۔کراچی پریس کلب کی ادبی کمیٹی نے آپ کا مجموعہ مرتب کرنا چاہا مگر باوجود کوشش کے ان کو مواد نہ مل سکا۔

مولوی عبدالحق

16اگست1961کو اردو کے عظیم محسن بابائے اردو مولوی عبدالحق وفات پاگئے اور کراچی میں اردو کالج کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔آپ1870میں ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔علی گڑھ کالج سے اپنی تعلیم مکمل کی جہاں سرسید، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حالی اور نواب محسن الملک جیسے صاحبان علم و فضل سے استفادہ کیا۔آپ نے اپنی ملازمت کا آغاز حیدرآباد دکن میں مدرسہ آصفیہ کے صدر مدرس کی حیثیت سے کیا۔1912میں انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری منتخب ہوئے اور اس انجمن سے آپ کی والہانہ وابستگی آپ کی وفات تک جاری رہی۔اس انجمن کے زیر اہتمام ادبیات و لسانیات اور جدید علوم پر دو سو سے زیادہ کتابیں شائع ہوئیں

جن میں بیشتر کتابیں نادر و نایاب ہیں۔ اردو کی پہلی یونیورسٹی جامعہ عثمانیہ لکھنؤ کی تشکیل میں آپ کا بڑا اہم کردار تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے اس انجمن کے زیر اہتمام اردو آرٹس، کامرس سائنس کالج اور اردو لاء کالج جیسے ادارے قائم کیے۔ علمی اور ادبی حیثیت سے اردو کے خدمت گزاروں کی کمی نہیں لیکن جس نے ہر پہلو سے اس کی خدمت کی اور اس کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی وہ مولوی عبدالحق کی ذات تھی۔

ڈاکٹر سیّد ابن حسن

16 اگست 2003 کو کراچی کے مشہور معالج ڈاکٹر سیّد ابن حسن کو ان کے کلینک کے سامنے نامعلوم افراد نے فائرنگ کر کے شہید کر دیا۔ آپ 9 ستمبر 1942 کو پٹنہ کے علاقے ہزاری باغ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کے خاندان نے ملیر میں مسرت کالونی کے علاقے میں سکونت اختیار کی۔ آپ نے ڈاؤ میڈیکل کالج کراچی سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور اپنے گھر کے پاس ملیر 15 کے مقام پر اپنے والد کے قدیمی کلینک سے منسلک ہو گئے اور تادم شہادت اسی اسپتال سے عوام و خواص کو شفایاب کرتے رہے۔ آپ ایک خدا ترس انسان تھے اور بے شمار سماجی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے جنازے میں بلا کسی رنگ نسل اور مذہب کے لوگوں نے شرکت کی۔

نسیم اللہ خان

18 اگست 2013 کو نامور ماہر تعلیم نسیم اللہ خان کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 22 فروری 1922 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی کے متعدد تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیے اور ڈائریکٹر آف اسکول کے منصب پر فائز رہے۔ آپ کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے جن میں سابق امیر جماعت اسلامی سید منور حسن، معروف سفارتکار کرامت اللہ غوری، کراچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی نامور سرجن ڈاکٹر محمد علی شاہ، معروف محقق عقیل عباس جعفری اور جسٹس ایس اے ربانی سرفہرست ہیں۔

مولانا سید محمد دہلوی

20 اگست 1971 کو نامور عالم دین مولانا سید محمد دہلوی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1897 میں ضلع بجنور ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ عالیہ ریاست رام پور میں حاصل کی اور 1906 میں لکھنؤ سے صدر الافاضل کی ڈگری لی۔ آپ کچھ عرصہ ریاست رام پور اور ریاست حیدر آباد دکن سے وابستہ رہے۔ آپ کی تقریر سن کر خواجہ حسن نظامی نے آپ کو خطیب اعظم کا خطاب دیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی منتقل ہو گئے اور بہت فعال زندگی گزاری۔ سماجی اور مذہبی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ نے کئی کتابیں بھی تحریر کیں جن میں نور العصر، کشکول، رسول اور ان کے اہل بیت اور یادگار شامل ہیں۔ آپ کی ایک بہت

بڑی لائبریری بھی تھی جس میں بے شمار نادر و نایاب کتابیں اور مخطوطے موجود ہیں مگر ستم زمانہ یہ ہے کہ یہ لائبریری اب مکمل طور پر بند ہو چکی ہے اور کتابیں الماریوں میں قید ہیں۔

راشد منہاس شہید

20 اگست 1971 کو پاک فضائیہ کی جانب سے پہلے نشان حیدر کا اعزاز حاصل کرنے والے راشد منہاس شہید ہو گئے۔ آپ 17 فروری 1951 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ 1969 میں پی اے ایف اکیڈمی رسالپور میں داخلہ لیا اور مارچ 1971 میں اپنی تربیت مکمل کی۔ 15 اگست 1971 کو آپ نے اپنی آخری تربیت مکمل کی اور باقاعدہ پائلٹ آفیسر بن گئے۔ 20 اگست 1971 کو انہیں تنہا پرواز کرنی تھی ابھی ان کا طیارہ رن وے پر تھا کہ انہیں ایک انسٹرکٹر فلائٹ لیفٹیننٹ مطیع الرحمٰن رن وے پر نظر آیا جس نے آپ کو روکنے کا اشارہ کیا۔ آپ نے جہاز روک کر روکنے کی وجہ پوچھی تو اس نے ایک جست لگائی اور کاک پٹ میں داخل ہو کر راشد کی پچھلی سیٹ پر قبضہ کر لیا اور دوسرے کنڑول کے ذریعے طیارے کے کنڑول پر قابض ہو گیا۔ اس نے وائیر لس کے ذریعے کراچی میں اپنے دوستوں کو پیغام دیا کہ وہ طیارہ اغوا کر کے جودھ پور لے جا رہا ہے اس وقت مطیع الرحمان کے پاس چند اہم دستاویزات تھیں جو وہ بھارتی حکومت کو دینے جا رہا تھا۔ آپ نے جیسے ہی غدار کی گفتگو سنیں تو کنڑول ٹاور کو طیارے کے اغوا کی اطلاع دی اور مزاحمت کرنا چاہی جس پر مطیع الرحمٰن نے کلوروفام سونگا کر آپ کو بے ہوش کر دیا۔ ابھی طیارہ ٹھٹہ کی حدود ہیں میں پہنچا تھا کہ آپ کو ہوش آگیا اور معاملے کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وہ آلہ دبا دیا جو جہاز کو نیچے لاتا ہے اور طیارہ ایک دھماکے کے ساتھ زمین سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ اور یوں آپ خود بھی منزل شہادت پر پہنچ گئے۔

ملا واحدی

22 اگست 1976 کو اردو کے صاحب طرز ادیب اور صحافی ملا واحدی نے کراچی میں وفات پائی۔ آپ 17 مئی 1888 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ اصل نام محمد ارتضی تھا مگر خواجہ حسن نظامی صاحب نے آپ کو ملا واحدی کا خطاب دیا اور اس کتاب کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ آپ کا اصل نام ہی غائب ہو گیا۔ آپ کو ادب اور صحافت کا شوق تھا جس کی بنا پر 15 سال کی عمر میں ہی اخبارات اور جرائد میں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔ 1909 میں جب خواجہ حسن نظامی نے رسالہ نظام المشائخ جاری کیا تو آپ نائب مدیر کی حیثیت سے ان کا ہاتھ بٹانے لگے۔ 1912 میں جب خواجہ حسن نظامی جب نظام المشائخ کی ملکیت سے دستبردار ہو گئے تو آپ نئے نظام المشائخ کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا کام بھی شروع کر دیا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی اور یہاں آکر 1948 میں دوبارہ نظام المشائخ کو عصر نو جاری کیا جو 1960 تک جاری رہا۔ تاہم اس کے بعد بھی تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہا اور مختلف اخبارات کے لئے آپ لکھتے رہے۔ آپ کی تصانیف میں تین جلدوں میں حیات سرور کائنات، میرے زمانے کے ولی اور سوانح خواجہ حسن نظامی شامل ہیں۔

محمود واجد

24اگست 2013کواردو کے مشہور نقاداور ماہر تعلیم محمود واجد کراچی میں وفات پاگئے۔آپ 17مارچ 1931کو بہار میں پیدا ہوئے تھے۔ایک طویل عرصہ تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔آپ کی تصانیف میں ابوالکلام آزاد آثار وافکار، خزاں کے پھول، بہار کے دن، لمحہ لمحہ زندگی اور فکشن کی تنقید کے نام شامل ہیں۔آپ آئندہ کے نام سے ایک خوبصورت جریدہ بھی شائع کرتے تھے۔

جمشید انصاری

24اگست 2005کو پاکستان ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے معروف فنکار جمشید انصاری کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی مغل پورہ قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔آپ 1942کو سہارن پور میں پیدا ہوئے تھے۔قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور گریجویشن کرنے کے بعد لندن چلے گئے جہاں بی بی سی میں کام بھی کیا اور ٹیلی پروڈکشن کے کورس بھی مکمل کیے۔
1960میں آپ پاکستان واپس آگئے اور ریڈیو پاکستان میں صداکاری شروع کی۔آپ ایک طویل عرصے تک ریڈیو پاکستان کے معروف سلسلے حامد میاں کے ہاں سے بھی منسلک رہے۔پاکستان ٹیلی ویژن کے شروع ہونے پر لاہور مرکز کے ڈرامے جھروکے سے آپ نے اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا۔اس کے بعد آپ نے کئی لازوال ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے جن میں کرن کہانی، زیر زبر پیش، انکل عرفی، اور تنہائیاں ایسے ڈرامے ہیں کہ جس میں آپ کی اداکاری ہمیشہ یادرکھی جائے گی۔

مولاناسید انیس الحسنین رضوی

25اگست 1975کو ممتاز عالم دین مولاناسید انیس الحسنین رضوی کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی علی باغ قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔آپ 31جنوری 1996کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔مدرسہ ناظمیہ لکھنؤاور مدرسہ الواعظین لکھنؤ سے دینی تعلیم حاصل کی۔1927میں کراچی کی جامعہ مسجد کھارادر کے خطیب اور بعد ازاں سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں دینیات کے مدرس مقرر ہوئے۔آپ کے قائداعظم سے نیاز مندانہ مراسم تھے۔چنانچہ قائداعظم کی وفات کے بعد محترمہ فاطمہ جناح کی خواہش پر آپ نے قائداعظم کی تجہیز و تکفین کی نگرانی فرمائی۔قائداعظم کی پہلی نماز جنازہ پڑھانے کا شرف بھی آپ ہی کو حاصل ہوا تھا۔مفسر قرآن مولانا حسن رضوی آپ کے صاحب زادے ہیں۔

خالدہ ریاست

26اگست 1996کو پاکستان کی نامور اداکارہ خالدہ ریاست طویل علالت کے بعد کراچی میں انتقال کر گئیں اور کراچی میں ہی سخی حسن کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئیں۔آپ یکم جنوری 1953کو پیدا ہوئیں۔فنی زندگی کا آغاز 1970میں کیا۔آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے لاتعداد ڈراموں اور ڈرامہ سیریلز میں اداکاری کے جوہر دکھائے۔ان میں لازوال، دھوپ کنارے، پڑوسی، بندش، ٹائپسٹ اور ہاف پلیٹ وغیرہ شامل ہیں۔

قمر جمیل

27 اگست 2000ء کو پاکستان کے معروف نقاد ادیب اور شاعر قمر جمیل کراچی میں وفات پا گیا ہے۔ آپ 10 مئی 1927 کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام قمر احمد فاروقی تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے الہ آباد سے حاصل کی اور بی اے جامعہ عثانیہ حیدر آباد سے کیا۔ حیدر آباد میں آپ کے محلے میں فانی بدایونی کی موجودگی نے آپ کے ذہن میں شاعری کے وقار کو بڑھادیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ریڈیو پاکستان لاہور سے وابستہ ہو گئے۔ بعد میں آپ کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ آپ کی شخصیت کا بنیادی حوالہ شاعری ہے لیکن نقاد کی حیثیت سے بھی آپ نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں آپ کے دو شعری مجموعہ خواب نما اور چہار خواب شائع ہوئے۔ جبکہ دو جلدوں پر مشتمل تنقیدی مضامین کا مجموعہ جدید ادب کی سرحدیں ان کی وفات کے کچھ عرصے بعد شائع ہوا۔ آپ نے دریافت کے نام سے ایک ادبی جریدہ بھی شائع کیا تھا۔ آپ نے کراچی سے نثری نظم کی تحریک کا آغاز کیا اور ادیبوں اور شاعروں کی ایک پوری نسل کو تخلیق کا نیا رجحان دیا۔ اردو ادب کے علاوہ عالمی ادب پر بھی آپ کی گہری نظر تھی۔

نظر حیدر آبادی

28 اگست 1968 کو معروف شاعر نظر حیدر آبادی کراچی میں وفات پا گئے۔
آپ 1921 کو حیدر آباد دکن کے ایک ضلع بیڑ میں ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ شعر و سخن کا ذوق آپ کے آباء واجداد سے چلا آ رہا تھا آپ کے والد علی اختر حیدر آبادی خود نامور شاعر تھے۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کے امتحان کو پاس کر کے سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ پاکستان آکر آپ نے دوبارہ نوکری نہ کی اور شاعری آپ کا ذریعہ معاش رہی۔ آپ کی شائع ہونے والی کتابوں میں اقبال اور حیدر آباد، کاروان اور خرمن شامل ہیں

الحاج خورشید احمد

30 اگست 2007 کو پاکستان کے نامور نعت خواں الحاج خورشید احمد وفات پا گئے اور کراچی میں ہی حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ رحیم یار خان کی بستی نور وال میں پیدا ہوئے تھے۔ 1973 میں آپ نے کراچی یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور اسی زمانے میں آپ کو نعت خوانی کی شہرت حاصل ہوئی۔ 1973 سے 1977 تک آپ ریڈیو پر نعت خوانی کرتے رہے تاہم آپ کو اس وقت شہرت حاصل ہوئی جب آپ نے خالد محمود نقشبندی کی مشہور نعت "یہ سب تمہارا کرم ہے آقا" پڑھی۔ 1983 میں آپ کو بہترین نعت خواں کا پی ٹی وی ایوارڈ بھی حاصل ہوا۔ جب کہ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی بھی عطا کیا۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

یکم ستمبر 1983 کو اردو کے نامور شاعر، نقاد، ڈرامہ نگار اور کالم نگار سلیم احمد کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 27 نومبر 1927 کو ضلع بارہ بنکی (ہندوستان) کے ایک قصبے کھیولی میں پیدا ہوئے تھے۔ جب آپ میرٹھ کالج میں تھے تو آپ کے تعلقات پروفیسر کرار حسین، محمد حسن عسکری، انتظار حسین اور ڈاکٹر جمیل جالبی سے استوار ہوئے جو تادم مرگ قائم رہے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی اور اپنی تعلیم کو مکمل کیا۔ 1950 میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے۔ شعر و سخن کا آغاز 1944 سے کیا اور 1948 سے تنقیدی مضامین لکھنا شروع کر دیے اور اپنے بے لاگ اور کھری کڑوی تنقید اور مضامین کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت پائی۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لیے متعدد ڈرامے تحریر کیے۔ ٹیلی ویژن کے لیے ایک معرکۃ الآراء تاریخی ڈرامہ "تعبیر" کے نام سے تحریر کیا جس میں 1857 سے لے کر 1947 تک کے معاشرے کو اور آزادی کی 3 نسلوں کی جدوجہد کو دکھایا ہے۔ آپ ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے اپنے آپ کو اردو ادب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپ نے بے شمار نثری اور شعری تصانیف شائع ہوئیں جن میں چراغ نیم شب، بیاض، ادھوری جدیدیت اور ادبی اقدار بہت مشہور ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود احمد

2 ستمبر 1968 کو کراچی یونیورسٹی میں تعینات کردہ پہلے استاد پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود احمد وفات پاگئے۔ 10 اکتوبر 1950 کو کراچی یونیورسٹی کا قانونی مسودہ منظور کیا گیا اور کچھ ہی عرصے میں کراچی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر اے بی اے حلیم کی تقرریں عمل میں آگئی اور سول اسپتال کے عقب میں چند متروکہ اسکولوں کی عمارات کراچی یونیورسٹی کے عارضی کیمپس کے لیے حاصل کی گئیں۔ شعبہ فلسفہ کراچی یونیورسٹی کا وہ پہلا شعبہ تھا جہاں تدریس کا آغاز ہوا اور اس شعبے کے لیے پہلے صدر پروفیسر ڈاکٹر محمد محمود احمد وہ پہلے استاد تھے جن کا تقرر کراچی یونیورسٹی میں بطور استاد کیا گیا۔ کراچی یونیورسٹی کی یہ پہلی کلاس صرف 8 طلبہ پر مشتمل تھی۔

حکیم محمد احسن عباسی

3 ستمبر 1994 کو کراچی کے پہلے مسلمان میئر حکیم محمد احسن عباسی کراچی میں وفات پاگئے اور سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1917 کو سیہون شریف میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد صاحب سندھی زبان کے نامور دانشور اور ادیب تھے۔ آپ نے اپنی تعلیم کراچی ہی میں مکمل کی۔ آپ نے زمانہ طالب علمی سے ہی سیاست میں حصہ لیا۔ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل 1947 میں ہی آپ کراچی میونسپل کارپوریشن کے میئر منتخب ہوئے۔ بعد ازاں آپ بیرونی ممالک میں سفیر بھی رہے۔ آپ قدیم طرز کے بلند پایہ طبیبوں میں سے تھے۔ اور محض طبیب نہ تھے بلکہ سارے مروجہ علوم یعنی تصوف، فلسفہ، منطق، علم حدیث، علم قرآن، تاریخ اسلام اور سیرت پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔

حبیب ولی محمد

3 ستمبر 2014 کو ملی نغموں کے معروف گلوکار حبیب ولی محمد امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں وفات پا گئے اور وہیں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 16 جنوری 1931 کو برما کے شہر رنگون میں گجرات کی معروف تابانی فیملی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی اشرف ولی محمد تابانی سندھ کے گورنر بھی رہ چکے ہیں۔ ماضی کی معروف فضائی کمپنی ایئر ایشیا آپ ہی کے خاندان کی ملکیت تھی۔ آپ کوئی پیشہ ور گلوکار نہیں تھے بس اپنے شوق کے لیے ملی نغمے گاتے تھے جو انتہائی شہرت پا گئے۔ جن میں سوہنی دھرتی اللہ رکھے اور روشن درخشاں نیر و تاباں پاکستان شامل ہیں۔

مقصود حسن

3 ستمبر 2014 کو ریڈیو ٹیلی ویژن اور اسٹیج کے معروف فنکار مقصود حسن کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ نے ریڈیو پاکستان پر بچوں کے پروگرام سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا بعد ازاں آپ نے متعدد ٹیلی وژن اور اسٹیج ڈراموں میں بھی کام کیا۔ آپ کی وجہ شہرت آپ کا چھوٹا قد اور اس پر کمال کی پرفارمنس تھی۔ آپ ریڈیو کی بہت معروف شخصیت منی باجی کے چھوٹے بھائی تھے۔

مرزا ظفر الحسن

4 ستمبر 1984 کو اردو کے معروف ادیب، نقاد، براڈکاسٹر اور یادگار غالب کے روح رواں جناب مرزا ظفر الحسن صاحب کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 30 جون 1916 کو سنگاریڈی حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ آپ نے اپنی تعلیم جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے مکمل کی۔ جامعہ عثمانیہ میں تقریری مقابلوں میں شرکت کے مواقع ملے جس سے تقریر کرنے کا ایسا چسکا پڑا کہ اس کی وجہ سے انجمن اتحاد طلبہ جامعہ عثمانیہ کے صدر بن گئے۔ 1932 میں آپ ریڈیو حیدر آباد دکن سے وابستہ ہو گئے۔ سقوط حیدر آباد دکن کے بعد آپ پاکستان آگئے اور آپ کا تقرر ریڈیو پاکستان پشاور میں ہو گیا اور 5 سال بعد آپ کا تبادلہ کراچی ہو گیا۔ فیض احمد فیض کے حکم پر آپ نے غالب کے صد سالہ برسی کو بنانے کے لئے ادارہ یادگار غالب کو تشکیل دیا اور ناظم آباد کے قلب میں گورنمنٹ کالج
فور مین ناظم آباد سے متصل ایک پلاٹ لائبریری کے لیے حاصل کیا۔ جس پر حبیب بینک سے ایک شاندار بلڈنگ بنوائی جو آج بھی غالب لائبریری کے نام سے مشہور ہے۔ آپ کی تصانیف میں ذکر یار چلے، دکن اداس ہے یارو، پھر نظر میں پھول مہکے، متاع لوح و قلم، اور صلیبیں میرے دریچے کی شامل ہیں۔

سرفراز احمد رفیقی شہید

6 ستمبر 1965 کو ہلال جرات حاصل کرنے والے پاک فضائیہ کے اسکواڈرن لیڈر سرفراز احمد رفیقی شہید ہو گئے۔ آپ 18 جولائی 1935 کو راجشاہی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے 6 ستمبر 1965 کو پاک بھارت جنگ میں 3 طیاروں کی قیادت کرتے ہوئے ہلواڑا کے بھارتی ہوائی اڈے پر حملہ کیا یہ جانتے ہوئے کہ شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ کو وہاں جاتے ہوئے بھی انڈین بمبار

طیاروں نے روکنے کی کوشش کی مگر آپ اپنے پختہ عزم اور حدف کے مطابق ہلواڑا کا اڈہ برباد کرکے رہے۔ اس کے بعد دشمن کے دس طیاروں نے اس چھوٹے سے دستے کا محاصرہ کر لیا اسی اثنا میں آپ نے دشمن کا ایک طیارہ اڑا دیا لیکن جیسے ہی دوسرے فائر کے لئے ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ آتش بار تو خراب ہو چکی ہے۔ چنانچہ آپ نے فوراً دفاعی پوزیشن اختیار کی تاکہ اپنے دوسرے طیاروں کو نکالا جا سکے مگر دشمن نے آپ کا طیارہ مار گرایا اور آپ نے اسی وقت شہادت پائی مگر جرات شجاعت اور ادائیگی فرض کی ایک زندہ جاوید مثال اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ حکومت پاکستان کی جانب سے آپ کی شجاعت کے اطراف میں ہلال جرات کا اعزاز دیا گیا۔

آغا شاہی

6 ستمبر 2006 کو پاکستان کے نامور سفارت کار اور سابق وزیر خارجہ آغا شاہی اسلام آباد میں وفات پا گئے۔ آپ 25 اگست 1920 کو بینگلور میں پیدا ہوئے تھے۔ 1943 میں انڈین سول سروس کا امتحان تیسرے نمبر پر پاس کیا اور انڈین سول سروس سے منسلک ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پاکستان آ گئے اور ڈی ایم جی گروپ میں خدمات انجام دینے لگے۔ 1951 میں پاکستان کی وزارت خارجہ میں شمولیت اختیار کی اور چین سمیت متعدد ممالک میں پاکستان کے سفیر کی خدمات انجام دیں۔ 1960 سے 1972 تک اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے اور اقوام متحدہ کی مختلف کمیٹیوں کے ممبر بھی رہے۔ 1973 سے 1977 تک پاکستان کے وزارت خارجہ کہ سیکرٹری بھی رہے۔ 1977 سے 1982 تک پاکستان کے وزیر خارجہ کے منصب پر بھی فائز رہے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو تمغہ پاکستان اور ستارہ قائد اعظم کے اعزاز سے نوازا۔

ڈاکٹر عبدالوہاب

6 ستمبر 2016 کو ممتاز ماہر تعلیم، جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر، آئی بی اے کے سابق ڈائریکٹر اور محمد علی جناح یونیورسٹی کے سابق صدر ڈاکٹر عبدالوہاب کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 10 جولائی 1939 کو ریاست ٹونک راجستھان میں میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں پاکستان چوک کے علاقے میں دو کمرے کے مکان میں رہائش اختیار کی۔ جوڑیا بازار کے اسکول "تعلیم گاہ" سے میٹرک کیا جبکہ انٹر اور گریجویشن ایس ایم آرٹس اینڈ کامرس کالج سے کیا۔ آئی بی اے سے ایم بی اے کرنے کے بعد اسی ادارے سے لیکچرر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ بعد ازاں کینیڈا کی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور وطن واپسی پر آئی بی اے کے ڈائریکٹر مقرر ہو گئے اور 1999 میں یہیں سے بطور ڈائریکٹر ریٹائر ہوئے آپ نے 1994 سے 1996 تک جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ 2002 سے 2012 تک محمد علی جناح یونیورسٹی کے صدر بھی رہے۔ آپ ایک بہترین استاد اور ایک بہترین منتظم بھی تھے۔ آپ کی قیادت میں آئی بی اے نے بحیثیت ایک انسٹیٹیوٹ بہت ترقی کی اور اس کا شمار پاکستان کی بہترین درسگاہوں میں ہونے لگا۔ آپ ایک اصول پسند انسان تھے اور آپ نے حصول تعلیم اور اپنے ادارے کے انتظام میں کسی تساہل کو برداشت نہیں کیا اور کبھی کسی کی سفارش کو خاطر میں نہیں لائے اپنے ہی ادارے میں داخلے کے لیے مطلوبہ

نمبروں سے کم نمبر ہونے پر اپنے بیٹے کو بھی آئی بی اے میں داخلہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ نے اپنے سوا دو سالہ کراچی یونیورسٹی کی وائس چانسلر شپ کے دوران یہ ثابت کیا کہ ایک اکیلا آدمی بھی اپنی ہمت اور جرات سے پورے نظام کو تبدیل کر سکتا ہے۔ آپ نے مختصر ٹائم میں کراچی یونیورسٹی میں تعلیمی صورتحال کو بہتر بنانے کا بیڑہ اٹھایا اور زبردست مخالفت اور دباؤ کے باوجود انقلابی اقدامات کیے۔ سب سے پہلے نقل کی روک تھام کے لیے بی اے، بی ایس سی، بی کام، ایم اے اور دیگر امتحانات کا مرکز جامعہ کراچی مقرر کر کے نقل کا مکمل خاتمہ کر دیا اور ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ سمسٹر سسٹم مکمل طور پر نافذ کر کے حاضری کو 75 فیصد تک لازمی قرار دیا اور اس پر عمل درآمد کر کے دکھایا۔ جامعہ کراچی کو خسارے سے نکال کر منافع میں لائے اور اس کے مالی حالات مستحکم کیے۔ جامعہ کراچی کی زمینوں پر جو قبضہ ہو گیا تھا وہ تمام واگزار کروایا۔ آپ نے سرکاری اداروں کے اصلاح کے موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی جس میں آپ نے کراچی یونیورسٹی اور آئی بی اے کے تجربات پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اپنی زندگی کے بھی حالات لکھے ہیں۔

حسن عابدی

6 ستمبر 2005 کو اردو کے معروف شاعر اور صحافی حسن عابدی کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ 7 جولائی 1929ء کو ظفر آباد ضلع جون پور میں پیدا ہوئے تھے۔ میٹرک اور انٹر آپ نے شبلی ہائی اسکول سے کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پہلے لاہور میں اور پھر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ 1955 میں آپ نے روزنامہ آفاق سے اپنا صحافتی کیریئر کا آغاز کیا اور بعدازاں فیض احمد فیض کی ادارت میں نکلنے والے مشہور جریدے لیل ونہار سے وابستہ ہو گئے۔ لیل ونہار کے بند ہونے کے بعد کراچی آ گئے جہاں روزنامہ ڈان میں ادبی و ثقافتی کالم لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو وفات تک جاری رہا۔ آپ کی تصانیف میں کاغذ کی کشتی دوسری نظمیں، نوشت نے، جریدہ اور فرار ہونا حرف کا شامل ہیں۔ آپ ایک اچھے مترجم بھی تھے اور آپ نے مشہور دانشور ڈاکٹر اقبال احمد کے مضامین کا اردو ترجمہ اقبال احمد کے منتخب مضامین کے نام سے کیا۔ آپ نے بچوں کے لئے بھی بے شمار کہانیاں اور نظمیں تحریر کیں۔

عبدالغفور مجنیٰ

6 ستمبر 2012 کو دیوار چین، پاکستانی پیلے اور پاکستان کا سیاہ موتی جیسے القابات سے نوازے جانے والے قومی فٹبال ٹیم کے سابق کپتان عبدالغفور مجنیٰ طویل علالت کے بعد کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1938 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ کھیل کا آغاز 1957 میں سیفی اسپورٹس لیاری سے کیا۔ 1958 میں آل پاکستان پریزیڈنٹ گولڈ کپ تک ٹورنامنٹ میں سندھ گورنمنٹ پریس کلب کی نمائندگی کی۔ 1959 میں قومی کوچ میک برائیڈ نے آپ کو قومی کیمپ میں طلب کیا اور قومی ٹیم کا حصہ بنایا۔ قومی ٹیم کے ساتھ آپ نے برما اور ہندوستان کا دورہ کیا اور ایشین کپ میں واحد پاکستانی کھلاڑی ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔

پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

7 ستمبر 1994 کو اردو کے ممتاز ادیب، نقاد، محقق، ماہر تعلیم اور ماہر لسانیات پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 15 جون 1916 کو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے آگرہ بدایوں اور علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ نے رشید احمد صدیقی کی زیر نگرانی لکھنو کے دبستان شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آپ علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہ اردو سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرنے والے پہلے اسکالر تھے۔ بعد میں آپ کا مقالہ کتابی شکل میں متعدد بار شائع ہوا اور یہی آپ کی شہرت کا اصل سبب بنا۔ بعد میں آپ لسانیات کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان چلے گئے۔ قیام پاکستان کے بعد پہلے لاہور اور پھر کراچی کے اندر سکونت پذیر ہوئے۔ 1956 میں کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہوئے اور 1976 میں ریٹائر ہوئے۔ لیکن آپ کی خدمات کے صلے میں آپ کو پروفیسر ایمریطس بنادیا گیا اور یوں آپ اپنے انتقال سے چند گھنٹے پہلے تک علم وادب کی روشنی سے اپنے طالب علموں کے ذہن منور کرتے رہے۔ نصابی کتابوں کی تدوین میں آپ نے بڑا کام کیا۔ آپ ہی کی مرتب کردہ کتابیں برسوں سے درسگاہوں میں پڑھائی جارہی ہیں۔ آپ کا ایک اور بڑا اور اہم کارنامہ چھ جلدوں میں اردو لغت کی تدوین ہے۔ آپ کی دیگر کتب میں آج کا اردو ادب، تاریخ زبان وادبیات اردو، تاریخ اصول تنقید اور جدید اردو ادبیات شامل ہیں۔

سرشار صدیقی

7 ستمبر 2014 کو ممتاز شاعر ادیب اور کالم نگار سرشار صدیقی وفات پاگئے اور کراچی میں ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 25 دسمبر 1926 کو متحدہ ہندوستان کے شہر کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام اسرار حسین محمد امان تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا اور مختلف اخبارات میں کالم نگاری کرتے رہے۔ 1955 میں نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازم ہوئے اور 1984 میں ریٹائرمنٹ لی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ مکمل طور پر ادبی زندگی سے وابستہ ہوگئے اور علامہ نیاز فتح پوری کے مجلے نگار کے مجلس ادارت سے آخری وقت تک وابستہ رہے۔ آپ کے 10 کے قریب شعری مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ روزنامہ جنگ اور ایکسپریس کے لئے بھی طویل عرصے تک کالم نگاری کرتے رہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی سے نوازا۔

پروفیسر سید ریاض احسن

8 ستمبر 2008 کو نامور ماہر تعلیم اور کالج کے اساتذہ کی تنظیم کے بانی سربراہ پروفیسر سید ریاض احسن کراچی میں 56 سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ آپ 25 دسمبر 1951 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد جناب پروفیسر سید ظہیر احسن بھی کراچی یونیورسٹی میں جغرافیہ کے پروفیسر تھے۔ آپ نے BVS اسکول سے میٹرک کیا اور آدم جی سائنس کالج سے انٹر کرکے کراچی

یونیورسٹی سے شماریات میں ایم ایس سی اور ریاضی میں ایم اے کیا۔ بعد ازاں آپ نے اطلاقی ریاضی اور اطلاقی شماریات دونوں میں پی ایچ ڈی بھی کیا۔ 1974 میں آپ نے ڈی جے سائنس کالج سے وابستہ ہو گئے۔ 1982 میں آپ نائجیریا یونیورسٹی ڈیپوٹیشن پر چلے گئے مگر واپس آ کر پھر کراچی میں سینٹ پیٹرک کالج سے وابستہ ہو گئے۔ 1990 میں کراچی یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے اور اپنی وفات تک وہیں رہے۔ آپ کی اصل شہرت سندھ کے کالجز کے لیکچررز اور پروفیسرز کے حقوق کے لئے آپ کی بے باکانہ اور اصولی جدوجہد ہے۔ آپ ایک طویل عرصہ تک کالج پروفیسرز کی تنظیم SPLA کے صدر رہے۔

ثروت حسین

9 ستمبر 1996 کو اردو کے معروف شاعر ثروت حسین کراچی میں ٹرین کے ایک حادثے میں وفات پا گئے۔ آپ 9 نومبر 1949 کو کراچی کے علاقے ملیر کینٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے جامعہ کراچی سے اردو میں ایم اے کیا اور درس وتدریس کو اپنا ذریعہ معاش بنایا۔ 1974 میں آپ جامعہ ملیہ کالج میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اور بعد میں ملیر ڈگری کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ آپ نے 70 کی دہائی میں شاعری کے سفر کا آغاز کر دیا تھا اور ابتدائی چند برسوں میں ہی جدید غزل کے حوالے سے ملک گیر سطح پر اپنا جداگانہ اسلوب رکھنے کی وجہ سے ایک معتبر اور ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ آپ کا پہلا مجموعہ آدھے سیارے پر 1989 میں شائع ہوا جس کی ادبی حلقوں میں بڑی پذیرائی ہوئی تھی اس کے علاوہ آپ کے دو مجموعے خاکدان اور "ایک کٹورا پانی کا" کے نام سے مزید شائع ہوا۔ آپ موجودہ دور میں نظم کے ابھرتے ہوئے مشہور شاعر ڈاکٹر سلمان ثروت کے والد ہیں۔

قائداعظم محمد علی جناح

11 ستمبر 1948 کو مسلمانان برصغیر کے محبوب ترین قائد اور صدی کے عظیم ترین لیڈر قائداعظم محمد علی جناح اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ آپ 25 دسمبر 1876 کو کراچی کے علاقے کھارادر میں واقع وزیر مینشن میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد جناح پونجا کاروبار کے سلسلے میں آپ کی پیدائش سے چند برس پہلے ہی راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) سے کراچی منتقل ہوئے تھے۔ آپ نے سندھ مدرستہ الاسلام سے تعلیم حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ وہاں لنکزان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ واپس آ کر پہلے کراچی میں وکالت شروع کی اور پھر بمبئی جا کر دفتر کھول لیا۔ آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز 1906 میں ہوا۔ 1916 میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نویں سالانہ اجلاس جو لکھنؤ میں منعقد ہوا اس کی صدارت کی اور دونوں بڑی جماعتوں کے درمیان "میثاق لکھنو" طے کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ 1920 میں کانگریس کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے اور 1924 میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پندرویں اجلاس میں جو لاہور میں منعقد ہوا اس کی صدارت کی اور اس اجلاس میں آئندہ 3 سال کے لیے مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔
1929 میں نہرو رپورٹ کے جواب میں اپنے مشہور 14 نکات پیش کیے۔ 1937 کے انتخابات میں مسلم لیگ کی شکست کے نتیجے میں آپ نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کا عزم کر لیا اور شب و روز کام کیا پورے ہندوستان کے طول و عرض میں دورے کیے جس کے نتیجے

میں 1946 کے انتخابات میں آپ کی قیادت میں مسلم لیگ نے مرکزی اسمبلی کی مسلم نشستوں پر مکمل کامیابی حاصل کی۔ آپ نے قیام پاکستان کے لیے 14 اگست 1947 تک شب و روز انتھک محنت کی جبکہ تب دق کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان کے گورنر جنرل بنے اور پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے صدر منتخب ہوئے لیکن آپ صرف اجلاس میں شریک ہو سکے کیونکہ بیماری اور شدید مصروفیات نے آپ کو بہت زیادہ تھکا دیا تھا۔ آرام کی غرض سے بلوچستان کے صحت افزا مقام زیارت گئے مگر تھوڑے ہی عرصے بعد 11 ستمبر 1948 کو وفات پا گئے۔

میجر ضیاء الدین احمد عباسی

11 ستمبر 1965 کو چونڈا سیالکوٹ میں معروف ٹینکوں کی لڑائی کے ہیرو میجر ضیاء الدین احمد عباسی دوران جنگ چونڈا میں شہید ہو گئے۔ جنگ شروع ہونے سے صرف 7 دن پہلے آپ کی شادی ہوئی تھی۔ مگر آپ جنگ کا سن کر واپس آ گئے اور بڑھ چڑھ کر جنگ میں حصہ لینے کے خواہشمند تھے۔ چونڈا میں آپ کی حیرت انگیز پلاننگ اور حکمت عملی کے باعث آپ اور آپ کے بہادر ساتھیوں نے 30 ٹینکوں کے ساتھ دشمن کے 600 ٹینک تباہ کیے اور ساتھ میں اسے بھاری جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ برستے گولوں کی بارش میں آپ اپنے ٹینک پر کھڑے سپاہیوں کو ہدایات دے رہے تھے کہ دشمن کا ایک گولا آپ کے جسم سے ٹکرایا اور آپ شہید ہو گئے۔ آپ کی شاندار قربانی اور شجاعت کے اطراف میں حکومت پاکستان نے ستارہ جرات عطا کیا۔ آپ کی یادگار کے طور پر کراچی میں بلدیہ عظمیٰ کراچی کے زیر اہتمام ایک بڑا اسپتال آپ کے نام سے "عباسی شہید اسپتال" قائم کیا گیا۔

ناظم جیوا

12 ستمبر 1999 کو ممتاز سماجی رہنما اور فاطمید فاؤنڈیشن کے سربراہ ناظم جیوا کراچی ائیر پورٹ پر امیگریشن کاؤنٹر پر اچانک دل کا دورہ پڑنے کے باعث انتقال کر گئے. آپ 1943 میں پیدا ہوئے تھے۔ 1978 میں آپ نے کراچی میں فاطمید کے نام سے ایک فلاحی تنظیم کی بنیاد رکھی تھی جس کا مقصد خون کی مختلف بیماریوں میں مبتلا افراد کو بلا معاوضہ خون فراہم کرنا تھا۔ رفتہ رفتہ اس ادارے کی شاخیں پورے پاکستان میں کھل گئی اور آج بھی آپ کا لگایا ہوا پودا درخت بن کر پورے پاکستان میں خون کی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کو مفت خون فراہم کر رہا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی

13 ستمبر 2020 کو نامور ادیب، محقق اور ماہر لسانیات علامہ ضمیر اختر نقوی کراچی میں وفات پا گئے اور وادی حسین کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 24 مارچ 1940 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم اور گریجویشن آپ نے لکھنؤ سے ہی کیا۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ میر نفیس اکیڈمی کے صدر، رسالے القلم کے مدیر اعلی اور مرکز علوم اسلامیہ پاکستان کے صدر بھی تھے۔ اردو رثائی ادب میں آپ کو دنیا بھر میں شہرت حاصل تھی۔ آپ کی اپنے گھر میں

خود ایک بہت بڑی اور شاندار لائبریری موجود تھی۔ رثائی ادب سے متعلق شاید ہی پوری دنیا میں اتنی کتابیں کسی لائبریری میں ہوں جتنی آپ کے پاس موجود تھیں۔ آپ نے آپ نے خود بھی بہت ساری کتابیں تحریر کیں جن میں زیادہ تر رثائی ادب پر ہیں۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے گھر کو آپ کی وصیت کے مطابق لائبریری بنا دیا گیا اور اس کا نام آپ کے نام پر یعنی ضمیر اختر نقوی لائبریری رکھا گیا۔

لہری

13 ستمبر 2012 کو پاکستان کے ممتاز مزاحیہ اداکار لہری کراچی میں وفات پا گئے اور یاسین آباد کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 2 جنوری 1929 کو کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سفیر اللہ صدیقی تھا۔ آپ نے آپ نے فنی کیریئر کا آغاز پچاس کی دہائی میں کیا اور تقریباً 200 کے قریب فلموں میں کام کیا۔ آپ ایک منفرد اداکار تھے اور مزاح کی خاص بات آپ کے برجستہ جملے ہوتے تھے۔ آپ کبھی بھی مزاح پیدا کرنے کے لیے ایکشن سے کام نہیں لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے مزاح کا ایک نیا باب کھولا۔ آخری وقتوں میں آپ نے فلمی دنیا سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور اپنے آپ کو ذکر خدا میں اور استغفار میں مشغول کر لیا تھا لیکن آخری وقت تک اپ کی برجستہ جملوں کا استعمال اور حاضر دماغی نہیں گئی۔

ڈاکٹر ایس ایم رب

15 ستمبر 2015 کو پاکستان کے نامور معالج محقق اور مرض کی تشخیص کے ماہر ڈاکٹر ایس ایم رب 83 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ آپ 1931 میں پٹنہ بہار میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد پٹنہ میں آئی جی پولیس تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے خاندان کے ساتھ مشرقی پاکستان میں ہجرت کر گئے اور ڈھاکہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی اور اعلی تعلیم کے حصول کے لیے لندن چلے گئے۔ آپ کی پریکٹس کے اولین دنوں میں ہی اس وقت آپ کی تشخیص کی دھوم ہوگئی جب آپ نے موت کے قریب پہنچی ہوئی عورت کی ٹھیک تشخیص کر کے اس کی جان بچائی۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد آپ کو ایک بار پھر ہجرت کرنی پڑی اور آپ کراچی منتقل ہو گئے۔ کراچی آکر آپ 1972 میں جناح میڈیکل کالج میں تدریس کا پیشہ اختیار کیا۔ اور 1991 میں ہیڈ آف میڈیسن ڈیپارٹمنٹ کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ مگر 2000ء تک پڑھاتے رہے۔ آپ ویسے تو جنرل فزیشن تھے لیکن ہر مرض کے ماہرین آپ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے تھے۔ آپ نے اپنی تشخیص سے اتنے لوگوں کو بچایا کے کراچی میں آپ کے بارے میں ایک محاورہ مشہور ہو گیا "اوپر رب اور نیچے ڈاکٹر رب"۔ آپ ایک بہترین معالج ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہترین استاد بھی تھے۔ آپ سے پڑھنے والے بے شمار طالب علم جو آج پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن وہ آپ کا شاگرد ہونا اپنی سب سے بڑی خوش نصیبی سمجھتے ہیں۔ اسی لئے آپ کو استادوں کا استاد بھی کہا جاتا ہے۔ آپ کالج آف فزیشن اینڈ سرجن کے بانی رکن تھے اور اس سے عقیدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کی نماز جنازہ بھی اس کالج کے گراؤنڈ میں ادا کی گئی۔ آپ ایک دفع سندھ کے ہیلتھ منسٹر بھی رہے۔ حکومت پاکستان میں آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ستارہ امتیاز عطا کیا۔

ہاجرہ مسرور

15 فروری 2012 کو اردو کی ممتاز افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ 12 جنوری 1931 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ کے والد ڈاکٹر تہوار احمد خان برطانوی فوج میں ڈاکٹر تھے۔ آپ جب آٹھ سال کی تھی تو والد کا انتقال ہو گیا جس کی وجہ سے آپ کا گھرانہ نامسائد حالات کا شکار ہوا لیکن پھر بھی آپ نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔ آپ کی والدہ خود رسالہ "عصمت" میں مضمون نگار تھیں جب کہ آپ کی بڑی بہن خدیجہ مستور اردو کی نامور ناول نگار تھیں۔ اسی وجہ سے آپ کو بھی فطری طور پر ادب سے لگاؤ تھا۔ آپ نے بہت کم عمری میں ہی افسانہ نگاری شروع کر دی تھی جس سے آپ کی کافی شہرت ہو گئی تھی اس کا اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب احمد ندیم قاسمی آپ کے افسانوں سے متاثر ہو کر آپ سے ملنے گئے تو حیران رہ گئے کہ یہ اتنی چھوٹی سی لڑکی ایسے افسانے کیسے لکھ لیتی ہے جن میں نفسیات مشاہدات اور بڑی جاندار توقعات کی دنیا آباد ہوتی ہیں۔ آپ نے تحریک پاکستان میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور مسلم لیگ کے خواتین گروپ کو منظم کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور میں سکونت پذیر ہوئی اور احمد ندیم قاسمی کے ساتھ ادبی جریدہ نقوش شائع کرنا شروع کیا۔ آپ کی شادی معروف صحافی احمد علی خان سے ہوئی اور پھر آپ کراچی منتقل ہو گئیں۔ آپ کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ برائے تمغہ حسن کارکردگی عطا کیا۔

ابوالفضل صدیقی

16 ستمبر 1987 کو اردو کے صف اول کے افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 4 ستمبر 1987 کو عارف پور ضلع بدایوں میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی ہجرت کر کے آئے تو جیکب لائن کے دو کمروں کے کوارٹر میں رہنے لگے کہاں ایکڑوں پر پھیلی ہوئی حویلی اور کہا دو کمروں کا کوارٹر لیکن آپ نے جواں مردی سے حالات کا مقابلہ کیا۔ 1932 میں آپ نے افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ آپ کے ہم عصر افسانہ نگاروں میں سجاد حیدر یلدرم، اختر حسین رائے پوری، غلام عباس، کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو شامل تھے مگر آپ نے ان سب لوگوں سے بالکل الگ اور ممتاز مقام حاصل کیا۔ آپ کی انفرادیت کی اصل وجہ سے آپ کے افسانوں کی موضوعات اور ان کا اسلوب ہے۔ آپ کے افسانے "چڑھتا سورج" پر 1957 میں یونسکو بین الاقوامی انعام دیا گیا۔ آپ کی ایک درجن سے زیادہ تصانیف موجود ہیں جن میں دن ڈھلے، گلاب خاص، ستاروں کی چال، احرام، آئینہ، انصاف اور ترنگ سر فہرست ہیں اور شخصی خاکوں کا مجموعہ "عہد ساز لوگ" شامل ہے۔

پروفیسر رفعت کریم

16 ستمبر 2008 کو انگریزی زبان و ادب کے معروف استاد پروفیسر رفعت کریم کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ 14 اگست 1940 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گھر میں اپنے والد سے حاصل کی. آپ نے جامعہ کراچی سے گریجویشن کیا اور

جامعہ پنجاب سے انگریزی اور معاشیات میں ایم اے کیا۔ 1972 میں جامعہ کراچی کے شعبہ انگریزی سے بطور استاد وابستہ ہوئے۔ آپ پاکستان میں شیکسپیئر پر اتھارٹی تصور کیے جاتے تھے اور شیکسپیئر ایسوسی ایشن آف پاکستان کے بانی صدر تھے۔ 1997 میں آپ نے بین الاقوامی شیکسپیئر کانفرنس بھی منعقد کروائی تھی۔

ڈاکٹر محمد شکیل اوج

18 ستمبر 2014 کو نامور ادیب، محقق، ماہر تعلیم اور کراچی یونیورسٹی کے شعبہ علوم اسلامیہ کہ رئیس (Dean) ڈاکٹر محمد شکیل اوج کراچی میں نامعلوم افراد کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ آپ یکم جنوری 1960 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے علامہ اقبال گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا اور ایم اے اسلامک سٹڈیز میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا اسکے علاوہ آپ نے صحافت میں ایم اے کیا اور ایل ایل بی کی سند بھی حاصل کی۔ آپ کے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ "قرآن مجید کے آٹھ منتخب اردو مترجم کا تقابلی جائزہ" تھا جس پر جامعہ کراچی نے 2000ء میں آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔ 2014 میں ڈی۔ لٹ کی سند حاصل کی اور یہ اعزاز علوم اسلامی میں حاصل کرنے والے پاکستان کے دوسرے فرد تھے۔ آپ 1987 میں جامعہ کراچی کے شعبہ علوم اسلامی سے وابستہ ہوئے اور عمر کے آخری دور میں آپ جامعہ کراچی کے شعبہ معارف اسلامیہ کے رئیس تھے۔ آپ کو بچپن سے ہی مطالعہ اور تحریر سے شوق تھا۔ 15 سال کی عمر میں حکیم محمد سعید کے رسالے "ہمدرد نونہال" میں پیغام کے نام سے آپ کا پہلا مضمون شائع ہوا۔ آپ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ مفسر قرآن بھی تھے اور آپ علوم تفسیر اور قرآن میں تحقیق و تصنیف کے حوالے سے معروف نام تھے۔ آپ کے لاتعداد مقالے مضامین اور دیگر تحریر اخبارات اور رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔ آپ کی مطبوعہ کتب کی کل تعداد 15 ہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو تمغہ امتیاز کا اعزاز عطا کیا۔

خورشید اسلم

18 ستمبر 1992 کو پاکستان کے مشہور او لمپیئن کھلاڑی خورشید اسلم کراچی میں وفات پاگئے اور گلشن اقبال کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 6 اپریل 1935 کو جبلپور انڈیا میں پیدا ہوئے تھے پاکستان کی ہاکی ٹیم میں فلبیک کی پوزیشن پر کھیلا کرتے تھے۔ 1958 کے ایشیائی کھیلوں اور 1960 کے روم اولمپکس میں پاکستان کی نمائندگی بھی کی۔ بعد ازاں آپ قومی ہاکی ٹیم کے سلیکٹر اور کوچ بھی رہے پاکستان کے مشہور ہاکی کھلاڑی اختر الاسلام آپ کے چھوٹے بھائی ہیں۔

محمد یوسف

20 ستمبر 1995 کو اسٹیج ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے معروف فنکار محمد یوسف کراچی میں وفات پاگئے اور میوہ شاہ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ نے اپنے فنی کیریئر کا آغاز 1945 میں آل انڈیا ریڈیو سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور آ گئے اور پھر مستقل سکونت کراچی میں اختیار کی۔ کراچی میں آپ نے خواجہ معین الدین کے اسٹیج ڈراموں میں اداکاری کے جوہر دکھائے اس کے ساتھ

ساتھ آپ ریڈیو پاکستان میں بھی صداکاری کرتے رہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد آپ نے متعدد ڈراموں اور سیریلز میں کام کیا۔ تاریخی ڈرامہ سیریل شاہین میں آپ کا کردار ابوداؤد کے نام سے بہت مشہور ہوا۔

شاہد حسین عشقی

20 ستمبر 2006 کو معروف شاعر اور ماہر تعلیم شاہد حسین عشقی وفات پاگئے۔

آپ 4 جولائی 1926 کو رامپور یوپی میں پیدا ہوئے تھے۔ گورنمنٹ کالج اجمیر سے آپ نے انٹر کیا اور جے پور یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی منتقل ہوگئے اور یہاں آکر کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ پاکستان پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ لیکچرار بن گئے۔ ابتداء میں آپ کا تقرر بہاولنگر میں ہوا اس کے بعد کراچی میں مختلف کالجوں میں پروفیسر رہے۔ آخر میں ڈی جے سائنس کالج میں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے اور یہیں سے 1984 میں ریٹائر ہوئے۔ آپ نے غزل اور نظم دونوں لکھیں مگر محبوب صنف سخن غزل تھی۔

مقبول فرید صابری

21 ستمبر 2011 کو پاکستان کے نامور قوال مقبول فرید صابری جنوبی افریقہ میں وفات پاگئے۔ آپ 12 اکتوبر 1941 کو کلیان (ہندوستان) میں پیدا ہوئے تھے۔ 11 برس کی عمر میں آپ نے اپنے بڑے بھائی غلام فرید صابری کی ہمنوائی میں قوالی کا آغاز کیا۔ اور ان کی وفات تک ان کے دست راست بنے رہے۔ ان کی جوڑی اپنے وقت کی مقبول ترین قوالی جوڑی سمجھی جاتی تھی۔ آپ کی مشہور قوالیوں میں بھر دو جھولی میری یا محمد، تاجدار حرم، من کن تو مولا اور میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا قابل ذکر ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان دونوں بھائیوں کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی بھی عطا کیا۔

عبدالماجد

21 ستمبر 1965 کو ریڈیو پاکستان کے نامور صداکار عبدالماجد کراچی میں اپنے بچے کو بجلی کے ایک تار سے بچاتے ہوئے کرنٹ لگنے سے جاں بحق ہوگئے۔ آپ 1926 کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی آواز پورے پاکستان میں جانی جاتی تھی حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں 26 جولائی 1966 کو بعد از مرگ تمغہ امتیاز عطا کیا۔

سید اقبال عظیم

22 ستمبر 2000ء کو اردو کے معروف شاعر ادیب اور محقق سید اقبال عظیم کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 8 جولائی 1913 کو یوپی کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ علم و ادب سے شغف وراثت میں پایا تھا آپ کے دادا، نانا اور والد سب ادب سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی سید وقار عظیم معروف نقاد اور ماہر تعلیم تھے۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور آگرہ یونیورسٹی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے ڈھاکہ میں سکونت اختیار کی اور مختلف کالجوں اور ڈھاکہ

یونیورسٹی سے وابستہ رہے۔اسی زمانے میں آپ نے کی تحقیق کی کتابیں بھی تالیف کیں جن میں بنگال میں اردو، سات ستارے اور مشرق کے نام سرفہرست ہیں۔1970 میں آپ کراچی منتقل ہوگئے اور اپنی وفات تک یہیں اقامت پذیر رہے۔آپ کے شاعری کے مجموعے مضارب، قاب قوسین، مضارب ورباب، لب کشااور ماحاصل وغیرہ سرفہرست ہیں۔آپ ایک اچھے نعت گو شاعر بھی تھے آپ کی ایک نعت بہت مشہور ہوئی جس کے دو مصرعے یہ ہے

مدینے کا سفر ہے اور میں نمدیدہ نمدیدہ

جبیں افسردہ افسردہ قدم لغزیدہ لغزیدہ

رئیس امروہوی

22 ستمبر 1988 کو اردو کے نامور شاعر اور ادیب رئیس امروہی ایک نامعلوم قاتل کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔آپ 12 ستمبر 1914 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔آپ کے جد اعلیٰ کا نام سید حسین شرف الدین تھا جنھیں شاہ ولایت کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔اردو فارسی اور عربی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انگریزی آپ نے خود سیکھی۔آپ نے شاعری کا آغاز 10 سال کی عمر میں کردیا تھا۔آپ نے عملی زندگی کا آغاز ہفت روزہ مسافت کی ادارت سے کیا۔پھر مختلف رسالوں اور اخبارات سے منسلک رہے۔تحریک پاکستان کے زمانے عروج میں آپ کی نظمیں اس نصب العین کے لیے وقف تھیں خاص طور پر آپ کی وہ نظم جس کا یہ تاریخی شعر بہت مشہور ہوا

یاد رکھنا وقت کا فرمان ٹل سکتا نہیں

موت ٹل سکتی ہے پاکستان ٹل سکتا نہیں

1946 میں روزنامہ جنگ دہلی سے وابستہ ہوئے جس میں پہلا قطعہ 5 جون 1947 کو شائع ہوااس دن سے لے کر اپنے یوم وفات تک ماسوائے چند دنوں کے آپ کا قطعہ جنگ میں انتہائی باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔آپ کے قطعات دراصل پاکستان کی منظوم تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔کیونکہ آپ کا ہر قطعہ اس دن کے سب سے اہم سیاسی یا معاشرتی واقعے پر طنز کی حیثیت رکھتا ہے۔آپ نے شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔جنگ میں ہر جمعے کو نفسیات، سیاسیات، سماجیات، یوگا، علم نجوم، فلسفہ اور دیگر علوم پر سادہ نثر میں کالم لکھتے تھے۔آپ کے 4 شعری مجموعوں اور قطعات کے الگ چار مجموعے شامل ہیں جب کہ نفسیات اور مابعد طبیعات کے موضوع پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں ہیں۔

عزیزالرحمن

22 ستمبر 2014 کو سابق اولمپین عزیزالرحمن کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 13 مارچ 1923 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ایم بی ہائی اسکول دہلی سے میٹرک کیا اور یہیں سے ہاکی کھیلنے کی ابتدا کی۔ آپ سائیڈ رائٹ کی پوزیشن پر کھیلتے تھے۔ 1942 سے 1947 تک دہلی کی نمائندگی کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور کئی برس تک پاک پی ڈبلیوڈی کی طرف سے ہاکی کھیلتے رہے۔ آپ نے پاکستان کی جانب سے 1948 کے برطانیہ اولمپکس میں پاکستان کی نمائندگی کا اعزاز حاصل کیا۔

شاعر لکھنوی

23 ستمبر 1989 کو معروف شاعر شاعر لکھنوی وفات پاگئے اور کراچی میں یاسین آباد کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 16 نومبر 1917 کو لکھنو میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن ہی سے تھا اور زمانہ طالب علمی میں ہی اشعار کہنا شروع کردیے تھے۔ کانپور کے ایک مشاعرے میں آپ کی پڑھی ہوئی غزل کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی جس کے بعد آپ کو بطور شاعر مشاعروں میں باقاعدگی سے مدعو کیا جانے لگا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے جہاں باقاعدہ فیچر پروگرام "پاکستان ہمارا ہے" پیش کرتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی اور ہمدرد دواخانہ سے وابستہ ہوگئے۔

تابش دہلوی

23 ستمبر 2004 کو اردو کے ممتاز شاعر تابش دہلوی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 9 نومبر 1911 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا تعلق شمس العلماء منشی ذکاءاللہ کے گھرانے سے تھا۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت والدہ کے زیر سایہ ہوئی آپ کو بچپن میں ہی فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے۔ 1939 میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہوگئے اور قیام پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان لاہور میں قائم ہوا تو پہلے لاہور میں رہے پھر نیوز یونٹ کو لے کر کراچی آگئے اور ایک طویل عرصے تک آپ نیوز کاسٹر اور پروڈیوسر رہے۔ آپ بنیادی طور پر غزل گو تھے مگر آپ نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ آپ کے شعری مجموعوں میں نیمروز، چراغ صحرا، غبار انجم، گوہر انجم اور دھوپ چھاؤں اس کے علاوہ نثری تصانیف میں دید باز دید شامل ہیں۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو "نشان پاکستان" کا اعزاز عطا کیا.

سید الطاف علی بریلوی

24 ستمبر 1986 کو نامور ماہر تعلیم اور تحریک پاکستان کے کارکن سید الطاف علی بریلوی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 10 جولائی 1905 کو بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے آپ نے اپنی تعلیم مکمل کی۔ سرسید کی قائم کردہ آل انڈیا مسلم

ایجو کیشنل کانفرنس کے بطور افسر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد جب آپ کراچی آئے تو یہاں آکر آل پاکستان ایجو کیشنل کانفرنس تشکیل دی جسے اس وقت کے بڑے بڑے دانشوروں اور ماہرین تعلیم کے ساتھ مل کر قائم کیا۔ آپ اس کے بانی سیکریٹری تھے اور آپ ہی کی ذاتی دلچسپی سے سر سید کالج قائم ہوا جو کراچی میں طالبات کا سب سے بڑا معیاری کالج سمجھا جاتا ہے۔ آپ کی بیگم سیدہ انیس فاطمہ بریلوی ہر قدم پر آپ کا ساتھ دیتیں ان کی مدد سے گولی مار کے علاقے میں 16 اسکول کھولے اس کے علاوہ فری پبلک لائبریری ناظم آباد میں قائم کی جس میں تحریک پاکستان اور علی گڑھ تحریک سے متعلق انمول لٹریچر موجود ہے۔ شعبہ تصنیف و تالیف بھی قائم کیا جس کے پہلے صدر سید سلیمان ندوی مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک ادبی ماہانہ جریدہ العلم کے نام سے مرتب کر کے شائع کرنا شروع کیا۔ آپ کی تصانیف میں علی گڑھ تحریک اور قومی نظمیں، طالب علم کی ڈائری، حاصل مطالعہ اور مقالات بریلوی سر فہرست ہیں.

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

25 ستمبر 2005 کو ممتاز روحانی شخصیت محقق اور ماہر تعلیم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان حیدر آباد میں وفات پاگئے اور سپر ہائی وے حیدر آباد ٹول پلازہ کے قریب غفوریہ مسجد کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ یکم جولائی 1912 کو جبل پور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارسی اور اردو میں ایم اے اور ایل ایل بی کی اسناد حاصل کیں اور 1947 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اسی دوران آپ ناگپور یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور 1950 میں بابائے اردو کی درخواست پر اردو کالج کے صدر شعبہ اردو کے عہدے پر فائز ہوئے۔ مگر کچھ عرصے بعد علامہ آئی آئی قاضی اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اصرار پر سندھ یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے جہاں آپ صدر شعبہ اردو کی ذمہ داریاں نبھاتے رہے۔ اس عہدے پر آپ 1976 تک فائز رہے 1988 میں سندھ یونیورسٹی نے آپ کو پروفیسر ایمریطس کے درجے پر فائز کیا۔ آپ 100 سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی اور ستارہ امتیاز بھی عطا کیا تھا۔

فتحیاب علی خان

26 ستمبر 2010 کو معروف سابق طالبعلم رہنما فتحیاب علی خان کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1936 میں حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ شکار پور میں اقامت پذیر ہوئے۔ ابتدائی تعلیم شکار پور میں ہی حاصل کی۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کراچی آگئے اور اسلامیہ کالج میں ایڈمیشن لیا۔ اسلامیہ کالج میں ہی آپ طلباء سیاست میں شامل ہو گئے تھے اور تھوڑے ہی دنوں میں اپنے انداز بیاں اور دلائل کی قدرت کی وجہ سے ایک بڑے طالب علم رہنما بن گئے۔ ایوب خان کے دور حکومت میں پہلی آواز کراچی کے طالب علموں نے اٹھائی جس کی قیادت آپ ہی کر رہے تھے فوجی عدالتوں نے آپ کو اور آپ کے

11 ساتھیوں کو ایک سال کی سزا سنائی اور رہائی کے بعد شہر بدر کر دیا آپ کے ساتھیوں میں معراج محمد خان، شیر افضل، انور احسن صدیقی، امیر حیدر کاظمی، اقبال میمن، آغا جعفر، جوہر حسین، علی مختار رضوی، محبوب علی اور نفیس صدیقی شامل تھے۔ زمانہ طالب علمی کے بعد آپ نے وکالت شروع کی اور کسان مزدور پارٹی میں شامل ہو گئے اور باقی پوری زندگی مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کے لیے لڑتے رہے۔

آئی آئی چندریگر

26 ستمبر 1960 کو پاکستان کے سابق وزیر اعظم اور تحریک پاکستان کے رہنما آئی آئی چندریگر وفات پا گئے۔ آپ 15 ستمبر 1897 کو احمد آباد میں پیدا ہوئے تھے آپ کا پورا نام اسماعیل ابراہیم چندریگر تھا۔ آپ نے بمبئی یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وکالت کے شعبے سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ سیاست میں آ گئے اور مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بمبئی کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے۔ 1940 کو لاہور میں ہونے والے تاریخی جلسے میں آپ کو تقریر کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ 1946 میں آپ آل انڈیا مسلم لیگ کی جانب سے ہندوستان کی عبوری کابینہ کے رکن بنائے گئے اور آپ کو تجارت کی وزارت دی گئی قیام پاکستان کے بعد بھی آپ کو مرکزی وزیر تجارت و صنعت بنایا گیا۔ کچھ عرصہ افغانستان میں پاکستان کے سفیر بھی رہے اور صوبہ سرحد اور صوبہ پنجاب کے گورنر بھی بنے۔ 18 اکتوبر 1957 کو آپ پاکستان کے چھٹے وزیر اعظم منتخب ہوئے مگر صرف 55 دن بعد 11 دسمبر 1957 کو اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

مولانا محمد اسماعیل ذبیح

27 ستمبر 2001 کو صحافی مصنف اور تحریک پاکستان کے پر جوش کارکن مولانا محمد اسماعیل ذبیح وفات پا گئے۔ آپ 1913 کو کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے گھر میں ہی حاصل کی اور پھر جامعہ ملیہ سے تعلیم مکمل کی اور بمبئی جا کر صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ صحافت کے ساتھ ساتھ سیاسی زندگی کا آغاز بھی کیا اور مجلس احرار ہند کے پبلسٹی سیکرٹری مقرر ہوئے جس کی وجہ سے کئی بار قید بھی ہوئے قید کے دوران بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں کے اصل منصوبے سے آگاہ ہوئے تو 1944 میں مسلم لیگ کے ہمنوا ہو گئے۔ 1946 کے عام تاریخ ساز انتخابات کے موقع پر یوپی کی اسمبلی کی مسلم نشستوں کے الیکشن انچارج بنے اور ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کی تمام کی تمام مسلم امیدواروں کو تاریخی کامیابی ہوئی جس پر قائد اعظم اور قائد ملت لیاقت علی خان کی جانب سے شکریہ اور ستائش کا اعزاز بھی حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس منعقدہ دسمبر 1947 خالق دینا ہال کراچی کا اہتمام بھی آپ ہی نے کیا تھا۔ آپ بے شمار قومی مضامین کے مصنف ہیں۔ آپ کی تین کتابیں برصغیر میں مسلمانوں کا عروج و زوال کا آئینہ اسلام آباد اور منزل مراد بہت زیادہ مشہور ہیں۔ حکومت پنجاب نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو تحریک پاکستان گولڈ میڈل دیا۔

حمید نسیم

28 ستمبر 1998 کو ممتاز اردو شاعر، ادیب، براڈ کاسٹر، نقاد اور مفسر قرآن حمید نسیم کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 16 اکتوبر 1920 کو شاہ پور ضلع گرداس پور میں پیدا ہوئے تھے پنجاب یونیورسٹی سے آپ نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے ریڈیو پاکستان سے وابستگی اختیار کی اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ریڈیو پاکستان کے عہدے تک پہنچے۔ ریڈیو پاکستان سے آپ نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ حاصل کی اور اس کے بعد علوم اسلامی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ آپ قرآن پاک کی تفسیر معارف القرآن کے نام سے تحریر کررہے تھے جس کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی تھیں لیکن آپ کی ناگہانی وفات کی وجہ سے تفسیر نامکمل رہ گئی۔ اس کے علاوہ آپ کی خود نوشت ناممکن کی جستجو اور شاعری کے مجموعے درد تحیر اور گرد ملال کے علاوہ تنقیدی مقالات علامہ اقبال ہمارے شاعر اور پانچ جدید شاعر بھی شامل ہیں۔

امید فاضلی

28 ستمبر 2005 کو اردو کے ممتاز شاعر امید فاضلی کراچی میں وفات پاگئے. آپ 17 نومبر 1923 کو ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام ارشاد احمد تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے میرٹھ سے حاصل کی اور گریجویشن علی گڑھ یونیورسٹی سے مکمل کیا۔ 1944 میں آپ کنٹرولر آف ملٹری اکاؤنٹس کے محکمے سے وابستہ ہوئے۔۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی اور اسی محکمے سے وابستہ رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے تصنیف وتالیف اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور ماہنامہ "الفاظ" میں مدیر کی حیثیت سے منسلک ہوگئے۔

آپ اہم غزل گو اور اہم مرثیہ گو شعرا میں شمار ہوتے تھے۔ آپ کے پہلے شعری مجموعے دریا آخر دریا کے نام سے اشاعت پذیر ہوا جس پر آپ کو آدم جی ادبی انعام بھی عطا ہوا تھا۔ آپ کے مرثیوں کا مجموعہ سرے نوا کے نام سے شائع ہوا۔ نعتوں کا مجموعہ میرے آقا کے نام سے شائع ہوا جیسے رائٹر گلڈ کا انعام عطا ہوا تھا۔ قومی شاعری کا مجموعہ پاکستان زندہ باد اور تب وتاب جاودانہ کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔

علامہ عبدالعزیز عرفی

28 ستمبر 2015 کے ممتاز قانون دان اور سیرت نگار علامہ عبدالعزیز عرفی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 4 مارچ 1927 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے ابتدائی تعلیم سٹی ہائی سکول علی گڑھ سے حاصل کی اور گریجویشن بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے کیا۔ آپ زندگی بھر اسلامی تعلیمات تصوف اور سیرت نگاری کے موضوعات پر لکھتے رہے۔ 1980 میں آپ نے چار جلدوں میں سیرت طیبہ پر ایک جامع کتاب جمال مصطفی تحریر کی۔ جنرل محمد ضیا الحق نے آپ کو اسی سال جمال مصطفی پر پہلا سیرت ایوارڈ عطا کیا۔ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ نے قرآن آرکائیو کا شعبہ قائم کیا جس میں قرآن پاک کے بے شمار نادر نسخے یکجا کیے گئے ہیں۔

نئیر علوی

29 ستمبر 2001 کو پاکستان کے ممتاز صحافی اور دانشور نئیر علوی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ کا اصل نام نیر اقبال تھا اور 2 اکتوبر 1939 کو دہرہ دون میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد پنڈی میں سکونت اختیار کی لیکن بعد ازاں کراچی منتقل ہو گئے جہاں آپ نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ آپ نے ہفت روزہ لیل ونہار سے اپنی فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ 1959 میں روزنامہ جنگ راولپنڈی سے منسلک ہوئے اور 1962 میں جب روزنامہ حریت جاری ہوا تو اس کے نیوز ایڈیٹر اور ایگزیکٹو ایڈیٹر رہے۔ اس کے علاوہ آپ روزنامہ جسارت، صداقت، انجام، اعلان اور پھر جنگ سے بھی منسلک رہے۔ 1983 میں آپ نے روزنامہ نوائے وقت کراچی کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔ 1998 میں جب کراچی سے روزنامہ ایکسپریس کا آغاز ہوا تو آپ اس کے پہلے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور اپنی وفات تک اسی عہدے پر فائز رہے۔

سید ہاشم رضا

30 ستمبر 2003 کو پاکستان کے ممتاز بیوروکریٹ، دانشور، شاعر اور سابق صوبائی وزیر سید ہاشم رضا کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 16 فروری 1910 کو ضلع اناؤ یوپی میں پیدا ہوئے تھے آپ کے والد جسٹس محمد رضا لکھنؤ کورٹ میں جج تھے۔ سیاسیات میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ چلے گئے۔ وطن واپس آکر آپ نے مقابلے کا امتحان پاس کیا اور 1934 میں انڈین سول سروس سے وابستہ ہو گئے۔ آپ مختلف محکموں میں فرائض انجام دیتے رہے قیام پاکستان کے بعد اپنی مرضی سے پاکستان کا انتخاب کیا۔ قیام پاکستان سے پہلے آپ لاڑکانہ اور تھرپارکر ضلع کے ڈپٹی کمشنر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی کے ایڈمنسٹریٹر بنے اس کے علاوہ سندھ کے تعلیم اور صحت کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ بعد ازاں آپ بہاولپور ڈویژن کے کمشنر اور مشرقی پاکستان کے گورنر بھی رہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ستارہ پاکستان اور ستارہ قائداعظم کے اعزازات سے نوازا۔ آپ مشہور شاعر سید آل رضا کے بڑے بھائی تھے جبکہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے سابق گورنر سلیم رضا اور نیشنل بینک آف پاکستان کے صدر علی رضا آپ کے فرزند ہیں۔ آپ کی خودنوشت ہماری منزل کے نام سے اشاعت پذیر ہوئی۔

الیاس سیتاپوری

یکم اکتوبر 2003 کو نامور تاریخی ناول نگار اور افسانہ نگار الیاس سیتاپوری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1935 کو سیتاپور ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام محمد الیاس خان تھا۔ پرائمری تک تعلیم سیتاپور میں ہی حاصل کی اور والد کے انتقال کے بعد روزگار کے حصول کے لئے لکھنؤ آگئے جہاں آپ کی ملاقات نسیم بک ڈپو کے مالک نسیم صاحب سے ہوئی اور ان ہی کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کی وجہ سے آپ نے اپنے قلمی سفر کا آغاز کر دیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ 1971 میں آپ کی پہلی تاریخی کہانی "اعظم خان کا تحفہ" سب رنگ ڈائجسٹ میں شائع ہوئی جو بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کے بعد تواتر کے

ساتھ آپ کی تاریخی کہانیاں شائع ہوتی رہیں. بہت سے ڈائجسٹوں کی کامیابی میں آپ کا بہت اہم کردار تھا۔ 1975 میں آپ نے اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ کھولا اور مختلف اخبارات اور جرائد میں چھپنے والی اپنی کہانیوں کو یکجا کر کے مجموعہ کی شکل میں شائع کرنا شروع کیا جن میں کشمیر کی کلی، عجائب خانہ عشق اور اندر کا آدمی شامل ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ آپ غیر معروف تاریخی کرداروں پر مشتمل واقعات مکمل جزئیات کے ساتھ تحریر کرتے تھے۔ آپ نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی اس کے باوجود کتابوں سے عشق اپنے کمال پر تھا آپ کے گھر میں ہر جگہ حتیٰ کے کپڑوں کی الماری تک میں کتابیں بھری پڑیں تھیں۔

سید کمال

یکم اکتوبر 2009 کو پاکستان کے نامور اداکار سید کمال دنیا سے رخصت ہوئے اور کراچی میں ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 27 اپریل 1937 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سید کمال شاہ تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے آپ نے بمبئی میں فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی چلے آئے اور اس کے بعد آپ نے بے تحاشہ فلموں میں کام کیا آپ نے 1985 کے الیکشن میں بھی عملی طور پر حصہ لیا مگر ناکام ہوئے۔ آپ نے اپنی خودنوشت "داستان کمال" کے نام سے تحریر کی اس کے علاوہ آپ کا مجموعہ کلام بھی کسب کمال کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ آپ کو تین مرتبہ نگار ایوارڈ اور ایک دفعہ لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ بھی ملا۔

امام بخش پہلوان

2 اکتوبر 1970ء کو رستم ہند امام بخش پہلوان کراچی میں وفات پا گئے اور لاہور میں پیر مکی شریف کے قبرستان میں اپنے بھائی گاما پہلوان کے پہلو میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1883 میں ریاست دتیہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ گاما پہلوان کے چھوٹے بھائی اور بھولو برادران کے والد تھے۔ آپ نے سات برس کی عمر میں کشتی لڑنا شروع کر تی تھی۔ 1916 میں آپ نے کولہاپور میں رحیم بخش سلطانی کو شکست دے کر رستم ہند کا گرز حاصل کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ لیاقت علی خان کی دعوت پر پاکستان آگئے جہاں آپ نے کراچی میں دارالصحت کے نام سے اپنا اکاڑہ قائم کیا۔

تصدق سہیل

2 اکتوبر 2017 کو پاکستان کے ممتاز مصور اور افسانہ نگار تصدق سہیل کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1930 کو جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کا خاندان پہلے لاہور اور پھر کراچی میں سکونت پذیر ہوا۔ آپ نے اسی دوران افسانہ نگاری کا آغاز کیا اور افسانوں کا ایک مجموعہ تنہائی کے سفر کے نام سے شائع ہوا۔ تھوڑے عرصے بعد آپ لندن چلے گئے جہاں آپ نے سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹس سے مصوری کی تربیت حاصل کی اور بہت جلد یورپ کے ممتاز مصوروں میں شمار ہونے لگے. 2001 میں آپ پاکستان واپس آگئے اور کراچی میں قیام پذیر ہوئے۔ آپ نے شادی نہیں کی تھی اور بیماری کے کھانے میں آپ کے شاگردوں میں باقاعدہ ڈیوٹی لگا کر آپ کی تیمارداری کی اور آپ کی طویل علالت کے باوجود کبھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑا۔

سمیع آرٹسٹ

3 اکتوبر 1964 کو برصغیر کے پہلے مسلمان کارٹونسٹ جناب سمیع آرٹسٹ کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 21 نومبر 1900 میں ہوشنگ آباد سی پی میں پیدا ہوئے تھے۔ 1923 میں اپنے جے جے اسکول آف آرٹس بمبئی سے مصوری میں ڈپلوما حاصل کیا اور مولانا محمد علی جوہر کے اخبارات کامریڈ اور ہمدرد سے بطور کارٹونسٹ اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ بعد میں آپ نے لاتعداد اخبارات اور رسائل کے لئے کارٹون بنائے اور بے شمار کتابوں کے سرورق ڈیزائن کیے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آگئے اور یہاں ڈان اور امروز کے لئے کارٹون بناتے رہے۔

شیخ غلام حسین ہدایت اللہ

4 اکتوبر 1948 کو سندھ کے پہلے گورنر اور تحریک پاکستان کے نامور رہنما شیخ غلام حسین ہدایت اللہ کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 18 جنوری 1879 کو شکارپور کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے شکارپور ہائی اسکول اور ڈی جے سائنس کالج کراچی سے تعلیم حاصل کی بعد ازاں بمبئی سے قانون کی تعلیم بھی حاصل کی۔ 1904 سے آپ نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور 1912 میں بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے رکن منتخب ہوئے اور صوبہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی تک بمبئی اسمبلی کے رکن رہے۔
1936 میں جب سندھ کو بمبئی سے الگ کرکے جب نیا صوبہ بنایا گیا تو آپ سندھ کے پہلے وزیر اعلی بنے۔ 1942 میں ایک بار پھر سندھ کے وزیر اعلی بنے اور قیام پاکستان تک آپ سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کو سندھ کا پہلا گورنر بنایا گیا۔
تحریک پاکستان میں آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جب 1946 میں مسلم لیگ نے سرکاری خطاب چھوڑنے کی تلقین کی تو آپ نے "سر" کا خطاب واپس کردیا۔

آفتاب عالم قزلباش

5 اکتوبر 2003 کو معروف قانون دان اور سماجی کارکن آفتاب عالم قزلباش کراچی میں وفات پاگئے اور وادی وسلام کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 17 مارچ 1919 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور تعلیمی مدارج لکھنؤ اور آگرہ سے مکمل کیے۔
آپ کی اصل وجہ شہرت کراچی میں آپ کے سماجی کام ہیں جن میں مختلف مساجد کی تعمیر زین العابدین ہسپتال خدیجہ میٹرنٹی ہوم حسن عسکری پبلک اسکول اور قبرستان وادی السلام وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر حسنین کاظمی

6 اکتوبر 2013 کو نامور ماہر تعلیم صحافی اور کمپیئر جناب پروفیسر حسنین کاظمی انتقال کرگئے۔ آپ 10 دسمبر 1931 کو کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ گریجویشن تک کی تعلیم آپ نے کانپور میں ہی حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں مقیم ہوئے اور تعلیم کو مزید آگے بڑھایا 1954 میں تاریخ اسلام میں ایم اے کیا اور 1957 میں اردو میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد

آپ نے تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور ابتدا میں جناح کالج میں پروفیسر مقرر ہوئے بعد میں نیشنل کالج آگئے جہاں آپ نیشنل کالج کے بانی ارا کین میں شمار ہوتے تھے۔ 1966 میں اپنے دوستوں کے ساتھ علامہ اقبال کالج قائم کیا اور اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ آپ نے 37 سال تک تدریس کے فرائض انجام دیئے اور ہزاروں تشنگان علم کی پیاس بجھائی۔ آپ کی علمی وادبی زندگی کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہی ہو گیا تھا جس میں آپ نے انتہائی معیاری میگزین نکالے اور دیگر ادبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ روزنامہ جنگ میں آپ آخری وقت تک قومی وملکی معاملات پر کالم لکھتے رہے اس کے علاوہ آپ کی پانچ تصانیف شائع ہو چکی ہیں جن میں روشن ہدایت اور منزل پاکستان بہت مشہور ہیں۔ آپ ٹیلی ویژن کی بھی بہت مشہور و معروف شخصیت رہے اور سالوں سال ایک دینی پروگرام تفہیم دین میں کمپیئر کی حیثیت سے آتے رہے اس کے علاوہ دیگر حالات حاضرہ کے پروگرامز میں بھی کمپیئر یا مبصر کی حیثیت سے آتے رہے۔

سید شاہ تراب الحق قادری

6 اکتوبر 2016 کو معروف مذہبی اسکالر سیاستدان اور جماعت اہل سنت کے سربراہ سید شاہ تراب الحق قادری کراچی میں وفات پاگئے اور کھوڑی گارڈن کھارادر میں علامہ قاری محمد مصلح الدین صدیقی کے مزار کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 25 اگست 1946 کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنے خاندان کے ہمراہ کراچی آگئے اور کورنگی میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ نے اپنی مذہبی تعلیم مدرسہ دارالعلوم امجدیہ سے حاصل کی۔ آپ کا تعلق سلسلہ قادریہ سے تھا اور مولانا احمد رضا خان بریلوی کے صاحبزادے مصطفی رضا خان قادری کے خلیفہ ہونے کے ناطے جماعت اہلسنت کے امیر تھے۔ آپ نے مولانا نورانی کے ہمراہ 1985 کے غیر جماعتی انتخابات میں حصہ لیا اور این اے 190 سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ تحریک ختم نبوت اور تحریک نظام مصطفی کے ساتھ ساتھ پاکستان میں چلنے والی بہت سی مذہبی تحریکوں میں آپ نے بھرپور حصہ لیا آپ مرکزی رویت ہلال کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ سیرت اور دیگر مذہبی موضوعات پر آپ کو خصوصی دسترس حاصل تھی آپ کی آواز کا سحر سامعین و حاضرین کو وجد میں مبتلا کر دیتا تھا۔

جناب اختر حمید خان

9 اکتوبر 1999 کو پاکستان کے مشہور سماجی کارکن، سابق سول سرونٹ، اور نگی پائلٹ پروجیکٹ کے معمار اور منتظم اعلی جناب اختر حمید خان وفات پاگئے۔ آپ 15 جولائی 1914 کو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ 24 سال کی عمر میں انڈین سول سروس کا مقابلہ جاتی امتحان پاس کیا اور 1945 میں آپ نے اپنے عہدے سے استعفی دے دیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ مشرقی پاکستان میں اقامت پذیر ہوئے اور قومی لامیر کٹوریاں کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ 1958 میں مشرقی پاکستان میں دیہی ترقیاتی اکیڈمی کومیلا کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ یہ منصوبہ آپ نے ایسی مہارت سے کامیاب کیا کہ دوسرے ملکوں خصوصاً انڈونیشیا نے بھی اس کی پیروی کی اور خود

اسٹیفنز کالج دہلی سے کیا۔ آل انڈیا ریڈیو اور اندوستان کے شعبہ اطلاعات کے مشہور ماہنامہ آج کل سے وابستہ رہے۔ قیام پاکستان کے بعد 18 سال تک حکومت پاکستان کے محکمہ مطبوعات و فلمسازی میں خدمات انجام دیتے رہے بعد ازاں پی ٹی وی سے بھی بطور ڈائریکٹر سیلز منسلک رہے۔ آپ کے بارے میں سید محمد تقی مدیر اعلی روزنامہ جنگ کہتے ہیں کہ آپ ملک کے ان گہری نظر رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں میں شامل ہیں جو سطحی افسانہ طرازی اور غزل بازیوں سے بچ کر ادب کے ٹھوس فکری اور تحقیقی مفاہیم میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ آپ کی تصانیف میں انتخاب ظفر، نشید حریت، خیابان پاک، دل کی زبان، انجان راہی اور آکسفورڈ انگریزی اردو لغت وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ امتیاز سے نوازا۔

ڈاکٹر فاطمہ شاہ

12 اکتوبر 2002 کو معروف سماجی کارکن ڈاکٹر فاطمہ شاہ کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ 11 فروری 1916 کو پیدا ہوئی تھیں۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد ایک بیماری کی وجہ سے آپ کی بینائی چلی گئی۔ 1960 میں نابینا افراد کی مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے پاکستان ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ قائم کی جس کی آپ تاحیات صدر رہیں۔ 1974 سے 1978 تک آپ نے انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف دی بلائنڈ بنائی جس کے صدر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ کچھ عرصے آپ وفاقی مجلس شوریٰ کی رکن بھی رہیں آپ کو متعدد عالمی اعزازات سے نوازا گیا۔

مصطفی زیدی

12 اکتوبر 1970 کو اردو کے نامور شاعر اور بیوروکریٹ مصطفی زیدی کراچی میں اپنے فلیٹ میں مردہ حالت میں پائے گئے۔ آپ 10 اکتوبر 1930 کو الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ انٹرمیڈیٹ امتحان میں امتیازی نمبروں کے ساتھ آپ نے پورے یوپی میں چھٹی پوزیشن حاصل کی تھی۔ الہ آباد یونیورسٹی سے آپ نے بی اے پاس کیا۔ دوران تعلیم آپ کو غیر معمولی قابلیت کے اطراف میں کی گولڈ میڈل اور تمغوں سے نوازا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے ایم اے پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا۔ پڑھائی سے فارغ ہو کر اسلامیہ کالج کراچی اور پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتے رہے۔ 1954 میں پاکستان سول سروسز کے امتحان میں شریک ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ جہاں آپ حکومت پاکستان کے اعلی عہدوں پر فائز رہے۔ اپنی وفات سے ایک سال پہلے ملازمت سے معطل کر دیا گیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مرحوم معطلی سے کچھ دن قبل اپنے محکمے کے ایک بااثر افسر کا تبادلہ روکنے اور اس تبادلے کو رکوانے کے لیے رشوت قبول کرنے سے نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ اکثر کے خلاف رشوت پیش کرنے کے الزام میں صوبے کے چیف سیکریٹری کو تحریری شکایت بھی پیش کی تھی مگر وہ افسر اتنا بااثر تھا کہ اس کا تو کچھ نہیں بگڑا البتہ آپ کو پہلے معطلی اور پھر ملازمت سے برطرفی کا سامنا کرنا پڑا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی آپ نے شاعری کا آغاز کر دیا تھا قیام پاکستان سے پہلے آپ کا شاعری کا ایک مجموعہ روشنی کے نام سے شائع ہو چکا تھا اس کے علاوہ زنجیریں، شہر آذر اور گریبان وغیرہ کے نام سے بھی آپ کے مجموعے شائع ہوئے۔

خواجہ جمیل احمد

13 اکتوبر 1981 کو نامور مورخ اور سوانح نگار جناب خواجہ جمیل احمد وفات پاگئے۔ آپ 1931 میں ضلع فیص آباد کے گاؤں تاج پور کے ایک معزز زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد خود بھی علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ آپ نے گریجویشن الہ آباد یونیورسٹی سے کیا اور ریلوے ملازم ہوگئے۔ تقسیم ہند کے بعد جب سرکاری ملازمین سے ہندوستان میں رہنے کا یا پاکستان جانے کا آپشن مانگا تو آپ نے پاکستان جانے کا آپشن دیا اور یوں آپ بمبئی کے راستے بحری جہاز سے پاکستان آگئے۔ آپ ایک منجھے ہوئے محقق افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار تھے۔ آپ متعدد بلند پایاں تصانیف کے مصنف تھے جنوں نے بین الاقوامی طور پر شہرت حاصل کی۔ آپ کی تصانیف میں مشہور مسلمان سائنسدان، اسلامی تہذیب کے گہوارے، غریب کی موت، خاموش محبت اور وراثت اسلام شامل ہیں۔ آپ کی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب Great Muslims 100 کو بین الاقوامی طور پر بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اس کتاب پر حکومت سعودی عرب نے شاہ فیصل ایوارڈ اور سعودیہ آنے کی دعوت دی۔

راجہ صاحب محمود آباد

14 اکتوبر 1973 کو تحریک پاکستان کے عظیم رہنما راجہ صاحب محمود آباد وفات پاگئے۔ آپ 5 نومبر 1914 کو ریاست محمود آباد میں پیدا ہوئے تھے آپ کا اصل نام امیر احمد خان تھا آپ تحریک پاکستان کے ان چند رہنماؤں میں شامل تھے جہنوں نے اس تحریک میں تن من دھن لگا کر ہر طرح سے شرکت کی۔ آپ کا تعلق یوپی کے مشہور حکمران گھرانے سے تھا اور آپ کے والد مہاراجہ سر محمد علی خان یوپی کی مشہور ریاست محمود آباد کے والی تھے۔ 23 مارچ 1931 کو والد کی وفات کے بعد آپ محمودہ آباد کے والی مقرر ہوئے۔ قائد اعظم کی ہدایت پر آپ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ اس زمانے میں مسلم لیگ کو جب کبھی پیسوں کی ضرورت پڑی راجہ صاحب نے سب سے پہلے بڑھ کر اس ضرورت کو پورا کیا انہوں نے اپنی وسیع عریض ریاست کی ساری آمدنی مسلمانوں کے مسائل کے حل کے لئے وقف کر دی تھی۔ 1938 میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے صدر منتخب ہوئے اور 9 سال تک فیڈریشن کے صدر رہے۔ 1946 میں اس عہدے سے مستعفی ہوئے۔ آپ مسلم نیشنل گارڈ کے بھی سالار تھے۔ قیام پاکستان کے بعد راجہ صاحب پاکستان چلے آئے۔ آپ کو متعدد مرتبہ وزارت اور سفارت کی پیشکش ہوئی لیکن آپ نے ہمیشہ اس سے گریز کیا اور بغیر کسی منصب کے اور لالچ کے ہمیشہ پاکستان کی خدمت کے لیے کمربستہ رہے۔

لیاقت علی خان

16 اکتوبر 1951 کو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور تحریک پاکستان کے صف اول کے رہنما قائد ملت لیاقت علی خان کو راولپنڈی میں جلسے کے دوران سید اکبر نامی شخص نے فائرنگ کر کے شہید کر دیا۔ آپ یکم اکتوبر 1895 کو ضلع کرنال کے ایک جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے بی اے کیا پھر اعلی تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی

سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ 1926 میں مظفر گڑھ سے قانون ساز اسمبلی کے لیے منتخب ہوئے۔ 1930 میں پھر اسی نشست سے بلا مقابلہ کامیاب ہوئے۔ 1945 کے الیکشن میں میرٹھ کی سیٹ سے مرکزی اسمبلی کے لئے رکن منتخب ہوئے اور عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی جانب سے بطور وزیر خزانہ کابینہ میں شامل ہوئے اور اسمبلی میں ایک ایسا بجٹ پیش کیا جسے غریب آدمی کا بجٹ کہا گیا۔ آپ مسلم لیگ میں قائداعظم کے بعد دوسرے بڑے رہنما تھے۔ آپ متواتر کئی سالوں تک مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان کے پہلے وزیراعظم مقرر ہوئے اور اپنی شہادت تک اسی عہدے پر تھے۔ آپ اپنے ضلع کے سب سے بڑے جاگیر دار تھے مگر آپ نے پاکستان آکر اپنی زمین کا کلیم جمع نہیں کروایا۔ پاکستان میں آپ کی ایک انچ بھی زمین نہ تھی اور نہ ہی کوئی بینک اکاؤنٹ تھا۔ آپ کے پاس 2 اچکن 3 پتلونیں اور ایک بوسکی کی قمیض تھی۔ پتلونوں میں بھی پیوند لگے ہوئے تھے جس سے آپ اچکن سے چھپا لیتے تھے۔ شہادت کے بعد جب آپ کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے گئی تو دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پاکستان کے وزیراعظم نے اچکن کے نیچے پھٹی ہوئی بنیان پہنی ہوئی ہے اور موزوں میں بھی جگہ جگہ سوراخ تھا۔

یوسف لودھی

16 اکتوبر 1996 کو پاکستان کے نامور کارٹونز اور صحافی یوسف لودھی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1936 کو پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے صحافتی زندگی کا آغاز 1969 میں پشاور ٹائمز کے نائب مدیر کے طور پر کیا۔ اپنے تند اور تیز تحریروں اور کارٹونوں کی وجہ سے آپ پر کئی مرتبہ پابندیاں لگیں اور آپ سے وابستہ مختلف اخباروں کو بندش کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کے جرات اظہار اور خوبصورت کارٹونوں کی وجہ سے کئی قومی اور عالمی اعزازات آپ کے حصے میں آئے۔ اے پی این ایس ایوارڈ بھی آپ کو دیا گیا مگر آپ نے جنرل ضیاء الحق کے ہاتھوں سے وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ فیض احمد فیض کے اشعار پر بنائے گئے کارٹون تھے جو فیض کے نام سے شائع ہوئے۔

حکیم محمد سعید

17 اکتوبر 1998 کو پاکستان کے نامور طبیب، مصنف، ماہر تعلیم اور صنعت کار حکیم محمد سعید کراچی میں فائرنگ سے شہید ہوگئے۔ آپ 9 جنوری 1920 کو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ 1906 میں آپ کے والد نے ہمدرد دواخانے کی بنیاد ڈالی تھی۔ کم سنی میں والد کا انتقال ہو گیا اس کے بعد آپ کے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید نے آپ کی تعلیم وتربیت کی۔ 1939 میں آپ نے طبیہ کالج دہلی سے طب کا اعلی امتحان پاس کیا اور ہمدرد دواخانہ کے کاموں میں اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ بٹانے لگے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اپنی والدہ، بھائی اور دولت وجائیداد کو چھوڑ کر پاکستان آگئے۔ کراچی آکر آپ نے نہایت تنگی کے حالات میں زندگی کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ اسکول میں تدریس کے فرائض انجام دیے پھر آرام باغ روڈ پر ایک کمرہ کرائے پر لیا اور اس کے باہر اپنے ہاتھ سے لکھ کر "ہمدرد دواخانہ" کا بورڈ لگایا۔ سڑکوں پر پیدل چل چل کر جوتوں میں سوراخ ہو گئے تھے مگر اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ نئے جوتے خرید سکیں۔ 1948

میں آپ نے آرام باغ پر باقاعدہ ہمدرد دواخانے کی از سر نو بنیاد رکھی جو دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان کا ایک عظیم طبّی، علمی، ادبی، تعلیمی، اشاعتی اور اسلامی ادارہ بن گیا۔ اس کے تحت آپ نے بے شمار ادارے قائم کیے جن میں مدینتہ الحکمت کا نام سر فہرست ہے۔ آپ کو کتابوں سے بے پناہ محبت تھی اسی لئے مدینتہ الحکمۃ میں ایک وسیع و عریض لائبریری بنوائی جس کا نام بیت الحکمت ہے۔ اس لائبریری میں 5 لاکھ سے زیادہ کتب ساڑھے 1700 مخطوطات اور 66 زبانوں میں قرآن مجید کے 412 تراجم موجود ہیں۔ یہ پاکستان کی بڑی لائبریریوں میں سے ایک ہے۔ اس لائبریری کی سب سے بڑی خاصیت اس کا اخباری تراشوں کا سیکشن ہے۔ آپ
روزانہ 17 اخبارات کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان اخبارات پر ضروری نشانات لگاتے اور انہیں بیت الحکمت لائبریری بھجوادیتے ہیں جہاں ان اخبارات کے یہ تراشے محفوظ کر لئے جاتے۔ اس طرح آپ نے پانچ سو سے زیادہ موضوعات پر لاکھوں تراشے جمع کئے جن سے پاکستان کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ آپ نماز تہجد کے بعد صبح چار بجے سے سات بجے تک دنیا بھر سے آئے ہوئے خطوط کے جوابات تحریر کرتے اور تصنیف و تالیف میں وقت گزرتے ایک ہی وقت میں بیسیوں صفحات لکھتے اور کسی ایک لفظ کو بھی کاٹ کر نہیں لکھتے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو ستارہ امتیاز اور نشان امتیاز عطا کیا۔

علامہ عبدالمصطفی الازہری

18 اکتوبر 1989 کو نامور عالم دین علامہ عبدالمصطفی الازہری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1916 کو قصبہ گھوسی ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا نام مولانا احمد رضا خان نے رکھا تھا۔ ابتدائی تعلیم سے لیکر درس نظامی تک کی تعلیم مدرسہ معینیہ عثمانیہ اجمیر شریف سے حاصل کی جہاں آپ کے والد صدر مدرس تھے۔ 1931 میں جامعۃ الازہر تشریف لے گئے اور وہاں 3 سال تک بحیثیت طالب علم مقیم رہے اور شہادۃ العالیہ کی سند حاصل کی۔ آپ نے دینی خدمات انجام دینے کے علاوہ سماجی اور سیاسی زندگی گزاری۔ تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اعظم گڑھ میں مسلم لیگی امیدوار کی کامیابی کے لیے آپ نے دھواں دھار تقریر فرمائی جس کے نتیجے میں مسلم لیگی امیدوار ضلع اعظم گڑھ سے کامیاب ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ جامعہ محمدی ضلع جھنگ اور پھر جامعہ رضویہ ہارون آباد ضلع بہاولنگر میں شیخ الحدیث مقرر ہوئے۔ 1958 میں آپ کراچی تشریف لائے اور پورے 30 سال جامعہ امجدیہ کراچی میں شیخ الحدیث اور پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ آپ دو مرتبہ قومی اسمبلی کے ممبر بھی رہے ایک دفعہ 1970 میں لانڈھی سے رکن قومی اسمبلی بنے اور دوسری مرتبہ 1985 کے عام انتخابات میں ملیر سے رکن قومی اسمبلی بنے۔

سید حسن ریاض

18 اکتوبر 1975 کو پاکستان کے نامور صحافی اور مورخ سید حسن ریاض کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1894 کو ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ 1918 میں آپ صحافت سے وابستہ ہوئے اور ہمدم، ہمدرد اور ہمت کی مجلس ادارت میں شامل رہے۔ 1929 میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ترجمانی کے لیے دہلی سے ہفت روزہ منشور جاری کیا جو کچھ عرصے بعد روزنامے میں تبدیل ہوگیا۔ اس

اخبار نے تحریک پاکستان میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لائے یہاں پہلے عملی صحافت اور پھر جامعہ کراچی میں درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے جن میں "پاکستان ناگزیر تھا" کا نام سرفہرست ہے جو کہ پاکستان کی تاریخ پر لکھی جانے والی مستند ترین کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب پر آپ کو کئی بار ایوارڈ بھی ملے۔

سلیم ناصر

19 اکتوبر 1989 کو پاکستان ٹیلی ویژن کے نامور فنکار سلیم ناصر کراچی میں وفات پاگئے اور ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 15 نومبر 1944 کو ناگپور میں پیدا ہوئے تھے۔ گریجویشن کرنے کے بعد آپ نے ڈی ایچ اے میں افسر تعلقات عامہ کی ملازمت اختیار کی مگر اس نوکری میں دل نہیں لگا اور اسے چھوڑ کر اداکاری کی طرف مائل ہوگئے۔ آپ نے اپنی فنی زندگی کا آغاز پاکستان ٹیلی ویژن کے لاہور مرکز کے ایک ڈرامے لیمپ پوسٹ سے کیا تھا۔ اس کے بعد آپ نے تقریباً چار سو انفرادی ڈراموں اور 27 سیریلز میں کام کیا۔ آخری چٹان آن کہی اور آنگن ٹیڑھا میں آپ کی پرفارمنس اتنی زبردست تھی کہ ہمیشہ کے لیے امر ہوگئی۔

قاضی قیصر الاسلام

19 اکتوبر 1998 کو معروف فلسفی، ناقد اور محقق جناب قاضی قیصر الاسلام کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 25 دسمبر 1934 کو خیر آباد یوپی کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد خیر آباد کے کالج میں لیکچرر تھے۔ ابتدائی تعلیم خیر آباد میں ہی حاصل کی اور پھر اعلی تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل رہائش پذیر ہوگئے اور ریلوے میں ملازمت اختیار کی اسی اثنا میں آپ کی ملاقات نیشنل بینک کے مینیجنگ ڈائریکٹر ممتاز حسن سے ہوگئی جو معروف دانشور اور علم دوست شخصیت کے مالک تھے وہ آپ کو نیشنل بینک لے آئے جہاں آپ ترقی کرتے ہوئے اسسٹنٹ وائس پریزیڈنٹ کے عہدے تک پہنچے۔ آپ تحقیق کے آدمی تھے اور محققانہ مزاج رکھتے تھے اور فلسفے سے متعلق مضامین لکھتے رہتے تھے۔ آپ کی کتاب "فلسفے کے بنیادی مسائل" بی اے آنرز کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی کتب میں تاریخ فلسفہ اور مغربی فلسفے کے جدید نظریات وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر سید معین الحق

20 اکتوبر 1989 کو ممتاز ماہر تعلیم، مورخ اور مترجم ڈاکٹر سید معین الحق کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1901 میں مراد آباد میں پیدا ہوئے تھے ابتدائی تعلیم مراد آباد اور میرٹھ میں حاصل کی اور اس کے بعد اعلی تعلیم کے حصول کے لیے علی گڑھ یونیورسٹی آگئے جہاں آپ نے تاریخ کے شعبے میں ایم اے کیا اور علی گڑھ میں تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آگئے۔ کچھ عرصے میں آپ کا اردو کالج میں تاریخ کے پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔ آپ ہی کی سربراہی میں پاکستان ہسٹوریکل سوسائٹی کی بنیاد ڈالی گئی اور آپ اس کے پہلے جنرل سیکرٹری اور ڈائریکٹر ریسرچ مقرر ہوئے۔ اس ادارے کے تحت تاریخ کے موضوع

پر آپ کی اپنی اور دیگر متعدد کتابیں شائع ہوئیں۔ کراچی کی ایک سڑک کا نام بھی آپ کی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر معین الحق روڈ رکھا گیا۔

ثمر نظامی

20 اکتوبر 1991 کو معروف شاعر اور تحریک پاکستان کے کارکن ثمر نظامی وفات پاگئے۔ آپ 4 جولائی 1928 کو امروہہ ضلع مراد آباد کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی خلیق احمد نظامی علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے تھے جب کہ دوسرے بھائی زیڈ اے نظامی کراچی ڈویلپمنٹ اتھارٹی کے ڈائریکٹر جنرل اور سر سید یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی تھے۔ آپ کالج کے زمانے سے ہی تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اپنے کالج کے مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن کے جنرل سیکریٹری اور سٹوڈنٹس نیشنل گارڈ کے سپہ سالار تھے۔ کرار نوری کی شاگردگی میں آپ نے باقاعدہ شعر کہنا شروع کیے۔ قیام پاکستان کے بعد سرکاری ملازمت کے سلسلے میں راولپنڈی میں ہی رہے اور ریٹائر ہونے کے بعد کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ جنگ، صداقت اور دیگر اخبارات میں نہ صرف مسلسل قطعات لکھتے بلکے روزانہ ایک طنز و مزاح کا کالم "نظر نظر میں" لکھتے رہے۔ جبکہ آپ کے طنز و مزاح کا ایک نثری مجموعہ "حصار نظر" کے نام سے شائع ہوا۔

سید علی اوسط زیدی

21 اکتوبر 2008 کو پاکستان کے نامور سوز خواں سید علی اوسط زیدی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1932 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ سوز خوانی کی تربیت آپ نے اپنے نانا سید محمد جان سے حاصل کی تھی جو اپنے زمانے کے معروف سوز خواں تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے۔ علامہ رشید ترابی کے مشورے پر آپ نے خود کو سوز خوانی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ 1958 سے لے کر 2008 تک مسلسل 50 برس کراچی کی مرکزی مجالس عزا میں سوز خوانی کرتے رہے۔

قمر جلالوی

24 اکتوبر 1968 کو اردو کے نامور غزل گو مرثیہ گو اور منقبت نگار شاعر جناب قمر جلالوی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1884 میں قصبہ جلالی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام محمد حسین عابدی تھا۔ کم عمری ہی میں شاعری کرنے لگے تھے اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے تھے۔ جاندار اشعار اور مخصوص انداز بیاں کی وجہ سے آپ کی شہرت جلالی سے نکل کر علیگڑھ پہنچی اور وہاں سے ملک کے دوسرے حصوں میں پہنچ گئی۔ جلالی سے نکل کر آپ میرٹھ آگئے اور معاشی حالات سے مجبور ہو کر سائیکل مرمت کی دکان کھولی۔ 24 سال کی عمر میں آپ نوجوان شاعروں کی اصلاح کرنے لگے تھے اسی لئے آپ کو استاد کے نام سے جانا جاتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے اور یہاں بھی معاشی مسائل کے سبب آپ نے پھر سائیکل مرمت کی دکان کھولی علامہ رشید ترابی کو جب آپ کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے آپ کو حکومت پاکستان کی طرف سے وظیفہ مقرر کروا دیا۔ آپ

نے بے شمار شعرا کے کلام پر اصلاح دی مگر اپنے کلام کی اشاعت سے بے نیاز رہے۔ معاشی حالات کی وجہ سے آپ کے مجموعہ کلام کی اشاعت تک نہ ہو سکی بعد میں آپ کی صاحبزادی کنیز جلالوی نے جو کلام انہیں مل سکا اسے جمع کر کے شائع کروادیا جو اوج قمر، رشک قمر، غم جاوداں اور عقیدت جاوداں کے نام سے اشاعت پذیر ہوئے۔ مگر ان میں آپ کا مکمل کلام نہیں ہے کیونکہ آپ کی غزلیں آپ کے شاگرد لے اڑے جو انہیں اپنے نام سے مشاعروں میں پڑھتے اور اپنے نام سے شائع کرواتے۔ آپ کے کلام نے اتنی مقبولیت حاصل کی کہ پاک وہند کا شاید ہی کوئی ایسا قوال یا پڑھنے والا ہو جس نے آپ کے کلام کو اپنی آواز نہ دی ہو۔

مولانا محمد مصطفیٰ جوہر

24 اکتوبر 1985 کو نامور عالم دین اور ممتاز شاعر مولانا محمد مصطفیٰ جوہر کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 10 مئی 1895 کو حسین گنج ضلع سارن صوبہ بہار کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ سلطان المدارس لکھنؤ کے فارغ التحصیل تھے جہاں آپ کو اپنے زمانے کے مشہور علماء سے اکتساب کرنے کا موقع ملا۔ آپ کافی عرصے تک سلطان المدارس لکھنؤ اور مدرسہ عباسیہ پٹنہ میں تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور 2 سال تک جامعہ امامیہ میں مدرس اعلی رہے۔ 1968 میں جب پاکستان ٹیلی ویژن سے عاشور کی شب جب مجلس شام غریباں کے سلسلے کا آغاز ہوا تو اس سلسلے کی پہلی مجلس سے آپ ہی نے خطاب کیا تھا۔ آپ ایک بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ آپ کے کلام کا مجموعہ "محراب" کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے اس کے علاوہ آپ کی ایک کتاب "توحید اور عدل" کے نام سے شائع ہوئی۔ نامور عالم دین علامہ طالب جوہری آپ ہی کے فرزند ہیں۔

ہادی مچھلی شہری

25 اکتوبر 1961 کو معروف شاعر جناب ہادی مچھلی شہری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1890 کو مچھلی شہر ضلع جونپور یوپی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سید محمد ہادی تھا۔ آپ کو ذوق سخن ورثے میں ملا تھا۔ آپ کے والد جناب سید عبدالرزاق شاکر جوج کے اہم منصب پر فائز تھے عربی فارسی کے زبردست عالم اور معروف شاعر تھے اور ان کی خط و کتابت غالب کے ساتھ براہ راست تھی۔ ان کے نام کے اکثر خطوط مکتوبات غالب کے مجلدات میں موجود ہیں۔ آپ کے صاحبزادے محمد وسیم صوبہ سندھ کے چیف سیکریٹری اور معتصب اعلی رہ چکے ہیں۔ آپ ایک بلند نظر شاعر تھے اور تاریخ گوئی میں آپ کو بڑی مہارت تھی۔ اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام نوائے دل الہ آباد سے شائع ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں آباد ہوئے آپ کا دوسرا مجموعہ صدائے دل آپ کے صاحبزادے محمد وسیم نے طبع کرآیا۔

علامہ عبدالعزیز میمن

27 اکتوبر 1978 کو عربی زبان وادب کے عظیم عالم استاد اور 30 سے زیادہ کتابوں کے مصنف علامہ عبدالعزیز میمن کراچی میں

وفات پا گئے۔ آپ 23 اکتوبر 1888 کو راجکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم راج کوٹ اور جونا گڑھ سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان دیا اور پوری یونیورسٹی میں اول آئے۔ علیگڑھ یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے بطور استاد وابستہ رہے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں شعبہ تحقیقات اسلامی اور کراچی یونیورسٹی میں شعبہ عربی قائم کیا۔ دو سال کے لئے پنجاب یونیورسٹی میں صدر شعبہ عربی کے فرائض بھی انجام دیے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

رئیس احمد جعفری

27 اکتوبر 1968 کو اردو کے نامور صحافی ادیب مترجم مورخ رئیس احمد جعفری وفات پا گئے۔ آپ 18 نومبر 1908 کو لکھیم پور میں پیدا ہوئے تھے۔ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے تعلیم حاصل کی۔ آپ کے مضامین زمانہ طالب علمی ہی میں مختلف اخبارات اور جرائد میں شائع ہونے لگے تھے۔ 1931 میں مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے بعد مولانا محمد علی جوہر کی سوانح عمری بھی آپ نے تحریر کی۔ 1934 میں مولانا شوکت علی نے آپ کو روزنامہ خلافت بمبئی کا مدیر مقرر کیا۔ مولانا شوکت علی کی وفات کے بعد آپ ہندوستان اور انقلاب جیسے اخبارات کے مدیر رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان تشریف لے آئے اور کئی اخبارات اور جرائد کے مدیر اور نائب مدیر رہے جس میں روزنامہ خورشید محاذ روزنامہ زمیندار اور سہ روزہ ماہی اور ثقافت کے نام سر فہرست ہیں۔ آپ کی تصانیف و تراجم کی تعداد 300 سے زائد ہے جن میں اقبال اور عشق رسول، دیدہ و شنید، علی برادران، اوراق گم گشتہ، اقبال اور سیاست ملی اور بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد شامل ہیں

وحیدہ نسیم

28 اکتوبر 1996 کو اردو کی ممتاز شاعرہ ادیبہ اور ماہر تعلیم وحیدہ نسیم کراچی میں وفات پا گئیں۔ آپ 9 ستمبر 1927 کو اورنگ آباد حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن سے نباتیات میں ایم ایس سی کیا تھا۔ سقوط حیدرآباد دکن کے بعد آپ پاکستان آ گئی اور کراچی میں مقیم ہوئیں۔ یہاں پر آپ نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کیا اور گورنمنٹ وومن کالج فیریئر روڈ میں لیکچرر کی حیثیت سے مقرر ہوئیں اور گورنمنٹ ڈگری کالج ناظم آباد سے بطور پرنسپل ریٹائر ہوئیں۔ آپ کے افسانوی مجموعہ ناگ منی، راج محل، رنگ محل اور دیگر کے نام سے جبکہ ناول غم دل کہا نہ جائے، بیلے کی کلیاں، زخم حیات اور ساحل کی تمنا کے نام سے اور تحقیقی کتابیں اورنگ آباد، ملک عنبر سے عالمگیر تک، عورت اور اردو زبان اور شاہان بے تاج کے نام سے شائع ہوئیں۔ جبکہ آپ کا شعری مجموعہ موج نسیم کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے کئی ڈرامے بھی تحریر کیے۔

صبا اکبر آبادی

29 اکتوبر 1991 کو اردو کے نامور شاعر ادیب اور مترجم صبا اکبر آبادی اسلام آباد میں وفات پا گئے۔ آپ 14 اگست 1908 کو

آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد خواجہ علی محمد آگرہ کے مشہور ڈاکٹر تھے۔ 12 سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیے تھے۔ 1928 میں آپ نے ادبی ماہنامہ آزاد نکالا جو دو برس تک جاری رہا۔ والد کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داریوں کا بوجھ آپ پر پڑا اور مختلف قسم کی ملازمت کرتے رہے اسی دوران آپ نے رسالہ "مشورہ" کی ادارت بھی سنبھالی۔ استاد خادم علی خان اور اخصر اکبر آبادی کی ہم نشینی کی وجہ سے تصوف کی دنیا سے رابطہ حاصل ہوا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ حیدر آباد منتقل ہو گئے جہاں آپ نے اردو فارسی اور سندھی زبان میں مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ کچھ عرصے بعد آپ کراچی منتقل ہو گئے جہاں آپ ایک سال تک محترمہ فاطمہ جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری بھی رہے۔ آپ کے شعری مجموعوں میں اوراق گل، سخن ناشنیدہ، ذکر و فکر اور چراغ بہار وغیرہ شامل ہیں اس کے علاوہ آپ کے مرثیوں کے 3 مجموعے سر بکف، شہادت اور قرطاس الم شامل ہیں۔ آپ نے عمر خیام، غالب، حافظ اور امیر خسرو کی منتخب فارسی کلام کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا۔ آپ کی ملی شاعری کا مجموعہ زمزمہ پاکستان قیام پاکستان سے پہلے شائع ہوا تھا۔

اطہر علی

29 اکتوبر 1996 کو ممتاز صحافی اور بی بی سی کی اردو سروس کے سابق سربراہ اطہر علی لندن میں انتقال کر گئے۔ آپ قیام پاکستان کے بعد دہلی سے کراچی منتقل ہوئے۔ 1953 میں روزنامہ جنگ کراچی سے منسلک ہوئے اور 5 سال تک نیوز ایڈیٹر رہے۔ 1958 میں آپ کو بی بی سی اردو سروس کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ آپ پہلے ایشیائی تھے جو بی بی سی کی اردو سروس کی سربراہ تک پہنچے۔ 1988 میں ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے روزنامہ ڈان کی نمائندگی کے فرائض انجام دینے شروع کیے۔ 1970 کے عام انتخابات میں آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن کی طویل نشریات کی میزبانی کا فریضہ بھی انجام دیا تھا۔

قربان جیلانی

30 اکتوبر 1996 کو ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے معروف فنکار قربان جیلانی کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی میں ہی گلشن اقبال کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 18 ستمبر 1929 کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے 1959 میں ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا۔ تاہم بعد میں آپ نے ریڈیو پاکستان کراچی میں بھی کام کیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد آپ نے ٹیلی ویژن کے متعدد اردو اور سندھی ڈراموں میں کام کیا جن میں انکل عرفی اور دیواروں کے نام سر فہرست ہیں۔ آپ نے اردو اور سندھی زبانوں میں فلموں میں بھی کام کیا۔ آپ نے فنکاروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایکٹرا ایکویٹی کے نام سے ایک تنظیم بھی بنائی۔

پروفیسر ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

3 نومبر 1983 کو اردو اور فارسی کے ممتاز ادیب محقق ماہر لسانیات اور ماہر تعلیم پروفیسر ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 4 دسمبر 1918 کو برست، پانی پت، ضلع کرنال میں ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے

گریجویشن کے بعد آپ نے پانی پت میں بطور معلم ملازمت اختیار کرلی۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے اور یہاں بھی درس وتدریس کے پیشے سے منسلک رہے اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھی آپ نے سندھ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ کراچی یونیورسٹی سے آپ نے ایم اے فارسی کیا۔ مغربی پاکستان پبلک سروس کمیشن سے آپ نے کامیابی حاصل کی اور گورنمنٹ کالج سکھر میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ اپنی ریٹائرمنٹ سے 7 سال پہلے آپ نے سندھ یونیورسٹی سے ڈاکٹر غلام مصطفی خان کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھیں جس میں غالب تاریخ کے آئینے میں، انقلاب ایران بیسویں صدی میں، ظفر علی خان بحیثیت شاعر، ظفر علی خان باحثیت صافی، تذکرہ سہیون اور شخصیات ومباحث بہت مشہور ہیں۔

عبدالستار افغانی

4 نومبر 2006 کو کراچی سے 2 بار منتخب ہونے والے میئر جناب عبدالستار افغانی کراچی میں 76 برس کی عمر میں وفات پا گئے اور کراچی میں میوہ شاہ قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ جون 1933 کو کراچی کے علاقے لیاری میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے آباواجداد افغان تاجک تھے اور 150 سال پہلے ہجرت کر کے بمبئی میں منتقل ہو گئے تھے۔ اور پھر بمبئی سے کراچی میں منتقل ہو گئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گورنمنٹ بوائز اسکول لیاری سے حاصل کی اور پھر اس کے بعد ایس ایم کالج سے انٹر پاس کیا۔ 1969 میں آپ نے جامعہ کراچی سے گریجویشن کیا۔ آپ نے جوتوں کی دکان میں سیلز مین کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا اور بلدیہ عظمی کراچی کے میئر منتخب ہونے تک آپ یہی کام کرتے رہے۔ آپ 1979 سے 1987 تک 2 مرتبہ کراچی کے میئر منتخب ہوئے۔ آپ کے زمانے میں بے شمار ترقیاتی کام ہوئے اور سب سے اہم بات آپ نے اپنے دامن کو کرپشن اور بے ایمانی کے داغ سے ہمیشہ محفوظ رکھا۔ آپ 2002 کے الیکشن میں بھی کراچی کے حلقے این اے 250 سے رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے تھے۔

اشتیاق اظہر

4 نومبر 1999 کو پاکستان کے ممتاز صحافی ادیب دانشور اور سیاستدان اشتیاق اظہر کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 3 مئی 1924 کو چٹائی محل، کانپور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی تعلیم کانپور اور علیگڑھ یونیورسٹی سے مکمل ہوئی۔ عملی صحافت کا آغاز روزنامہ "تنویر" لکھنؤ کی نامہ نگاری سے کیا۔ اس کے بعد آپ بے شمار اخبارات میں مختلف ادارتی حیثیتوں سے وابستہ رہے۔ آپ نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ آپ کانپور میں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کے نائب صدر، سٹی مسلم لیگ کانپور کے سیکریٹری اور یوپی مسلم لیگ کونسل کے رکن تھے۔ آپ کو جدوجہد آزادی میں مولانا حسرت موہانی کے ساتھ کام کرنے کا اعزاز حاصل تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی آپ مختلف اخبارات سے وابستہ رہے اور صوبہ سندھ اور بلوچستان کے ڈائریکٹر اطلاعات کے عہدوں پر بھی فائز رہے۔ آپ کی تصانیف میں شعر و نغمہ، دانائے راز، لعل شہباز قلندر، سیدالاحرار اور تاریخ کانپور شامل ہیں۔ آپ ایک بار سینیٹ کے رکن بھی منتخب ہوئے۔

سکندر صنم

5 نومبر 2012 کو اسٹیج اور فلم کے معروف اداکار اور ہدایت کار سکندر صنم طویل علالت کے بعد کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی کورنگی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ کا اصل نام محمد سکندر تھا اور 21 ستمبر 1960 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد عبدالستار چوکی گجراتی زبان کے شاعر تھے۔ آپ نے چائلڈ سٹار کے طور پر فنی زندگی کا آغاز کیا اور بہت جلد اسٹیج کے مقبول اداکاروں میں شمار ہونے لگے۔

لطیف ابراہیم جمال

5 نومبر 2004 کو پاکستان کے نامور صنعتکار لطیف ابراہیم جمال کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ نے اپنے بھائی حسین ابراہیم جمال کے نام سے ایچ ای جے فاؤنڈیشن قائم کی جس کے آپ مستقل چیئرمین رہے۔ اس ادارے کے تحت آپ نے بے شمار تعلیمی کام کروائے اپنے بھائی حسین ابراہیم جمال کی یاد میں 31 جنوری 1967 کو عالمی سطح کا ادارہ حسین ابراہیم جمال انسٹی ٹیوٹ آف کیمسٹری کراچی یونیورسٹی میں قائم کیا۔ اس کے علاوہ جامعہ کراچی کے اندر ہی لطیف ابراہیم نیشنل سائنس انفارمیشن سنٹر بھی قائم کروایا۔ اس کے علاوہ آپ فیڈریشن آف پاکستان، چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کہ چیئرمین اور صدر کراچی اسٹاک ایکسچینج اور صدر جمیت جوانان میمن بھی رہے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو ستارے قائداعظم کے اعزاز سے بھی نوازا۔

محمود ہارون

6 نومبر 2008 کو پاکستان کے ممتاز سیاستدان اور صنعت کار محمود ہارون کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 9 ستمبر 1920 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد سر عبداللہ ہارون تحریک پاکستان کے صف اول کے رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کو 17 برس کی عمر میں قائداعظم کا اے ڈی سی بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1945 میں آپ سندھ اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے جبکہ 1953 میں کراچی کے میئر منتخب ہوئے۔ دو مرتبہ آپ برطانیہ میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے۔ 1979 میں چار سال کے لیے آپ کو وزیر داخلہ کا عہدہ بھی ملا۔ 1994 سے 1995 تک آپ سندھ کے گورنر بھی رہے۔

سید شمس الحسن

7 نومبر 1981 کو تحریک پاکستان کے ممتاز کارکن سید شمس الحسن کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1892 میں بریلی کے ایک معزز علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ تعلیمی مراحل آپ نے بریلی اور آگرہ میں مکمل کیے۔ ابتداء میں آپ آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری سید وزیر حسن کے پرسنل اسٹاف میں باحثیت اسٹینو گرافر مقرر ہوئے۔ 1919 میں مسلم لیگ کے مرکزی دفتر میں اسسٹنٹ مقرر ہوئے اور 1947 تک 33 سال آپ اسی عہدے پر خدمات انجام دیتے رہے۔ آفس سیکرٹری ہونے کے ساتھ ساتھ

آپ مسلم لیگ کے سرکاری ترجمان بھی تھے۔ قائداعظم آپ پر بے پناہ اعتماد کرتے تھے اورانہوں نے ایک مرتبہ فرمایا "مسلم لیگ کیا ہے میں شمس الحسن اوران کا ٹائپ رائٹر"۔ آپ قائداعظم کے اس قدر قریب تھے کے قیام پاکستان سے چند روز قبل قائداعظم نے آپ کو دہلی میں اپنی رہائش گاہ پر بلوایا اوراپنے ذاتی خطوط جو مسلمانان ہند نے ان کو وقتن فوقتن تحریر کیے تھے وہ اور مسلم لیگ کا ریکارڈ اور دوسرے دستاویزات ان کے حوالے کئے جن کی تعداد 10,000 سے زیادہ تھی. ہجرت کے وقت اپنے ذاتی سامان کو تو آپ دہلی سے نہ لاسکے لیکن دستاویزات بوریوں میں بھر کر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر بڑی مشکل سے کراچی لے آئے اور پھر ان کو نہایت سلیقے سے 98 جلدوں میں مرتب کیا۔ یہ ریکارڈ "شمس الحسن کلیکشن" کہلاتا ہے۔ اس کا ایک سیٹ قائداعظم اکیڈمی کراچی دوسرا سیٹ کراچی یونیورسٹی اور تیسرا قائداعظم انٹر نیشنل یونیورسٹی اسلام آباد میں رکھوایا گیا ہے۔ دو مرتبہ برطانیہ کے سفیر رہنے والے مشہور صحافی واجد شمس الحسن اور نیشنل بینک کے سینیئر ایگزیکٹو خالد شمس الحسن آپ کے فرزند ہیں۔ 2007 میں حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو بعد از مرگ ستارہ امتیاز عطا کیا۔

پروفیسر کرار حسین

7 نومبر 1999 کو پاکستان کے ممتاز ماہر تعلیم دانشور اور مصنف پروفیسر کرار حسین کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 8 ستمبر 1911 کو راجستھان میں پیدا ہوئے تاہم آپ کی تعلیم وتربیت میرٹھ میں مکمل ہوئی۔ آگرہ یونیورسٹی سے آپ نے انگریزی اور اردو میں ایم اے کیا اور میرٹھ کالج میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے اسلامیہ کالج کراچی میں تدریس کے فرائض انجام دیئے اور پھر گورنمنٹ کالج خیرپور کے اور گورنمنٹ کالج میرپور خاص کے پرنسپل رہے۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کچھ عرصہ جامعہ ملیہ کالج کراچی کے لیے بھی تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر آپ کافی عرصے بلوچستان یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ آپ کی شخصیت مشرق و مغرب کا عجیب ملاپ تھی۔ آپ مغرب کے سارے ناقدوں اور صاحب علم سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور ساتھ ہی مشرق کے علوم میں دین ومذہب کے ساتھ ساتھ مشرقی فلسفہ منطق اور تاریخ اسلامی کے اکابر اور فکروفن سے بھی خوب واقف تھے۔ آپ کی خاص بات یہ تھی کہ آپ جتنا اچھا لکھتے تھے اس سے زیادہ اچھا بولتے تھے۔ آپ کسی بھی موضوع پر بہت دلچسپ مدلل اور برجستہ تقریر کرسکتے تھے۔ آپ کا گھر آپ کی ان صفات کی وجہ سے علم وادب کی پیاس بجھانے والوں کے لیے چشمہ بنا رہتا تھا۔ پروفیسر شبیہ حیدر اور سیاستدان تاج حیدر آپ ہی کے فرزند ہیں اور کراچی یونیورسٹی کی شعبہ ریاضی کی سابق ہیڈ ڈاکٹر شائستہ زیدی آپ کی دختر ہیں۔ آپ کی کتب میں "قرآن اور زندگی" کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

جون ایلیا

8 نومبر 2002 کو اردو کے ممتاز شاعر جون ایلیا کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 14 دسمبر 1931 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد علامہ شفیق حسن ایلیا اردو، فارسی، عربی اور عبرانی زبان کے عالم تھے جب کہ نامور دانشور سید محمد تقی اور اردو کے نامور

شاعر رئیس امروہوی آپ کے بڑے بھائی تھے۔ آپ خود بھی اردو عربی فارسی اور عبرانی زبانیں جانتے تھے۔ آپ نے اردو میں ایم اے عربی میں فاضل اور فارسی میں کامل کی اسناد حاصل کیں تھیں۔ امروہہ میں عربی و فارسی کی تدریس سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ کراچی میں آپ نے ادارہ ذہین جدید قائم کیا اور ایک علمی ماہنامہ "انشاء" جاری کیا۔ اردو ترقی بورڈ کی دعوت پر 8 سال تک ترقی اردو بورڈ میں لغت نویس کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ نے تقریباً 22 کتابوں کے ترجمے مختلف اداروں کے لیے کیے جو شائع بھی ہو چکے ہیں۔ آپ بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے بیسویں اور اکیسویں صدی کے عظیم اور معتبر شاعروں کا جب بھی تذکرہ لکھا جائے گا اس میں آپ کا نام سرفہرست ہوگا۔ آپ کے شعری مجموعوں میں شاید، یعنی، لیکن، گمان، گویا اور رموز شامل ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

خواجہ معین الدین

9 نومبر 1971 کو اردو کے نامور ڈرامہ نگار خواجہ معین الدین کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ 23 مارچ 1924 کو حیدرآباد دکن کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ جامعہ عثمانیہ سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ زمانہ طالب علمی سے ہی آپ نے ڈراما لکھنا شروع کیا۔ 16 سال کی عمر میں آپ نے پہلا ڈرامہ "سرکاری دکان" لکھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی فرمائش پر آپ نے لال قلعے سے لالو کھیت لکھا جو درد انگیز ہجرت کی داستان ہے پاکستان ٹیلی ویژن نے اس کھیل کو ایک کلاسک کی حیثیت سے فلمایا۔ 1956 میں آپ نے "مرزا غالب بندر روڈ پر" کے نام سے ایک ڈرامہ لکھا جو بہت زیادہ مقبول ہوا۔ آپ کے ایک اور ڈرامے "تعلیم بالغاں" کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی اس کو ٹیلی ویژن کے لیے فلمایا بھی گیا۔ آپ نے بہت سارے اور بھی کئی ڈرامے لکھے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔ لاہور کی ایک تقریب میں آپ کو باباڈرامہ کے لقب سے نوازا گیا۔ آپ نے صرف چالیس سال کی قلیل عمر پائی مگر اتنی کم عمری کے باوجود ڈرامہ نگاری میں آپ نے انمٹ نقوش رقم کر دیے۔

محشر بدایونی

9 نومبر 1994 کو اردو کے ممتاز شاعر محشر بدایونی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 4 مئی 1922 کو بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام فاروق احمد تھا۔ آپ نے بدایوں میں ہی تعلیم حاصل کی شوق سخن کا پہلے ہی چسکا تھا اور پھر میونسپل لائبریری میں ملازمت اختیار کی جہاں تمام شعراء کے دیوان اور کلیات اس لائبریری میں ہی دستیاب تھے جس سے آپ کے شوق میں اور اضافہ ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت پذیر ہو گئے اور مزید تعلیم کے لئے اردو کالج میں داخلہ لیا جہاں آپ کی ملاقات بخاری صاحب سے ہوئی اور آپ ریڈیو پاکستان کے جریدے "آہنگ" سے منسلک ہو گئے۔ آپ کا شمار پاکستان کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کی

تصانیف میں شہر نوا، غزل دریا، گردش کوزہ، فضا فردہ، چراغ ہمنوا اور حرف ثناوغیرہ شامل ہیں۔ آپ کا ایک معروف شعر ملاحظہ ہو

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیے میں جان ہو گی وہ دیا رہ جائے گا

پروفیسر کوثر بشیر احمد

9 نومبر 2006 کو معروف ماہر تعلیم آرکیٹیکٹ شاعر اور مترجم پروفیسر کوثر بشیر احمد کراچی میں وفات پا گئے اور ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 9 مارچ 1939 کو فیروز پور میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ نے ترکی جرمنی اور لندن سے فن تعمیر کی تعلیم حاصل کی اور 1978 میں داؤد کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کے شعبہ آرکیٹیکچر سے وابستہ ہوئے۔ آپ کچھ عرصے داؤد کالج آف انجینئرنگ کے پرنسپل بھی رہے۔ رائل انسٹیٹیوٹ آف برٹش آرکیٹیکچر نے آپ کو دنیا کے آرکیٹیکچر کے پانچ بڑے ماہرین تعلیم میں شمار کیا تھا۔ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے اس کے علاوہ آپ نے ترکی زبان کی کتابوں کا ترجمہ اردو زبان میں کیا۔

حیدر دہلوی

10 نومبر 1958 کو اردو کے معروف شاعر حیدر دہلوی کراچی میں انتقال کر گئے۔ آپ 17 جنوری 1896 کو گلی شاہ تارہ اجمیری گیٹ دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سید جلال الدین حیدر تھا۔ 9 سال کی عمر میں آپ نے شاعری کا آغاز کیا اور 13 برس کی عمر میں باقاعدہ مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ خمریات کے موضوعات کی مضمون بندی میں آپ کو کمال حاصل تھا اس لئے ارباب علم وفن نے آپ کو خیام الہند کے خطاب سے نوازا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ پہلے ڈھاکہ اور پھر کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ کے شاگردوں میں سے اکثر اساتذہ شمار کیے جاتے ہیں۔ آپ کا مجموعہ کلام آپ کی وفات کے بعد "صبح الہام" کے نام سے شائع ہوا۔

سید امیر امام حر

10 نومبر 2013 کو اردو کے ممتاز مرثیہ نگار شاعر سید امیر امام حر وفات پا گئے. آپ 14 جنوری 1928 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نامور نقاد امداد امام اثر کے پرپوتے تھے۔ جبکہ راجہ صاحب محمود آباد محمد امیر احمد خان کے داماد تھے۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی اور کیمبرج سے اعلی تعلیم حاصل کی تھی بعد ازاں آپ کراچی میں تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے اور پھر ایک طویل عرصہ تک لندن میں مقیم رہے۔

اقبال حیدر

11 نومبر 2012 کو معروف قانون دان اور انسانی حقوق کمیشن پاکستان کے چیئرمین، سابق وفاقی وزیر اور اٹارنی جنرل اقبال حیدر کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 14 جنوری 1945 کو آگرہ شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے والدین کے ہمراہ

کراچی میں سکونت پذیر ہوئے۔ آپ نے گورنمنٹ کامرس کالج کراچی سے بی کام اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں اعلی تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے جہاں لنکنزان سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ جون 1967 میں وکالت شروع کی اور 1972 میں ہائی کورٹ اور 1978 میں سپریم کورٹ کے باضابطہ وکیل بن گئے۔ آپ انسانی حقوق کے علمبردار تھے اور ساری زندگی اس کے لیے کام کرتے رہے آپ انسانی حقوق کی وزارت کے پہلے وزیر بھی مقرر ہوئے اس کے علاوہ آپ نے وفاقی وزیر برائے قانون اور پارلیمانی امور کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ آپ کئی غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں کے عہدیدار بھی تھے۔

این ایم عقیلی

11 نومبر 1996 کو پاکستان کے پہلے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور سابق وزیر خزانہ جناب این ایم عقیلی وفات پاگئے۔ آپ 11 اگست کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ گورنر اسٹیٹ بینک اور PICIC کے مینیجنگ ڈائریکٹر بھی رہے اس کے علاوہ آپ کچھ عرصے کے لیے حکومت پاکستان کے وزیر خزانہ کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ آپ کی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے آپ کو ستارہ قائد اعظم اور ستارہ پاکستان سے نوازا۔

ڈاکٹر فہمیدہ عتیق

13 نومبر 2004 کو معروف ماہر تعلیم اور ادیبہ ڈاکٹر فہمیدہ عتیق کراچی میں وفات پاگئیں۔ آپ 21 اگست 1939 کو دہلی میں پیدا ہوئی تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی شروع میں آپ نے ماری پور میں گورنمنٹ ملازمین کے لیے بنائے گئے کیمپوں میں رہائش اختیار کی بعد میں مارٹن کوارٹرز میں آپ کے والد کو کوارٹر الاٹ ہو گیا جبکہ کوارٹرز زیر تعمیر تھے اور اس میں کھڑکیاں اور دروازے ابھی نہیں لگے تھے۔ آٹھویں کلاس پاس کر کے آپ نے پی ٹی سی کا امتحان پاس کیا اور ایک اسکول میں ملازمت اختیار کی۔ دوران ملازمت آپ نے میٹرک کا امتحان دیا لیکن انگلش کا پرچہ رہ گیا اور فیل ہو گئی جو بعد میں سپلیمنٹری کا امتحان دے کر پاس کر لیا۔ ان ہی دنوں میں آپ کی شادی معروف افسانہ نگار پروفیسر عتیق احمد سے ہو گئی۔ شادی کے بعد شوہر کی مدد سے آپ نے انٹر کا امتحان پاس کیا اور پھر بی اے اور بی ایڈ کیا۔ 1974 میں ایم اے اردو کیا اور 1984 میں ایم ایڈ کیا 1985 سے 1995 تک ایم فل کی ڈگری ڈاکٹر اسماعیل سعد کی نگرانی میں حاصل کی اور ان کے مقالے کا عنوان "ابن خلدون کے تعلیمی افکار" تھا آخر میں آپ نے جامعہ کراچی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری "جمیل الدین عالی کے احوال و فن" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر حاصل کی۔ آپ کی پوری زندگی پڑھنے اور پڑھانے میں گزری آپ نے بچوں کے لیے سبق آموز کہانیاں بھی لکھیں جو نونہال میں چھپیں آپ کی کہانیوں کا مجموعہ "آگ کا پرندہ" ہمدرد فاؤنڈیشن نے شائع کیا ہے۔

مولانا ظہور الحسن درس

14 نومبر 1972 کو مشہور عالم دین مولانا ظہور الحسن درس وفات پاگئے اور کراچی میں قبرستان مخدوم صاحب میں آسودہ خاک

ہوئے۔ آپ 9 فروری 1905 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ 1940 سے 1947 تک آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے رکن اور اہم عہدوں پر فائز رہے۔ قیام پاکستان کے بعد قائداعظم نے عید کی نماز آپ ہی کی اقتداء میں ادا کی۔ اکتوبر 1947 میں عیدالاضحی کی نماز کے وقت جب قائداعظم کہ عید گاہ میں پہنچنے میں تاخیر ہوئی اور اعلی حکام نے آپ سے نماز کو کچھ وقت کے لئے موخر کرنے کی درخواست کی تو آپ نے کہا میں قائداعظم کے لیے نماز پڑھانے نہیں آیا ہوں بلکہ خدائے عزوجل کی نماز پڑھانے آیا ہوں چنانچہ آپ نے صفوں کو درست کر کے تکبیر فرمادی۔ اتنے میں قائداعظم بھی عید گاہ پہنچ گئے اور انہوں نے پچھلی صفوں میں نماز ادا کی۔ نماز کے بعد قائداعظم نے آپ کی جرات ایمانی کی تعریف کی اور کہا کہ ہمارے علما کو ایسے ہی کردار کا حامل ہونا چاہیے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔

زاہد حسین

14 اکتوبر 1957 کو پاکستان کے مشہور ماہر اقتصادیات اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی تعلیم مکمل کی اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی میں ہی بطور لکچرار فرائض انجام دینے لگے۔ مالیات کے اعلی امتحان میں کامیاب ہو کر سرکاری ملازمت اختیار کرلی اور غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے ترقی کر کے پہلے چیف کمشنر دہلی کے مشیر مالیات پھر محکمہ سپلائی میں مالی مشیر اور وزارت ریلوے کے فائنانس کمیشنر مقرر ہوئے۔ 1945 میں دولت آصفیہ حیدرآباد دکن میں وزیر مالیات کے طور پر بھی کام کیا۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی آگئے اور حکومت پاکستان میں آپ کو بھارت میں اپنا پہلا ہائی کمشنر مقرر کیا۔ یکم جولائی 1948 کو جب اسٹیٹ بینک قائم ہوا تو آپ کو پہلا گورنر مقرر کیا گیا۔ 14 مئی 1952 تک آپ اس عہدے پر کام کرتے رہے بعدازاں منصوبہ بندی کمیشن کے پہلے چیئرمین کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔

سلمان اعظمی

17 نومبر 2018 کو معروف جواں سال شاعر سلمان اعظمی مختصر علالت کے بعد کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی وادی حسین کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 4 دسمبر 1986 کو کراچی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے جامعہ کراچی سے انٹرنیشنل ریلیشن میں ایم اے کیا تھا۔ شاعری کا آغاز آپ نے انتہائی کم سنی سے ہی شروع کردیا تھا۔ آپ نے اپنے آپ کو صرف حمد، نعت، منقبت اور نوحوں کی حد تک محدود رکھا جبکہ آپ کا انتقال 32 سال کی عمر میں ہوا تھا عام طور پر اس عمر کے لوگوں کی شاعری عشق مجازی تک محدود ہوتی ہے مگر آپ نے اپنے آپ کو کبھی بھی اس سے آلودہ نہیں کیا جو آپ کی شاعری کا حیرت انگیز پہلو ہے۔ آپ نے اپنی مختصر سی زندگی میں ہزاروں کی تعداد میں حمد، نعت، منقبت اور نوحے لکھے جن میں سے بہت سے کلام شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ آپ موجودہ دور میں اردو نوحہ نگاری کے امام جناب ریحان اعظمی کے بڑے فرزند تھے۔

مسرت حسین زبیری

17 نومبر 1987 کو معروف بیوروکریٹ اور ادیب جناب مسرت حسین زبیری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 12 دسمبر 1912 کو آگرہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر ابن الحسن زبیری جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے جب کہ ایک اور بھائی عزت حسین زبیری راجشاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے جو بعد میں حکومت پاکستان کے مشیر تعلیم بھی بنے۔ آپ نے سیاسیات میں ایم اے کیا اور پھر انڈین سول سروس کا امتحان پاس کر کے مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے میں جن سول سرونٹ کا کردار ہے ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ پاکستان میں بھی آپ مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے اور آخر میں پاکستان کے سیکریٹری مواصلات کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ نے ایک کتاب voyage through history لکھی جو دو جلدوں میں ہمدرد فاؤنڈیشن نے شائع کی اس کتاب میں تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کے حالات وواقعات کی چشم دید تاریخ بیان کی گئی ہے۔ پاکستان کے پہلے ڈاک ٹکٹ آپ ہی کی کوششوں سے جاری ہوئے۔

پروفیسر سید وقار عظیم

17 نومبر 1974 کو اردو کے معروف ادیب نقاد اور مترجم محقق اور ماہر تعلیم پروفیسر سید وقار عظیم وفات پاگئے۔ آپ 17 اگست 1910 کو الہ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور اس کے علاوہ علی گڑھ یونیورسٹی سے بی ٹی کیا۔ آپ نے الہ آباد یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ دہلی سے تدریس کا آغاز کیا اور ایک جریدے "آج کل" کے مدیر بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کچھ عرصہ کراچی رہے اور پھر لاہور چلے آئے جہاں نقوش کی ادارت سنبھالی۔ 1950 میں اورینٹل کالج لاہور میں لیکچرار کے طور پر مقرر ہوئے اور 1970 تک اسی کالج سے وابستہ رہے اور اس کے ساتھ ساتھ آپ اقبال اکیڈمی، مرکزی اردو بورڈ، مجلس ترقی ادب، مجلس زبان دفتری اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف وتالیف میں بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ افسانوی ادب کے اولین نقاد شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے 18 سے زیادہ کتابیں لکھیں جس میں افسانہ نگار داستان سے افسانے تک، نیا افسانہ، ہماری دستانیں، اقبال بطور شاعر فلسفی اور اقبالیات کا تنقیدی جائزہ کے نام سر فہرست ہیں۔

مرزا ابوالحسن اصفہانی

18 نومبر 1981 کو تحریک پاکستان کے صف اول کے رہنما، معروف قانون دان اور قائد اعظم کے بااعتماد ساتھی مرزا ابوالحسن اصفہانی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 30 مارچ 1902 کو مدراس میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے کلکتہ کیمبرج اور لندن کے تعلیمی اداروں سے اعلی تعلیم حاصل کی۔ خاندانی کاروبار ایم ایم عثمانی لمیٹڈ سے وابستہ ہو کر کچھ عرصے میں ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے ٹکٹ پر بنگال کی مجلس قانون ساز اور 1946 میں مرکزی مجلس قانون کے رکن منتخب ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد امریکہ کے پہلے سفیر مقرر ہوئے اور اقوام متحدہ میں بھی پاکستانی وفد کے ڈپٹی لیڈر نامزد ہوئے۔ 1954 میں آپ مرکزی حکومت

میں وزیر صنعت و تجارت بھی رہے اور 1973 میں افغانستان میں پاکستان کے سفیر رہے۔ آپ کا خاندان انڈیا کے بڑے کاروباری خاندانوں میں سے ایک تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے آپ کے خاندان نے ایک ایئر لائن بنائی جس کا نام اورینٹ ائرویز تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے اپنی ایئر لائن جہاز اور دیگر اثاثوں سمیت پاکستان کو عطیہ کر دی اور یہی اورینٹ ائرویز بعد میں پی آئی اے بنی۔ آپ نے کئی کتابیں بھی تحریر اور مرتب کیں جن میں "قائداعظم میری نظر میں" اور "ایم اے جناح اور اصفہانی مراسلات" کے نام سر فہرست ہیں۔

مولانا سید حسن امداد

19 نومبر 2014 کو نامور عالم دین، شاعر، استاد، دانشور، محقق اور مترجم مولانا سید حسن امداد امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں وفات پاگئے۔ آپ یکم جولائی 1914 کو غازی پور (انڈیا) میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد سید علی احمد بہار میں کا گرااسٹیٹ میں مذہبی امور کے مشیر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی کے علاقے لالوکھیت میں مستقل سکونت اختیار کی اور جیکب لائن کے ایک اسکول میں بطور معلم ملازمت اختیار کی۔ آپ کا شمار اردو اور عربی کے نامور علماء میں ہوتا تھا۔ آپ نے عربی کی بہت سی کتابوں کو اردو میں منتقل کیا۔ مگر آپ کا اصل کارنامہ بحارالانوار کی 110 جلدوں کا سلیس اور شستہ زبان میں ترجمہ ہے۔ اس کے باوجود آپ ترجمہ نگاری کے بارے میں کہتے ہیں کہ "ایک زبان کا ترجمہ دوسری زبان میں بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص ایک شیشی کا عطر دوسری شیشے میں انڈیلنے کی کوشش کرے اول تو ڈالتے وقت کچھ نہ کچھ گر جائے گا اور اگر بڑی احتیاط بھی برتی جائے اور نہ گرے تو بھی پہلی شیشی میں کچھ نہ کچھ لپٹا ہوا ضرور رہ جائے گا یعنی پورا کا پورا عطر دوسری شیشی میں منتقل نہیں ہو سکتا"۔ آپ ایک بہترین شاعر بھی تھے آپ کے کلام کا مجموعہ لواءالحمد کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔

حمید زمان

20 نومبر 1999 کو ممتاز صحافی اور براڈکاسٹر حمید زمان وفات پاگئے۔ آپ یوپی کے رہنے والے تھے اور انگریزی ادب میں ایم اے کیا تھا۔ پروفیسر محمد حسن عسکری کے چہیتے شاگردوں میں سے ایک تھے۔ ریڈیو پاکستان میں انگریزی زبان میں تقریری مذاکرے اور مغربی موسیقی کے شعبے آپ کے پاس تھے۔ بہت زیادہ تخلیقی صلاحیتوں کے مالک تھے آپ کے پروڈیوس کیے ہوئے ہوئے پروگرام بلا جھجک بی بی سی کے پروگراموں کے مقابلے میں پیش کیے جا سکتے تھے۔ آپ کا سب سے زیادہ زور ٹیلنٹ کے انتخاب پر ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں آپ بڑے سے بڑے افسر کی سفارش ماننے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتے تھے۔ آپ کے ٹیلنٹ کی فہرست میں جمشید مارکر، عمر قریشی، ممتاز حسن، ڈاکٹر محمود حسین، پروفیسر احمد علی، سرجن جمعہ خان، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی اور بہت سے دوسرے شامل تھے۔ اپنی حق گوئی کی وجہ سے بالآخر ریڈیو کی ملازمت سے آپ کو استعفیٰ دینا پڑ گیا اور یوں آواز کی دنیا کا ایک نہایت باصلاحیت براڈکاسٹر الیکٹرانک میڈیا سے پرنٹ میڈیا میں چلا گیا۔ تھوڑی عرصے میں آپ نے انگریزی اخبار "مارننگ نیوز" میں بھی اپنا مقام پیدا کر لیا۔

پھر دوبارہ پورے سندھ میں ٹاپ کیا۔ 1923 میں آپ نے بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے کے امتحان میں ٹاپ کیا جس کے بعد حکومت ہند نے آپ کو اسکالر شپ پر مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیج دیا جہاں آپ نے کیمبرج یونیورسٹی سے "فارسی شاعری کے ارتقا پر عربی شاعری کا اثر" کے عنوان سے مقالہ تحریر کر کے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آکر آپ مختلف اہم مناصب پر فائز رہے۔ 1939 میں آپ کو صوبہ سندھ میں محکمہ تعلیم کا ڈائریکٹر بنایا گیا۔ 1941 میں حکومت نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب عطا کیا۔ آپ برصغیر کی آخری علمی شخصیت تھے جنہیں یہ خطاب ملا۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ سندھ کی دو مشہور فارسی تواریخ چچ نامہ اور تاریخ معصومی کی ترتیب و ترجمہ ہے۔ آپ نے عربی فارسی اور انگریزی میں 28 کتابیں یادگار چھوڑیں ہیں۔

محمد امین

23 نومبر 1996 کو ٹیلی ویژن کے معروف فوٹو گرافر محمد امین ایک فضائی حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔ آپ کا ایتھوپیا کے اس بدقسمت طیارے میں سوار تھے جو اغوا ہو گیا تھا اور بعد میں گر کر تباہ ہو گیا۔ پاکستان میں آپ کی شناخت آپ کی دو کتابیں Journey Through Pakistan اور Defender of pakistan ہیں جن کی تصاویر آپ نے انتہائی پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ کھینچی تھیں۔ حکومت برطانیہ نے ممبر آف دی آرڈر آف دی برٹش امپائر اور حکومت پاکستان نے آپ کو تمغہ امتیاز سے نوازا تھا۔

وحید مراد

23 نومبر 1983 کو پاکستان کے مشہور فلمی اداکار وحید مراد کراچی میں انتقال کر گئے اور لاہور میں گلبرگ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 2 اکتوبر 1939 کو پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے تمام تعلیمی مدارج کراچی میں ہی مکمل کیے اور جامعہ کراچی سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ شروع میں آپ نے فلم آرٹس کے نام سے ایک ادارہ بنایا جس کے تحت آپ نے دو فلمیں بنائیں۔ اوران فلموں کے تکمیل کے دوران ہی آپ کو اداکاری کا شوق ہوا اور آپ نے فلموں میں بطور اداکار کام شروع کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں شہرت کی بلندیوں تک پہنچ گئے آپ کو چاکلیٹی ہیرو کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آپ نے لاتعداد فلموں میں ایوارڈ حاصل کیے۔

جمیل الدین عالی

23 نومبر 2015 کو نامور شاعر، ادیب، کالم نگار، دانشور اور بینکار جمیل الدین عالی وفات پاگئے۔ آپ 20 جنوری 1925 کو دہلی میں نواب امیر الدین کے گھر پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام نوابزادہ مرزا جمیل الدین احمد خان تھا۔ اینگلو عربک کالج دہلی سے آپ نے بی اے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور کراچی یونیورسٹی سے آپ نے ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ سی ایس ایس کا امتحان پاس کیا اور سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے مگر 1966 میں آپ نے سرکاری ملازمت سے

استعفی دے دیا۔ 1967 میں آپ نے نیشنل بینک جوائن کر لیا اور ممبر ایگزیکٹو بورڈ تک کے عہدے پر پہنچے۔ آپ کا شمار ان ادیبوں اور شعرا میں ہوتا تھا جو اردو کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ آپ نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے قیام میں بھی فعال حصہ لیا اور اس کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ 1961 میں آپ انجمن ترقی اردو کے بھی سیکرٹری مقرر ہوئے اور اردو لغت بورڈ سے بھی منسلک رہے۔ اردو سائنس کالج کے قیام اور پھر اس کے یونیورسٹی بننے میں بھی آپ نے انتہائی فعال کردار ادا کیا۔ آپ کے شعری مجموعوں میں لاحاصل، انسان، غزلیں، دوہے، جیوے جیوے پاکستان اور اے میرے دشت سخن شامل ہیں۔ آپ کے کالموں کے بھی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ آپ بہت سے ملی نغمہ کے خالق بھی ہیں جن میں "اے وطن کے سجیلے جوانوں"، "جیوے جیوے پاکستان" اور ہم مصطفوی ہیں سر فہرست ہیں۔ 1997 میں آپ سینٹ کے ممبر بھی منتخب ہو چکے ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کو ہلال امتیاز، ستارہ امتیاز اور صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا جبکہ جامعہ کراچی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی سند بھی عطا کی۔

مریم مختار

24 نومبر 2015 کو میانوالی کے قریب پاک فضائیہ کے طیارے کے حادثے میں پاکستان کی پہلی فلائنگ آفیسر مریم مختار شہید ہو گئیں۔ آپ 18 مئی 1992 کو کراچی میں پیدا ہوئی تھیں۔ آپ نے این ای ڈی انجینئرنگ یونیورسٹی کراچی سے سول انجینئرنگ میں بی ای کیا تھا۔ جس کے بعد جی ڈی پائلٹ کی حیثیت سے پاک فضائیہ میں شمولیت اختیار کی اور تربیت کے لئے رسالپور اکیڈمی چلی گئیں۔ تربیت مکمل کرنے کے بعد آپ کو 2014 میں کمیشن ملا اور آپ کی پوسٹنگ ایم ایم عالم بیس میانوالی ہو گئی جہاں آپ نے فائٹر پائلٹ کی مشکل تربیت حاصل کی۔ 24 نومبر 2015 کو آپ اپنے طیارے ایف سیون تھری جی کی تربیتی پرواز پر تھیں کہ کندیاں کے علاقے پر پرواز کے دوران آپ کے طیارے میں شدید نوعیت کی ٹیکنکل خرابی پیدا ہوئی جس کے بعد آپ نے طیارے کو آبادی پر گرنے سے روکنے کی بھرپور کوشش کی اور اسی کوشش میں طیارہ سنسان علاقے تک لے جانے میں کامیاب ہو گئیں مگر جب طیارے سے باہر نکلنے لگیں تو طیارہ زمین کے بہت قریب آ گیا تھا اور جان بچانا ناممکن ہو گیا اور آپ کی شہادت ہو گئی۔

اردشیر کاؤس جی

24 نومبر 2012 کو روزنامہ ڈان کے معروف کالم نگار، دانشور اور ممتاز کاروباری مخیر سماجی شخصیت اردشیر کاؤس جی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 13 اپریل 1924 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا پورا خاندان تجارت کے پیشے سے وابستہ تھا۔ آپ 1973 میں پاکستان ٹورزم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے مینیجنگ ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے۔ 80 کی دہائی میں آپ نے روزنامہ ڈان میں مراسلہ لکھنے شروع کئے جس میں سماجی ناانصافیوں کو بے نقاب کیا جاتا تھا۔ یہ مراسلے اتنے مقبول ہوئے کہ روزنامہ ڈان کی انتظامیہ نے آپ کو انہی موضوعات پر مستقل کالم لکھنے کی پیشکش کی جسے آپ نے قبول کیا اور یوں آپ پاکستان کے مقبول کالم نگاروں میں شمار ہونے لگے۔ آپ کے کالموں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ آپ نے کاؤس جی فاؤنڈیشن کے نام سے ایک فلاحی ادارہ بھی قائم کیا تھا۔

ڈاکٹر محمد ایوب قادری

25 نومبر 1983 کو اردو کے معروف محقق اور مترجم اور ماہر تعلیم ڈاکٹر محمد ایوب قادری ایک ٹریفک حادثے میں وفات پاگئے۔ آپ 28 جولائی 1926 کو ضلع بریلی میں پیدا ہوئے تھے۔ انٹر آپ نے ہندوستان سے کیا لیکن پھر قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی تشریف لے آئے۔ کراچی میں سکونت اختیار کرکے آپ نے اپنے تعلیمی مراحل مکمل کیے اور کراچی یونیورسٹی سے "اردو نثر کی ارتقاء میں علما کا حصہ" کے موضوع پر اپنا اپنا مقالہ تحریر کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم مکمل کرکے بعد آپ نے اردو کالج میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور آخر میں شعبہ اردو کے صدر مامور ہوئے۔ آپ نے بے شمار تصانیف تحریر کی اس کے علاوہ آپ نے فارسی کی کئی اہم کتابوں کو بھی اردو کے قالب میں ڈھالا ان کتابوں میں تذکرہ علمائے ہند، مآثرالامراء وصایا العربیہ وغیرہ شامل ہیں۔

قیوم راہی

25 نومبر 2009 کو معروف افسانہ نگار قیوم راہی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 10 جولائی 1923 کو ضلع مراد آباد یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مشتاق حسین مشہور وکیل اور شاعر بھی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ لاہور میں مقیم ہوئے اور ایک عرصے تک ڈپٹی کمشنر آفس لاہور میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ 1978 میں آپ نے ریٹائرمنٹ لے لی اور کراچی منتقل ہوگئے جہاں ہمدرد فاؤنڈیشن سے منسلک ہوگئے۔ آپ کا ادبی سفر گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی سے ہوا آپ کا پہلا افسانہ ماہنامہ ادب لطیف میں 1953 میں شائع ہوا۔ آپ کے افسانے برصغیر کے صف اول کے ممتاز اور قابل ذکر ادبی رسائل میں جگہ پاتے رہے ہیں۔ آپ کے درج ذیل افسانوں کے مجموعے شائع ہوچکے ہیں تیسری آپا، روشنی کا پتھر، مسکراتا ہوا شخص، زیر سطح اور آٹھواں سمندر۔

پروفیسر شجاع احمد زیبا

26 نومبر 1995 کو معروف شاعر ادیب اور ماہر تعلیم پروفیسر شجاع احمد زیبا کراچی میں وفات پاگئے اور پاپوش نگر کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 27 اکتوبر 1922 کو امروہہ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے ایم اے اور ایل ایل بی کے امتحانات علیگڑھ یونیورسٹی سے پاس کیے اور تعلیم سے فارغ ہوکر علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں اسسٹنٹ لیکچرر مقرر ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور پھر کچھ عرصہ روزنامہ امروز سے وابستہ رہے۔ 1950 میں آپ اردو کالج سے وابستہ ہوگئے پانچ سال یہاں رہنے کے بعد آپ جناح کالج کراچی اور پھر اسلامیہ کالج کراچی میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ 1964 میں اپ اسلامیہ کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے اور 1973 تک خدمات انجام دیتے رہے۔ آخر میں آپ سراج الدولہ کالج کے پرنسپل ہوکر ریٹائر ہوئے۔ آپ کی رفاقت تادم مرگ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ رہی اور ان کی انجمن کے تنظیمی امور میں ساتھ دیتے رہے۔ آپ 1950 سے 1954 تک رسالہ قومی زبان کے مدیر بھی رہے۔ آپ کے بے شمار علمی وادبی مضامین مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ آپ ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے۔

سید رشید احمد

26 نومبر 2005 کو ریڈیو پاکستان کے سابق ڈائریکٹر جنرل سید رشید احمد کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 4 جون 1959 کو ذوالفقار علی بخاری کی ریٹائرمنٹ کے بعد ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل کے منصب پر فائز ہوئے تھے اور 9 ستمبر 1962 تک اس منصب پر فائز رہے۔ آپ ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ذوالفقار علی بخاری جیسی ہمہ جہت شخصیت کے بعد ان کے منصب پر فائز ہونا خود ایک بہت مشکل مرحلہ تھا جس کو آپ نے انتہائی خوش اسلوبی سے پورا کیا پاکستان کی نامور ماہر تعلیم زینت رشید احمد آپ کی اہلیہ اور سابق وفاقی وزیر جاوید جبار آپ کے داماد ہیں۔

خواجہ اکمل

26 نومبر 2017 کو پاکستان کے مشہور مزاحیہ فنکار خواجہ اکمل کوئٹہ میں وفات پا گئے اور کراچی میں ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1957 کو پیدا ہوئے تھے۔ 1990 میں پاکستان ٹیلی ویژن کے مزاحیہ پروگرام ایکسکیوزمی سے اپنے فنی سفر کا آغاز کیا اور بہت جلد پاکستان کے ممتاز مزاحیہ فنکاروں میں شمار ہونے لگے۔ آپ پیروڈی کے فن پر عبور رکھتے تھے اور اپنی بے ساختہ اداکاری کے باعث ناظرین میں بے حد مقبول تھے۔

انور عنایت اللہ

29 نومبر 1991 کو ممتاز افسانہ نگار، صحافی، نقاد اور براڈکاسٹر انور عنایت اللہ کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 25 اگست 1925 کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی ایس سی آنرز کیا تھا اور سقوط حیدر آباد کے بعد آپ مشرقی پاکستان چلے گئے لیکن اگلے ہی سال 1950 میں آپ کراچی آ گئے اور مستقل سکونت اختیار کر لی۔ کراچی آکر آپ ریڈیو پاکستان سے منسلک ہو گئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ 1974 میں محکمانہ زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے آپ نے استعفیٰ دے دیا اور امریکن سفارتخانے میں بحیثیت چیف کلچرل ایڈوائزر منسلک ہو گئے۔ آپ کا پہلا افسانہ "کلوپیٹرا" تھا جو آپ نے زمانہ طالب علمی میں لکھا تھا۔ آپ کی جو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں ان میں ٹوٹی زنجیریں، آگ برف اور انسان، قلعہ مضبوط تھا (زوال حیدر آباد) بے زبان دوست، دی اسٹوری آف جناح اور دیگر شامل ہیں۔ آپ ایک بہترین مترجم اور صحافی بھی تھے آپ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے اور اردو کے منتخب مضمون انگریزی میں اور انگریزی کے منتخب مضامین اردو میں منتقل کرتے رہتے تھے۔ آپ کے خود کے کئی افسانے متعدد اہم زبانوں میں ترجمہ کیے جا چکے ہیں۔

حمزہ علوی

یکم دسمبر 2003 کو پاکستان کے معروف مورخ اور دانشور حمزہ علوی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 10 اپریل 1921 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی، ڈی جے کالج کراچی، واڈیا کالج پونا اور بمبئی یونیورسٹی سے تعلیمی مراحل طے

کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے معاشیات میں ایم اے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے منسلک ہو گئے۔ اسٹیٹ بینک میں آپ بہت جلد ترقی کی منازل طے کر رہے تھے مگر اچانک ایک تنازع پر آپ نے استعفی دے دیا اگر آپ اپنی ملازمت برقرار رکھتے تو کم عمری میں ہی گورنر اسٹیٹ بینک بن جاتے۔ پچاس کی دہائی میں آپ انگلینڈ منتقل ہو گئے اور تدریس کے شعبے سے وابستگی اختیار کی آپ نے یونیورسٹی آف کیلیفورنیا لاس اینجلس یونیورسٹی آف ڈینور یونیورسٹی آف سسکس یونیورسٹی آف مانچسٹر یونیورسٹی آف لیڈز یونیورسٹی آف ملائیشیا کوالالمپور اور مشی گن اسٹیٹ یونیورسٹی میں تدریسی فرائض انجام دیے۔ 1971 سے 1985 تک آپ جرنل آف کنٹمپریری ایشیا کے ادارتی بورڈ کے بانی رکن رہے اسی دوران آپ جرنل آف پیزنٹ اسٹڈیز اور پاکستان ٹوڈے سے بھی وابستہ رہے۔ 1997 میں آپ پاکستان واپس آگئے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے بھائی زین علوی نے آپ کے نام سے حمزہ علوی فاؤنڈیشن بنائی اور آپ کی نایاب کتابیں کراچی یونیورسٹی کے پاکستان اسٹڈی سینٹر کو عطیہ دینے کا فیصلہ کیا مگر اسٹڈی سینٹر کے پاس کتابیں رکھنے کے لیے جگہ نہیں تھی۔ حمزہ علوی فاؤنڈیشن نے پہلے لائبریری کی بڑی پیمانے پر توسیع کروائی جہاں بعد میں ضمیر نیازی پروفیسر اے بی علیم اور ہاجرہ مسرور بھی کتابیں عطیہ کر چکے ہیں۔

چوہدری محمد علی

یکم دسمبر 1980 کو پاکستان کے سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کراچی میں وفات پا گئے. آپ 15 اپریل 1905 کو ننگل انبیا تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اسلامیہ کالج سے گریجویشن کرنے کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی۔ عملی زندگی کا آغاز اسلامیہ کالج لاہور سے بطور لیکچرار کیمسٹری کیا۔ بعدازاں مقابلے کا امتحان پاس کر کے 1928 میں انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ سروس میں شامل ہو گئے اور تیزی سے ترقی کے مراحل طے کرتے ہوئے ایڈیشنل سیکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ قیام پاکستان سے پہلے جب عارضی حکومت میں لیاقت علی خان کو وزیر خزانہ بنایا تو بطور مشیر اعلی ان کا بجٹ تیار کرنے میں آپ نے بڑی مدد کی. قیام پاکستان کے بعد آپ پاکستان کے پہلے سیکرٹری جنرل اور 1951 میں وفاقی وزیر خزانہ بنے۔ 1955 میں دستور ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور 11 اگست 1955 سے 12 ستمبر 1956 تک پاکستان کے وزیر اعظم رہے. اگرچہ آپ تقریر کرنے کی صلاحیت اور سیاسی ڈپلومیسی جیسی صلاحیتوں سے جو وزیر اعظم کے منصب کے لیے ہونا ضروری ہیں بالکل ناواقف تھے لیکن ایمانداری اور شرافت کی وجہ سے ایک سرکاری ملازم سے ترقی کرتے ہوئے وزیر اعظم کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ معاشی امور کے ماہر تصور کئے جاتے تھے۔ اسی لیے قیام پاکستان کے پہلے اور بعد تک کی حکومت نے آپ کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ آپ کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ پاکستان کے پہلے آئین کی منظوری تھا۔ ایوب خان کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد سے آپ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تاہم محترمہ فاطمہ جناح کی صدارتی انتخابات میں آپ نے فعال کردار ادا کیا۔ تحریک پاکستان کے موضوع پر آپ نے ایمرجنسی آف پاکستان کے نام سے ایک کتاب بھی تحریر کی۔ جو کہ تحریک پاکستان پر لکھی جانے والی اب تک کی مستند ترین کتاب تصور کی جاتی ہے۔

محترمہ شیریں جناح

2دسمبر 1980 کو قائداعظم محمد علی جناح کی ہمشیرہ محترمہ شیریں جناح کراچی میں وفات پاگئیں اور حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئیں۔ آپ 1880 میں ممبئی میں پیدا ہوئیں تھیں۔ آپ کی شادی 1904 میں قاسم جعفر بھائی سے ہوئی۔ آپ کے ایک ہی صاحبزادے اکبر علی جعفر بھائی تھے۔ آپ محترمہ فاطمہ جناح کی وفات کے بعد پاکستان آگئیں اور اپنی وفات تک مستقل قائداعظم کے اصولوں اور روایتوں کا پاسدار رہیں۔ آپ نے شیریں جناح ٹرسٹ بھی قائم کیا تھا جس کے لیے آپ نے اپنی جائیداد کا 25 فیصد وقف کردیا تھا۔ کراچی کا ایک علاقہ شیریں جناح کالونی آپ ہی کے نام سے منسوب ہے۔

محبوب خزاں

3دسمبر 2013 کو اردو کے ممتاز شاعر محبوب خزاں کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ یکم جولائی 1930 کو اترپردیش کے ضلع بلیہ کے ایک تعلیم یافتہ گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام محمد محبوب صدیقی تھا۔ الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویشن کیا اور پاکستان آگئے جہاں آپ سی ایس ایس کے امتحان میں شریک ہو کر کامیاب ہوئے اور اکاؤنٹنٹ جنرل آف پاکستان ریونیو کے عہدے تک ترقی پائی۔ آپ کا شعری مجموعہ "اکیلی بستیاں" کے عنوان سے شائع ہوا گو کہ آپ نے اردو ادب کے قارئین کو ایک مختصر مجموعہ دیا ہے مگر اپنے معیار اور انفرادیت کی بنا پر یہ مجموعہ آج بھی اردو شاعری کا ایک گراں قدر سرمایا ہے۔

محمد صلاح الدین

4دسمبر 1994 کو پاکستان کے بے باک اور معروف صحافی جناب محمد صلاح الدین نامعلوم دہشت گردوں کی اندھادھند فائرنگ سے جان کی بازی ہار گئے۔ آپ 5 جنوری 1935 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ 1963 میں آپ نے حریت سے اپنی صحافتی کیریئر کا آغاز کیا اور پھر جنگ اور جسارت میں کام کرنے کے بعد اپنا ہفت روزہ رسالہ تکبیر جاری کیا۔ ملکی صحافتی حلقوں میں آپ ایک بہادر، بے باک اور نڈر صحافی کے طور پر جانے جاتے تھے جس کی وجہ سے کئی بار آپ نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو بعد از مرگ تمغائے امتیاز سے نوازا۔

امیر حیدر کاظمی

5دسمبر 2013 کو ممتاز سیاسی رہنما اور معروف طالب علم رہنما امیر حیدر کاظمی لندن میں وفات پاگئے۔ آپ نے اپنی سیاست کا آغاز طالب علم رہنما کے طور پر کیا۔ آپ کا تعلق انہیں 12 طالب علم رہنماؤں میں سے تھا جن کو ایوب خان کے دور میں کراچی بدر کیا گیا تھا۔ بعد میں آپ دو مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے اور ایک بار وفاقی وزیر کے منصب پر بھی فائز رہے۔

عزیز میاں

6دسمبر 2000 کو پاکستان کے نامور قوال عزیز میاں ایران کے شہر تہران میں وفات پاگئے۔ آپ 27 جولائی 1942 کو یوپی کے

شہر بلند شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے قوالی گانے میں اپنا ایک منفرد انداز اختیار کیا آپ کی مشہور قوالیوں میں شرابی، تیری صورت نگاہوں میں، اور اللہ ہی جانے کون بشر ہے سر فہرست ہیں۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا تھا۔ آپ ملتان میں مزار بابا ناظر حسین میں آسودہ خاک ہوئے۔

سید ناصر جہاں

6 دسمبر 1990 کو پاکستان کے معروف نعت خواں اور نوحہ خواں سید ناصر جہاں کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1927 کو لکھنو میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی۔ ذوالفقار علی بخاری کی مردم شناس نظروں نے آپ کی صلاحیتوں کو جلا بخشی جس کے نتیجے میں 1954 میں ریڈیو پاکستان میں آپ نے مجلس شام غریباں کے بعد سید آل رضا کی نظم شام غریباں اپنے خوبصورت لحن میں پیش کی یہ نظم بعد میں سلام آخر کے نام سے معروف ہوئی۔ آپ ایک اچھے نعت خواں بھی تھے آپ کی پڑھی ہوئی کئی نعتیں بے حد مقبول ہوئیں جن میں امیر مینائی کی نعت "جب مدینے کا مسافر کوئی پاجاتا ہوں" سر فہرست ہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں آپ کو صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

ڈاکٹر افضل حسین قادری

6 دسمبر 1974 کو ایک محترم استاد، سائنسی محقق اور تحریک پاکستان کے رہنما ڈاکٹر افضل حسین قادری وفات پاگئے۔ آپ 7 فروری 1912 کو بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ 1936 میں آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے سائنس میں پہلی پی ایچ ڈی کی۔ اسی سال کیمبرج چلے گئے اور وہاں 1938 میں پی ایچ ڈی کی دوسری ڈگری حاصل کی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں دوران تعلیم ڈاکٹر صاحب کی ملاقات چوہدری رحمت علی سے ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے وطن واپس آکر علی گڑھ کے پروفیسرز کے ساتھ مل کر پاکستان سے متعلق ایک بیان شائع کیا جس سے علی گڑھ کے پروفیسروں کا منصوبہ یا علی گڑھ اسکیم کہا جاتا ہے۔ اس اسکیم کی رو سے ہندوستان کو تین خود مختار وفاقوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا جن میں ایک شمال مغرب میں واقع چار مسلم اکثریتی صوبوں اور متعدد چھوٹی ریاستیں دوسرا بنگال اور تیسرا باقی ماندہ ہندوستان پر مشتمل ہو۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اپنی تمام خدمات مسلم لیگ کے لیے وقف کردیں اور قائداعظم نے انہیں مسلم لیگ کی تعلیمی کمیٹی کا رکن اور سیکریٹری بھی مقرر کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ محکمہ جنگلات سے وابستہ رہے پھر جامعہ کراچی سے منسلک ہوگئے اور آپ کا یہ تعلق آخری سانس تک قائم رہا۔ ڈاکٹر صاحب کا شمار پاکستان میں سائنسی ریسرچ کی بنیاد رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔

جنید جمشید

7 ستمبر 2016 کو پاکستان کے معروف نعت خواں مبلغ اور ماضی کے نامور پاپ سنگر جنید جمشید ایک فضائی حادثے میں جہاں بحق ہوگئے۔ آپ 3 ستمبر 1964 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے یو ای ٹی لاہور سے مکینیکل انجینئرنگ میں گریجویشن کیا تھا۔

آپ زمانہ طالب علمی میں ہی مختلف فنکشنز میں گاتے تھے۔ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر وائٹل سائنز بینڈ بنایا۔ اسلام آباد کے ایک لائیو کنسرٹ میں پی ٹی وی کے پروڈیوسر رانا کنول نے آپ کو گاتے سنا اور پاکستان ٹیلی ویژن مدعو کیا۔ پی ٹی وی میں آپ کی ملاقات پروڈیوسر شعیب منصور سے ہوئی جن کی ہدایات میں اگست 1987 میں وائٹل سائنس نے پی ٹی وی کے لیے شہرہ آفاق ملی نغمہ "دل دل پاکستان جان جان پاکستان" گایا جو یوم آزادی پر نشر ہوا اس ملی نغمے نے آپ کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ اس کے بعد آپ کے متعدد البم ریلیز ہوتے رہے اور آپ نئی نسل کے مقبول ترین گلوکار کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ 1997 میں آپ کی ملاقات مولانا طارق جمیل سے ہوئی جس کے بعد دونوں کی رفاقت کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہا۔ 2001 میں آپ نے گانوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور 2004 میں آپ نے جے ڈاٹ کے نام سے فیشن ڈیزائننگ کا کاروبار شروع کیا۔ یہ کام بھی بے حد مقبول ہوا اور جلد ہی پورے ملک میں آپ کے ادارے کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ 2005 میں آپ نعت خواں کے روپ میں سامنے آئے اور اسی سال آپ کی نعت "محمد کا روضہ قریب آ رہا ہے" پیش ہوئی جو بے انتہا مقبول ہوئی۔ اس کے بعد آپ نے بہت ساری حمد اور نعتیں پیش کیں۔ آپ ٹی وی چینلز پر بھی مختلف مذہبی پروگراموں میں شرکت کرتے رہے۔

کیف بنارسی

8 دسمبر 2003 کو تحریک پاکستان کے کارکن اور معروف شاعر کیف بنارسی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ سے 1926 کو ضلع مرزا پور یوپی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصل نام سید یاور حسین تھا۔ آپ نے ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جہاں شعر و سخن کا چرچا تھا اسی لئے نہایت کم عمر میں ہی اشعار کہنا شروع کر دیے۔ آپ نے اپنی نوجوانی میں تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اپنی ملی قومی نظمیں اور ترانے نہایت جوش اور ولولے کے ساتھ پیش کیے جو پورے برصغیر میں مشہور ہوئے۔ آپ نے اپنی ایک طویل نظم پر مشتمل کتاب بیت المقدس کی تلاش کے عنوان سے شائع کی۔ اس نظم کا بعد میں ممتاز مذہبی سکالر مولانا عبدالقدوس ہاشمی ندوی نے عربی میں ترجمہ کیا جس کو پڑھ کر سعودی عرب کے فرمانروا شاہ خالد نے بھی آپ کو خط لکھا۔ آپ کو بیشتر سرکاری اور غیر سرکاری اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

امراؤ طارق

8 دسمبر 2011 کو اردو کے ممتاز افسانہ نگار امراؤ طارق کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 15 مارچ 1932 کو فتح پور یوپی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام سید طارق علی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے پہلے ڈھاکہ اور پھر کراچی میں سکونت اختیار کی۔ یہاں آ کر آپ نے پہلے اردو کالج کراچی سے بی اے آنرز کیا اور اس کے بعد کراچی یونیورسٹی سے ایل ایل بی کیا اور پولیس کے محکمے سے وابستہ ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آپ نے انجمن ترقی اردو سے وابستگی اختیار کی اور نائب معتمد کے عہدے پر خدمات انجام دیں۔ آپ کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے آپ نے شعر و ادب کی نامور شخصیات پر خاکے بھی تحریر کئے جن کا مجموعہ "دھنک کے باقی

ماندہ رنگ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ شفیق الرحمان اور قرۃ العین حیدر سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ آپ نے کچھ عرصہ مشرقی پاکستان میں گزارا اس لیے آپ کے افسانوں میں وہاں کی معاشرتی تہذیب اور زندگی کی بہت خوبصورت عکاسی ملتی ہے۔ آپ کی تصانیف میں بدن کا طواف، خشکی پر جزیرے، تاروں پر لکھے نام اور تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے کے نام شامل ہیں۔

علامہ ظفر احمد عثمانی

8 دسمبر 1974 کو پاکستان کے نامور عالم دین اور تحریک پاکستان کے فعال رہنما علامہ ظفر احمد عثمانی ٹنڈوالہ یار میں وفات پا گئے۔ آپ 5 اکتوبر 1892 کو دیوبند میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے تعلیم دارالعلوم دیوبند سے حاصل کی اور پھر تھانہ بھون کانپور اور سہارنپور میں مختلف علماء سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کی والدہ علامہ اشرف علی تھانوی کی چھوٹی بہن تھی جب کہ آپ مولانا شبیر احمد عثمانی کے چھوٹے بھائی تھے۔ تحریک پاکستان کی آخری دہائی میں آپ مشرقی بنگال میں درس وتدریس میں مصروف تھے۔ یہاں آپ نے تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے میں بڑا اہم کردار کیا ادا کیا۔ جب سلہٹ میں ریفرنڈم کا مرحلہ درپیش ہوا تو یہ آپ تھے جن کی کاوشوں سے مسلم لیگ نے اس ریفرنڈم میں کامیابی حاصل کی اور یوں یہ خطہ بھی پاکستان کا حصہ بن گیا۔ 14 اگست 1947 کو کراچی میں پرچم کشائی مولانا شبیر احمد عثمانی نے کی اور اسی روز ڈھاکہ میں پرچم کشائی کا اعزاز آپ کو حاصل ہوا۔ 1954 میں آپ ڈھاکہ سے ٹنڈوالہ یار منتقل ہو گئے اور وہاں ایک مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈالی اور آخری وقت تک اسی مدرسے میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔

مسعود احمد برکاتی

10 دسمبر 2017 کو بچوں کے معروف ادیب اور ہمدرد نونہال کے مدیر مسعود احمد برکاتی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 15 اگست 1933 کو راجھستان کی مسلم ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے دادا حکیم برکات احمد ایک جید عالم تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ ہجرت کر کے کراچی تشریف لے آئے۔ تھوڑے عرصے میں آپ کے بڑے بھائی نامور حکیم محمود احمد برکاتی بھی دہلی سے کراچی تشریف لے آئے۔ دونوں بھائیوں نے ہجرت کے بعد بہت کٹھن حالات کا سامنا کیا۔ گزر بسر کرنے کے لئے اردو فارسی اور قرآن مجید کی تعلیم گھر گھر جا کر دیتے اور رات گزارنے کے لئے مختلف ہوٹلوں اور دکانوں پر رہائش پذیر ہونا پڑتا۔ حتی کے گورا قبرستان کے پاس ایک جھونپڑی بنائی جس میں دونوں بھائی رہا کرتے تھے۔ پہلی مرتبہ جب مولوی عبدالحق کے رسالے "معاشیات" میں اپنا مضمون "اشتراکیت کیا ہے" لکھا تو مولوی عبدالحق اتنے متاثر ہوئے کہ ملنے کے لیے خود آن پہنچے۔ 1949 سے لے کر 1952 تک آپ "معاشیات" کے لیے لکھتے رہے۔، 1952 میں آپ کی ملاقات حکیم محمد سعید سے ہوئی اور وہ آپ کو ہمدرد لے آئے۔ 1953 میں جب ہمدرد نونہال کا اجرا ہوا تو حکیم صاحب نے آپ کو اس کا مدیر اعلی بنا دیا۔ اور آپ نے بھی اس عہدے کو تادم مرگ نبھایا۔ پاکستان میں بچوں کا کوئی ادیب ایسا نہیں ہو گا جو 64 سال تک ایک ہی رسالے کا مدیر رہا ہو۔ آپ نے تین نسلوں کی

تربیت کی۔ بچے آپ کی تحریر پڑھتے ہوئے جوان ہوئے اور بوڑھے ہوئے۔ آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی نے آپ کی طویل خدمات کے اعتراف میں آپ کو نشان سپاس اور لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ عطا کیا۔

روشن علی بھیم جی

10 دسمبر 1998 کو پاکستان میں بیمہ سازی کی صنعت کے مہمان روشن علی بھیم جی کراچی میں وفات پاگئے اور میوہ شاہ قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 13 اگست 1917 کو بمبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی آ گئے اور یکم جنوری 1961 کو پاکستان کی معروف بیمہ کمپنی اسٹرلنگ فیڈرل یونین کے جنرل مینیجر مقرر ہوئے جسے آپ نے اپنے حسن انتظام سے ملک کی سب سے بڑی بیمہ کمپنی میں تبدیل کر دیا۔ 1972 میں پاکستان میں جب بیمہ سازی کی صنعت کو قومی تحویل میں لے لیا گیا تو آپ لندن چلے گئے جہاں آپ نے ایسٹرن فیڈرل یونین کو از سر نو منظم کیا اور ایک مرتبہ پھر اسے ایک بڑی بیمہ کمپنی بنادیا۔ آپ علم وادب کے بڑے قدردان تھے جوش ملیح آبادی نے اپنی خود نوشت سوانح عمری یادوں کی برات کا انتساب آپ کے نام کیا تھا۔

مولانا شاہ احمد نورانی

11 دسمبر 2003 کو بلند پایہ عالم دین مبلغ اسلام اور سیاسی رہنما مولانا شاہ احمد نورانی اسلام آباد میں وفات پاگئے اور کراچی میں عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے احاطے میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 31 مارچ 1924 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے 8 سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا تھا۔ عربی کالج میرٹھ سے گریجویشن کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے فاضل عربی کی ڈگری حاصل کی۔ درس نظامی کی تکمیل مدرسہ اسلامیہ قومیہ میرٹھ میں کی۔ آپ نے دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں تبلیغی دورے کیے اور آپ کی تبلیغ کے اثر سے ہزاروں غیر مسلم مشرف بااسلام ہوئے۔ آپ 1953 سے 1964 تک ورلڈ مسلم علماء اور گنائزیشن کے سیکرٹری جنرل رہے۔ 1953 سے 1974 تک ختم نبوت کی تحریکوں میں آپ نے بھرپور حصہ لیا۔ 1973 اور 1977 کے عام انتخابات میں قومی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ نظام مصطفی کی تحریک میں بھی آپ کا اہم کردار تھا۔ 1995 میں جب فرقہ واریت اپنے عروج پر تھی تو آپ نے اتحاد بین المسلمین کے لیے ملی یکجہتی کونسل بنائی اور تمام مسالک کے علماء کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے کشید گی کو ختم کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔ 2002 میں جب تمام علماء نے مل کر ایک تنظیم متحدہ مجلس عمل بنائی تو آپ اس کے صدر منتخب ہوئے۔ آپ کو ہر مسلک میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

بیگم شائستہ اکرام اللہ

11 دسمبر 2000 کو تحریک پاکستان کی معروف خاتون رہنما سفارتکار اور معروف ادیبہ بیگم ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ وفات پاگئیں اور کراچی میں حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار کے احاطے میں دفن ہوئیں۔ آپ 22 جولائی 1915 کو کلکتہ میں پیدا ہوئیں تھیں۔ آپ کے والد حسان سہروردی برطانوی وزیر ہند کے مشیر تھے۔ جبکہ سابق وزیراعظم حسین شہید سہروردی آپ کے بڑے بھائی

تھے۔ آپ کی شادی جناب اکرم اللہ سے ہوئی جو قیام پاکستان کے بعد سیکریٹری خارجہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ شادی سے پہلے افسانے بھی لکھا کرتی تھیں اور ناول نگاری پر آپ نے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آپ 1940 میں مسلم لیگ کی باضابطہ ممبر بنیں اور اپنے صوبے میں مسلمان خواتین میں سیاسی بیداری کی لہر پیدا کرنے کے لیے اپنے بھائیوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ 1942 میں مادر ملت کے کہنے پر مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی پہلی کانفرنس منعقد کی۔ اپریل 1943 میں آپ کو مرکزی سب کمیٹی کا رکن نامزد کردیا گیا۔ 1946 میں مسلم لیگ نے آپ کو انتخابی ٹکٹ دیا اور آپ انتخابات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد متحدہ ہندوستان مجلس دستور ساز اسمبلی کی رکن چن لی گئیں۔ آپ کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ آپ اردن کے سابق ولی عہد شہزادہ حسن اور بنگلہ دیش کے سابق وزیر خارجہ رحمن سجان کی خوش دامن تھیں۔

ساقی امروہی

12 دسمبر 2005 کو اردو کے ایک خوش گو شاعر ساقی امروہی کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی بہشت زیرہ قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 1925ء کو امروہہ کے مردم خیز شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ شاعری کا آغاز آپ نے نوجوانی ہی سے شروع کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ آپ کے شعری مجموعوں میں افتاد اور مگر اب شام ہوتی جارہی ہے کہ نام شامل ہیں۔

علامہ شبیر احمد عثمانی

13 دسمبر 1949 کو نامور عالم دین اور مفسر قرآن شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی انتقال کر گئے۔ آپ 1885 کو بجنور میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل بھی تھے اور ایک طویل عرصے تک اسی ادارے میں درس وتدریس کے فرائض انجام بھی دیے اور صدر مہتمم کے عہدے پر مقرر ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جس وقت آپ مولانا اشرف علی تھانوی کے بعد پورے برصغیر کے دینی حلقوں میں سب سے زیادہ مقبول موثر اور فعال شخصیت تسلیم کیے جاتے تھے۔ 26 اکتوبر 1940 کو آپ نے جمعیت علمائے اسلام قائم کی جو مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان کی حامی تھی۔ قائد اعظم محمد علی جناح خود قیام پاکستان کے لیے علامہ شبیر احمد عثمانی کی خدمات کے بڑے معترف تھے۔ 14 اگست 1947 کو جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو پاکستان کے دار الحکومت کراچی میں پاکستان کا پہلا پرچم بلند کرنے کا اعزاز بھی آپ ہی کے حصے میں آیا۔ قرار داد مقاصد کی تیاری اور اس کی منظوری میں آپ نے بڑا بھرپور حصہ لیا۔

منور عباس

13 دسمبر 1988 کو کراچی کے ممتاز ماہر قانون، شاعر اور سماجی شخصیت منور عباس ایڈوکیٹ وفات پاگئے۔ آپ 1908 میں میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی جہاں آپ کا شمار کراچی کے ممتاز ماہرین قانون میں

ہوتا تھا۔ کراچی میں آپ نے محرم الحرام کی مرکزی مجالس کے انعقاد کے لئے پاک محرم ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کے اہتمام میں ابتدا میں جہانگیر پارک اور پھر نشتر پارک میں کراچی کی سب سے بڑی مجلس اور مرکزی جلوس کا اہتمام کیا گیا۔ آپ ایک اچھے شاعر بھی تھے اور شاہ صاحب تخلص کرتے تھے۔

گل جی

16 دسمبر 2007 کو پاکستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ نامور مصور، مجسمہ ساز اور خطاط محمد اسماعیل عرف گل جی کراچی میں قتل کر دیے گئے۔ 19 دسمبر کو آپ اپنے گھر میں اپنی بیوی اور ملازمہ کے ساتھ مردہ حالت میں پائے گئے۔ آپ کا قتل 3 روز قبل 16 دسمبر کو ہوا تھا اور 3 دن تک آپ اور باقی لوگوں کی لاش گھر میں پڑی رہی۔ ایک انتہائی المناک اور دلخراش واقعہ تھا۔
آپ 25 اکتوبر 1926 کو پشاور میں پیدا ہوئے تھے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے 1945 میں انجینئرنگ میں گریجویشن کی اور علی گڑھ یونیورسٹی میں ہی سول انجینئرنگ کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ کولمبیا یونیورسٹی اور ہارورڈ یونیورسٹی سے ہائیڈرولکس اور میکانیات میں ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔ کافی عرصے تک سینٹرل انجینئرنگ اتھارٹی حکومت پاکستان میں ڈپٹی ڈائریکٹر رہے۔ منگلا اور ورسک ڈیم کی تعمیر میں بھی مشیر انجینئر کے طور پر کام کیا۔ آپ کی تصاویر کی پہلی نمائش بھی وارسک ہی میں 1954 میں ہوئی۔ آپ نے مصوری کی روایتی طریقے سے بالکل الگ اپنی دنیا آپ پیدا کی۔ آپ نے اپنے فن پاروں کی وجہ سے بین الاقوامی شہرت حاصل کی اور پاکستان کی شناخت بنے۔ بڑی بڑی عمارتوں پر آپ نے میورل بھی کندہ کیے جیسے حبیب بینک پلازہ، امریکن لائف انشورنس کمپنی، پی آئی اے، شاہ خالد کا محل، نیشنل اسمبلی بلڈنگ اسلام آباد، شاہ فیصل مسجد کی محرابیں، ڈیفنس لائبریری کراچی اور سب سے بڑھ کر 60 ٹن وزنی شاہ فیصل مسجد کے لیے تخلیق کیا ہوا پتھر کا تراشیدہ فن پارہ۔ آپ کی فنی و قومی خدمات کے اعتراف میں حکومت پاکستان کی جانب سے اعلی ترین سول ایوارڈ ہلال امتیاز عطا کیا گیا۔ اس سے پہلے آپ کو 2 بار ستارہ امتیاز، صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی، جاپان فاؤنڈیشن ایوارڈ اور قائد اعظم ایوارڈ بھی دیا جا چکا ہے۔

کمال احمد رضوی

17 دسمبر 2015 کو معروف ڈرامہ نگار اور اداکار کمال احمد رضوی کراچی میں وفات پاگئے اور کراچی میں ہی ڈیفنس سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہوئے. آپ 1930 کو بہار کے ایک قصبے میں پیدا ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے پہلے کراچی اور پھر لاہور میں سکونت اختیار کی جہاں اب تصنیف و تالیف کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ 1958 میں آپ نے تھیٹر کا رخ کیا اور مختلف ڈرامے تحریر کیے۔ 1965 میں لاہور ٹیلی ویژن کے قیام کے بعد پہلی دفعہ الف نون شروع کیا جس میں آپ نے خود الن کا اور محمد رفیع خاور نے ننھے کا کردار ادا کیا۔ یہ پروگرام پی ٹی وی کا مقبول ترین پروگرامز میں سے ایک تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے مختلف ڈراموں میں جیسے آپ کا مخلص، صاحب بی بی اور غلام اور مسٹر شیطان کے نام سرفہرست ہیں۔ آپ ایک اچھے خاکہ

نگار بھی تھے آپ کے خاکوں کا مجموعہ آپ کی وفات کے بعد کمال کی باتیں کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف کے طور پر صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی عطا کیا۔

زین نورانی

18 دسمبر 1992 کو تحریک پاکستان کے کارکن اور ممتاز سیاستدان زین نورانی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 1926 میں ممبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز مسلم اسٹوڈنٹ سے ہوا۔ قائداعظم نے آپ کو ہفت روزہ اسٹار کا نائب مدیر اعلیٰ مقرر کیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ بدستور مسلم لیگ میں شامل رہے اور مغربی پاکستان اسمبلی اور قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ وزیر اعظم محمد خان جونیجو کی کابینہ میں آپ خارجہ امور کے وزیر مملکت کے طور پر شامل تھے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ 1988 میں جنیوا معاہدہ پر دستخط تھے جس کے بعد افغانستان سے روسی افواج کا انخلا عمل میں آیا۔

علامہ رشید ترابی

18 دسمبر 1976 کو تحریک پاکستان کے رہنما، عظیم خطیب، عالم دین اور شاعر علامہ رشید ترابی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 9 جولائی 1908 کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام رضا حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم آپ نے علامہ سید علی شوستری اور آغا محمد محسن شیرازی سے اور عربی کی تعلیم علامہ ابو بکر شہاب اور فلسفے کی تعلیم خلیفہ عبدالحکیم سے حاصل کی۔ آپ نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے اور الہ آباد یونیورسٹی سے فلسفے میں ایم اے کیا۔ آپ نے 16 برس کی عمر میں عنوان مقرر کر کے تقریریں کرنا شروع کیں۔ تقریر کا یہ سلسلہ عالم اسلام میں نیا تھا اس لیے آپ کو جدید خطابت کا موجد بھی کہا جاتا ہے۔ 1942 میں آپ نے آگرہ میں شہید ثالث کے مزار پر جو تقریر کی وہ آپ کی ہندوستان گیر شہرت کا باعث بنی۔ آپ نے نواب بہادر یار جنگ کے ساتھ مل کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور نواب بہادر یار جنگ کے دوش بدوش تحریک آزادی میں بھرپور حصہ لیا۔ قائداعظم نے بھی آپ کی خدمات کو سراہا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی اور عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ آپ کی تقریر کا آغاز بڑی دھیمی آواز سے ہوتا تھا پھر لہجہ بلند تر ہوتا جاتا تھا اور آخر میں پوری قوت کے ساتھ تند و آتشی انداز میں بولتے تھے۔ نشتر پارک اور خالق دینا ہال میں آپ کی تقریر سننے کے لئے پورا شہر امڈ آتا تھا۔ شام غریباں کے موقع پر لاکھوں مسلمان ریڈیو سے آپ کی تقریر سننے کے منتظر رہتے تھے۔ آپ ایک قادرالکلام شاعر بھی تھے آپ کے کلام کا ایک مجموعہ "شاخ مرجان" کے نام سے اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔

شوکت صدیقی

18 دسمبر 2006 کو اردو کے نامور ادیب، ناول نگار، افسانہ نگار اور صحافی شوکت صدیقی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 10 مارچ 1923 کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم اے کیا اور قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے لاہور اور پھر

کراچی آ گئے۔ صحافت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور مختلف اخباروں میں مختلف حیثیتوں میں کام کیا۔ 1958 میں آپ کا معرکتہ الآرا ناول "خدا کی بستی" شائع ہوا۔ اس ناول کے اب تک 62 ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اس کے 42 زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ 1971 میں پاکستان ٹیلی ویژن نے بھی اس ناول کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا اور اس ڈرامے نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ اس کے علاوہ آپ کا ایک اور مشہور زمانہ ناول "جانگلوس" ہے جس کو پی ٹی وی نے ڈرامائی شکل میں ٹی وی پر پیش کیا اور اس نے بے انتہا مقبولیت حاصل کی۔ اس کے علاوہ بھی آپ نے بے شمار افسانے اور ناول لکھے۔ حکومت پاکستان نے آپ کی خدمات کے اعتراف میں صدارتی اعزاز برائے حسن کارکردگی اور ستارہ امتیاز عطا کیا۔

سید صمد حسین رضوی

18 دسمبر 2009 کو پاکستان کے نامور ماہر فلکیات ادیب اور شاعر سید صمد حسین رضوی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 30 جولائی 1924 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ہی انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی اور پھر پاکستان ملٹری انجینئرنگ سے وابستہ ہوئے۔ تاہم آپ کی اصل وجہ شہرت فلکیات سے آپ کا شغف تھا۔ آپ نے اس سلسلے میں کئی تصانیف مقالے اور تراجم یادگار چھوڑے ہیں۔ اخبارات میں رویت ہلال کے بارے میں شائع ہونے والی آپ کی پیشن گوئیاں بیشتر درست ثابت ہوتی تھیں۔

محب عارفی

19 دسمبر 2011 کو اردو کے معروف شاعر محب عارفی کراچی میں وفات پا گئے اور کراچی میں ہی آسودہ خاک ہوئے۔ آپ 2 جنوری 1919 کو یوسف پور ضلع غازی آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام محمد محب اللہ صدیقی تھا۔ مڈل تک تعلیم آپ نے اپنے ضلع میں ہی حاصل کی اور پھر میٹرک انٹر اور گریجویشن آپ نے علی گڑھ سے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ پہلے آپ جنرل ہسپتال کے قریب مہاجر کیمپ میں رہے اور پھر سرکاری نوکری حاصل کرنے کے بعد مارٹن کوارٹرز میں منتقل ہو گئے۔ دارالخلافہ کی تبدیلی کی وجہ سے آپ اسلام آباد چلے گئے اور 1979 میں جوائنٹ سیکریٹری کی منصب سے ریٹائر ہوئے۔ آپ کے شعری مجموعوں میں گل آگہی اور چھلنی کی پیاس شامل ہیں جبکہ آپ کی نثری کتب میر تقی میر اور آج کا ذوق شعری، شریعت مسلک معقولیات اور تجسس کا سفر نامہ کے نام سے شائع ہوئیں۔

عذرا شیر وانی

19 دسمبر 2005 کو پاکستان ٹیلی ویژن کی مایہ ناز اداکارہ عذرا شیر وانی امریکہ میں وفات پا گئیں جہاں وہ اپنے بیٹے کے پاس طویل عرصے سے مقیم تھیں اور امریکہ میں ہی آسودہ خاک ہوئیں. آپ نے بے شمار ٹیلی ویژن ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے مگر انکل عرفی اور تنہائیاں میں آپ کی یادگار پرفارمنس کوئی ٹی وی ناظر کبھی فراموش نہ کر سکے گا۔ آپ ان اداکاراؤں میں شامل تھیں جنہیں مد نظر رکھ کر خصوصی کردار تخلیق کیے جاتے تھے۔

نجم آفندی

21 دسمبر 1975 کو اردو کے نامور مرثیہ گو شاعر نجم آفندی کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1893 میں آگرہ کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کا اصل نام مرزا تجمل حسین تھا۔ آپ کے پر دادا جعفر علی فصیح کو حاجیوں کی خدمت کرنے پر سلطنت عثمانیہ کی جانب سے آفندی کا خطاب ملا تھا۔ تب سے یہ خطاب نسلن بعد نسلن آپ کے خاندان کے افراد کے ناموں کا جز بن گیا۔ آپ نے 12 سال کی عمر میں شاعری کا آغاز کر دیا تھا۔ ابتداء میں آپ نے غزل کہی مگر پھر مرثیہ نگاری کی طرف راغب ہو گئے اور اتنا کمال حاصل کیا کہ ناصر الملک نے آپ کو شاعر اہل بیت کا خطاب عطا کیا۔ آپ نے مرثیوں اور رباعیات کے لاتعداد مجموعے یادگار چھوڑے۔ آپ کی کلیات "کائنات نجم" کے نام سے 2 جلدوں میں اشاعت پذیر ہو چکی ہے۔

شہزاد خلیل

23 دسمبر 1989 کو پاکستان ٹیلی ویژن کے ممتاز پروڈیوسر شہزاد خلیل حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے کراچی میں وفات پا گئے۔ آپ 1944 میں پیدا ہوئے تھے۔ 1982 میں پاکستان ٹیلی ویژن کی ٹیم کا حصہ بن کر کئی مشہور ڈراموں کی ہدایات دیں۔ ان میں ڈرامہ سیریل پلیٹ فارم، سایہ، تیسرا کنارہ، تنہائیاں، راشد مہناز اور دھوپ کنارے کے نام سرفہرست ہیں۔ آپ کو متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا تھا جن میں کئی پی ٹی وی ایوارڈز اور صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی بھی شامل ہے۔ آپ کے انتقال کے بعد کراچی کی ایک سڑک کو بھی آپ کے نام سے منسوب کیا گیا۔

ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد

23 دسمبر 1947 کو برصغیر کے مشہور ماہر تعلیم ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد وفات پا گئے۔ آپ 13 فروری 1878 کو میرٹھ میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والد حافظ نعیم الدین زبیری تحصیلدار تھے۔ 1897 میں آپ نے ایم اے ریاضی کیا اور سرکاری وظیفے پر اعلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان گئے۔ وہاں ریاضی کے اعلی اعزازات حاصل کیے خصوصا "سر نیوٹن اسکالر شپ" جسے حاصل کرنے والے آپ پہلے ہندوستانی تھے۔ 1905 میں آپ نے جرمنی کی ایک یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1906 میں آپ ہندوستان واپس آئے تو حکومت نے سرکاری ملازمت کے لیے اصرار کیا لیکن آپ اپنی مادر علمی یعنی علی گڑھ سے ایسے وابستہ ہوئے کہ آخری سانس تک اس کے لیے وقف رہے۔ پہلے پروفیسر پرنسپل اور بعد ازاں وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ آپ نے طلبہ کی بہبود کے لیے بے مثال اقدامات کیے یونیورسٹی میں تمام ضروری اور جدید سائنس کے شعبے قائم کرائے مثلا انجینئرنگ، میڈیکل، نرسنگ کا ادارہ، زراعت، کامرس، ہوابازی وغیرہ۔ آپ ہی کے زمانے میں سپلیمنٹری امتحان متعارف کرایا گیا۔ جب تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے دوران علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بند کرنے کی کوشش کی گئی اور ضد میں علی گڑھ کے اندر جامعہ ملیہ کے نام سے ایک اور یونیورسٹی قائم کی گئی۔ اس نازک دور میں یہ آپ ہی کا کارنامہ تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو بند ہونے سے

بچالیا۔ آپ 1906 سے ہی مسلم لیگ کے بنیادی رکن تھے اور اپنی وفات تک اس کے رکن رہے۔ 1938 میں جب آپ مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تو قائداعظم کی فرمائش پر اسمبلی میں مسلم لیگ کے پارلیمانی سیکریٹری بنے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ کی یاد میں ڈاکٹر ضیاءالدین ہسپتال ڈاکٹر ضیاءالدین میڈیکل یونیورسٹی جبکہ کراچی کی ایک مرکزی شاہراہ بھی آپ کے نام سے منسوب ہے۔ حال ہی میں سندھ کے اندر آپ کے نام سے ضیاءالدین تعلیمی بورڈ بھی بنایا گیا ہے۔

وفاکانپوری

24 دسمبر 2003 کو معروف شاعر اور ماہر تعلیم وفاکانپوری کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ کا اصل نام مرزا قمر عباس تھا وفا تخلص تھا اور کانپور سے تعلق کی وجہ سے وفاکانپوری کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی اولین رہائش سوکواٹر گولیمار میں تھی۔ آپ نے کراچی یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا اور سندھ پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرکے تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوگئے۔ کراچی کے مختلف کالجوں میں تدریس کے فرائض انجام دیئے آخری وقت میں اسلامیہ کالج کے اردو ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ تھے۔ آپ کا پڑھانے کا انداز اتنا دلنشین اور لیکچر اتنا پر مغز ہوتا تھا کے دوسرے کالجوں کے طلباء بھی آپ کی کلاس لینے کھچے چلے آتے تھے۔ جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر لیکچر علمی لحاظ سے جاندار ہو اور طلباء کو بات سمجھ میں آرہی ہو تو پھر متلاشی علم کے لئے یہ بات اہمیت نہیں رکھتی کہ مضمون کونسا ہے۔ آپ نے کم عمری میں ہی شاعری شروع کردی تھی اور یونیورسٹی ہی کے زمانے میں اپنی شاعری سے کافی شہرت حاصل کرلی تھی مگر آپ مشاعروں میں شرکت نہیں کرتے تھے۔ آپ ایک بہترین آرٹسٹ بھی تھے خاص کر کیلی گرافی اور سائن بورڈ پینٹنگ میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ آخری زمانے میں آپ کا ایک کلام بہت زیادہ مشہور ہوا۔ جس کا مصرع یہ تھا۔
اے کاش میں بھی ہوتا میدان کربلا میں۔

اظہار قاضی

24 دسمبر 2007 کو پاکستان کے مشہور اداکار اظہار قاضی
وفات پاگئے۔ آپ 1957 کو کراچی میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ نے جامعہ کراچی سے تعلیم حاصل کی اور پاکستان اسٹیل میل سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ 1984 میں آپ نے پاکستان ٹیلی ویژن کے ڈرامہ سیریز کہ ایک ڈرامے تھکن سے اپنے فنی کیریئر کا آغاز کیا۔ اس ڈرامے میں آپ کا کردار بہت مختصر سا تھا مگر آپ نے اتنے بھرپور انداز سے ادا کیا کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروڈیوسروں کی توجہ اپنی طرف کروالیں۔ اس کے بعد پروڈیوسر قاسم جلالی نے اپنے ایک ڈرامے گردش میں اور پھر انا میں اپنے فن کا اتنا بہترین مظاہرہ کیا کہ آپ کو پاکستانی امیتابھ بچن کہا جانے لگا۔ اس کے بعد آپ فلمی صنعت میں چلے گئے اور اپنی وفات تک اسی میں رہے تھے۔ آپ نے 87 فلموں میں کام کیا جن میں زیادہ تر کامیاب ہوئیں۔

پروین شاکر

26دسمبر 1994کو پاکستان میں اردو ادب کی صف اول کی شاعرہ اور بیوروکریٹ محترمہ پروین شاکر اسلام آباد میں ٹریفک کہ ایک حادثے میں وفات پا گئیں۔آپ 24نومبر 1952کو کراچی میں پیدا ہوئی تھیں۔آپ کا آبائی تعلق حسین آباد صوبہ بہار سے تھا۔ میٹرک رضویہ سوسائٹی کے ایک اسکول سے کیا اور سرسید کالج کے شعبہ فنون میں داخلہ لیا۔کراچی یونیورسٹی سے انگریزی ادب اور لسانیات میں ایم اے کیا۔کچھ عرصہ سرسید گرلز کالج میں اور پھر عبداللہ گرلز کالج میں انگریزی کی استاد رہیں۔1981میں آپ نے سی ایس ایس کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور میرٹ پر دوسرے نمبر پر رہیں اس کے بعد آپ کسٹم اینڈ ایکسائز کے محکمے میں ڈپٹی کلکٹر کسٹم کے عہدے پر فائز ہوئیں اور اسلام آباد چلی گئیں۔آپ نے باقاعدہ شاعری زمانہ طالب علمی سے ہی شروع کر دی تھی تاہم 1977میں آپ کا پہلا مجموعہ خوشبو شائع ہوا۔اس مجموعہ کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی اور آپ کا شمار اردو کے صف اول کے شعرا میں ہونے لگا۔خوشبو کے بعد آپ کے کلام کے کئی اور مجموعے صد برگ خود کلامی اور انکار شائع ہوئے۔جبکہ آخری مجموعہ ماہ تمام آپ کی وفات کے بعد اشاعت پذیر ہوا۔آپ کو اردو کے صاحب اسلوب شاعروں میں شمار کیا جائے تو بے جانہ ہوگا۔آپ نے اردو شاعری کو نیا لب ولہجہ دیا اور شاعری کو نسائی احساسات سے مالامال کیا۔آپ کا اصل وصف مشاہدے کی حس اور زندگی کے معاملات کو اشعار کے دھاگوں میں پرونے کا فن ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ نے غیر معمولی طور پر بہت کم عمر اور کم وقت میں اپنے خوبصورت شاعرانہ اسلوب سے ہر خاص وعام کو اپنا گرویدہ بنالیا۔آپ جو کچھ کہتی ہر کوئی سمجھتا گویا یہ اس کے دل کی آواز ہے۔

پروفیسر غفوراحمد

26دسمبر 2012کو بزرگ سیاستدان اور جماعت اسلامی کے نائب امیر پروفیسر غفور احمد وفات پا گئے۔آپ 20جون 1927کو بریلی اترپردیش میں پیدا ہوئے تھے۔آپ نے لکھنؤیونیورسٹی سے ایم کام کی ڈگری حاصل کی تھی۔قیام پاکستان کے بعد آپ کراچی میں رہائش پذیر ہوئے۔یہاں آپ نے انڈسٹریل اکاؤنٹس کا کورس کیا اور آئی سی ایم اے کی فیلوشپ حاصل کی۔آپ ICAP، انسٹیٹیوٹ آف انڈسٹریل اکاؤنٹس اور اردو کالج جیسے تعلیمی اداروں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔آپ 1970 اور 1976کے عام انتخابات میں کراچی سے قومی اسمبلی کے رکن بھی منتخب ہوئے۔1973کے آئین کی تشکیل کا کام کرنے اور اس آئین کے مسودے پر دستخط کرنے والے سیاست دانوں میں شامل تھے۔ایک دفعہ وفاقی وزیر صنعت بھی رہے۔آپ نے پاکستان کی سیاسی موضوعات پر 5کتابیں بھی تحریر کی ہیں

پروفیسر شاہ فریدالحق

26دسمبر 2011کو ممتاز ماہر تعلیم عالم دین اور سیاست دان پروفیسر شاہ فریدالحق کراچی میں وفات پا گئے۔آپ 1933میں ضلع بالیاں ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔میٹرک کے امتحان میں فرسٹ پوزیشن حاصل کرنے کے بعد شبلی کالج اعظم گڑھ سے آرٹس میں انٹر کیا۔علیگڑھ یونیورسٹی سے ایم اے اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کیں۔قیام پاکستان کے بعد آپ نے کراچی میں سکونت

اختیار کی اور اسلامیہ کالج میں بحیثیت لیکچرار مقرر ہو گئے اور 15 سال تک آپ اس کالج سے وابستہ رہے اسی دوران آپ نے کئی کتب کی تصنیف کیں جو انٹر اور بی اے کے کورس میں شامل رہیں۔ آپ نے ملیر میں تعلیم کے حصول میں دشواری کو دیکھتے ہوئے یہاں لیاقت کالج کے نام سے ایک کالج بنایا جو بعد میں حکومت کی ملکیت میں چلا گیا۔ 1970 اور 1977 کے عام انتخابات میں آپ صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی منتخب ہوئے۔ جبکہ ایک دفعہ سندھ اسمبلی میں قائد حزب اختلاف بھی رہے۔

ڈاکٹر منظور دین احمد

27 دسمبر 2012 کو جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر منظور دین احمد نیویارک میں وفات پاگئے۔ آپ 1929 میں متحدہ ہندوستان کے شہر سلطان پور کے مقام پر پیدا ہوئے تھے آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے ماسٹرز اور کولمبیا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آپ کولمبیا یونیورسٹی کے شعبہ پاکستان اسٹڈیز میں قائداعظم کے سربراہ بھی رہے۔ 1973 میں آپ جامعہ کراچی کے شعبہ پولیٹیکل سائنس سے منسلک ہوئے اور 1987 میں جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ اس عہدے پر 1990 تک فائز رہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں اسلامک پولیٹیکل سسٹم ان ماڈرن ایج اور پاکستان انڈ پینڈنس اینڈ بیانڈ کے نام سر فہرست ہیں۔

ڈاکٹر منظور الدین احمد

27 دسمبر 2012 کو جامعہ کراچی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر منظور الدین احمد نیویارک میں وفات پاگئے۔ آپ 1929 میں متحدہ ہندوستان کے شہر سلطان پور کے مقام پر پیدا ہوئے تھے آپ نے الہ آباد یونیورسٹی سے ماسٹرز اور کولمبیا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ آپ کولمبیا یونیورسٹی کے شعبہ پاکستان اسٹڈیز میں قائداعظم کے سربراہ بھی رہے۔ 1973 میں آپ جامعہ کراچی کے شعبہ پولیٹیکل سائنس سے منسلک ہوئے اور 1987 میں جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ آپ اس عہدے پر 1990 تک فائز رہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے جن میں اسلامک پولیٹیکل سسٹم ان ماڈرن ایج اور پاکستان انڈ پینڈنس اینڈ بیانڈ کے نام سر فہرست ہیں۔

شاہ محی الحق فاروقی

31 دسمبر 2011 کو اردو کے ممتاز ادیب اور مترجم شاہ محی الحق فاروقی کراچی میں وفات پاگئے۔ آپ 15 جون 1932 کو غازی پور یوپی میں پیدا ہوئے تھے۔ ابتدائی تعلیم شبلی انٹر کالج اعظم گڑھ سے حاصل کی اور قیام پاکستان کے بعد کراچی میں سکونت اختیار کی۔ کراچی آکر ذریعہ معاش اور حصول علم کے لیے دو مختلف جگہوں پر ملازمت کرتے رہے۔ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کر کے گریڈ 15 کی جاب حاصل کی اور ترقی کرتے ہوئے جوائنٹ سیکریٹری گریڈ 20 پر ریٹائر ہوئے۔ آپ کی تصانیف میں بیدار دل لوگ اور کھٹے میٹھے انار اور تراجم میں بلبل نواب کی اور ان دیکھی گہرائیوں کے نام شامل ہیں۔ آپ سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی ڈاکٹر مشیر الحق کے چھوٹے بھائی تھے۔